شہنشاہ اقلیم سائنس

سیرت ڈاکٹر عبدالسلام

رانا عبدالرزاق خان لندن

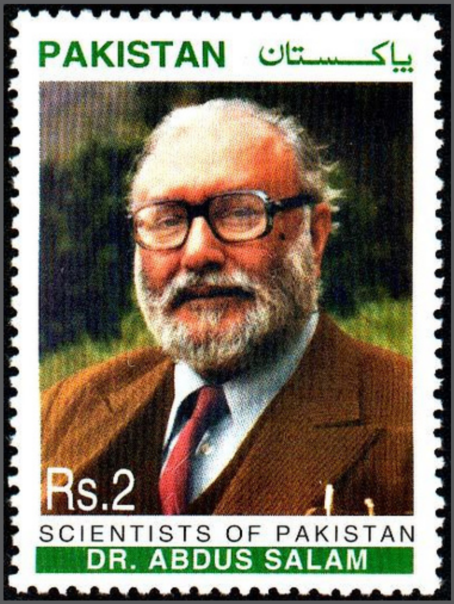
PAKISTAN
پاکستان
Rs.2
SCIENTISTS OF PAKISTAN
DR. ABDUS SALAM

شہنشاہ اقلیم سائنس

مؤلف: رانا عبدالرزاق خان ۔لندن

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	:	سیرت عبدالسلام صاحب
مصنف	:	رانا عبدالرزاق خان
ناشر	:	قندیل ادب انٹرنیشنل لندن
سن اشاعت	:	2025
ملنے کا پتہ	:	103 پیٹر بارو روڈ
		SM5 1EE

Qindeel-e-Ilem

(Articals on History, Education, Politics & Poetry.)

By: Rana Abdul Razzaq Khan London
E-mail:ranarazzaq52@gmail.com
(M) 00447886304637

فہرست

نمبر شمار	نام مضمون	صفحہ نمبر
	پیش لفظ۔ زکریا ورک کینیڈا	
	اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر عبدالسلام کو عالمی اعزازت سے نوازا۔ انجینئر محمود مجیب اصغر	
	پروفیسر عبدالسلام صاحب کی شخصیت ۔۔۔۔۔ پروفیسر آصف علی پرویز	
	چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے۔	1
	ڈاکٹر عبدالسلام ۔ راغب مراد آبادی	4
	غیر اس کے سب ہیں فانی۔ حضرت امام جماعت احمدیہ کا محبت بھرا ذکر خیر	5
	پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے اعزازات ۔ مکرم راجہ برہان احمد صاحب	20
	عظمتوں کا مینار ۔ مکرم نصیر احمد صاحب انجم	24
	ڈاکٹر عبدالسلام ۔ عطاء القدوس طاہر	26
	چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے۔ بشریٰ ربانی	27
	ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بزرگ۔ مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب	28
	ڈاکٹر عبدالسلام ۔ عبدالکریم قدسی	44
	خدائے ''السّلام'' کا بندہ ۔ عبدالسلام مکرم ناصر احمد طاہر	45
	ڈاکٹر عبدالسلام صاحب امپیریل کالج ۔ چوہدری عبدالحمید صاحب	51
	ہمارے بھائی جان ۔ مکرم چوہدری عبدالرشید صاحب لندن	55
	میرے پیارے بھیّا۔ مکرم حمیدہ بشیر صاحبہ کراچی	61

	ڈاکٹر عبدالسلام ۔ میرا بھائی ۔ مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب	59
	ڈاکٹر صاحب کا ایک مکتوب اور اس کا متن	73
	سائنسدانوں کو ناز تھا اس پر ۔ سلیم شاہجہانپوری	77
	آغاز کس طرح کروں اس داستان کا ۔ آپ کے اہلِ خانہ کا انٹرویو	78
	انٹرویو محترمہ ڈاکٹر امۃ الرشید صاحبہ ۔ تحریر سعدیہ ایاز صاحبہ	78
	ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی محترمہ آصفہ صاحبہ سے انٹرویو	82
	ڈاکٹر صاحب کی بیٹی محترمہ بشریٰ صاحبہ	84
	اہلیہ ثانی ڈاکٹر صاحب محترمہ لوئس جانسن سلام صاحبہ سے ایک انٹرویو	85
	آپ کے صاحبزادے عمر سلام صاحب	88
	نوبل انعام کا بانی ۔ الفریڈ نوبل ۔ مکرم ڈاکٹر سلطان احمد مبشر صاحب	90
	نوبل انعام کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ۔ مکرم منیر الدین احمد صاحب	94
	ایک عظیم توحید پرست سائنسدان ''انٹرویو نوائے وقت'' امۃ الحی آسیہ صاحبہ	98
	صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف مکرم پروفیسر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب	111
	دور حاضر کا شہرہ آفاق عظیم پاکستانی سائنس دان ۔ مسعود احمد خان دہلوی	127
	سلام عالم اسلام کا سرمایہ افتخار ۔ پروفیسر راجہ نصر اللہ خان	158
	ڈاکٹر عبدالسلام ۔ چند یادیں ۔ بشیر احمد خان رفیق	181
	میرا سائنسی شریک کار، عبدالسلام ۔ پروفیسر جوگیش پتی	189
	پروفیسر عبدالسلام صاحب آئیوری کوسٹ میں ۔ مکرم نصیر احمد صاحب شاہد	199
	مکرم ڈاکٹر صاحب اور گورنمنٹ کالج لاہور ۔	203

	محترم ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق ۔ گورنمنٹ کالج کے خالد آفتاب صاحب	208
	گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ فزکس کے چیئر مین ڈاکٹر محمد زکریا بٹ سے گفتگو	210
	پروفیسر عبدالسلام ۔ ایک مطالعہ ۔ پروفیسر اسرار احمد علی گڑھ	220
	چند یادیں چند باتیں ۔ محترم ثاقب زیروی صاحب	224
	ڈاکٹر صاحب کی خدمات اور اوصافِ جمیلہ امۃ الحئی آسیہ صاحبہ	227
	ڈاکٹر پروفیسر انیس عالم صاحب ۔ مکرم حافظ راشد جاوید صاحب	247
	ڈاکٹر عبدالسلام صاحب تنزانیہ میں ۔ مکرم عبدالوہاب احمد صاحب	252
	انٹرو ویو ڈاکٹر پروفیسر مجاہد کامران ۔ مکرم انصر رضا، مکرم راشد جاوید صاحب	259
	ڈاکٹر صاحب کو خراج عقیدت ۔ پروفیسر ڈاکٹر اختر حسین آفتاب، بھارت	267
	ایک نابغۂ روزگار وجود ۔ مکرم عطاء المجیب راشد صاحب ۔ لندن	270
	ڈاکٹر عبدالسلام کی رحلت ۔ ڈاکٹر منیر احمد خان صاحب	273
	ڈاکٹر سلام کی سائنسی خدمات اور اعلیٰ کردار ۔ ڈاکٹر منیر احمد خان صاھب	277
	میرا دوست میرا حبیب ۔ سابق چیف آف ائیر سٹاف ظفر چوہدری	286
	ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر خدا سے دعا ۔ انور سدید	291
	نایاب ہیں ہم ۔ ہیرو کی موت ۔ روزنامہ پاکستان لاہور کی ایک تحریر	295
	پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی یاد میں ۔ مکرم ظہور الدین بابر	300
	بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ۔ مکرم ڈاکٹر فہمیدہ منیر صاحبہ	301
	ڈاکٹر عبدالسلام ۔ عالم سائنس میں پاکستان کی شناخت ۔ سید سجاد نقوی	302
	ایک کڑوا سچ ۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی جلاوطنی آخر ختم ہوئی	307

	پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی عظیم سائنسی خدمات ۔ راجا نصر اللہ خان	312
	وحدت، حقیقت اور عبدالسلام ۔ پروفیسر جان زیمان برسٹل یونیورسٹی	331
	گمنام تھا وطن میں ۔ جناب اصغر علی گھرال	340
	گورنمنٹ کالج کا مالی بابا سید اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب	346
	روحانی اقدار کے علمبردار ایک صوفی سائنسدان ۔ زینب محمود	348
	ڈاکٹر عبدالسلام کی ادبی خدمات ۔ از عمران اختر	357
	پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام صاحب سے وابستہ یادیں ۔ انجینئر محمود مجیب اصغر	448
	پہلا احمدی مسلمان نوبیل انعام یافتہ سائنسدان ۔ ڈاکٹر محمد عبدالسلام ایک زندہ جاوید شخصیت (انجینئر محمود مجیب اصغر)	453
	حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا تعلیمی منصوبہ اور ڈاکٹر عبد السلام ۔ (انجینئر محمود مجیب اصغر)	461
	اس ایٹمی دور میں پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے میں ڈاکٹر محمد عبد السلام کی نمایاں خدمات (انجینئر محمود مجیب اصغر)	471
	آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ ۔ پروفیسر عبدالسلام صاحب کے قلم سے	480
	پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا مقالہ ۔ ملک مبشر احمد صاحب کراچی	492
	ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک مختصر خطاب ۔ مرسلہ لطیف احمد کاہلوں	503
	ڈاکٹر عبدالسلام کا ایک لیکچر ۔ سائنس، قیام امن ۔ تقریر ڈاکٹر صاحب	505
	ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک یادگار انٹرویو	514
	ڈاکٹر صاحب کی کتب کا تعارف ۔ صبوحی ناصر صاحبہ اور مکرمہ منورہ حمید صاحبہ	528

	خدا حافظ و ناصر۔تحریر سید مبشر احمد ایاز مدیر ''خالد''	550
	ہمارا ہیرو ہم سے رخصت ہو گیا۔ڈاکٹر پرویز ہود بھائی	554
	دروغ بر گردن ''راوی''	557
	ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔منیر احمد خان	558
	قراردادِ تعزیت۔مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان	563

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ نصلی علیٰ رسولہ الکریم

وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

عرض مؤلف

راناعبدالرزاق خاں لندن

یہ محض اللہ تعالیٰ کافضل اوراحسان ہے کہ خاکسار اپنی گیارہویں کتاب مکمل کرنے کے قابل ہوا ہے۔یہ سب دوست احباب کے تعاون سے ممکن ہوا ہے۔میرے بہت سے مہربان دوست ہیں ۔جن کا ذکرضروری ہے۔محترم زکریاورک صاحب جنہوں نے خود ڈاکٹرعبدالسلام پر چار کتب لکھ رکھی ہیں۔ان کے تعاون سے اس کتاب کومرتب کرنے تک پہنچا۔دوسرے محترم انجینئر محمود مجیب اصغر ہیں۔جوایک منجھے ہوئے لکھاری ہیں،انہوں نے حیات ناصر کے علاوہ بھی بہت سی کتب لکھی ہیں۔تیسرے پروفیسر آصف علی پرویز ہیں۔جنہوں نے ڈاکٹرعبدالسلام کے کام پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔المنار یوکے میں مسلسل 2008ءسے لکھ رہے ہیں۔چوتھے دوست چوہدری کولمبس خان جرمنی سے ہیں جوایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔المنار جرمنی کے ایڈیٹرہیں۔انہوں نے بھی حددرجہ تعاون کیاہے۔

ڈاکٹرعبدالسلام وہ ہیرا ہے جسے نیک سیرت لوگوں کی دعاؤں نے جلابخشی ہے۔یہ ایک اعجاز مسیحا ہے۔جس کی قدروقت کے ابوجاہلوں نے نہیں کی۔مگر اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹرعبدالسلام کوابدی عزت وتوقیردے کران وقت کے یزیدوں کے منہ میں خاک ڈال دی۔اب تک ساری اُمت اس پایہ کاایک انسان نہ پیداکرسکی۔یہی وہ اُمت ہے جس نے اپنے عبقری سائنس دانوں اوراہل علم و عقل سے مجرمانہ سلوک کرکے اسلام ترقی کوپس پشت ڈالا۔اوراسی وجہ سے یہودونصائی کی جوتیاں

چاٹنے میں مصروف ہیں۔ڈاکٹر عبدالسلام نے تاریخ کو دہرایا ہے۔ابن رُشد اور سب کو زندہ کیا ہے۔اور اس اُمت کے مقتدر حکمرانوں نے وقت کے ابوجاہلوں کو زندہ کیا ہے۔**انا للہ وانا الیہ راجعون**۔خاکسار نے تو ڈاکٹر عبدالسلام کی سیرت کو مرتب کر کے احباب حاضر کو وہ آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس دور میں بھی دیدہ ور لوگ تھے۔قدردان تھے۔نیک فطرت لوگ ہر وقت اپنے ماحول پر نظر رکھتے ہیں۔اور سیاہ سفید کے فرق کو بیان کرتے ہیں۔ہمیں چاہیئے کہ سچائیوں کو بیان کریں۔حقائق کو منظر عام پر لائیں تا کہ آنے والے مستقبل کا قاری کسی نتیجے پر پہنچے۔تاریخ مرتب کرنے سے ایک زمانہ سنبھالا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ برکات خلافت سے ممکن ہوا ہے۔ہم سب کچھ بھی نہیں۔جب تک ہم سب اس اس رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں گے۔ہم صحرا و دشت عبور کرتے چلے جائیں گے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔میں سب کا مشکور و ممنون ہوں۔

والسلام

رانا عبدالرزاق خاں

7 فروری 2025ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نوبیل انعام یافتہ سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کی ولادت با سعادت 29 جنوری 1926 کو (سنتوک داس) جھنگ میں ہوئی تھی۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ آپ کی ولادت کے عین 99 سال بعد شائع ہو رہی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس نیک اور تاریخی کام کو کما حقہ ادا کرنے کی سعادت لندن کے معروف ادیب، کہنہ مشق شاعر، درجن بھر کتابوں کے مؤلف ومصنف، اور منجھے ہوئے قلمکار جناب رانا عبدالرزاق خاں کے حصہ میں آرہی ہے۔ زیر نظر کتاب میں 68 مضامین دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے متعدد یہ مضامین ربوہ سے شائع ہونیوالے رسالہ خالد کی اشاعت خاص ''عبدالسلام نمبر'' میں 1997 میں شائع ہوئے تھے۔ ان کو قند مکرر کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ یہ مضامین ایک نسل قبل شائع ہوئے تھے اس لئے ایک مقصد یہ ہے نئی نسل بھی ان مضامین سے آگاہ ہو سکے۔ کتاب میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے بارے میں جن لوگوں کے قلبی تاثرات شامل کئے گئے ہیں ان میں ان کے افراد خاندان، ان کے اساتذہ، شاگرد، روحانی بزرگ، اہل صحافت، اور مغرب ومشرق میں ان کے دوست احباب شامل ہیں۔ اسلامی ممالک میں سائنس کا فروغ اور نشاۃ ثانیہ ان کا مرغوب موضوع سخن تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنے بچے سمجھتے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب سے پوچھا جاتا کہ ان کے کتنے بچے ہیں تو جواب دیتے کئی ہزار۔ منظوم کلام بھی دیا گیا ہے۔ جو مضامین انگلش میں قلمکاروں نے لکھے تھے ان کے سکہ بند تراجم بھی دیئے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ کتاب ایک حسین وجمیل مرقع ہے۔

راقم مضمون ان خوش نصیب وخوش بخت انسانوں میں سے ہے جس نے ڈاکٹر عبدالسلام جیسے قدآور طبیعات دان سے 1982 میں وسکانسن ریاست کے شہر میڈیسن میں 1982 میں سیر حاصل ملاقات کی تھی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ آپ کو نوبیل انعام ملنے کے دوسال بعد 1981 میں ٹورنٹو کے ایک کمیونٹی اخبار میں آپ کی اس عظیم الشان کامیابی پر انگلش میں راقم نے ایک مضمون لکھا اور اس کی کاپی ڈاک سے آپ کو لندن روانہ کردی۔ آپ نے اس مضمون کو بہ نظر استحسان دیکھا اور جواباً خط میں لکھا:

I appreciated the manner in which you have brought out faith of an Ahmadi Muslim

یہ گرامی نامہ ٹائپ شدہ تھا مگر اس کے سرورق پر بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی عبدہ المسیح الموعود ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ اگلے سال میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ایک روز مجھے آپ کا خط موصول ہوا کہ میں فلاں تاریخ کو میڈیسن (وسکانسن امریکہ) لیکچر دینے کے لئے آرہا ہوں اس لئے اگر ممکن ہو تو ملاقات کے لئے ضرور آؤں۔ چنانچہ ایک لمحہ کے تردد کے بغیر ہم ٹورنٹو سے ملواکی ایک ہزار کیلومیٹر کا سفر کار کے ذریعہ طے کر کے پہنچے، اور وہاں سے کچھ روز آرام کے بعد میڈیسن یونیورسٹی کی اس سٹوڈنٹ ریزی ڈینس میں پہنچ گئے جہاں آپ کی رہائش تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا آپ لیکچر دینے کے بعد قیلولہ فرما رہے تھے۔ پنجابی میں اور میرا اور میری اہلیہ کا تعارف ہونے کے بعد میں نے آپ سے اجازت طلب کی کہ کچھ پوچھ سکتا ہوں تو آپ نے مسکرا کر فرمایا بڑے شوق سے۔

اس دور میں امریکہ میں پاکستان کے نیوکلئیر بمب بنانے کا بہت چرچا تھا۔ میں نے اس ضمن میں نیویارک ٹائمز اور انڈیا ابراڈ میں مضامین بھی مطالعہ کئے تھے۔ میں نے آپ سے پوچھا کہ مغربی میڈیا میں کہا جاتا ہے کہ آپ پاکستان کی اس ضمن میں مدد کر رہے ہیں؟ بلکہ بعض نے تو آپ کو

فادر آف نیوکلیئر پروگرام بھی لکھا ہے۔ تو آپ مسکرا دئے اور ایک منجھے ہوئے ڈپلومیٹ کی طرح فرمایا: It's a double edge sword ہم دونوں تقریباً ایک گھنٹہ تک گفتگو کرتے رہے۔ دوران گفتگو آپ نے مجھے وہ والا مشہور واقعہ بھی سنایا کہ کس طرح صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد میں پارلیمنٹ بلڈنگ میں ملاقات کے دوران لفظ خاتم النبیین کے معنی پر بات چیت کی تھی۔ صدر صاحب کو مسکت جواب دے کر شش و پنج میں ڈال دیا تھا بلکہ جنرل صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کو خود سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں۔ اور جب ڈاکٹر سلام نے کہا کہ کیا میں اس کو اخبارات میں چھپوا دوں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس سے انکار کر دوں گا۔ ہماری گفتگو پنجابی اور انگلش میں دونوں زبانوں میں تھی۔ اس واقعہ کی تفصیل کتاب ''مسلمانوں کا نیوٹن'' میں تفصیل سے درج ہے۔

اس کے بعد آپ نے نیویارک کی فلائٹ لینی تھی تو میں بھی آپ کے ہمراہ اپنی کار میں ائرپورٹ پہنچ گیا جہاں نصف درجن کے قریب آپ کے مداح پاکستانی دوست آئے ہوئے تھے۔ میں نے آپ کو شگفتہ مزاج، ظریف الطبع پایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ قدرت نے آپ کو مردم شناسی، معاملہ فہمی اور خطابت کا جوہر بھی عطا کیا تھا۔ روانگی سے قبل آپ نے مجھے اپنا نیویارک کا فون نمبر دے دیا۔ واپس ٹورنٹو آکر میں نے CHIN ریڈیو پر ہونے والی ہفتہ وار پروگرام ''وائس آف انڈیا'' کے جرنلسٹ اور نیوز ریڈر پروفیسر نرندر ناتھ سے گزارش کی کہ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔ وہ فوراً رضامند ہوگئے۔ اس تاریخی انٹرویو کا ٹیپ کیسٹ 43 سال بعد بھی میرے پاس ہے اور اب تو اس کو ای میل اور واٹس ایپ (2025) پر بھی درجنوں دوستوں اور احباب کو بھجوا دیا ہے۔ یہ انٹرویو میں نے ڈاکٹر سلام پر ڈاکومنٹری Salam–The First......Nobel Laureate بنانے والے کراچی کے نوجوان ذاکر تھاور Z.Thaver کو بھی دیا تھا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کا آڈیو فلم میں استعمال کر کے کریڈٹس میں میرا نام بھی دیا تھا۔ یہ فلم یوٹیوب پر دستیاب ہے۔

اگلے دس سال میری آپ سے خط و کتابت جاری رہی۔ اکثر خطوط کے جواب آپ کی پرسنل سیکرٹریز دیتی تھیں مگر ایسا بھی ہوا کہ جواب کے آخر پر آپ کے دستخط کے مہر لگی ہوتی تھی۔ یہ خطوط ابھی تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ امریکہ کے کسی رسالے یا کتاب میں آپ کے بارے میں کچھ بھی ملتا تو فوراً اس کی نقل آپ کو بھجوا دیتا۔ جیسے ٹائمز میگزین میں مضمون کی کاپی اور نیشنل جیوگرافک میں مضمون کی کاپی آپ کو بھجوائی۔ آپ کا اردو مضمون رسالہ تہذیب الاخلاق 1986 میں شائع ہوا، جو ایک قسم کی خودنوشت ہے۔ اس کا انگلش میں ترجمہ میں نے 1989 میں آپ کو بھجوایا تو آپ نے میری اس حقیر کوشش کو بہت سراہا بلکہ اس ترجمہ کا آئی سی ٹی پی کی سکریٹری سے ورڈ پروسیسر پر ٹائپ کرواکے مجھے نقل بجھوائی۔ یہ مضمون ریویو آف ریلیجنز کے 1990 کے ایک شمارہ کی زینت بنا تھا۔ الاسلام ویب سائٹ پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ 21 نومبر 2024 کو بی بی سی لندن کے صحافی وقار مصطفیٰ نے آپ وفات کی برسی کے ضمن میں وقیع مضمون شائع کیا جس میں میرے اس ترجمے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ اس دوران گاہے بگاہے مجھے آپ کی طرف سے تصانیف موصول ہوتی رہیں جیسے آئیڈیلز اینڈ ریلیٹیز (10)، نوٹس آن سائنس، یونی فی کیشن آف فنڈا مینٹل فورسز۔ مؤالذکر کتاب کے ساتھ آپ کی نصف درجن تصاویر بھی تھیں اور سکریٹری Katrina Danforth کا پیغام تھا۔ Prof Salam sends his regards. Jan 1992 آپ کی صحت پارکنسن بیماری سے کافی ناساز ہو چکی تھی اس لئے خط و کتابت کا تسلسل قائم نہ رہا۔

تا وقت تحریر راقم آثم کو آپ کی زندگی اور سائنسی کارناموں میں چار کتابیں (رموز فطرت 1996، مسلمانوں کا نیوٹن 2003، ذکر عبدالسلام 2010، سلام عبدالسلام 2015) اور ایک کتاب انگلش میں سو سے زیادہ مضامین پر مشتمل سائنٹسٹ آف دی ایسٹ (2016 آن لائن) شائع کرنے کی توفیق ملی ہے۔ رموز فطرت آپ کی وفات نومبر 1996 سے چند ماہ قبل آکسفورڈ پہنچا دی گئی تھی۔ نیز پچھلے تیس سالوں میں درجنوں مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے کی سعادت ملی جو ہندوستان،

پاکستان، کینیڈا، برطانیہ کے مختلف اخبارات اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

کتاب کے مؤلف رانا عبدالرزاق خاں اپنی ذات میں انجمن بلکہ ایک سرگرم ادارہ ہیں۔ آپ کی ادبی سرگرمیوں اور قلمی کارناموں کی تفصیل کافی طویل ہے جیسے انہوں نے 2013 میں رسالہ قندیل ادب لندن سے جاری کیا جس کے 146 شمارے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ دنیا کے 180 سے زیادہ ممالک میں اس کو پڑھا جاتا بلکہ اس میں لکھنے والوں میں بین الاقوامی شاعر، دانشور اور ادیب شامل ہیں۔ اس کے بعد 2018 میں انہوں نے سہ ماہی رسالہ قندیل حق جاری کیا جو دوصد صفحات تک ضخیم ہوتا ہے۔ اب تک دس کتابیں تالیف کر چکے ہیں اور پانچ کتب پر کام جاری ہے۔ دانشکدہ عظیم تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی تاریخ اور 500 صفحات پر مشتمل ہے۔ قائداعظم کا دست راست چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب کی سوانح 600 صفحات کی ہے۔ قندیل علم اخبارات میں شائع ہونیوالے آپ کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ پانچ سو صفحات کی روح پرور کتاب قندیل حق اسلامی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے اپنے سسر ناصر احمد بہادر شیر کی سوانح ترتیب دی جو خلفائے احمدیت کے افسر حفاظت تھے۔ دربار خلافت کا جاں نثار شاعر احمدیت ثاقب زیروی پر 700 صفحات کی کتاب ہے۔ نافلہ مہدی صاحبزادہ مرزا مظفر احمد (سابق وائس پریذیڈنٹ ورلڈ بنک) کی سوانح عمری ہے۔ قندیل صحرائی ان کی شاعری کا دیوان ہے۔ تذکرہ شعرائے احمدیت تیاری کے مراحل میں ہے جس میں چارصد شعراء کا ذکر اور کلام ہوگا۔ بلبلان احمدیت میں شاعرات احمدیت کا سلسلہ کے اخبارات رسالوں میں شائع ہونیوالا کلام دیا جائیگا۔ خالد احمدیت عبدالرحمن خادم گجراتی کی سوانح بھی تیاری کے مراحل میں ہے۔ اسی طرح نامور شاعر قاضی ظہور الدین اکمل جن کا کلام ایک سو سال گزرنے کے باجود زبان زد عام ہے۔ مسجد فضل لندن کی تاریخ پر بھی کتاب اشاعت کے مراحل میں ہے۔ اشاعت اور تصنیف کے یہ سب جلیل القدر پراجیکٹس انہوں نے پچھلے دس سال میں سرانجام دئے ہیں۔ یہ کتاب شہنشاہ اقلیم سائنس جو آپ کے زیر مطالعہ ہے، دنیائے

سائنس کے مہر درخشاں ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں احباب، رشتہ داروں، اساتذہ، شاگردوں کے تاثرات پر مشتمل ہے، جو ان کی زندگی کو مختلف جہتوں سے احاطہ کرتی ہے۔

رانا صاحب مشاعرے بھی منعقد کرواتے ہیں اور اب تک 500 مشاعرے کرا چکے ہیں جو زوم پر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ پچھلے سال آپ کینیڈا کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لئے تشریف لائے تو ان کے لئے ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ راقم التحریر کو بھی ان کے ساتھ لنچ پر جانے اور حالات حاضرہ پر باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ بہت ہی اعلیٰ قسم کے منتظم، شاعر اور دانشور ہیں۔ جس بات کا ایک دفعہ مصمم ارادہ کر لیتے اس کو فوراً پایہ تکمیل تک پہنچانے میں تن من دھن لگا دیتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

رہ طلب کا مسافر تھا اور یگانہ تھا
گدائے عشق بہ انداز خسروانہ تھا
وہ شخص بو علی تھا اس زمانے کا
وہ شخص دانش و حکمت کا اک خزانہ تھا
سلا دیا جسے مٹی میں ہم نے پچھلے پہر
وہ اک شخص نہ تھا پورا اک زمانہ تھا

(ڈاکٹر پرویز پروازی)

زکریا ورک

29 جنوری 2025

ٹورنٹو (میپل) اونٹاریو، کینیڈا

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر عبدالسلام کو عالمی اعزازت اور انعامات سے نوازا

انجینئر محمود مجیب اصغر

اس عاجز کے محسن اور مخلص دوست رانا عبدالرزاق خان صاحب نے پہلے نوبیل انعام یافتہ احمدی مسلمان سائنسدان ڈاکٹر پروفیسر محمد عبدالسلام صاحب پر ایک ضخیم اور حقائق سے بھرپور کتاب تدوین کر کے بہت بڑی جرآت اور علمی خدمت سرانجام دی ہے۔ جس سے دل اللہ تعالیٰ کی حمد سے لبریز ہے اور مؤلف و مرتب کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رانا عبد الرزاق خان صاحب کو اپنی جناب سے اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

احمدیت کی مخالفت میں پاکستان اور تیسری دنیا کے لئے آپ کے کارہائے نمایاں اور سائنسی خدمات کو چھپانے کے لئے ہر طرح کے منصوبے کئے جاتے رہے ہیں حتیٰ کہ احمدیت کے عناد میں پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے والے اصل ہیرو ڈاکٹر سلام کی جگہ ایک متنازعہ شخصیت ڈاکٹر عبدالقدیر کو پیش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلام نے سالہا سال پاکستان کی چیف سائیٹفک ایڈوائزر کی حیثیت میں سائنس اور عمل کے میدان میں غیر معمولی خدمات سرانجام دی ہیں حتیٰ کہ 1974ء میں پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے پر ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور چیف سائیٹفک ایڈوائزر کی پوسٹ سے استعفیٰ دے دیا لیکن بالواسطہ ساری عمر پاکستان کی سائنسی ترقی میں گامزن رہے۔

جتنا ان کے نام اور عالمی اعزازات کو پاکستان میں چھپایا گیا اتنا ہی اللہ تعالیٰ نے عالمی سطح پر انہیں غیر معمولی عزت مرتبہ اور اعزازات سے نوازا۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی بارش کو دنیا کی کون

سی چھتری روک سکتی ہے۔

والدین کی تربیت اور دعاؤں کے ساتھ آپ کی grooming حضرت مصلح موعودؓ کے ذریعے ہوئی اور 1979ء میں آپ کو نوبیل انعام حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی دعا سے ملا اور سائنس کے میدان میں آپ حضرت مسیح موعود کی ایک عظیم الشان پیشگوئی کے پہلے مظہر قرار پائے۔ آپ کے لئے یہ اعزاز سب سے بالا ہے۔

تحدیث نعمت کے طور پر یہ عاجز بیان کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ آپ کے نوبیل انعام ملنے پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خواہش پر اس وقت کے صدر خدام الاحمدیہ مرکزیہ محمود احمد صاحب شاہد (بنگالی) کی وساطت سے احمدی بچوں کے لئے ''کتاب: پہلا احمدی مسلمان سائنس دان پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام۔'' تصنیف کرنے کی سعادت اس عاجز کو ملی۔ الحمدللہ۔

کتاب اس عاجز نے ان کے بھائی انجینئر محمد عبدالسمیع صاحب کے ساتھ 27 دسمبر 1983ء کو ڈاکٹر صاحب کو پیش کی تھی جس کے بعد ڈاکٹر صاحب سے خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔

ایک لمبے عرصے پر پھیلے ہوئے ڈاکٹر سلام پر مضامین اور انٹرویوز کو اکٹھا کر کے رانا صاحب نے اس کتاب کو مدون کیا ہے۔ جس کے لئے آپ شکریے کے مستحق ہیں۔ جزاھم اللہ احسن الجزا

احقر العباد

انجینئر محمود مجیب اصغر (بھیروی)

ریٹائرڈ چیف انجینئر/ جنرل مینیجر نیشنل انجینئرنگ سروسز پاکستان (نیسپاک)

حال سٹاک ہولم سویڈن

پروفیسر عبدالسلام صاحب کی شخصیت اور آپ کا سائنسی کام پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے

پروفیسر آصف علی پرویز

پروفیسر عبدالسلام صاحب ایک عظیم انسان، سائنس دان اور تیسری دنیا میں سائنس کے فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ مگر رانا عبدالرزاق خان صاحب نے اپنی اس کتاب میں مختلف افراد کے مضامین اور رائے کو اکٹھا کیا ہے جو ایک بہت ہی قابل قدر کام ہے۔ ایک قاری کو آپ کے بارے بہت ہی عمدہ مضامین مل سکتے ہیں۔ جس سے آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں بچپن سے ہی خاکسار آپ کے نام گرامی سے واقف تھا۔ ہمارے والدین آپ کو نام لے کر ہمیں بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب کرتے۔ 1970ء جب تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں Abdus Slam Physics Society کا اجرا ہوا تو خاکسار اس کا پہلو صدر منتخب ہوا۔ فالحمدللہ۔

پروفیسر عبدالسلام صاحب جب ربوہ تشریف لاتے تو نیو کیمپس آ کر ہمیں اپنی تازہ ترین تحقیق سے آگاہ فرماتے اور ہمیں بھی تحقیقی کاموں کو کرنے کی تلقین کرتے یوں مجھے براہِ راست آپ سے علم سیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے میں بہت ادب کے ساتھ آپ کا ادنیٰ طالبعلم ہونے کا اعزاز پا چکا ہوں۔

1972ء میں جب میں تعلیم الاسلام کالج میں فزکس پڑھا رہا تھا تو ہم پروفیسر صاحبان اور M.Sc کے طلباء حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ حضور انور نے فرمایا کہ جب پروفیسر عبدالسلام صاحب سائنس کانفرنسوں میں جاتے ہیں تو چوٹی کے سائنس دان آپ کے اعزاز میں کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن کن آنکھوں سے یہ بھی اشارے کرتے ہیں کہ یہ شخص اللہ

تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے۔حضور نے فرمایا کہ انشاء اللہ پروفیسر عبدالسلام صاحب کو نوبل انعام ملے گا۔حضور کی یہ بات 1979ء میں پوری ہوئی جب آپ کو دو دوسرے سائنس دانوں کے ہمراہ نوبل انعام سے نوازا گیا۔فالحمدللہ۔

خاکسار اپنی تحریر، تقاریر اور Youtube پروگراموں میں پروفیسر عبدالسلام کی سوانح عمری اور آپ کی سائنسی کاوشوں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔خاکسار نے تقریباً یک صد مضامین آپ کی سوانح عمری پر لکھے ہیں جو لندن سے شائع ہونے والا رسالہ المنار میں چھپ چکے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر عبدالسلام صاحب کی شخصیت اور آپ کا سائنسی کام اتنا زیادہ ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔یہ کتاب اس لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے کہ اس میں وہ لوگ جن کو کسی وقت میں بھی آپ سے شرف ملاقات ہوا۔انہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس میں اول طور پر خلیفہ وقت، ان کے فیملی کے ممبران، ان کے دوست، سائنسی ساتھی وغیرہ شامل ہیں۔اس لئے یہ کتاب ایک گلدستہ ہے جس کا ہر مضمون ایک خوشبودار پھول ہے۔

میں محترم رانا عبدرزاق خان صاحب کی اس گرانقدر کوشش پر انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔آپ ایک کہنہ مشق صحافی، ادیب، شاعر اور دوستوں کے دوست انسان ہیں۔لندن میں رہتے ہوئے آپ نے 14 کتابیں تخلیق کیں۔آپ قندیل ادب کے نام سے ہر ماہ رسالہ شائع کرتے ہیں۔باقاعدگی سے Zoom پر مشاعرہ کرواتے ہیں۔غرض پردیس میں رہ کر آپ کی قابل قدر خدمات ہیں۔اللہ آپ کو اس کا اجر عظیم دے۔آمین۔

خاکسار

پروفیسر آصف علی پرویز

لندن یوکے

تبصرہ کتاب سیرت ڈاکٹر عبدالسلام صاحب

گزشتہ دنوں رانا عبدالرزاق خان جیسی قد آور علمی شخصیت کی ایک اور ضخیم کتاب سیرت عبدالسلام پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ کتاب پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام کے بارے معلومات کا خزانہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ رانا صاحب کمال کی ادبی شخصیت ہیں، موصوف شاعر ادیب اور محقق ہیں۔ سیرت عبدالسلام ہی نہیں بلکہ ان کی دیگر ضخیم کتب جیسے کہ دانش کدہ عظیم تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی تاریخ، سوانح چوہدری ظفر اللہ خان صاحب، سوانح عمری صاحبزادہ مرزا مظفر احمد نافلہ مہدی، دربار خلافت کا جان نثار شاعر احمدیت ثاقب زیروی وغیرہ ان کی محققانہ طبیعت کا ثبوت ہیں۔ رانا صاحب شاعر بھی ہیں ان کا دیوان قندیل صحرائی کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ موصوف تذکرہ شعرائے حق کے نام سے 400 احمدی شعراء کی مختصر تاریخ پر بھی کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خالد احمدیت عبدالرحمن خادم گجراتی اور مشہور و معروف احمدی شاعر قاضی ظہور الدین اکمل کی سوانح حیات بھی اشاعت کے قریب ہیں۔ رانا صاحب اپنے قبیلہ کے لوگوں خاص طور پر بزرگوں سے بے حد محبت کرتے ہیں اسی محبت کا نتیجہ ہے تاریخ کاٹھ گڑھ۔ یہ کتاب کاٹھ گڑھ سے تعلق رکھنے والے احمدیوں کی مکمل تاریخ ہے۔ یقینی طور پر یہ کتاب کاٹھ گڑھ کے احمدیوں اور خود رانا صاحب کو امر کرنے والی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کی کوئی کتاب بھی 00 5 صفحات سے کم نہیں ہے۔ رانا صاحب دو رسائل ماہنامہ قندیل ادب اور دوماہی قندیل حق کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ مشاعروں کا انعقاد بھی رانا صاحب ہی کا کارنامہ ہے 500 سے زیادہ مشاعرے کروا چکے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ جن ہستیوں کے متعلق کتاب لکھی جا رہی ہے وہ ان کی زندگی اور کام کا بھرپور احاطہ کرنے والی ہو۔ اور رانا صاحب اس کوشش میں کامیاب

بھی ہو جاتے ہیں۔سیرت عبدالسلام میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام کے متعلق لکھی گئی تقریباً ہر تحریر کا ذکر بحوالہ موجود ہے،اسی طرح اس کتاب میں نادر تصاویر بھی موجود ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ رانا صاحب کسی دیو مالائی جن سے کم نہیں ان کی ہر ہر علمی کاوش اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔صرف 10 برس میں 15 ضخیم کتابوں کا مصنف ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی والی لمبی فعال زندگی عطا فرمائے اور انہیں مزید کتابیں لکھنے کی توفیق عطا فرماتا چلا جائے۔آمین یارب العالمین

طالب دُعا

رانا محمد حسن خاں

چیف ایڈیٹر پیشوا انٹرنیشنل لندن

چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے

قابل رشک عظمتوں کے حامل منفرد وجودوں میں سے ایک وجود

ڈاکٹرمحمد عبدالسلام

ماہنامہ خالد کا اداریہ از مبشرایاز صاحب

لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹرمحمد عبدالسلام کوفزکس میں نوبیل انعام ملا تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب بہت بڑی شخصیت ہیں ۔ گویا کہ ڈاکٹر صاحب کی عظمت اور مقام اس لئے ہے کہ آپ کو یہ انعام ملا تھا حالانکہ یہ درست نہیں ۔حقیقت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب عظیم تھے اس لئے آپ کونوبیل انعام ملا۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ دنیاوالوں کے پاس مادی اعتبار سے نوبیل انعام سے بڑاانعام کوئی تھاہی نہیں اس لئے جو کچھ بھی تھا وہی انہوں نے پیش کر دیا اور یوں آپ کی عظمت اور مقام کوتسلیم کرنے کا دراصل ایک اظہار تھا جواس انعام کی صورت میں دنیانے کیا۔ درحقیقت ’’وہ عظمت‘‘ کیاتھی جس نے آپ کو ان اعلیٰ بلندیوں تک پہنچایا جس نے عظمتوں کے چاندلگائے اورشہرتوں کے ستارے ٹانکے جس نے دنیا کے بادشاہوں ، یونیورسٹیوں کے سربراہوں ، چوٹی کے سائنسدانوں ، نامور دانشوروں اور فلاسفروں کوڈاکٹرعبدالسلام کی علمی برتری اورعلم ومعرفت میں کمال کا اعتراف کرنے پرمجبور کردیا۔ وہ کیابات تھی کہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسراایوارڈ اوراعزاز آپ کی جھولی میں گرکر خودفخر کرتا رہا۔ ڈاکٹرعبدالسلام کی وہ کیا خوبی تھی کہ امریکہ ہو یا افریقہ، یورپ ہو یا آسٹریلیا ایشیاء کے ترقی یافتہ ممالک ہوں یا پسماندہ ترقی پذیر ملک سب کے سب ڈاکٹرعبدالسلام کواپنا شہری سمجھنے کی حسرت لئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹرعبدالسلام میں وہ کیا چیزتھی کہ مسلمان ہو یا غیرمسلم کافر ہو یا مومن خدا کو ماننے والا ہو یا منکر تمام لوگ ایک ہی رنگ میں ایک ہی انداز میں آپ کی عزت وتوغیر کرنے پر نہ صرف مجبور ہوجایا

کرتے تھے بلکہ اس میں اپنے لئے باعث فخر سمجھا کرتے تھے۔

وہ کیا خصوصیت تھی کہ بڑے سے بڑا عالم اور ڈاکٹر اور پروفیسر اور حقیقی ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سننے کے لئے گھنٹوں سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سننے کے محتاج اور بے تاب ہوا کرتے تھے جس کے لئے ملکوں کی یونیورسٹیاں فخر کرتی تھیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ہماری اعزازی ڈگری کو قبولیت کا شرف بخشا ہے۔ آخر وہ کیا خوبی تھی کہ جس کے علم و معرفت کا کمال ساری دنیا کا منہ بند کئے ہوئے تھا۔ ہر قوم کا فرد ہر فرد جس کے علم و تحقیق کے اس شیریں چشمہ سے آکر پانی پیتا اور اور سیراب ہو کر جاتا اپنی پیاس بجھاتا۔ کیا یہ نوبیل انعام کی وجہ سے تھا۔ نہیں نہیں۔ عبدالسلام کی عظمت کے بلند میناروں کے سامنے یہ ایک انعام تو بہت چھوٹی اور معمولی سی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علم و معرفت کے بحر زخّار میں یہ نوبیل انعام کی سند اور میڈل اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باعث ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ اس کی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ تو آخر وہ کیا وجہ تھی کہ عظمتوں کے چاند اس کے ماتھے کا جھومر بن گئے۔ میڈل اور اعزاز اس کے ساتھ لگ کر خود اعزاز پا گئے۔ وہ کیا چیز تھی کہ مغرب کے دانشور اس کو ''پرافٹ آف سائنس'' کہنے لگ گئے۔

وہ عظمت بخشنے والا پارس۔ اقرار توحید تھا۔ خدائے واحد و لاشریک کا نظریاتی و علمی اور عملی اقرار تھا۔ جس عظیم نے اس کو عظمتوں سے مالا مال کر دیا۔ اور اس سنہری اصول اور کامیابی کے راز کو عطا کرنے کا باعث قرآن کریم اور حضرت اقدس محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی تعلیمات اور تحریرات تھیں۔ اور حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے ساتھ کئے جانے والے وہ خدائی وعدے اور بشارتیں جو آپ کے ماننے والوں اور پیروکاروں کے حق میں خدا نے کئے۔ اور ان عظمتوں کی راہ تیار کرنے والے اور ان عظمتوں کے نور کو ڈاکٹر عبدالسلام کے خون میں منتقل کرنے والے آپ کے بزرگ اور نیک فطرت صالح والدین تھے کہ جن کی شب و روز کی دعائیں خون بن کر ڈاکٹر صاحب کے رگ و ریشہ میں سما گئیں۔

اور بلاشبہ اور یقیناً آپ کی تمام تر عظمتوں اور علمی شہرتوں کی اس ناؤ کو زندگی کے کنارے تک

لگانے والے وجود، ناخدا، خلیفۃ المسیح کے نورانی وجود تھے کہ جن کی دعاؤں، راہنمائی اور جن کے ساتھ محبت کے ساتھ عقیدت و وابستگی ڈاکٹر صاحب کو کمال حفاظت کے ساتھ زندگی کے ایک افق سے طلوع کر کے نیک آغاز کے ساتھ نہایت تابناک عظمتوں کی بلندیوں تک لے گئی اور اسی عظمت اور شہرت کے ساتھ آپ کا ایک نیک اور قابل رشک انجام ہوا۔ خدا تعالیٰ کی توحید کے قولی و فعلی اقرار، بزرگ ماں باپ کی دعاؤں مسلسل محنت اور عاجزی وانکساری اور خلافت کے ساتھ گہری محبت اور والہانہ عشق کی بناء پر یہ ساری عظمتیں آپ کو نصیب ہوئیں ان کے بغیر یہ سب کچھ ناممکن تھا۔ نوبیل انعام تو ویسے بھی ملا کرتے ہیں اور یوں تو نوبیل انعام یافتہ بھی ہوا کرتے ہیں۔ لیکن وہ محمد عبد السلام نہیں ہوا کرتے۔ اسی عبدالسلام کے متعلق یہ نمبر ترتیب دیا گیا ہے تا ہم دیکھیں کہ وہ کیا امور تھے کہ جو آپ کو اس مقام تک پہنچا گئے اور یوں ہم بھی ان نیک باتوں کو اپنی زندگیوں میں عمل کے ساتھ یاد رکھیں اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے ساتھ کئے جانے والے خدائی وعدوں اور بشارتوں کے مصداق بنیں تا رہتی دنیا تک ایسے نیک وجودوں کے ساتھ ہمارا نام شامل ہوا اور خدائے عظیم و لازوال کی نعمتیں عظمتوں کی صورت میں ہمیں اور ہماری نسلوں کو بھی نصیب ہوں سیرت وسوانح کے ایسے خاص شماروں میں ان بزرگوں کی سوانح شائع کرنے کا وہی بنیادی مقصد ہوا کرتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس مضمون کی اہمیت و افادیت کی طرف راہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ ”.....سوانح نویسی سے اصل مطلب تو یہ ہے کہ تا اس زمانے کے لوگ یا آنیوالی نسلیں اُن لوگوں کے واقعات زندگی پر غور کر کے کچھ نمونہ اُن کے اخلاق یا ہمت یا زہد وتقوی یا علم و معرفت یا تائید دین یا ہمدردی نوع انسان یا کسی اور قسم کی قابل تعریف ترقی کا اپنے لئے حاصل کریں اور کم سے کم یہ کہ قوم کے اولوالعزم لوگوں کے حالات معلوم کر کے اس شوکت اور شان کے قائل ہو جائیں۔ جو کے عمائد میں ہمیشہ سے پائی جاتی رہی ہے تا اس کو حمایتِ قوم میں مخالفین کے سامنے پیش کر سکیں اور یا یہ کہ ان لوگوں کے مرتبے یا صدق اور کذب کی نسبت کچھ رائے قائم

کرسکیں...‘‘(کتاب البریہ صفحہ 141-142 حاشیہ روحانی خزائن جلد 13 صفحہ 159-160 حاشیہ)

جانے والے تیری محبت کو	دل کی دھڑکن کے ساتھ رکھیں گے
راہِ منزل پر زندگی کے چراغ	تیری یادوں سے روشنی لیں گے
تیرے قدموں کے برگزیدہ نشاں	رہ نوردوں کو حوصلہ دیں گے
کام آئے گی تیری عظمتِ فکر	زیست کی عظمتیں بھی دیکھیں گے

ڈاکٹر عبدالسلام

راغب مرآدآبادی

بایقیں تھے ڈاکٹر عبد السلام	برگزیدہ عابد رب الانام
رحمت باری ہو ان کی قبر پر	جنت الماوی میں ہو ان کا مقام
نام پاکستان کا روشن کیا	چرخ شہرت کے تھے وہ ماہِ تمام
نوبیل انعام ان کا حق تھا جو ملا	ان کی عظمت کو میسر ہے دوام
منفرد سائنس داں تھے ان سے بھی	آبرو سائنس کی ہے لا کلام
خوبیوں کا ان کی ہے احصا محال	ہے نہایت ہی بلند ان کا مقام
نام نامی ان کا لب پر آئے گا	اہل علم و فن کے باصد احترام
ان کا اب نعم البدل کوئی نہیں	بے بدل بے شک رہیں گے وہ مدام
خاک میں ربوہ کی آسودہ ہیں آج	قدسی عنصر ڈاکٹر عبد السلام‘‘

1417ھ

(راغب مرادآبادی۔بشکریہ ہفت روزہ لاہور 12 اپریل 1997ء صفحہ 9)

غیر اس کے سب ہیں فانی

بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔ڈاکٹر عبدالسلام صاحب انہیں وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے۔ویسا کوئی اور سائنسدان اس جیتی دنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا۔دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ عرض کرتے تھے اور خدمت کر کے ساتھ پاتے تھے۔ہمارا بہت ہی پیارا علموں کا خزانہ۔ہمارا پیارا ساتھی اور بھائی ہم سے جدا ہوا۔

اللہ کے حوالے۔اللہ کے پیار کی نگاہیں ان پر پڑیں۔

پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کا پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا محبت بھرا ذکر خیر

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۔ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (سورۃ الرحمان آیات 27 تا31) حضور نے فرمایا:

یہ سورۃ رحمان کی آیات جن کی میں نے تلاوت کی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس پر یعنی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے۔وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ اور صرف تیرے رب کی شان جمال و جلال ہے جو باقی رہے گی۔ وہ صاحب جلال ہے اور صاحب اکرام ہے۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کی تکذیب کرتے ہو یا

تکذیب کرو گے۔ يَسْأَلُه مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ اسی سے سوال کرتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہر وقت وہ ایک نئی شان کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ يَوْمٍ یہاں وقت کے پیمانے کے طور پر ہے۔ اس لئے لحہ لحہ بھی یہاں یوم کے مفہوم میں داخل ہے۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ پس تم اپنے رب کی کن کن آیات کی تکذیب کرو گے۔ یہاں دونوں کا لفظ خطاب میں شامل ہے مگر جب ہم اردو میں تم کہتے ہیں تو لازم نہیں ہوا کرتا کہ ''دونوں'' لفظ کو دہرایا جائے مگر قرآن کریم نے یہاں جب بھی سوال اٹھایا ہے تو تم دونوں کہہ کر اٹھایا ہے۔ تو تم دونوں کن کن باتوں میں یعنی خدا تعالیٰ کی کس کس شان اور جلوہ گری کی تکذیب کرتے ہو یا کرو گے۔ ....پس یہ وہ مضمون ہے جو ساری دنیا میں سب کے لئے قدر مشترک رکھتا ہے۔ فی الحقیقت انسان اپنی فنا پر ویسا یقین نہیں رکھتا جیسا یقین اس کی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا جانتے ہوئے کہ موت مقدر ہے پھر بھی اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرتی۔ تو قرآن کریم کا اس شان کے ساتھ اس مضمون کا ذکر فرمانا جو بظاہر دنیا میں سب کو معلوم ہو یہ بتا رہا ہے کہ تمہیں وہم ہے کہ تم جانتے ہو، تم نہیں جانتے کہ ہر چیز فانی ہے اور جب ہر چیز کا ذکر فرمایا تو اس کے بعد یہ ہے اعلان وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ کہ ہاں تیرے رب کا جلال و جمال کا جلوہ ہے۔ جو باقی رہے گا اور دوسرا ''وجہ'' کا مطلب رضا ہے جو باقی رہے گی۔ یعنی خدا کی رضا جس کو باقی رکھنا چاہے گی اسے رکھے گی اور جو کچھ بھی رہے گا رضا کی بنا پر، اس سے لٹک کر، اس کے سہارے رہے گا۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو اللہ کے جلال اور جمال کا جلوہ باقی رہے گا اور جس پر اس کی دائمی ازلی ابدی رضا کی نگاہ پڑی ہے وہ بھی باقی رہ سکتا ہے مگر خدا تعالیٰ کی رضا میں شامل ہو کر اس سے الگ رہ کر نہیں۔

دوسری بات جو اس میں خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ چیزوں کے فنا کا، ان کی عظمت کے ساتھ جو تعلق ہے یہ مضمون اس بات کو خوب کھول کر بیان فرما رہا ہے کہ تمہاری عزتیں، تمہاری دنیا کی نمود کی کمائی جو کچھ بھی ہے اس کی خاطر تم دنیا سے چمٹے ہوئے تھے تو یاد رکھو کہ وہ بھی فنا

ہیں اور اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہاں ایک خدا کے جلال و جمال کا جلوہ ہے جو باقی رہنے والا ہے۔ اس لئے اگر عزتوں کی خاطر تم کچھ کرتے ہو، اپنی دنیا کی نام ونمود کے لئے محنتیں کرتے ہو تو وہ وقت آئے گا جب وہ چیزیں مٹ جائیں گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض قوموں اور بعض لوگوں اور بعض بڑے بڑے بادشاہوں کی عزت اور نام ونمود تو ہمیں دنیا میں پیچھے باقی رہتی دکھائی دیتی ہے یہ کیوں باقی رہی۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس مضمون کا آخری فنا کے فیصلے سے تعلق ہے اس لئے اگر اس وقت سے پہلے کہ دنیا میں انسان کی صف لپیٹ دی گئی کسی کی عزت وجاہ وجلال کا تذکرہ باقی رہ بھی جائے تو اس کی حقیقت کوئی نہیں کیونکہ خدا کے علم میں یا خدا کے فیصلوں میں وقت کی وہ حیثیت نہیں ہے جو انسان کے علم اور فیصلوں میں وقت کی حیثیت ہے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی زمانہ تقسیم نہیں کرتا۔ نہ ماضی، نہ حال، نہ مستقبل۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور یہی اس کی ازلیت اور ابدیت ہے جو اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے سوا ہر چیز کو فنا ہے۔ کسی چیز کو بھی ازل اور ابد کا دعویٰ نہیں ہے، نہ ہوسکتا ہے اور پہلے جو توہمات تھے دنیا کے مثلاً آریہ سماج کا عقیدہ کہ دنیا ازل سے ہے اور بعض یورپین فلسفیوں کا بھی یہ خیال کہ کوئی چیز عدم سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی اس لئے ازل سے ہے اس خیال کو کلیۃً غلط ثابت کرنے میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بھی ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ پہلے جو یہ خیال تھا کہ پروٹان کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ ایٹم Destroy نہیں ہوسکتا اور ایک Law تھا، یعنی نظریہ نہیں اس کو Law کہتے ہیں۔

Indestructibility of Atom جو کچھ مرضی ہو جائے ایٹم Destroy نہیں ہوسکتا اور ڈاکٹر عبد السلام کے دور سے پہلے سائنس دانوں نے ثابت کر دیا کہ ایٹم تو Destroy ہوسکتا ہے اگر نہ ہوسکتا تو ایٹم بم کیسے بن جاتا اور پھر جب کائنات پر زیادہ گہری نظر ڈالی تو Black Hole کا جو تصور ابھرا ہے اور اس کا علم اور اس کی ماہیت سے متعلق جو سائنسی اندازے لگائے گئے تو پتا لگا کہ Black Hole تو بنتا ہی اس وقت ہے جب کہ ایٹم آپس میں کچلے جاتے ہیں اور الیکٹرانز کے فاصلے اپنے مرکز سے

اس دباؤ کی طاقت سے جو Gravitational Pull ہے یعنی کشش ثقل اس کے نتیجہ میں یوں آپس میں اکٹھے ہوجاتے ہیں کہ بہت عظیم الشان وسیع کائنات سمٹ کر گویا ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود ہوجاتی ہے جو پھر سمٹتا اور پھر سمٹتا ہے اور اپنی طاقت کے زور کے ساتھ ایک خودکشی کر لیتا ہے یعنی وجود اس طاقت کی عظمت کے سامنے جھک کر ایک فنا کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے جس کے متعلق انسان کچھ نہیں جانتا کہ وہاں کیا ہے اس کی پرلی طرف، اس کو کہتے ہیں Event Horizon۔ تو یہ حصہ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے اس معاملے میں تو سائنس دانوں کی آنکھیں کہ یہ کائنات ازل سے بہرحال نہیں ہے مگر جہاں تک ابد کا تعلق ہے اس بات پر کافی اٹکے رہے ہیں کہ پروٹان Indestructible ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مرحوم ومغفور نے اس نظریہ میں بہت بڑا کام کیا ہے اور بیماری سے پہلے مجھے ان سے اس بارے میں جو گفتگو کا موقع ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے Mathematically یعنی حساب کی مدد سے جو ثابت کیا ہے کہ دنیا کی پروٹانز کی عمر اتنی ہے۔ نظریہ کے طور پر تو اب سائنس دان اسے قبول کر چکے ہیں لیکن دو تین نظریئے ہیں۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں اس سے ایک حصہ کم، بعض کہتے ہیں ایک حصہ زیادہ مگر جو حصہ ہے وہ بھی بہت بڑا تصور ہے اس لئے آپ کو میں عددی تصورات میں الجھانا نہیں چاہتا۔ تو 32 Raise to the Power of ہے یا 33 یا 34 ہے یہ بحث چل رہی ہے بس اور 32 اور 34 میں اتنا فرق ہے بظاہر ایک کا فرق ہے لیکن جب Powers میں باتیں کی جاتی ہیں تو اس مقام پر پہنچ کر عام انسانی ذہن اس کا تصور کر ہی نہیں سکتا کہ کتنی بڑی چیز ہے۔ مگر سائنسدان اللہ کے فضل کے ساتھ اور حساب دان بہت باریک باتوں کو اپنے استدلال کے ذریعے معلوم کر لیتے ہیں اور کائنات کے کناروں تک کی خبریں اپنے استدلال کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب نے جہاں تک مجھے یاد ہے 33 Raise to the Power of کا نظریہ پیش کیا تھا اور مجھے بتا رہے تھے بلکہ کئی دفعہ بتایا کہ اس وقت دنیا میں لیبارٹری بڑی بڑی عظیم بے انتہا خرچ کر کے کام کر رہی ہیں۔ ان میں ایک امریکہ میں بھی ہے ایک اٹلی میں بھی ہے اور شاید ایک

اور جگہ بھی اور اب تک جو خبریں ملی ہیں وہ امید افزاء ہیں۔ اگر یہ قطعیت سے ثابت ہو گیا تو ہرگز بعید نہیں کہ ایک اور نوبل پرائز ان کو مل جائے یعنی بطور حق کے ان کو ایسا Nobel Laureate بننے کی توفیق ملے کہ دو دفعہ زندگی میں Nobel Laureate بنیں۔

تو یہ ایک دنیا کا انعام و اکرام ہے جو ممکن تھا کہ ہو جاتا مگر جہاں تک عقلی تعلق ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ آپ کی فضلیت عقل کی روشنی کے لحاظ سے ساری دنیا میں مسلم ہے۔ کوئی دنیا کا سائنسدان نہیں ہے جو عظمت کی نگاہ سے آپ کو نہ دیکھے بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت کردار کے لحاظ سے یہ ایک وہ سائنس دان ہے جس کی دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی عزت کرتے تھے اور حقیقت میں ان کے سامنے عظمت کے ساتھ سر جھکاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بے تکلف گفتگو میں مجھے انہوں نے کئی دفعہ بتایا کہ فلاں ملک کا سربراہ اس طرح مجھ سے پیش آتا ہے، فلاں ملک کا اس طرح پیش آتا ہے، دعوتیں دیتے ہیں کہ ہمارے پاس آؤ ہم شاہی اعزاز کے ساتھ تمہاری خدمت کر کے کچھ تسلی پائیں کہ ہم نے بھی کسی بڑے انسان کی کوئی خدمت کی ہے لیکن ان باتوں کے باوجود تکبر کا نام و نشان نہیں تھا اور یہ وہ اصل عظمت کردار تھی جس کا میڈل سے تعلق نہیں ہے۔ پس اس مضمون کو اس طرف منتقل کرتے ہوئے میں چند باتیں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بیان کروں گا مگر اس سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں عامۃ الناس کے لئے بھی ایک عجیب پیغام ہے جو کوئی بلندی حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کو یہ پیغام ہے کہ تم بھی تو یا بڑے لوگوں میں ہو یا چھوٹے لوگوں میں ہو مگر بڑے بھی مٹ جانے ہیں، چھوٹے بھی مٹ جانے ہیں اور بڑے بھی اپنی بڑائی کی شانوں کے ساتھ مٹا دیئے جائیں گے اور چھوٹے بھی جو قدریں بھی وہ رکھتے ہیں ان کے سمیت مٹا دیئے جائیں گے تو اس عارضی چیز کے لئے تم کیوں کسی سے حسد کرو کیوں تکلیف میں مبتلا رہ کر زندگی گزارو کہ فلاں تو اتنا بڑا ہو گیا، فلاں نے اتنا علم حاصل کیا، فلاں کو اس طرح دنیا نے عزتیں دیں۔ فرمایا دنیا، دنیا کی عزتیں یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں، اس سے کیوں نہیں تعلق جوڑتے جس کی رضا کا چہرہ کبھی فنا نہیں ہوگا۔

یہ وہ مضمون ہے جو ان آیات میں ہر بنی نوع انسان کی محرومی کے زخموں پر ایک ایسا پھایا رکھتا ہے کہ ہر دکھ کا علاج ہے لیکن اگر انسان اپنی توجہ پھیرے۔ چنانچہ آج صبح ڈاکٹر صاحب کے لئے دعا کے وقت یہ مضمون میرے ذہن میں ابھر کر میری دعا کو ایک اور رخ دے گیا۔ میں نے کہا یہ دنیا کی عزتیں تو آج نہیں تو کل فنا ہونے والی ہیں کچھ بھی ان کا نہیں رہتا لیکن جو تیری رضا کی عزت ہے، جس کا وجہ ربک میں ذکر آیا ہے وہ دائمی ہے۔ پس ان کے لئے قرآن کے الفاظ میں میں نے یہ دعا کی اِرْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر:29) اے مطمئن روح! اپنے رب کے حضور اس طرح حاضر ہو کہ راضیہ ہو۔ تو اپنے رب سے راضی ہو اور مرضیہ ہو، پس وجہ رَبِّكَ کی جو لازوال زندگی اور لازوال وجود کی خوش خبری ہے وہ ان دو لفظوں میں داخل ہو جاتی ہے۔

کوئی انسان جو اپنے رب سے راضی نہ ہو وہ ہمیشگی نہیں پا سکتا۔ کوئی انسان جس سے خدا راضی نہ ہو وہ ہمیشگی نہیں پا سکتا۔ پس اس مضمون کے ساتھ ہی میری توجہات بدل گئیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ آج ہم سے ایک ایسا وجود رخصت ہوا جس کے نتیجے میں ایک خلاء پیدا ہو گیا اور جماعت کو آئندہ یہ خلاء محسوس ہوتا رہے گا میں نے کہا وہ مضمون کیوں نہ میں بیان کروں جو ہمیشگی کا مضمون ہے اور لازوال مضمون ہے۔ پس نیک انجام کے ساتھ میری توجہ نیک آغاز کی طرف گئی اور مجھے یہ خیال آیا کہ درحقیقت لوگ اچھے انجام کی طرف دیکھتے دیکھتے اس سے ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بسا اوقات آغاز کا خیال ہی نہیں کرتے حالانکہ بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں بعض دفعہ انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی انہی وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔

جیسے چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب رضی اللہ عنہ۔ ان کو جو عظمتیں ملی ہیں وہ بار بار یاد کرایا کرتے تھے دنیا کو، میری ماں کی دعائیں تھیں۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کی توحید کے ساتھ وابستگی اور وفا، اس کا غیر متزلزل اور محکم یقین خدا کی وحدانیت پر اور غیر اللہ کو ردّ کرتے چلے جانا یہ وہ خوبیاں تھیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ان کے لئے ایک نعمت کی صورت میں ظاہر

ہوئیں۔ پس میں اپنی پاک بزرگ ماں کی دعاؤں کا ایک پھل ہوں اور یہ مضمون ان کو انکساری کی طرف لے جاتا تھا کہ کھل کر باتیں کرتے تھے، مجھ سے تو بہت بے تکلفی تھی، کہا کرتے تھے کہ بس قصہ وہی ہے سارا، میں کیا، میرا وجود کیا، دعاؤں کا پھل ہوں۔ اور ڈاکٹر صاحب بھی دعاؤں ہی کا پھل تھے۔ ان کے والد بزرگوار چوہدری محمد حسین صاحب اور ان کی والدہ ہاجرہ بیگم نام تھا ان کا دونوں ہی بہت مقدس وجود تھے، بہت پاکیزہ، صاف ستھرے، خالص پاکیزہ زندگی گزارنے والے اور احمدیت کے بعد تو سونے پر سہاگے کا عالم تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی پیدائش سے پہلے رؤیا دیکھا کہ ان کو ایک خوب صورت پاک بیٹا عطا کیا جارہا ہے اور اس کا نام عبد السلام بتایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت مصلح موعودؓ کو رؤیا لکھی اور چونکہ بہت منکسر المزاج تھے اپنی رؤیا کی بنا پر خود نام نہیں رکھا خواب لکھ کر حضرت مصلح موعودؓ سے پوچھا کہ میں اس بچے کا کیا نام رکھوں۔ تو آپ نے فرمایا یہ اللہ نے تمہیں بتا دیا ہے تو میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا یہی نام رکھ لو۔ پس عبد السلام اس بیٹے کا نام الٰہی منشاء اور رضا کے مطابق رکھا گیا جو ان کی خاص دعاؤں کا پھل تھا اور ساری زندگی پھر اس نے اس رؤیا کی سچائی کو ظاہر کیا اور اپنے ماں باپ کے خلوص کی قبولیت کو ظاہر کیا۔

تو اس میں ایک اور بھی ہمارے لئے سبق ہے۔ ایک وجود گزر گیا مگر اس کے حوالے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے اے اللہ احمدیت کو اور نوبل لارئیٹ Nobel Laureate عطا کر مگر وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ نوبل لارئیٹ کتنے ہیں اور کتنوں کا مقابلہ کرے گی احمدیت، ہزار نوبل لارئیٹ ہیں اور بنتے چلے جائیں گے۔ چار اور بھی لے لئے احمدیت نے مانگ مانگ کے تو کتنا فرق پڑے گا لیکن وہ انعام یافتہ جو خدا کے دربار سے انعام یافتہ ہو وہ تو اگر ان پڑھ بھی ہو تو ایسا انعام یافتہ بن سکتا ہے کہ تمام کائنات کو چوٹی کے علماء اور چوٹی کے اعزاز پانے والے اس کی جوتیوں کو اٹھانے میں فخر محسوس کریں، اس کے پاؤں کی خاک چومنے میں فخر محسوس کریں۔ تو چھوٹی باتوں پہ ہم کیوں راضی ہوں، چھوٹی دعائیں کیوں مانگیں۔ وہ دعائیں مانگیں جیسی ڈاکٹر عبد السلام کے

باپ نے اپنے بیٹے کے لئے کی تھیں اور جن کو خدا نے اسی طرح قبول فرمایا کہ اپنی رضا کا مظہر بنایا اور اس بات کا قطعی ثبوت آپ کی زندگی کے لمحہ لمحہ نے دیا ہے۔

سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ تک پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل۔ بلکہ ایک دفعہ مجھے کہہ رہے تھے کہ جب میں کسی سائنسی اجتماع میں جاتا ہوں تو بعض سرگوشیوں کی آواز آتی ہے یہ وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے اور بھی سائنسدان اب ماننے لگے ہیں پہلے سے بڑھ گئے ہیں لیکن جس شان کے ساتھ آپ نے خدائے واحد و یگانہ کے ایمان کا حق ادا کیا ہے اور اس جھنڈے کو بلند کیا ہے ویسا کوئی اور سائنس دان اس جیتی دنیا میں آپ کو دکھائی نہیں دے گا اور پھر خدائے واحد و یگانہ کی عظمت کے نتیجے میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں ہمیشہ رہا۔ نظام جماعت کے سامنے خادمانہ حیثیت کی حفاظت کی ہے۔

اب میں ان کی عمر کے لحاظ سے چھوٹا، دنیا کے علم کے لحاظ سے تو حیثیت ہی کوئی نہیں مگر جب مجھ سے گفت و شنید کرتے تھے، ملتے تھے وہ عزت و احترام کے تمام تقاضے جو خلافت سے وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ان کو اس طرح پورا کرتے تھے کہ میں حیران رہ جاتا تھا اور باتوں میں مشورہ کر کے وہ کہتے تھے جو میں کہتا تھا وہ کرتے تھے جو میں بیان کرتا تھا یا مشورہ نہیں لیں گے، مشورہ لیں گے تو قبول کریں گے اس کو۔ غرضیکہ مجھے ان کی انکساری کو دیکھ کر رشک آتا تھا کہ کتنا بڑا عالم ہے سائنس کے مضامین میں۔ سوچیں میں ان سے بحث کر رہا ہوں یہ نہیں کبھی کہا کہ آپ کو پتا کچھ نہیں، آپ کو حساب بھی نہیں آتا تو آپ مجھ سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مگر انتہائی توجہ سے بات سن کر دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ رفتار کے اوپر بحث چلی کہ سائنس کا یہ اور خاص طور پر حساب دانوں کا یہ قطعی نظریہ ہے کہ روشنی کی رفتار سے کوئی چیز آگے نہیں بڑھ سکتی تو میں نے ان سے کہا کہ یہ جو حد لگائی جا رہی ہے یہ میں تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ میرے نزدیک خدا تعالیٰ کے اوپر حد بندی نہیں ہو سکتی، خالق کے اوپر نہیں ہو سکتی۔ حساب کھول دیئے باقاعدہ۔ اپنا حساب دان کھول لیا اور نقشے بنائے اور

دائرے بنائے اور بتایا کہ یہ دیکھیں حسابی رو سے ناممکن ہے اور فزکس کے نظریہ کے لحاظ سے بھی یہ ناممکن ہے۔ میں نے باتیں سمجھیں، میں نے کہا آپ نے جو باتیں کہی ہیں دلیل کے ساتھ کہی ہیں میں دلیل کا انکار نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک اور بات آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ یہ ساری باتیں آپ کے اس کائنات کے تصور سے وابستہ ہیں اور مشروط ہیں جو اب تک آپ پر ظاہر ہوا ہے اور کیا یہ درست نہیں کہ مادہ میڈیم ہے لہروں کے لئے اور اگر مادہ نہ بھی ہو تو کوئی میڈیم ہونا چاہئے اور میڈیم کی صفات ہیں جو رفتار طے کرتی ہے تو کیا ایتھر کے علاوہ کوئی اور میڈیم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایتھر نہیں ہے تو پھر خود یہ محلِ نظر ہے کہ چیز حرکت میں کیسے رہتی ہے اور ویو (Wave) کیسے بنتی ہے جب کہ ویو (Wave) مادے کی صفت ہے اور حرکت کی صفت نہیں ہے۔ یہ باریک باتیں تھیں ڈاکٹر صاحب کو تو ایک لمحہ نہیں لگا ان باتوں کو سمجھنے میں۔

مجھے انہوں نے جواب میں کہا کہ آئن سٹائن تو قائل ہے کہ ایتھر ہے اور ایتھر ہی کی صفات ہیں جو جلوہ گر ہیں مگر باقی سائنس دان قائل نہیں ہوئے ابھی اور ابھی تک قطعی ثبوت کوئی نہیں مل سکا۔ میں نے کہا مل سکتا ہے کہ نہیں؟ کہا کہ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا اگر ایتھر کے سوا کوئی اور میڈیم ہو جس کی صفات مختلف ہوں تو رفتار بڑھ سکتی ہے!؟ انہوں نے کہا بڑھ سکتی ہے۔ میں نے کہا اب یہ بتائیں کہ اگر کسی چیز کو مادی میڈیم کی ضرورت نہ ہو اور وہ روحانی وجود ہو؟ آپ خدا کی ہستی کے قائل تھے اس کا انکار کر ہی نہیں سکتے تھے تو اس کو کون سا قانون پابند کرے گا کہ اس کا پیغام روشنی کی رفتار سے ان گنت زیادہ تیزی کے ساتھ جہاں وہ پہنچانا چاہئے پہنچا دے تو اس کے بعد وہ نہیں بولے پھر۔ صرف کہا ہاں اصولاً میں مان گیا ہوں یہ ٹھیک ہے یہ ہو سکتا ہے مگر معلوم دنیا میں اب تک جو ہے وہ یہی ہے اس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔

تو اس رنگ میں ان کے اندر یہ حوصلہ تھا اور یہ انکسار تھا کہ بالکل ان پڑھ، سائنس کے ابتدائی علم سے بھی عاری انسان، جس کا ماضی ان کے علم میں تھا کیا حیثیت رکھتا تھا کچھ بھی نہیں۔ اس سے اتنے بڑے مضامین کے اوپر بڑے حوصلے کے ساتھ گفتگو کرنا، اسے سمجھانے کی کوشش کرنا اور جب

کوئی ایسی دلیل دی جائے جو ان کے اپنے عقیدے کے مطابق تسلیم ہونی چاہئے تسلیم کر لی، کر لیتے تھے تو یہ بھی رفعت کی علامت ہے یعنی انکسار، اور ان دونوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں تبھی سجدے کا رفعتوں سے تعلق ہے رَفعت (راء کی زیر کے ساتھ) لفظ عربی میں تو ہے مگر اردو میں بعض لوگ رَفعت (راء کی زبر کے ساتھ) بھی کہہ دیتے ہیں اس لئے میں رَفعت بھی کہہ دیا کرتا ہوں مگر اصل لفظ رِفعت ہے۔ تو رفعتیں جو انسان کو عطا ہوتی ہیں ان کا انکساری سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ سجدے میں ربی الاعلی کی دعا سکھائی گئی ہے۔ رب سب سے اعلیٰ ہے اور مراد یہ ہے کہ تم نے اس کے حضور جب ماتھا ٹیک دیا ہے جتنا نیچے ہو سکتے تھے ہو گئے ہو اب ربِ اعلیٰ کو یاد کرو تو تم اس سے فیض پاؤ گے اور رفعتیں حاصل کرنے والا اتنا ہی زیادہ جھکتا چلا جاتا ہے۔ یہ دونوں مضمون لازم وملزوم ہیں۔ سب سے زیادہ انکسار دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دکھایا ہے اور سب سے زیادہ رفعتیں آپ کو عطا ہوئی ہیں۔

پس ایک بڑے آدمی کے گزرنے کے ساتھ ان مفاہیم پر گفتگو ہونی چاہئے جو لوگوں کو بڑا بنانے والے ہیں اور سب کے لئے برابر پیغام رکھتے ہوں۔ اب علم کے لئے اگر میں کہہ بھی دوں کہ دعا کرو کہ اللہ ہمیں سونوبل لارئیٹ عطا کر دے تو کیا اس کا آخری نتیجہ نکلے گا؟ کیا وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ جائیں گے جنہیں کسی مکتب میں بیٹھنے کی توفیق نہیں ملی۔ تمام صاحب علم انسانوں سے اور ذی روح، ذی شعور وجودوں سے علم میں آپ کا وجود آگے بڑھ گیا تو ان رفعتوں کے لئے کیوں نہ دعا مانگی جائے جس میں ہم سب برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ چھوٹا بڑا غریب ایک تیسری دنیا کا آدمی، ایک ترقی یافتہ مغربی ملک کا باشندہ ان سب کے لئے قدر مشترک ہے کہ اصل علم کا منبع، اصل عزتوں کا منبع جس کا علم اور جس کی عزتیں باقی رہنے والی ہیں وہ اللہ کی ذات ہے اسی کی طرف جھکو، اس کی طرف دل لگاؤ تم میں سے ہر ایک کو پھر وہ رفعتیں عطا ہو سکتی ہیں کہ جو اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔

تو اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے ان کو بہت بلند مرتبے عطا فرمائے اور

ان کی رفعتوں کی جو جان ہے یعنی دعاؤں کا پھل وہ جان اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں اور نسلوں میں آگے جاری فرمائے۔ بعض بچے ان کی اولاد میں سے بہت سعید فطرت اور ایسا وجود رکھتے ہیں جن پر توقع سے نظریں پڑتی ہیں۔ ان کی بیٹی عزیزہ ہے، حمید الرحمان اور عزیزہ کا چھوٹا بیٹا جب بھی میں اس کو دیکھتا ہوں میں ان کو کہتا ہوں کہ اس میں تو مجھے ڈاکٹر سلام نظر آ رہا ہے، ایک اور ڈاکٹر سلام۔ تو یہ میری مراد ہرگز نہیں کہ وہ صرف نوبل لارئیٹ بن جائے گا کسی وقت، میں جب کہا کرتا ہوں تو میں ان کو سمجھا رہا ہوں کہ میری یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ اس میں وہ خوبیاں پیدا کر دے جو روحانی رفعتوں کی علم بردار ہوتی ہیں اور روحانی رفعتوں کے مقابل پر دنیا کی رفعتوں کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتیں پھر اس کے صدقے میں نوبل لارئیٹ بھی بنے تو کیا کمی، کیا بات ہے سبحان اللہ، نور علی نور یعنی نوبل لارئیٹ کے اوپر رضا کی نظر جب پڑے گی تو نور پر نور نازل ہو جائے گا تو یہ دعا اس بچے کے لئے تو میں کرتا ہی ہوں آپ بھی یاد رکھیں اور اپنی اولادوں کے لئے یہ دعا کریں۔ اگر دنیاوی طور پر عظمتیں اور رفعتیں مقدر میں نہیں ہیں تو صرف ایک بات ہم مانگتے ہیں کہ تیری نظر ان پر ایسی پڑے کہ ان کی پیدائش بھی سلام کی پیدائش ہو اور ان کا وصال بھی سلام کا وصال ہو۔ وہ انعام یافتہ جو خدا کے دربار سے انعام یافتہ ہو وہ تو اگر ان پڑھ بھی ہو تو ایسا انعام یافتہ بن سکتا ہے کہ تمام کائنات کے چوٹی کے علماء اور چوٹی کے اعزاز پانے والے اس کی جوتیوں کو اٹھانے میں فخر محسوس کریں۔

السَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا جو حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا بچپن کی بتلائی گئی ہے وہ یہ وہ سلام ہے جس کے متعلق میں آپ کو توجہ دلا رہا ہوں۔ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے پیدائش سے پہلے ہی وہ سلام لکھ دیا تھا جو سلام موت کا سلام بھی بن گیا اور زندگی کا سلام بھی بن گیا۔ پس جب بھی خدا سے عظمتیں طلب کریں تو انکساری کی عظمتیں طلب کریں اور اس سلام کی عظمتیں طلب کریں جو آسمان سے اترتا ہے اور پھر وہ جس شکل میں بھی نازل ہو بہت ہی خوب صورت اور دلکش دکھائی دیتا ہے لیکن کسی سے توقع رکھنا اور بات ہے اور اس توقع کا پورا ہونا

ایک اور بات ہے۔ یہ دعا بھی ہونی چاہئے کہ اللہ ہر منزل کے خطرات سے بچا کر کسی شخص کو اپنی صلاحیتوں کے عروج تک پہنچائے۔ پس جن بچوں میں نجابت دیکھتا ہوں، اعلیٰ اقدار دیکھتا ہوں ان کی ذہانت ان کے چہرے بشرے سے ٹپکتی ہے ان کے لئے میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ خدا اس کو اس کے آسمانی نقطہ عروج تک پہنچائے۔

اب حضرت مصلح موعودؓ کی پیش گوئی میں یہ بہت ہی عارفانہ نکتہ ہے جو بیان ہوا ہے کہ ہر شخص کا ایک آسمانی نقطہ عروج ہے اور وہاں تک وہ بلند ہو سکتا ہے اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا لیکن بھاری اکثریت ہے، اتنی بھاری اکثریت کہ شاید اس کو اعداد و شمار میں شمار ہی نہ کیا جا سکے جو اس نقطہ عروج سے نیچے رہ کر مر جاتی ہے اور کئی ایسے بھی ہیں جو اس نقطہ عروج کی طرف حرکت کرنے کی بجائے مختلف سمت میں حرکت کرتے ہیں۔ اس مضمون کو قرآن کریم کی اس آیت نے کھولا ہے اور میں بارہا سمجھا چکا ہوں۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (الاعراف: 177) ایک بدنصیب کا ذکر قرآن کریم فرماتا ہے اگر اللہ اسے چاہتا تو جو صلاحیتیں ہم نے عطا کی تھیں ان کے نتیجے میں اسے اس نقطہ عروج آسمانی کی طرف بلند کر لیتا جو اس کا منتہیٰ تھا۔ وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وہ زمین کی طرف جھک گیا۔ پس آغاز اچھا ہونا ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے اور دعاؤں کی ذمہ داریاں بھی یاد دلاتا ہے کہ ایسے وجود جن پر تمہاری محبت اور پیار اور شفقت کی نظر ہو جن سے تم توقعات رکھتے ہو کب تک تم ان کی حفاظت کر سکو گے، کب تک ساتھ دو گے، کب تک یہ یقین رکھو گے کہ دنیا کے اثرات اسے اپنی طرف نہیں کھینچ لیں گے اس لئے یہ دعا بھی لازم ہے کہ اسے نیک انجام تک اللہ پہنچائے اور اس نقطہ نگاہ سے سب سے پیاری دعا جو میری زندگی کی جان ہے جس کے لئے میں کئی دفعہ بعض دفعہ لوگوں کو رمضان سے پہلے بھی عاجزانہ خط لکھ کر خصوصیت سے متوجہ کرتا ہوں وہ یہ دعا ہے کہ ان میں شامل کر دے جن کے لئے آسمان سے یہ آواز اٹھے، ان کا استقبال اس لازوال آواز کے ساتھ ہو۔ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۔ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً

مَرْضِيَّةً ـ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ـ وَادْخُلِي جَنَّتِي (الفجر:28تا31)تو جسے یہ نیک انجام نصیب ہو جائے اس سے بہتر کیا انسان تصور کر سکتا ہے؟

پس اس جانے والی پاک روح کے لئے ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ان لوگوں میں شمار فرمائے جن کی وفات کے وقت یہ آواز کان میں سنائی دی ہو،جس کی روح سے خدا اس طرح مخاطب ہوا ہو اوران کی اولاد کو بھی وہ وجہ عظمت عطا کرے جو تعلق باللہ کی وجہ ہے۔ جہاں تعلق باللہ وجہ عظمت بنتا ہے، جہاں رفعتیں سجدے میں مضمر ہیں، جہاں ربی الاعلیٰ کی دعا اس طرح اٹھتی ہے کہ انسان پھر ادنیٰ رہ ہی نہیں سکتا، وہ اعلیٰ سے تعلق جوڑ کر ضرور اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔ یہ دعائیں اپنے لئے بھی، اپنی اولادوں کے لئے، سب گزرے ہوئے اور آئندہ لوگوں کے لئے بھی کریں کیونکہ جزا کا وقت تو ابھی باقی ہے یعنی آخری فیصلے تو قیامت کے دن ہونے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ جماعت احمدیہ کو یہ عظمتیں نصیب فرمائے اور پھر اپنے نشان کے طور پر دنیا کی برکتیں بھی بخشے کیونکہ دنیا کی آنکھ ان باتوں کو دیکھتی نہیں ہے مگر جب خدا کی عظمتیں دنیا کے نشانوں میں ظاہر ہوتی ہیں تب وہ آنکھیں کھولتی ہے اور وہ ان باتوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

اب میں مختصراً کچھ یہ مضمون جو تھا میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا لمبا مضمون ہے اس کے جو پہلو میرے ذہن میں تھے وہ پورے تو میں بیان نہیں کر سکا مگر امید ہے مرکزی نکتہ احباب جماعت کو سمجھ آ گیا ہوگا۔ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے احوال کا خلاصہ یہ ہے کہ 29/جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے تھے۔حضرت چوہدری محمد حسین صاحب جو صاحب رؤیا وکشوف بزرگ تھے ان کا نکاح بھی حضرت مصلح موعودؓ نے پڑھایا تھا،ان کی والدہ ماجدہ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ یہ حکیم فضل الرحمن صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔حکیم فضل الرحمن وہ مبلغ ہیں جو تئیس سال تک اپنی جوانی میں اپنی بیوی سے الگ رہے اور اف تک نہیں کی کبھی۔ افریقہ کے جنگلوں میں زندگی گزاری۔نہایت پاکباز اور بہت ہی بااخلاق اور جاذب نظر شخصیت تھی۔ یہ ہمارے امریکہ کے ڈاکٹر حمید الرحمان صاحب کے خالو تھے۔ڈاکٹر

صاحب مرحوم کے ماموں اور ڈاکٹر حمید الرحمن صاحب کے خالو تھے۔ثریا بیگم جن کا وصال ابھی ہوا ہے جن کی نماز جنازہ پڑھائی تھی ان کی ہمشیرہ ڈاکٹر حمید الرحمان کی والدہ تھیں۔تو یہ خاندان آپس میں اس طرح بڑے قریبی تعلق میں بندھا ہوا ہے اور بہت پاک روایتیں ہیں جو اس خون میں جاری ہیں۔پس دعا کریں کہ یہ آئندہ بھی ہمیشہ جاری رہیں۔

بہت سے پاک اور نیک انجام ہیں جن کی بنیادیں بعض دفعہ انسان کی پیدائش سے پہلے ڈال دی جاتی ہیں۔چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی انہی وجودوں میں سے ایک وجود ہیں۔

وہ مجھے جو یاد تھا کہ رؤیا میں دیکھا تھا وہ رؤیا نہیں بلکہ کشفی طور پر آپ کو یہ دکھایا گیا تھا یہ نوٹس ہیں ان میں لکھا ہے۔''تین جون 1925ء کو خدا تعالیٰ نے کشفی طور پر دکھلایا کہ ایک فرشتہ ظاہر ہوا جس کے ہاتھوں میں ایک معصوم بچہ تھا،فرشتے نے وہ بچہ چوہدری محمد حسین صاحب کو پکڑا دیا اور کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹا عطا فرمایا ہے آپ نے اس بچے کا نام پوچھا تو آواز آئی عبدالسلام۔''

یہ رؤیا انہوں نے جب لکھ کر حضرت مصلح موعودؓ کو بھجوائی اور نام کی درخواست کی تو آپ نے لکھا۔''جب خدا تعالیٰ نے خود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں''یعنی یہ بات حضرت مصلح موعودؓ کا لکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی رؤیا اور کشوف کی سچائی پر آپ کو کامل یقین تھا اور ویسے بھی انکسار کا پھر یہی تقاضا ہے جب کہہ دے خدا نے نام رکھ دیا ہے مگر محض اس وجہ سے نہیں مجھے یقین ہے کہ چونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ ایک صاحب کشف انسان ہیں اس لئے یہی لکھنا اس وقت یا صرف یہی لکھنا جائز تھا کہ جب خدا نے نام رکھ دیا تو ہم کیسے دخل دیں۔

چنانچہ پھر یہ بڑھے ہیں تو اللہ کے فضل سے دعاؤں کے ساتھ۔اب یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ باقی بھی تو بہن بھائی ہیں ان کا تعلیمی کردار،بڑے ذہین ہیں،ہوشیار بھی ہیں، اچھے اچھے مرتبے حاصل کئے،کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ایسا ہے جیسے کوئی چیز شوٹ Shoot کر کے ایسا اوپر نکل جاتی ہے کہ باقی سب چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں اس کے مقابل پر،کوئی نسبت

نہیں ہے۔ ہر میدان میں ایسے ایسے انہوں نے میڈل بچپن سے حاصل کرنے شروع کئے ہیں، ریکارڈ پر ریکارڈ توڑتے چلے گئے ہیں اور بعض ایسے ریکارڑ جو پھراور ہو ہی نہیں سکتے۔ جب سو فیصدی نمبر لے لو گے تو ریکارڈ کیسے ٹوٹے گا اور پھر جب پاکستان میں ناقدری کی گئی تو انگلستان میں آئے اور انگلستان کی حکومت کی فراخ دلی ہے یا قدر شناسی کہنا چاہئے، فراخ دلی کا سوال نہیں، انہوں نے بڑی عزت کا سلوک کیا امپیریل کالج کی پروفیسر شپ کی سیٹ عطا کی اور مسلسل ان کے ساتھ بہت ہی عزت اور احترام کا سلوک جاری رکھا ہے۔

پھر اٹلی نے آپ کی عزت افزائی کی۔ انہوں نے جو ایک تحریک کی کہ میرے نزدیک وہاں ٹرانسٹ میں ایک سنٹر بنانا چاہئے سائنس کے فروغ کا تو حکومت اٹلی نے بڑا حصہ خرچ کا ادا کیا پھر دوسرے اداروں نے بھی اس میں حصہ لیا اور خاص طور پر غریب مما لک کے بچوں کو تعلیمی سہولتیں دے کر ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان کو نقطہ عروج تک پہنچانا، یہ آپ کا مقصد تھا اور اس میں قطعاً مذہبی تعصب کا اشارہ تک بھی نہیں تھا۔ غیر احمدی، پاکستانی، غیر پاکستانی، پولینڈ کے لڑکے، عیسائی، دہریہ سب پر یہ فیض برابر تھا جو رحمانیت کا فیض ہے اور اللہ کے فضل سے اس کے ساتھ بنی نوع انسان کو بہت بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اب تعلیمی ڈگریاں اور میڈل بیان کرنے کا تو وقت نہیں ہے میں نے جو چیزیں اہمیت کی سمجھیں وہ بیان کر دیں۔ اب یہ ہمارا بہت ہی پیارا علموں کا خزانہ، دنیاوی علوم میں بھی، روحانی علوم میں بھی ترقی کرنے والا ہمارا پیارا ساتھی اور بھائی ہم سے جدا ہوا۔ اللہ کے حوالے، اللہ کے پیار کی نگاہیں ان پر پڑیں اور ان کو سنبھال لیں اور اس کے علاوہ ان کی اولاد کے لئے بھی یہی دعا کریں کہ خدا ان سے ہمیشہ حسن سلوک رکھے، شفقت اور رحمت کا سلوک رکھے اور ان دعاؤں کو آگے بھی، ان کے خون میں، ان کی نسلوں میں جاری کر دے جو ان کے حق میں قبول ہوئیں۔ (الفضل انٹرنیشنل 10 تا 16 جنوری 1997ء)

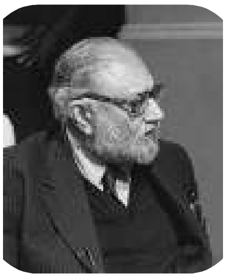

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے علمی اعزازات کی تفصیل

راجہ برہان احمد

''ڈاکٹر آف سائنس'' کی اعزازی ڈگریاں

پنجاب یونیورسٹی، لاہور (پاکستان) 1957ء۔ایڈنبرا یونیورسٹی ۔ برطانیہ 1971ء۔ٹریسٹ یونیورسٹی، اٹلی 1979ء۔اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان 1979ء۔نیشنل ڈی انجینئر یونیورسٹی پیرو 1980ء۔سان مارکس یونیورسٹی ۔ پیرو 1980ء۔نیشنل یونیورسٹی آف سان انطونیو آباد. پیرو 1980ء.سائمن بولیور یونیورسٹی۔ ویزویلا 1980ء روکولو یونیورسٹی پولینڈ 1980ء۔یرموک یونیورسٹی اردن 1980ء۔استنبول یونیورسٹی۔ترکی 1980ء۔گورونانک یونیورسٹی امرتسر (بھارت) 1981ء۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (بھارت) 1981ء نہرو یونیورسٹی بنارس (بھارت) 1981ء۔چٹا گانگ یونیورسٹی ۔ بنگلہ دیش 1981ء۔برسٹل یونیورسٹی ۔ برطانیہ 1981ء۔میڈوگوری یونیورسٹی ۔ نائیجیریا 1981ء۔فلپائن یونیورسٹی کوئزون سٹی۔فلپائن 1982ء۔خرطوم یونیورسٹی۔سوڈان 1983ء۔ میڈرڈ یونیورسٹی ۔سپین 1983ء۔سٹی یونیورسٹی ۔سپین 1983ء۔سٹی یونیورسٹی آف نیو یارک ۔ امریکہ 1984ء۔نیروبی یونیورسٹی کینیا 1984ء۔کیو یونیشنل یونیورسٹی کیو یو۔ارجنٹائن 1985ء۔ نیشنل ڈی لاٹا یونیورسٹی ۔ ارجنٹائن 1985ء۔کیمبرج یونیورسٹی ۔ برطانیہ 1985ء۔گیٹبرک، یونیورسٹی۔سویڈن 1985ء۔سوفیا کلائی پینٹ اورڈسکی یونیورسٹی۔ بلغاریہ 1986ء۔گلاسگو یونیورسٹی ۔سکاٹ لینڈ 1986ء۔یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی چین 1986ء۔سٹی یونیورسٹی۔لنڈن (یو کے) 1986ء۔پنجاب یونیورسٹی ۔ چنڈی گڑھ (انڈیا) 1987ء۔میڈیسینا آلٹرنیٹو ۔کولمبو (سری لنکا) 1987ء۔نیشنل یونیورسٹی آف بینن ۔کوٹونو (بینن) 1987ء۔ایکسٹر یونیورسٹی یو

کے 1987ء۔ پیکنگ یونیورسٹی چین 1987ء۔ کینٹ یونیورسٹی بلجیئم 1988ء۔

ایوارڈز

ستارہ پاکستان 1959ء۔ تمغہ و ایوارڈ حسنِ کارکردگی 1959ء۔ نشانِ امتیاز 1979ء۔ ہاپکن پروائز کیمبرج یونیورسٹی 1985ء۔ نشان اندرس بیلو و نیزویلا 1980ء۔ نشان استقلال اردن 1980ء۔ نشان میرٹ۔ اٹلی 1980ء۔ آخری ٹائٹ ٹکمانڈر ایوارڈ آف برٹش ایمپائر 1989ء

اعزازات

ایڈمنز پرائز کیمبرج یونیورسٹی 1958ء۔ پہلا میکسویل میڈل اور ایوارڈ (فزیکل سوسائٹی لنڈن 1964ء۔ ہیوز میڈل رائل سوسائٹی لنڈن 1964ء۔ ایٹم برائے امن کا میڈل اور ایوارڈ 1968ء۔ جے رابرٹ اوپن ہائمر میموریل میڈل اور پرائز میامی یونیورسٹی۔ امریکہ 1971ء۔ گوتھرائی میڈل اور پرائز انسٹی ٹیوٹ آف فزکس۔ لنڈن 1976ء۔ سردیو پرشاد سرداد ھیکاری گولڈ میڈل۔ کلکتہ یونیورسٹی 1977ء۔ تیوسی میڈل اکیڈمی نیشنل روم 1978ء۔ جان ٹورنس ٹانٹے میڈل امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس 1978ء۔ رائل میڈل، رائل سوسائٹی لنڈن 1978ء۔ نوبیل انعام برائے طبعیات۔ نوبیل فاؤنڈیشن 1979ء۔ آئن سٹائن میڈل یونیسکو پیرس 1979ء۔ شری آر ڈی برلا ایوارڈ۔ انڈین فزکس ایسوسی ایشن 1979ء۔ جوزف سٹیفن میڈل جوزف سٹیفن انسٹی ٹیوٹ 1980ء۔ گولڈ میڈل برائے حسین کارکردگی طبعیات اکیڈمی آف سائنس چیکوسلواکیہ 1981ء۔ امن میڈل چارلس یونیورسٹی پیراگ 1981ء۔ گولڈ میڈل یو ایس ایس آر اکیڈمی آف سائنس 1982ء

پاکستان میں تقرریاں

رکن اٹیمی انرجی کمیشن 1958ء تا 1964ء۔ مشیر تعلیمی کمیشن 1959ء۔ رکن سائینٹفک کمیشن 1959ء۔ مشیر اعلیٰ سائنس صدر مملکت 1961ء تا 1974ء۔ صدر انجمن ترقیٔ سائنس پاکستان 1961ء۔ 1962ء۔ صدر سپارکو 1961ء تا 1964ء۔ پاکستان کی جانب سے بین الاقوامی

ایٹمی انرجی ایجنسی کے گورنر 1962ء۔ 1963ء۔رکن نیشنل سائنس کونسل پاکستان 1963ء۔ 1975ء۔رکن مجلس انتظامیہ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن 1973ء۔1977ء

تقرریات

پروفیسر گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ہیڈ آف میتھ میٹکس ڈیپارٹمنٹ 1951ء تا 1954ء۔منتخب فیلوسینٹ جان کالج کیمبرج 1951ء۔1956ء۔رکن انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈی۔ پرسٹن 1951ء۔لیکچرار کیمبرج یونیورسٹی کیمبرج 1954ء۔1956ء۔ پروفیسر نظری طبعیات لندن یونیورسٹی ۔امپیریل کالج 1957ء تا 1993ء۔بانی ڈائریکٹر بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبعیات۔اٹلی 1964ء تا وفات ۔منتخب آنرری لائف فیلوسینٹ جان کالج کیمبرج 1971ء

اقوام متحدہ کے عہدے

سائنٹفک سیکرٹری جنیوا کانفرنس 1955ء تا 1958ء.(جوہری توانائی کے پرامن استعمال کے لئے جتنی بھی کانفرنسیں ہوئیں)۔رکن مجلس مشاورت سائنس وٹیکنالوجی ۔اقوام متحدہ 1964ء تا 1975ء۔رکن مجلس قائمہ برائے اقوام متحدہ یونیورسٹی 1970ء تا 1973ء۔چیئرمین مجلس مشاورت سائنس وٹیکنالوجی۔اقوام متحدہ 1971ء۔1972ء۔رکن مجلس مشاورت اقوام متحدہ یونیورسٹی 1981ء1983ء۔رکن کونسل امن یونیورسٹی 1981ء۔چیئرمین یونیسکو مجلس مشاورت برائے سائنس و معاشرہ 1981ء۔رکن سائنٹفک کونسل و بین الاقوامی امن تحقیقی ادارہ 1970ء۔نائب صدر انٹرنیشنل یونین برائے خالص واطلاقی طبعیات 1976ء۔1978ء

اکیڈمیاں اور سوسائٹیاں

منتخب فیلو پاکستان اکیڈمی آف سائنس ۔اسلام آباد 1954ء۔رائل سوسائٹی لنڈن کے پہلے پاکستانی منتخب فیلو 1959ءمنتخب فیلو رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنس سٹاک ہوم 1970ء۔منتخب ن امریکن اکیڈمی برائے آرٹس وسائنسز بوسٹن 1971ءمنتخب رکن یو ایس ایس آر اکیڈمی آف سائنس۔

ماسکو 1971ء۔منتخب اعزازی فیلوسینٹ جان کالج کیمبرج 1971ء۔منتخب رکن یو۔ایس۔اے نیشنل اکیڈمی آف سائنس۔واشنگٹن 1979ء۔منتخب رکن اکیڈمی نیشنل روم 1979ءمنتخب رکن اکیڈمی تبرینا،روم 1979ء۔منتخب رکن عراقی اکیڈمی بغداد 1979ء۔منتخب رکن ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ برائے بنیادی تحقیق کمیٹی 1979ء۔منتخب رکن کورین فزکس سوسائٹی سیول جنوبی کوریا 1979ء۔منتخب رکن اکیڈمی مراکش، رباط 1980ء۔منتخب رکن اکیڈمی نیشنل برائے سائنس، روم 1980ء۔منتخب رکن یوروپی اکیڈمی برائے سائنس و فنون، پیرس 1980ء۔منتخب رکن جوزف سٹیفن انسٹی ٹیوٹ 1980ء۔منتخب رکن انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی، نئی دہلی 1980ء۔منتخب رکن بنگلہ دیش اکیڈمی برائے سائنس۔ڈھاکہ 1980ء۔منتخب رکن سائنس اکیڈمی ویٹی کن سٹی 1980ء۔منتخب رکن سائنس اکیڈمی لزبن پُرتگال 1981ء۔بانی ڈاکٹر ورلڈ اکیڈمی آف سائنس 1983ء۔منتخب رکن یوگوسلاویہ اکیڈمی آف سائنس زغرب 1983ء۔منتخب رکن گھانا اکیڈمی آف سائنس و فنون 1984ء۔منتخب رکن پولش اکیڈمی آف سائنس 1985ء۔منتخب رکن پاکستان اکیڈمی آف میڈیکل سائنس 1987ء۔منتخب رکن انڈیا اکیڈمی آف سائنس بنگلور 1988ء۔منتخب رکن ڈسٹنگوش انٹرنیشنل آف سگماچی 1988ء۔منتخب رکن برازیلین میتھامیٹیکل سوسائٹی 1989ء۔منتخب رکن نیشنل اکیڈمی آن اکزکٹ،فزکس اینڈ قدرتی سائنس (ارجنٹینا) 1989ء۔منتخب رکن ہنگیری اکیڈمی آف سائنس 1990ء۔منتخب رکن اکیڈمی یوروپیا 1990ء

اہم ترین اعزاز اور سعادت

یہ فہرست ’’نامکمل‘‘ رہے گی اگر ڈاکٹر صاحب کے ایک اور اعزاز کا تذکرہ نہ کیا جائے اور وہ یہ کہ آپ حضرت خلیفۃ المسیح کی منظوری سے 1966ء سے لے کر وفات تک مجلس افتاء کے اعزازی ممبر رہے۔

عظمتوں کا مینار۔ مشہور چار دانگ تیرا انکسار ہے

مکرم نصیر احمد صاحب انجم

زمین پر حضرت انسان کا وجود لاکھوں سال سے ہے اور فی زمانہ بھی چھ ارب کے لگ بھگ انسان اس عالم رنگ و بو میں بستے ہیں کل بنی نوع انسان میں سے انبیاء علیہم السلام کا گروہ سرخیل کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہے۔ ان کے افضل مقام میں سے کسی کو کلام نہیں ہے۔ باقی انسانوں کے انبوہ کثیر میں سے لاکھوں انسان دنیا سے بے شناخت گذر جاتے ہیں اور کروڑوں ایسے ہیں جو عمریں کھپانے کے باوجود بے نیل مرام رہتے ہیں پھر کتنے ہیں جو حوادث زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بہت ہیں جو جنگ و جدال کے مہیب خطرات میں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ نیرنگی کائنات ہمیں کئی رنگ دکھاتی ہے۔ اور معدودے چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے میدان عمل میں کامرانیوں کی انتہاء کو چھو لیتے ہیں۔ یہی لوگ نابغہ روزگار کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

قارئین محترم! ایسے ہی ایک عبقری ہمارے محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہیں جو پاکستان ایسے پسماندہ ملک کے پسماندہ ضلع میں پیدا ہوئے مگر کامیابی کے زینے کے بعد زینے طے کرتے چلے گئے تمام ناموافق حالات اور نامساعد کیفیات بھی آپ کو علو مرتبت کے حصول سے باز نہ رکھ سکیں۔ آپ اہل علم و دانش میں ایک بلند مینار بن کر ابھرے۔ ایک ایسا مینار جس کی طرف دیکھنے کیلئے لوگوں کو اپنی ٹوپیاں اور پگڑیاں سنبھالنی پڑتی تھیں۔ عالم طبیعیات کا یہ شہنشاہ اس صدی کے کئی دہاکوں تک ماہرین فن کی آنکھوں کو خیرہ کرتا رہا۔ آپ کی عظمتوں کو ارباب دانش کدوں نے برملا تسلیم کیا۔ اور مغرب و مشرق کے ایوانوں میں آپ کی قابلیت کے گن گائے گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے فزکس کی دنیا میں وہ کام کر دکھایا جو آئن سٹائن کے بس سے بھی باہر تھا۔

1979ء میں جس تھیوری پر آپ کو نوبیل انعام ملا وہ ہر جہت سے قابل ذکر ہے۔ لیکن میرا

وجدان اس سے ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا ایک انوکھا ثبوت فراہم کرتا ہے۔آپ خدا کے فضل سے دین حق کے پیروکار اور مخلص احمدی تھے۔آپ کا نظریہ دراصل یہ تھا کہ کائنات میں کارفرما قوت ایک ہی ہے۔ جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔آپ کی تھیوری سے قبل سائنس یہاں تک پہنچی تھی کہ بنیادی طور پر کارفرما قوتیں چار ہیں۔آپ نے یہ عظیم کام کر دکھایا کہ یہ چار نہیں بلکہ تین قوتیں ہیں۔ یوں توحید کی طرف سفر پر آپ رواں دواں تھے۔محترم ڈاکٹر صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ میں قارئین کو اپنے ایک تاثر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔نوبل پرائز پانے کے بعد آپ پاکستان تشریف لائے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے از راہ شفقت ملاقات کی سعادت بخشی۔ مصافحہ اور معانقہ ہوا۔ مَیں نے وہ تصویر دیکھی ہے۔مصافحہ کرتے ہوئے سائنس کا یہ بطل جلیل اپنے روحانی امام کے سامنے جس طرح عاجزی وانکساری کا مرقع بنا ہوا ہے۔تصویر سے یہ تاثر نمایاں ہو کرا بھرتا ہے کہ آپ کو خلافت سے کیسا مخلصانہ انس فدایانہ بلکہ عاشقانہ تعلق تھا۔یقیناً ڈاکٹر صاحب کی عظمت کردار کا یہ قابل تقلید انداز تھا۔آپ اپنے زمانہ عروج میں جب دنیا کی نگاہوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ایک دفعہ اپنے آبائی شہر جھنگ تشریف لے گئے۔ جہاں سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اس سکول نے آپ کو دعوت پر بلایا۔سکول میں آپ کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے لوگ امڈ آئے تھے۔اس جم غفیر میں آپ کے پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تھے۔محترم ڈاکٹر صاحب کی نظر جونہی ان پر پڑی آپ مہمان خصوصی کی کرسی سے اٹھے اور اپنے استاد محترم سے جا کر ملے اور انہیں اپنے قریب بٹھایا۔کیونکہ یہی وہ شخص تھا جس نے یہ چھتنار درخت اس وقت سینچا تھا جب یہ نازک پودا اپنی کونپلیں نکال رہا تھا۔قارئین کرام! اس مادی دور میں جب کہ تھوڑی سی دولت نظریں پھیر دیا کرتی ہے اور ذرا سا عہدہ ملنے سے غرور آ جایا کرتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کا اپنے تمام تر مراتب کے باوجود بوڑھے استاد سے حسن سلوک آپ کی عظمتوں کا ایک اور باب وا کرتا ہے۔

قارئین! آپ سے ایک آخری بات یہ بھی کہنا ہے کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ہم جانے والے کی عظمت

کا اقرار تو کرتے ہیں مگر ہم محض پدرم سلطان بود کہہ کر ماضی کے جھروکے سے جھانکتے نہیں رہتے بلکہ ہم سلطان است جیسے محاورے ایجاد کرنے والے اور مستقبل پر کمندیں ڈالنے والے لوگ ہیں۔

اِذَا سَیِّدٌ مِنَّا خَلَا قَامَ سَیِّدٌ قَؤُلٌ لِمَا قَالَ الْکِرَامُ فَؤُوْلُ

کہ جب بھی ہمارے اندر سے کوئی سردار دنیا سے اٹھتا ہے تو اس کے قول وفعل کے امین بہت سے معزز سردار اس کی جگہ لینے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔خدا تعالیٰ احمدی سائنسدانوں کو ڈاکٹر صاحب کا مشن آگے بڑھانے کی توفیق بخشے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین

ڈاکٹر عبدالسلام

اللہ پر یقین سے بھرپور اک وجود
حبّ رسول سے رہا پر نور اک وجود
رہتا تھا عشق دل میں مسیحا کا موجزن
اک شان سے تھا عجز کی راہوں پہ گامزن
سائنس کو اس نے دین سے ایسے ملا دیا
گل کو اٹھا کے دھول سے کیسے سجا دیا
سائنس کو حق نے بخشا تھا عالم وہ بے بدل
قرآن سے پیش کرتا تھا ہر مسئلے کا حل
طبیعیات ان کے علم کا میدان خاص تھا
فضل خدا سے نوبل انعام ان کے پاس تھا
انکا تھا اس کا دل سدا جس پاک خاک میں
آرام کر رہا ہے وہ اس ارض پاک میں
اپنی دعا خدا سے ہے ہر روز صبح و شام
اس قوم میں ہوں پیدا بہت ڈاکٹر سلام

(عطاء القدوس طاہر حیدر آباد)

چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے

اک حسین تھی شخصیت حرارتیں لئے ہوئے
عظیم تر تھی زندگی سعادتیں لئے ہوئے
ڈاکٹر عبد السلام ایک ایسا نام ہے
جس کا حرف حرف ہے بشارتیں لیے ہوئے
اس کی محنتوں کا ثمر بحر و بر پہ چھا گیا
صف بہ صف عالم رہا عنائتیں لئے ہوئے
دین و دنیا میں ترقی اس نے پائی بے شمار
بڑھتا رہا قدم قدم صداقتیں لئے ہوئے
اور جب مانا گیا وہ فرد اعظم ایک دن
دنیا تھی سنگ سنگ پر عداوتیں لئے ہوئے
دل میں چھپا کے یار سے ملنے کی اک گہری تڑپ
چل دیا وہ نور کی رفاقتیں لئے ہوئے
تھا ذرہ ذرہ مضطرب جب آخری دیدار تھا
لمحات وہ بھی کٹ گئے قیامتیں لیے ہوئے
اے خدا کر اور پیدا ایسے بابرکت وجود
جن کا قول و فعل ہو امانتیں لیے ہوئے
دل نے چاہا جب ربّانی چند لفظوں کو لئے
آ گئے اس بزم میں جسارتیں لئے ہوئے

(بشریٰ ربانی ایم اے لاہور 1996ء)

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے برگزیدہ آباواجداد

مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب

احمدیت کے اس مایہ ناز سپوت اور دنیا کے عظیم سائنس دان کے حالات زندگی کارنامے افکارو نصائح اخبار الفضل اور دیگر ملکی و غیر ملکی اخبارات ور سائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔لیکن آج اس عظیم سائنس دان کے آباواجداد کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے اپنی سوانح میں لکھا ہے:۔

''میرے اب امجد ایک ہندو راجپوت خاندان کے شاہزادے تھے۔نہایت پاک سیرت ہونے کی وجہ سے حق شناسی کا مادہ ان میں بہت تھا۔حضرت غوث بہاء الحق زکریا علیہ الرحمہ جب اعلائے کلمہ اللہ کیلئے ہندوستان تشریف لائے تو ان سے ملاقات ہوئی۔حضرت ممدوح کی تبلیغ نے ان کے دل کی تہ تک اثر کیا۔آخر انہوں نے دین حق کو قبول کر لیا۔ان کا نام بڈھن (یہ ہندوانہ نام تھا اور دعائیہ نام تھا کہ لمبی عمر پانے والا) سے سعد بڈھن رکھا گیا۔پھر کیا تھا۔تخت کو چھوڑا اپنے آقا سے سچی لو لگائی اور باقی عمر ساتھ نہیں چھوڑا۔درددل سے دعائیں کرنا ان کا کام تھا اور یہ ان کی دعاؤں کی برکت ہے کہ ان کی اولاد ہمیشہ قرآن مجید کی خادم رہی اور دنیاوی حیثیت میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔''

دادا: آپ کے دادا کا نام میاں گل محمد تھا۔جو کہ پیشہ کے لحاظ سے طبیب تھے۔نہایت ہی عالم باعمل انسان تھے۔اگرچہ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت نہیں کی تھی لیکن آپ کے مصدق تھے۔

دادی: آپ کی دادی بہت نیک خاتون تھیں۔تہجد باقاعدگی سے ادا کرتیں۔اپنے تینوں بچوں کے نام لے لے کر دعائیں کرتیں۔نماز کی ادائیگی کیلئے سخت تاکید کرتیں۔

تایا: آپ کے تایا جو آپ کے خسر بھی بنے ان کا نام چوہدری غلام حسین تھا۔ 21 جنوری 1874ء کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔ مڈل کا امتحان مڈل سکول جھنگ سے دیا اور صوبہ بھر میں اوّل آئے۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ سے پاس کیا اور صوبہ بھر میں دوم آئے۔ وظیفہ لیکر مشن کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ وہاں سے بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی۔ ڈیرہ غازیخان، کرنال، فیروز والا، لدھیانہ میں ملازمت کے سلسلہ میں مقیم رہے۔ 1932ء میں ڈسٹرک انسپکٹر آف سکولز ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد محلہ دارالفضل قادیان میں اپنا مکان تعمیر کرایا جہاں تقسیم ملک تک قیام پذیر رہے۔ 1947ء میں اپنے آبائی وطن جھنگ شہر میں سکونت اختیار کی جہاں اپنی وفات جو 24 جنوری 1950ء کو واقع ہوئی تک مقیم رہے۔

وہ مولوی محمد حسین بٹالوی کے زبردست معتقد تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی حضرت بانی جماعت احمدیہ کی مخالفت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انہی دنوں منشی الٰہی بخش اکوانٹنٹ اور ان کے ساتھ جو مولوی محمد حسین بٹالوی کے معتقدین میں سے تھے کے اکسانے پر حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''عصائے موسیٰ'' رکھا گیا۔ اس کتاب سے حضرت بانی جماعت احمدیہ کو بہت تکلیف پہنچی جس کا آپ نے اپنی کتاب ''اعجاز احمدی'' جو 15 نومبر 1902ء کو شائع کی تھی۔ تحریر فرمایا: ''کیا محمد حسین کا دل ہدایت پر آجائے گا یہ کون گمان کرسکتا ہے عجیب بات ہے اور خدا کے نزدیک سہل اور آسان ہے تین آدمی اس کے ساتھ اور ہیں ایک ان میں سے الٰہی بخش اکوٹنٹ ملتانی ہے بس سن اور سنا دے۔ تیری قسم کہ ہم نے بغیر گناہ کے ان کے نیزوں کا مزا چکھا۔ پس ہمیں یہی اچھا معلوم ہوا کہ ان کے حق میں دعا کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد الٰہی بخش اکونٹنٹ اور ایک ساتھی طاعون سے ہلاک ہوگیا اور چوہدری غلام حسین صاحب کو سخت قسم کا ہیضہ ہوگیا۔ جس کے بعد آپ کا دل احمدیت کی طرف مائل ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت بانی جماعت احمدیہ کی کتب کا مطالعہ کرنا شروع کردیا۔ خدا کے حضور دعائیں مانگیں جس کے نتیجہ میں ایک خواب دیکھا اور بالاخر احمدیت قبول کرلی مگر انہیں افسوس اس بات کا رہا کہ یہ

سعادت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی زندگی میں حاصل نہ ہوئی۔ جب ابتداء میں احمدیت کے مخالف تھے تو نہایت زور اور شدت کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ جب خدا تعالیٰ کی توفیق سے احمدیت کو اختیار کیا تو پھر نہایت پر جوش اور مخلص احمدی ثابت ہوئے۔ بڑی دلیری کے ساتھ دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دیتے گویا انہیں اس کا جنون تھا اور وہ اس سے کسی حالت میں بھی باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر اسی مقدس مشغلے میں بسر کی۔ شان و شوکت، رعب داب اور فخر و مباہات کی زندگی سے ہمیشہ الگ رہے۔ نہایت ہی سادہ وضع، سادہ حالت اور سادہ پوشش رکھتے۔ نیکی و پاکبازی کی ایسی حیرت انگیز قوت رکھتے تھے کہ پاس بیٹھنے والوں پر اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔ نام و نمود اور دکھاوے سے ہمیشہ متنفر رہے۔ شاید ہی کوئی احمدی ہوگا جس نے اپنے متعلق جماعت احمدیہ کے تمام خلفاء کی قبولیت دعا کا نشان نہ دیکھا ہو اور بار بار نہ دیکھا ہو۔

اخبار الفضل مورخہ 28 دسمبر 1939ء (جوبلی نمبر) میں حضرت چوہدری صاحب نے ''ہر آڑے وقت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) کی طرف رجوع'' کے موضوع کے تحت لکھتے ہوئے تحریر کیا۔ ''گو خوف و ہراس میرے دل پر کبھی مستولی نہیں ہوا۔ مگر میری زندگی تکالیف اور صدمات سے پر گذری ہے اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جو تشویش سے خالی ہو۔ لیکن میں نے ہر آڑے وقت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف رجوع کیا اور جتنا جلدی ہو سکا دعا کے لئے لکھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنے اس محبوب کی ایسی خاطر منظور ہے کہ لفافہ لیٹر بکس میں گیا اور ادھر مشکل حل ہونی شروع ہو گئی اور اگر حل نہ ہوئی تو اس نے کوئی ایسا رنگ اختیار کر لیا جو خوبی میں پہلے سے بھی بڑھ کر نکلا۔ جب سے یہ نسخہ میرے ہاتھ آیا ہے میں نے کئی دوستوں کو بتایا اور انہوں نے خواہ وہ غیر از جماعت بلکہ غیر مسلم بھی تھے اس سے فائدہ اٹھایا اور حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں بطور شکر یہ نذرانے بھیجے خوش اعتقادی میں ایک حقیقت ہے جو واقعات پر مبنی ہے۔ میں مشاہدات کی بناء پر جو ایک نہیں بلکہ کئی ہیں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے اکثر حالات جو ابھی سربستہ راز ہوتے ہیں حضرت امام پر کھولے جاتے ہیں۔ ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ میں نے پچیس روپے

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی نذر کرنے چاہے مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سندھ تشریف لے گئے ہیں ۔ میں بیمار اور صاحب فراش ۔ میں نے وہ روپے الگ کر کے بطور امانت رکھ دیئے تا کہ اور روپے کے ساتھ خرچ نہ ہو جائے ۔ اچانک محاسب صاحب کی استفساری چھٹی پہنچی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے سندھ سے بذریعہ فون دریافت فرمایا ہے کہ آیا میں نے کوئی روپیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی امانت فنڈ میں جمع کرایا ہے میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یہ نذر اس مالک حقیقی کے حضور قبول ہوگئی'' آپ نہایت صاحب فراست با اخلاق، متقی، بردبار، ذکی الطبع ،غربا کے ہمدرد، یتیم پرور، بیواؤں کے خبر گیران، امیر ہو کر فقیر منش، فرمانبردار بیٹے، مہربان بھائی اور شفیق باپ تھے غرض آپ کا وجود احمدیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ آپ صاحب کشف بزرگ تھے۔ حضرت رسول مقبول ﷺ کی خواب میں کئی بار زیارت ہوئی تھی۔

کشف القبور کے متعلق کئی باتیں سنایا کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے حصہ شیخ سعدی کو کشف میں دیکھا اور باتیں کیں آپ کے اعمال اور افعال قرآن اور حدیث کے مطابق تھے۔ سلسلہ کی ہر تحریک میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ چنانچہ تحریک جدید دفتر اوّل میں ان کا آخر تک حصہ رہا اور دفتر اوّل کے انیس سال مکمل کئے۔ آپ موصی تھے۔ جھنگ شہر میں اپنے آبائی قبرستان میں امانتاً تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کیں۔ سب سے بڑی بیٹی نے تینتیس برس اور سب سے چھوٹے بیٹے نے 16 برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر آپ نے صبر کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔

نانا: آپ کا نام حضرت حافظ نبی بخش صاحب تھا۔ آپ موضع فیض اللہ چک جو قادیان سے قریباً 4-5 میل کے فاصلے پر تھا کے رہنے والے تھے۔ آپ ان معدودے چند خوش قسمت احباب میں سے تھے جنہیں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی طرف سے ان کے دعویٰ سے طویل عرصہ قبل بار بار حاضر ہونے اور فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ آپ سے بے تکلفانہ حسن سلوک فرماتے تھے۔ آپ کو ان ایام میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے سونے کے کمرہ یعنی بیت الفکر

میں اس ارادہ سے سونے کا موقع ملتا تا تہجد کیلئے بیدار ہوسکیں۔آپ کم عمر نوجوان ہی تھے کہ معدودے چند اشخاص کی طرح آپ کو بھی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ ایک شخص کیلئے دعائیں کرنے اور خواب آئے تو بتانے کیلئے فرمایا کرتے تھے۔چونکہ ابھی آپ بالکل کم عمر تھے اس وقت حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا آپ کو دعا کیلئے کہنا گویا حضرت بانی سلسلہ کی خداداد فراست کے مطابق آپ کی فطری رشد اور جبلی سعادت پر دلالت کرتا ہے۔ایک دفعہ آپ کی امامت میں حضرت بانی سلسلہ نے نماز پڑھی تھی۔اپنے گاؤں میں آپ بیعت کرنے والے تیسرے اور ضلع گورداسپور میں تینتسویں فرد تھے۔آپ نے 10 مارچ 1890ء کو بیعت کر کے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہونے کا شرف پایا۔

رجسٹر بیعت میں اس تاریخ میں آپ کا اندارج یوں ہے۔آپ کا نمبر 181 (ایک سو اکاسی) ہے۔

شیخ نبی بخش ولد شیخ کریم بخش ساکن فیض اللہ چک ضلع گورداسپور پیشہ ملازمت''

یہ ایک عظیم سعادت تھی جو آپ کو نصیب ہوئی سچ ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

آپ کی پیدائش غالباً 1877ء میں ہوئی چودہ پندرہ برس کی عمر میں یعنی 82-1881ء میں حضرت بانی سلسلہ کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں عطا کیں۔بڑے بیٹے شیخ عبدالرحمن کی نوعمری میں وفات پر آپ نے رضا بالقضا کا بہترین نمونہ دکھانے کی وجہ سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی خاص دعائیں لینے کا موقع پایا۔آپ کے دوسرے بیٹے حکیم فضل الرحمان صاحب کو ربع صدی تک گولڈ کوسٹ (غانا) سالٹ پانڈ اور لیگوس (نائجیریا) میں بطور مربی انچارج خدمت کرنے کی توفیق ملی۔جہاں وہ 1925ء میں پہلی مرتبہ تشریف لے گئے۔آپ کے تیسرے بیٹے ملک حبیب الرحمان تھے جو سرگودھا سے بطور ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز ریٹائر ہوئے۔مارچ 1965ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ان کا وقف منظور فرماتے ہوئے تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ کا مینجر مقرر فرمایا۔بعد میں آپ نے بطور ہیڈ ماسٹر خدمات سرانجام دیں۔محلہ دارالبرکات کے صدر بھی رہے۔

حضرت حافظ نبی بخش صاحب نے اپنے فرزند ارجمند حکیم فضل الرحمن صاحب کے کہنے پر اپنے کچھ حالات تحریر فرمائے جو درج ذیل ہیں۔اپنے حالات لکھنے کے بعد آخر میں آپ نے تحریر فرمایا''بالاخر میں عزیز لخت جگر مبلغ افریقہ کوتحریر کرتا ہوں کہ میری یہ تحریر بحفاظت رکھے اور آئندہ میری نسل اس سے فائدہ اٹھائے اللہ کی توفیق سے۔

''چند باتیں میں اپنے حالات گزشتہ کی درج ذیل کرتا ہوں۔تمہید کے طور پر یہ حروف بھی تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوتے ہیں۔میرے والد صاحب حضرت حکیم کریم بخش صاحب موضع فیض اللہ چک تحصیل وضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔ان کی زندگی کا اکثر حصہ ملازمت محکمہ انہار میں گزرا۔جو پہلے پہل متفرق جگہوں میں مقیم رہے۔آخرش ان کی تبدیلی امرتسر میں ہوئی۔اس وقت ان کی جائے قیام خاص امرتسر ہوگئی۔اس وقت شہر میں مولوی ابوعبید اللہ غلام علی صاحب قصوری،قصور سے ہجرت کر کے امرتسر میں مقیم ہو گئے تھے اور انہوں نے قصور سے اس لئے ہجرت کی تھی کہ ان کا مذہب الحدیث یا موحد تھا۔قبر پرستی اور پیر پرستی وغیرہ سے ان کو بہت تنفر تھا اور باشندگان قصور اکثر قبر پرست اور پیر پرست تھے۔اس لئے ان کا ان کے عقائد میں سخت اختلاف ہوگیا۔حضرت والد صاحب مولوی صاحب کے پاس آنے جانے لگے اور ان کی صحبت سے عقائد سابقہ میں تبدیلی ہونے لگی۔یہاں تک تبدیلی ہوگئی کہ باشندگان فیض اللہ چک ان کو وہابی کے لفظ سے پکارنے لگے۔میں بھی اپنے والد صاحب کے پاس رہتا تھا اور حافظ محمد بخش کڑوسفید (کڑھیگیاں) میں مولوی صاحب موصوف کی مسجد میں مقیم تھے۔ان سے قرآن کریم پڑھتا اور حفظ کیا کرتا تھا۔مولوی صاحب موصوف خود درس قرآن کریم دیتے تھے جس میں شامل ہو کر قرآن شریف پڑھتا تھا۔

مولوی غلام علی کی صحبت سے متاثر ہو کر رشوت ستانی سے بیزار ہو کر حضرت والد صاحب نے ملازمت چھوڑ دی اور ایک شخص نامی شیخ بڈھا صاحب جو امرتسر میں چمڑے کی آڑھت کرتے تھے ان کے ہاں بھی کھاتہ لکھنے کی ملازمت اختیار کر لی اور محض حصول رضائے خدا اور روزی حلال کمانے

کی خاطر ایک اچھی آمدنی کی جگہ چھوڑ کر معمولی سے گذارہ والی جگہ اختیار کر لی۔ میں قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد فیض اللہ چک میں آکر منڈی کرال میں جو کہ فیض اللہ چک سے قریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے پرائمری سکول میں داخل ہو گیا۔

یہ چند حروف اس لئے لکھے ہیں کہ بتلایا جائے کہ میں اپنے والد صاحب کے پاس رہنے اور مولوی غلام علی صاحب کی صحبت میں رہنے اور ان سے قرآن شریف پڑھنے کے باعث بچپن میں ہی شرک و بدعت سے ایسا بیزار اور متنفر ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ایسی بات یا حرکت کرتا جس میں شرک و بدعت کی بو محسوس کرتا تو میں اسے سننا یا دیکھنا پسند نہ کرتا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے شرک و بدعت کی جڑ میرے دل سے بچپن میں ہی اکھاڑ دی تھی۔ ان ایام میں میرے تایا صاحب قادر بخش صاحب تحصیل بٹالہ میں ملازم تھے اور وہ قادیان میں سرکاری کاموں کے واسطے اکثر جایا کرتے تھے اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے ملتے تھے۔ کھانا بھی حضور ہی اندر سے ان کے واسطے لاتے تھے۔ جب کبھی تایا صاحب فیض اللہ چک جائے تو حضور کا ذکر نہایت اخلاص اور محبت سے کرتے تھے۔ اور بڑی شدومد سے حضور کے اخلاق حسنہ کا ذکر کرتے۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں حضور کی زیادت کا شوق بلکہ حضور کیلئے ایک عشق پیدا ہو گیا اور دل چاہنے لگا کہ اڑ کر بھی حضور کی زیارت کروں۔ حتی کہ میں قادیان پہنچا اور حضور سے ملا اور ایک رات قادیان ٹھہر کر واپس فیض اللہ چک چلا گیا۔ اس کے بعد دل میں ایک تڑپ کی رہنے لگی اور جب تک حضور کی زیارت نہ کر لیتا چین نہ آتا۔ حضرت حافظ حامد علی صاحب خادم حضور پر نور میرے قادیان جانے سے پہلے حضور کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے میں ان کے ذریعہ حاضر حضور ہوا تھا۔ حافظ صاحب موضع غلام نبی کے رہنے والے تھے اور میرے رشتہ داروں میں سے تھے۔ پہلی دفعہ کی حاضری کے بعد میری آمد و رفت کا راستہ کھل گیا کیونکہ میں نے حضور کے اخلاق حمیدہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر پائے جو ہمارے تایا جان بتلاتے تھے۔ حتی کہ میں یہ یقین کرنے لگا کہ حضور مجھ سے کسی پر زیادہ شفقت نہیں کرتے۔ پھر میں اور حافظ نور محمد صاحب جو فیض اللہ چک کے ہی رہنے والے تھے مل کر حضور کی

خدمت میں حاضر ہوتے اور وہاں ٹھہرتے۔مسجد مبارک کی شمال کی طرف جو چوبارہ ہے جس کا نام بیت الفکر ہے اس کے مشرقی دروازہ کے سامنے ایک تخت پوش چوبی رکھا ہوا تھا۔اس پر میں اور جو کوئی مہمان بھی ہوتا بیٹھ کر کھانا کھاتے اور حضرت اقدس کھانا اندر سے اپنے دست مبارک سے لا کر ہم مہمانوں کے آگے رکھتے اور خود بھی شامل ہو جاتے۔ایک چھوٹی چائے دانی بیت الفکر میں موجود رہتی اور قہوہ تیار رہتا اور پاس ہی مصری پڑی رہتی میں دن میں جتنی دفعہ چاہتا قہوہ پی لیتا۔حضور فرماتے اور پیو اور پیو۔ایک چھوٹی چارپائی بھی بیت الفکر میں موجود رہتی جب کبھی میں سردی کے موسم میں اکیلا حاضر ہوتا تو اسی بیت الفکر میں تخت چوبی شمالی دیوار کے پاس بچھا ہوتا۔میں خود ہی عرض کر دیتا کہ حضور میں اس پر سوؤں گا۔اور اس میں میری غرض یہ ہوتی تھی کہ میں دیکھوں کہ حضور رات کو کسی وقت جاگ کر نماز میں مصروف ہوتے ہیں۔اس بیت الفکر میں (اس تخت پوش کی پائنتی کی طرف ایک چارپائی ہوتی جس پر حضور رات کو اور صبح کی نماز کے بعد استراحت فرماتے تھے۔(حافظ حامد علی بھی وہاں ہوتے تھے) جب کبھی میری آنکھ کھلتی تو میں حضور کو اسی تخت پوش کے ایک طرف نماز میں مشغول پاتا اور عجیب بات یہ ہے کہ حضور میرے پاس ہی نماز گزارتے اور مجھے کبھی نہ جگاتے اور نہ ہی یہ فرماتے کہ ایک طرف ہو جاؤ۔

ایک دفعہ میں قادیان میں حاضر ہوا تو مجھے وہاں تین چار دن ٹھہرنا پڑا۔میرے پاس ایک گائے ہوتی تھی میں اس کے لئے صرف ایک دو دن کا چارہ جمع کر کے چھوڑ آیا تھا۔چار دن کے بعد جب میں نے واپس جانے کی اجازت چاہی اور ساتھ ہی گائے کا ذکر کیا تا اس کی وجہ سے مجھے اجازت مل جائے تو اس وقت حضور نے حافظ نور محمد صاحب کو جو پاس ہی موجود تھے تبسم کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی گائے بھی بنی اسرائیل کی گائے کی طرح ہی ہوگئی۔حضور کی عادت میں داخل تھا کہ چھوٹا ہو یا بڑا ''تو'' کے لفظ سے کسی کو نہ بلاتے بلکہ ''آپ'' کا لفظ استعمال فرماتے۔حالانکہ میں چھوٹا بچہ تھا لیکن مجھے بھی کبھی ''تو'' نہ کہتے۔حضور نماز عشاء سے فارغ ہو کر جب سونے کے لئے بیت الفکر میں تشریف لے آتے تو بعض دفعہ میرا اپنا دل ریوڑیاں کھانے کو چاہتا تو میں خود ہی اونچی آواز سے کہہ

دیتا کہ حضور حافظ نور محمد صاحب ریوڑیاں کھائیں گے۔ حافظ صاحب وہاں موجود ہوتے مگر بچارے کچھ نہ بولتے ۔حضور میری عرضی سنتے ہی حافظ حامد علی صاحب کو آواز دیتے اور فرماتے کہ میاں حامد علی بازار سے ریوڑیاں لاؤ مگر کڑاکے دار لانا۔ حافظ صاحب فوراً تعمیل ارشاد کرتے اور ریوڑیاں لے آتے ۔حضرت اقدس اپنے دست مبارک سے نہایت خندہ پیشانی سے ہمیں ریوڑیاں دیتے اور خود بھی کھاتے تھے۔''

یہ سب واقعات حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دعویٰ سے پہلے کے ہیں ۔اسی طرح کے اور کئی واقعات اور روایات انہوں نے تحریر فرمائی تھیں ۔ بیعت کرنے کے بعد کا ایک واقعہ آپ تحریر فرماتے ہیں ۔''ایک دفعہ میں کمزوری نظر کی شکایت لیکر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی خدمت میں علاج دریافت کرنے کیلئے حاضر ہوا۔تو حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل نے فرمایا۔شاید موتیا اترے گا۔ میں بہت ہی پریشان اور مضطرب حال ہوا اور ان کے رقعہ پر اور ڈاکٹروں (جناب ڈاکٹر میر محمد اسمعیل صاحب اور ڈاکٹر محمد حسین صاحب) سے بھی آنکھوں کا معائنہ کرایا۔سب نے ہی کہا کہ پانی اترے گا۔جس پر میں اور پریشان ہوا اور حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر تمام حال زبانی عرض کیا۔ حال عرض کرنے سے پہلے چونکہ میں دیر کے بعد آیا تھا۔حضور نے فرمایا آپ دیر سے آئے ہیں ۔ میں نے کہا حضرت میری آنکھیں دکھتی ہیں ۔حضور نے فرمایا ٹھہرو اور اس وقت الحمد للہ پڑھ کر آنکھوں پر پھونک دی اور دست مبارک پھیر کر فرمایا کہ میں دعا کروں گا۔اس کے بعد نہ وہ موتیا اترا اور نہ وہ کم نظری ہی رہی۔''

آپ کی شادی محترمہ عظیم بی بی صاحبہ دختر چوہدری غلام غوث صاحب سے ہوئی۔ وہ اعلیٰ پایہ کی موحد اور شرک سے پرہیز کرنے والی تھیں اور نہایت ہی نیک صابرہ با اخلاق اور سلیقہ شعار خاتون تھیں ۔ وہ تمام اقارب سے محبت اور رواداری سے پیش آتیں ۔حضرت حافظ نبی بخش صاحب کی ملازمت گو معمولی یعنی پٹواری کی حیثیت سے تھی لیکن آپ کا قیام جہاں بھی رہا آپ اپنے اخلاق حسنہ، رعب اور شخصیت کے باعث مسلم کیا اور غیر مسلم کیا تمام ہی آپ کو بزرگ اور باپ جیسا شفیق و

بہی خواہ سمجھتے تھے اور اپنے ذاتی خاندانی و دیگر تنازعات کا آپ سے فیصلہ کراتے۔ افسر بھی آپ سے احترام سے پیش آتے اور اکثر امور میں آپ کا مشورہ قبول کرتے۔ آپ رسومات و تکلفات سے بالا تھے۔ آپ مذہب کے معاملہ میں بڑے باغیرت تھے۔ آپ کے حلقہ احباب اور افسران میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوتی تھی کہ آپ کی موجودگی میں احمدیت یا بزرگان سلسلہ کے متعلق ناروا رنگ میں لب کشائی کریں۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے دارالفضل قادیان میں مستقل سکونت کر لی۔ دارالفضل کے سیکرٹری تعلیم و تربیت تھے۔ آپ کو ذیابیطس کا مرض مدت سے تھا۔ 1935ء میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی حتی کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ آخر طویل علالت کے بعد 23 مارچ 1942ء کو آپ نے وفات پائی۔ آپ بہشتی مقبرہ قادیان میں مدفون ہیں۔

والد ماجد: مکرم ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار کا نام حضرت چوہدری محمد حسین صاحب تھا۔ وہ 2 ستمبر 1891ء کو جھنگ شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ شہر میں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لیا۔

قبول احمدیت: اپنے کالج کی بلڈنگ کے اوپر ایک ڈارمیٹری میں رہتے تھے۔ ایک روز ایک شخص میاں پیر بخش پٹرنگ سکنہ بھاٹی دروازہ لاہوران کے پاس آیا اور کہا کہ اس نے مرزائیوں کے خلاف ایک انجمن بنائی ہے جس کا نام تائید اسلام رکھا ہے اور ان سے اس انجمن کا ممبر بن جانے کیلئے کہا جس کا ماہوار چندہ چار آنے تھے۔ آپ نے پیر بخش صاحب سے کہا کہ اگر وہ شخص (مراد حضرت بانی سلسلہ احمدیہ) سچا ہو تو ہم کدھر جائیں گے؟ پیر بخش نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن آپ اس انجمن کے ممبر نہ بنے بلکہ پیر بخش سے کہا کہ فیصلہ خداوند کریم سے دریافت کریں۔ آپ نے دلیل دی کہ ریلوے اسٹیشن لاہور کا راستہ اگر کسی نابکار شخص سے بھی دریافت کریں تو وہ بھی غلط نہ جائے گا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رحیم و کریم خدا سے سیدھا راستہ طلب کریں اور نہ بتائے چنانچہ اس دن سے آپ نے ”ہمیں سیدھا رستہ دکھا“ کا ورد اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے شروع کر دیا اور چالیس روز تک کیا۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ جھنگ شہر میں ہمارے پرانے مکان میں ایک بزرگ تشریف

فرماہیں۔عمویم حاجی اللہ داد خاں انسپکٹر پولیس سامنے کھڑے ہیں اور مجھے جاتے ہیں کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی آپ تلاش میں تھے۔میں نے ان بزرگ کی معیت میں کھانا کھایا۔اس کے بعد وہ مگھیانہ کی طرف چل پڑے جس راستہ سے وہ گئے وہ ہونے والی مسجد احمدیہ جھنگ سے گزرتا ہوا چوک کو جاتا تھا۔ساتھ ہی اشارہ ہوا۔یہ قاریان والے تھے'' پھر آپ خود بیان فرماتے ہیں:۔

''اس کے بعد میں موقع پا کر قادیان گیا۔سہ پہر کے وقت پہنچا مجھے بتایا گیا کہ مولوی نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاوّل اپنے مطب میں تشریف لا رہے ہیں۔میں ان کے مکان کے اندر گیا قریباً تین آدمی ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔مجھے آخری ہے جگہ پر بیٹھنے کا موقع ملا۔تھوڑی دیر بعد خلیفۃ المسیح الاوّل تشریف لائے آپ کو حضرت مفتی محمد صادق صاحب اور مرزا خدا بخش صاحب نے سہارا دیا ہوا تھا۔آپ نے سیدھے میرے طرف آنے کی تکلیف کی اور مجھ سے ایسے طریق سے پوچھا جیسے وہ مجھے پہلے جانتے تھے اور کہا کہ کیا آپ آ گئے ہیں۔میں نے بھی پہچان لیا آپ نے پوچھا کہ کیا بیعت کرنا چاہتے ہیں؟ میں چپ ہو گیا۔آخر آپ نے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھو اور میں جو کہے جاؤں تم بھی کہتے جاؤ جس وقت کوئی لفظ طبیعت کے موافق نہ ہو ہاتھ اٹھا لینا۔میں نے دل میں کہا کہ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے چنانچہ سب حاضرین میرے ساتھ الفاظ دہرانے میں شامل ہوئے اور میری بیعت ختم ہوئی۔میں نے اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جلدی ملنا۔(اٹھارہ روز بعد آپ وفات پا گئے۔) حضرت مفتی محمد صادق صاحب میرے ساتھ امرتسر تک تشریف لائے اور مجھے راستہ میں سمجھاتے رہے۔دوسرے روز لاہور میں مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ پڑی۔چونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ ہمیشہ سچ بولنا۔میں سچ ہی بولتا رہا آخر مخالفین نے احمدیت پر میرے ایمان کو مضبوط کر دیا۔

زمانہ قیام لاہور میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے از راہ شفقت انہیں سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوٹل لاہور کا عہدہ عطا فرمایا۔ہوسٹل کے ساکین میں اکثر وہ لوگ تھے جو بعد میں سلسلہ احمدیہ کے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔چند ایک کے نام درج ہیں۔حضرت ملک غلام فرید صاحب،مکرم مرزا

عبدالحق صاحب، حضرت شیخ احمد دین صاحب، حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر، حضرت صوفی غلام محمد صاحب دیگر بہت سارے احباب۔

لاہور میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ جھنگ واپس تشریف لے گئے۔ 1920ء میں آپ کی شادی سعیدہ بیگم دختر چوہدری خدابخش صاحب سے ہوئی جن کے بطن سے پہلی لڑکی مسعودہ بیگم پیدا ہوئیں۔لڑکی کی پیدائش کے فوراً بعد آپ کی بیوی وفات پا گئیں۔12 مئی 1935ء کو آپ کی دوسری شادی ہاجرہ بیگم بنت حضرت حافظ نبی بخش صاحب جو حضرت بانی سلسلہ عالیہ کے اولین رفقاء میں سے تھے کے ساتھ ہوئی۔ان کے بطن سے سات فرزند اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔جن میں سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سب سے بڑے ہیں۔اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ میں بطور انگلش ماسٹر ملازمت کی۔ بعد میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز جھنگ کے دفتر میں ملازمت اختیار کی۔2 جنوری 1941ء کو انہیں انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن کے دفتر میں بطور ڈویژنل ہیڈ کلرک تعینات کیا گیا۔ جہاں سے آپ 1951ء میں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ دوران ملازمت نہایت ہی دیانت داری، فرض شناسی، محبت اور لگن سے کام کیا۔ اپنے افسران بالا اور ماتحت عملہ سے خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو تعریفی سند دی گئی۔ریٹائرمنٹ سے قبل سرکاری ملازمین کی کارکردگی کے بارے میں ان کی سالانہ رپورٹ میں لکھا گیا Excellence Work and sterlino character اپنی سوانح میں ایک جگہ آپ نے لکھا کہ ”میں نے ایک حدیث پڑھی کہ جبرئیل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام سے فرمایا جو شخص تیرا نام نامی سنے اور درود شریف نہ پڑھے اس کا ناک خاک آلودہ ہو۔ چونکہ میرے نام کا پہلا حصہ حضور کے نام نامی سے شروع ہوتا ہے میرے دل میں ڈر آ گیا کہ مجھ پر بھی دستخط کرتے وقت ہمیشہ درود شریف پڑھنا فرض ہے۔ مجھے منصبی طور پر دن میں بے شمار بار دستخط کرنے پڑتے تھے۔ میں نے ہر بار درود شریف پڑھنا اپنے لئے لازمی قرار دے دیا۔ چنانچہ ہندو سکھ مسلمان حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا پڑھتا رہتا ہے۔“

قیام ملتان کے دوران آپ کو جماعت احمدیہ کی بطور سیکرٹری تعلیم وتربیت،صدر اور امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع ملتان جس میں ملتان، وہاڑی، کبیر والا، خانیوال، میلسی، شجاع آباد، لودھراں کی تحصیلیں تھیں خدمت کرنے کی توفیق ملی۔مرکز سلسلہ سے دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں جو بھی علماء و بزرگ ملتان کا دورہ کرتے ان کا قیام آپ کے ہاں ہی ہوتا تھا۔ریٹائرمنٹ کے بعد آپ اپنے آبائی وطن جھنگ شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔وہاں سے اپریل 1959ء میں آپ لندن تشریف لے گئے اور اپنے فرزند محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔لندن میں اپنے قیام کے دوران آپ نے بے شمار تربیتی لیکچر دیئے خاص طور پر نوجوانوں کی تربیت کیلئے بہت کوشاں رہتے۔ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب (اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو) نے اپنے ایک خط میں جو انہوں نے مجھے جرمنی میں لکھا تھا تحریر فرمایا۔’’میں آپ کے والد صاحب محترم کو تحریک کرتا رہتا ہوں کہ لندن کے نوجوان پاکستانیوں کی تربیت کا کام سنبھالیں۔اب قریباً دوسو احمدی نوجوان وہاں پہنچ چکا ہے۔ انہیں اگر منظم کیا جائے تو بڑی طاقت ہے۔‘‘ پھر کئی دفعہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے اپنے خطوط میں لکھا کہ ’’میں آپ کی ہمت پر رشک کرتا ہوں اور اس بات پر بھی رشک کرتا ہوں کہ کس طرح پیرانہ سالی میں آپ جماعت کی خدمت بجالا رہے ہیں۔‘‘

آنحضرت ﷺ کی حدیث ’’اپنی اولاد کی عزت کرو‘‘ پر ہمیشہ عمل پیرا ہوتے۔اپنے بچوں کو کبھی تم یا تو کے الفاظ سے مخاطب نہ ہوتے بلکہ ہمیشہ تسیں یا آپ کے الفاظ سے مخاطب ہوتے۔

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کی کامل اتباع اور خلافت احمدیہ کے ساتھ دلی وابستگی کے طفیل آپ کو جو غیر معمولی قبولیت اور نصرت عطا ہوئی اس کا ایک زندہ اور درخشندہ و تابندہ ثبوت اس عاجزانہ دعا کا قبول ہو کر منصۂ شہود پر آنا ہے جو آپ نے شادی کے بعد ایام جوانی میں مانگی اور خدا نے متواتر رویا و کشوف کے ذریعے آپ کو اس کی قبولیت کی بشارتیں عطا فرمائیں۔

حضرت چوہدری صاحب نے بعد میں آنے کے باوجود بتائید و توفیق الٰہی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں اس قدر تعمد اور عزم و ہمت کا مظاہرہ کیا کہ حسب وعدہ الٰہی آپ کے قلب صافی

سے بھی محبت الٰہی اور ہمدردی بندگان خدا کا پاک چشمہ پھوٹا اور ایسے ہی دوسرے ہزار ہا قلوب سے پھوٹنے والے چشموں کے ساتھ مل کر اور ایک جگہ اکٹھا ہو کر دریا کی صورت میں بہتا ہوا نظر آیا۔ آپ کا وجود ان چراغوں میں سے ایک چراغ کی مانند تھا جنہیں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ اور آپ کے عالی مرتبہ خلفاء کرام سے اکتساب نور کی بدولت اونچی جگہ پر رکھا گیا۔ جو مشرق و مغرب میں اپنی روشنی پھیلاتے رہے۔ آپ کا دل محبت الٰہی میں گداز تھا۔ قرآن مجید، آنحضرت ﷺ اور حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ سے والہانہ عشق آپ کی خاص صفت تھی۔ خلافت کے ساتھ دلی وابستگی نظام سلسلہ کے احترام اور بندگان خدا پر شفقت کرنے میں آپ تعہد سے کام لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ عشق الٰہی، عشق کلام پاک، عشق رسول ﷺ، عشق بانی سلسلہ احمدیہ، خلافت کے ساتھ دلی وابستگی، نظام سلسلہ کے احترام اور شفقت علی خلق اللہ کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے میں آپ ہر آن کوشاں رہتے تھے اور اس میں خاص لذت محسوس کرتے تھے۔ پاکیزہ جذبات اور قوت عملی کے باہمی امتزاج نے آپ کی شخصیت میں ایک عجیب دلاویزی پیدا کر دی تھی جس کے زیر اثر آپ سراپا محبت نظر آتے تھے۔ عبادت اور ذکر الٰہی آپ کی روح کی غذا تھی۔ آپ اس کثرت سے دعا کرتے تھے کہ ہر آن دعاؤں میں مصروف رہنا آپ کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ اس حقیقت پر کہ دعا بجائے خود قوت اور طاقت کا ایک زبردست خزانہ ہے اور یہ غیر ممکن کو بھی ممکن میں بدل دیتی ہے۔ آپ کو ایسا پختہ ایمان حاصل تھا کہ اس بارہ میں حق الیقین کے مرتبہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ دعائیں کرنے کی تلقین کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے عزیزوں دوستوں اور دیگر احباب جماعت کے نام آپ کا کوئی خط ایسا نہ ہوتا تھا جس میں دعاؤں کی پرزور تلقین نہ ہوتی۔ آپ کے یہی اوصاف تھے جو غیر معمولی رنگ میں جذب فضل الٰہی کا موجب ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل اور نشان کے طور پر آپ کو غیر معمولی قبولیت اور نصرت سے نوازا۔ ای غیر معمولی قبولیت اور نصرت سے جس کا حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے کامل متبعین کے حق میں۔ حضرت بانی سلسلہ سے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں وعدہ فرمایا تھا۔

''ہمیشہ قیامت تک ان میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جن کو قبولیت اور نصرت دی جائے گی۔'' (اشتہار 4 مارچ 1889ء) حسب وعدہ الٰہی آپ کو جناب الٰہی سے جو غیر معمولی قبولیت اور نصرت عطا ہوئی اس پر آپ کی ساری زندگی آپ کی سیرت اور آپ کا کردار شاہد ناطق کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدائی افضال وانعامات آپ پر بارش کی طرح برسے اور آپ اللہ تعالیٰ کی اس دین اور عطا پر ہر بار جذبات شکر سے لبریز ہو کر پہلے سے بھی بڑھ کر اس کے آستانہ پر جھکے اور اللہ تعالیٰ کا قرآنی وعدہ ''اے لوگو! اگر تم شکر گزار بنے تو میں تمہیں اور بھی زیادہ دوں گا'' بار بار آپ کے حق پورا ہوتا چلا گیا۔ اپنی وفات سے پہلے اپنی اولاد کو مندرجہ ذیل وصیت فرمائی۔ خدمت دین کو اک فضل الٰہی جانو۔ اس کے بدلے میں کبھی طالب انعام نہ ہو۔ 2۔ یعنی اگر تم مومن ہو تو اعلیٰ مقام (دین و دنیا میں) پاؤ گے۔ 3۔ یہ احمدی جماعت ہی ہے جس کا فرض اولین نیکی پھیلانا اور بدی سے روکتا ہے۔ اے میری اولاد تم پر فرض ہے کہ خود بھی اس کے عامل ہو اور اپنی اولادوں کو بھی اسی رستہ پر تربیت کرتی جاؤ۔ 4۔ خلافت کے ساتھ وابستگی لازمی ہے میں تمام سعادتوں اور الٰہی تجلیوں کا مظہر ہے۔ جنہوں نے خلافت کو چھوڑا وہ دین و دنیا میں ناکارہ ہو گئے۔ 5۔ تم میں سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے کا ہمیشہ خیال رکھو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ کریم نے اپنی محبت کیلئے چنا تو ساتھ ہی خوشی سے فرمایا۔ یعنی ابراہیم! میں تمہیں دنیا کا امام (لیڈر) بناتا ہوں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شوق ظاہر کیا کہ کیا میری اولاد کو بھی اس امامت کے مقام سے نوازا جائے گا تو فرمان ہوا ''کہ... میرا عہد تیرے نقش قدم پر چلنے والوں پر پورا ہوگا۔ جو ظالم ہوں کے وہ میری نعمت امامت سے سرفراز نہیں کئے جائیں گے۔'' 6۔ آنحضرت ﷺ میں یہ فرماتے ہیں... یعنی سخت جھگڑالو شخص اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔ بس جھگڑے سے پرہیز لازم ہے۔ 7۔ میری اپنی ساری اولاد کیلئے یہ دعا ہے کہ

اہل وقار ہوویں فخر دیار ہوویں
حق پر نثار ہوویں مولیٰ کے یار ہوویں

بابرگ و بار ہوویں اک سے ہزار ہوویں

8۔حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ والدین کی وفات کے بعد اولاد کا فرض ہے کہ ان کیلئے دعا اور استغفار کرتی رہے ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آئے اور ان کے دوستوں کی عزت کرے۔ (ابوداؤد) پس میری اولاد بھی میرے بعد اس حدیث نبوی پر عمل کرے۔ اللہ اس کے ساتھ ہو۔ آپ نے ایک مختصر علالت کے بعد 7 ماہ شہادت 1348 ہش مطابق 7 اپریل 1969ء بروز دوشنبہ 3 بجے علی الصبح کراچی میں وفات پائی۔ آپ کا جنازہ اسی روز کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز لائلپور (فیصل آباد) لایا گیا اور پھر وہاں سے بذریعہ ایمبولینس کار شام سوا سات بجے ربوہ پہنچا۔ اسی رات دس بجے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث (اللہ کی رحمت ان پر ہو) نے احاطہ مسجد مبارک میں نماز جنازہ پڑھائی جس میں ربوہ کے مقامی احباب کے علاوہ جھنگ اور ملتان کے بعض احباب نے بھی شرکت کی۔ نماز جنازہ پڑھانے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے خاصی دور تک جنازہ کو کندھا دیا۔ بعد ازاں جنازہ بہشتی مقبرہ لے جا کر آپ کے جسد خاکی کو قطعہ خاص میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کے جسد خاکی کو خاص اس قطعہ میں دفن کئے جانے کی خصوصی منظوری حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے عطا فرمائی تھی۔

والدہ ماجدہ: آپ کا نام ہاجرہ بیگم تھا۔ ان کی پیدائش 1902ء میں ہوئی۔ ان کے والد حضرت حافظ نبی بخش صاحب حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے اولین رفقاء میں سے تھے۔ ان کا وطن فیض اللہ چک تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور تھا جو قادیان سے چند کوس دور تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی۔ محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بھی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ چونکہ ان کے والد صاحب حافظ قرآن تھے ان کی صحبت میں رہ کر انہیں بھی قرآن مجید کا اکثر حصہ حفظ ہو گیا تھا۔ ان کے شوہر چوہدری محمد حسین صاحب کو جب کبھی کسی آیت کے حوالہ کی ضرورت پڑتی تو وہ سورۃ کا نام اور رکوع بتا دیا کرتیں۔ جھنگ اور ملتان میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے بے شمار بچوں اور بچیوں کو قرآن ناظرہ پڑھانے کی توفیق پائی۔ نہایت ہی صابرو

شاکر منکسر المزاج خاتون تھیں۔ اپنے بچوں سے نہ ہی ناراض ہوتیں اور نہ ہی کبھی ان پر سختی کرتیں بلکہ ہمیشہ پیار ومحبت سے ان کے ساتھ پیش آتیں۔ اپنی ساتوں بہوؤں کے ساتھ ان کا سلوک مثالی تھا اور بہوئیں بھی ان سے ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتیں۔ بہت ہی عبادت گزار اور دعا گو خاتون تھیں۔

انہوں نے 7 اکتوبر 1977ء کو لندن میں اپنے بیٹے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے پاس مختصر سی علالت کے بعد وفات پائی۔ چونکہ وہ 5/1 حصہ کی موصیہ تھیں۔ ان کے جسد خاکی کو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب براستہ فیصل آباد ربوہ لائے جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کے جسد خاکی کو قطعہ خاص میں ان کے خاوند حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کے عین سرہانے کی طرف دفن کئے جانے کی خصوصی منظوری حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے عطا فرمائی۔ آپ اس قطعہ خاص میں دفن ہونے والی واحد خاتون ہیں۔

ڈاکٹرعبدالسلام

عبدالکریم قدسی صاحب

بڑے دناں تو کوئی خط نہیں لکھیا سلام صاحب
عجب رجھیویں نے حال کیتا سلام صاحب
تہاڈی صحت دا حال کیہ اے اوہ کیہ مرض سی
اوہ سائیں سوہنا اوہ شیر افضل اوہ جعفری
خدا نوں اوہ دی ہے پیارا ہویا سلام صاحب
بڑی سچی غزل سی لکھ دا نظم سی لکھ دا
اوہدی نثر دا سواد وکھرا سلام صاحب
جمیل عالی دے ہیسی کالم وچ نوبل انعام
ملے گا تمانوں او مڑ دوبارہ سلام صاحب

ایہہ بخت آور پنجاب ساڈا چناب ساڈا
ہے جنھے جنیاں سپوت ایسا سلام صاحب
پنجاب دھرتی دی بولی دا دی ہے حق تساں تے
کوئی وقت کڈھ کے ایہہ قرض لاہنا سلام صاحب
ودھیرے سجناں نوں خط لکھے ہن میں نظم اندر
اوہنا چوں اک ہے تہانوں لکھیا سلام صاحب

1992ء میں خاکسار نے پینتیس دوستوں عزیزوں اور بزرگوں کو منظوم خطوط لکھے تھے۔ یہ سارے پنجابی زبان میں لکھے گئے خطوط ''قلم کبوتر'' کی صورت میں چھپنے کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خط کے جواب میں اپنی بیماری کی تفصیل لکھی تھی اور اپنی مادری زبان پنجابی میں کچھ لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

خدائے ''السلام'' کا بندہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام

تحریر مکرم ناصر احمد طاہر صاحب

اسم بامسمّی ''عبدالسلام'' بزرگ والدین کی دعائیں اور الٰہی پیش گوئیاں جس کے حق میں پوری ہوئیں، اللہ کا ایک عاجز بندہ جس نے عصر حاضر کی دنیائے سائنس کو نئی جہتیں عطا کیں اور خدائے واحد کی طرف رخ موڑا عالم اسلام کا سر فخر سے بلند کیا، پاکستان کا قابل فخر سپوت ثابت ہوا۔ پاکستان نے اس کی قدر نہ کی مگر وہ سب جہالتوں، تعصّبات، ناقدریوں کے باوجود اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرتا رہا۔ اس کا ایک ایک سانس ''حب الوطن من الایمان'' کا ثبوت دیتا رہا۔ وہ جس کا نام نیوٹن اور آئن سٹائن کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ وہ یوں کے لئے ہمدردیاں غریب فرد

واحد سے شروع ہو کر غریب ملکوں تک اپنا اثر دکھاتی ہیں۔تیسری دنیا کے لئے غریب ملکوں کے لئے انٹرنیشنل سنٹر برائے نظریاتی فزکس' قائم کر کے عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیتے ہیں تو اس غریب شخص کو بھول نہیں جاتے جس کو ابتداء سے وظیفہ دے رہے ہیں۔نظریاتی یا مالی امداد دے رہے ہیں۔لاکھوں ڈالر کے انعامات میں سے کچھ بھی تو اپنے لئے نہ رکھا۔ہر سب کچھ غریبوں کو حصول تعلیم کے لئے دے دیا۔نوبل انعام پاتے ہیں تو ''مسجد الفضل لندن'' میں سجدات شکر بجالاتے ہیں۔

مجھے تو ان کے قول میں ان کے فعل میں محبت الٰہی جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔دنیا ان پر ایوارڈز کی بارش کر رہی ہے۔انعامات کے پھول نچھاور کئے جارہی ہے۔ان پر فخر کر رہی ہے مگر وہ اپنی عاجزی میں مست ہیں۔ان کی توجہ اللہ کو راضی کرنے پر ہے۔فخر و تکبر نام کو نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی یہ پیشگوئی آپ کے حق میں پوری ہوتی نظر آتی ہے اور اس کے بارے میں حضرت مرزا بشیر احمد صاحب نے پہلے ہی آپ کے والد محترم کو خبر دے دی تھی)

''میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے''۔(تجلیات الٰہیہ)

آپکا نام ''عبدالسلام'' اللہ نے رکھا

آپ کے والد محترم صاحب رؤیا و کشف بزرگ تھے۔اللہ نے آپ کی پیدائش کی خبر اور نام ''عبدالسلام'' انہیں عطا فرمایا۔اس واقعہ کو وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:۔

''3 جون 1925ء بادشاہ انگلستان کا یوم پیدائش تھا۔کچہری میں چھٹی تھی۔میں شام کی نماز کی سنتیں...مسجد احمدیہ جھنگ شہر کے مؤذنہ کے پاس پڑھ رہا تھا کہ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ..الخ کی دعا پڑھی۔جس مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لڑکا پکڑا دیا گیا جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لے لیا۔میں نے اس کا نام دریافت کیا تو بتایا گیا کہ اس کا نام عبدالسلام ہے۔میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور دوسرے روز بذریعہ چٹھی اپنی بیوی کو اس کے میکے اس کشف سے آگاہ کیا۔اسی روز محترم میاں ناصر علی صاحب بی۔اے احمدی جو اس وقت

دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب جھنگ میں ملازم تھے کو جھنگ شہر کچہری روڈ پر کپاہیاں کی بستی کے سامنے یہ کشف بتایا۔ وہ بھی حیران رہ گئے۔ آخر 29 جنوری 1926ء بروز جمعۃ المبارک بوقت نماز جمعہ عزیز عبدالسلام کی پیدائش ہوئی۔ حضرت اقدس کی خدمت میں تمام ماجرا لکھا اور نام رکھنے کی درخواست کی۔ حضور نے فرمایا کہ جب خدا تعالیٰ نے ازخود نام رکھ دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں۔ چنانچہ یہی نام رکھا گیا اور عزیز نے بھی اپنے اسی نام کو برقرار رکھا۔ (سوانح محمد حسین: صفحہ 36-35 مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی مطبوعہ 1974ء: شائع کردہ محمد احمد اکیڈمی: رام گلی نمبر 4: لاہور)

بشارات ربانی: پھر فرماتے ہیں:۔ الحمدللہ بشارت ربانی کے ماتحت پیدا ہوا۔ اس کے لئے بہت دعائیں کیں کہ وہ وجیھا فی الدُّنیَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ المقربین ہو۔ الحمدللہ عزیز نے دنیا میں بھی شہرت پائی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اسے دین کا ستون بھی بنائے اور آخرت میں بھی وجیہ اور مقرب الٰہی ہو۔ آمین۔

ایک روز عزیز سخت بیمار ہو گیا۔ جان کا بھی خطرہ محسوس ہوا۔ بہت دعا کی تو خواب میں عزیز کو ایک اچھے خاصے قد والا جوان دکھایا گیا۔ اس پر میں نے خدا تعالیٰ کی حمد کی۔

(سوانح محمد حسین صفی 36-35 مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی مطبوعہ 1974ء شائع کردہ محمد احمد اکیڈمی رام گلی نمبر 4: لاہور)

فرمانے لگے کہ انشاء اللہ اتنا بولے گا کہ دنیا سُنے گی''۔ پہلا احمدی..... سائنسدان عبدالسلام: صفحہ 19: تصنیف محمود مجیب اصغر: طبع اوّل ستمبر 1983ء: پرنٹر محمد محسن: لاہور آرٹ پریس 15 نیو انار

یہ اتنا بولے گا کہ دنیا سنے گی: عام طور پر بچے جس عمر میں بولنا شروع کرتے ہیں عبدالسلام اس عمر کو پہنچ گئے لیکن ابھی بولتے نہ تھے۔ ان کے والدین نے ایک احمدی بزرگ حضرت مولوی غلام رسول صاحب راجیکی سے دعا کروائی۔ چنانچہ ان کے والد صاحب بیان کرتے ہیں:۔

''ایک مرتبہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی چند روز ہمارے گھر جھنگ شہر میں مہمان

رہے۔عزیز عبدالسلام کی عمر اس وقت چھوٹی تھی اور وہ بولتا نہ تھا جس کا اس کی ماں کو سخت احساس تھا۔حضرت مولوی صاحب کے پاس عزیز سلام سلمہ کو لے جا کر شکایت کی کہ یہ بولتا نہیں دعا کریں۔مولوی صاحب نے بڑی محبت کے لہجے میں عزیز سے خطاب کیا اور کہا ''او گونگلو کیوں نہیں بولتا'' اور فرمانے لگے کہ انشاء اللہ اتنا بولے گا کہ دنیا سنے گی۔'' (پہلا احمدی .... سائنسدان عبدالسلام۔صفحہ 19 تصنیف محمود مجیب اصغر طبع اوّل ستمبر 1983ء۔ پرنٹر محمد محسن لاہور آرٹ پریس 15 نیوانارکلی لاہور)

عبدالسلام کیلئے خلعت تیار کیا جا رہا ہے۔میاں ناصر علی صاحب جھنگ صدر تحریر کرتے ہیں:۔

''عبدالسلام ابھی بچہ تھا۔ایک روز غریب خانہ پر بھائی صاحب تشریف لائے۔میں اس وقت اپنے ایک عزیز کے مکان پر بیٹھا تھا اور بھی کئی دوست وہاں تھے۔بھائی صاحب وہیں ہمارے پاس بیٹھ گئے اور اپنی روحانی باتوں سے مجلس کو ذکر الٰہی کی مجلس بنا دیا۔پھر اپنا ایک تازہ رویا سنایا۔فرمایا کہ رویا میں ایک نہایت بلند درخت دکھایا گیا جس کی شاخیں فضا میں نہایت ارفع چلی گئی ہیں۔ عزیز عبدالسلام اس درخت پر چڑھ رہا ہے اور بڑی پھرتی سے چڑھتا چلا جا رہا ہے۔فرمایا کہ یہ دیکھ کر میں ڈرا کہ معصوم بچہ ہے گر نہ جائے اور اسے زور سے آواز دینے لگا کہ سلام اب بس کرو اور نیچے اترو۔بچہ میری طرف دیکھتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے کہ ابا جان فکر نہ کریں۔ یہ کہتے ہوئے پھر اوپر ہی اوپر چڑھتا گیا اور اتنی بلندی پر گیا کہ گویا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔(سوانح محمد حسین صفحہ 259)

سلام یہ سب وظیفے لے گا: آپ کے والد بزرگوار نے بچپن سے ہی آپ کی تعلیم و تربیت میں بہت محنت کی تھی۔بہت دعائیں کی تھیں اور وہ اپنے رب سے ان دعاؤں کی قبولیت کا یقین بھی رکھتے تھے چنانچہ آپ کے والد محترم بیان کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سلام کی پڑھائی کیلئے خود انتظام فرماتا رہا۔قابلیت کی بناء پر انہوں نے امام جماعت احمدیہ سے بھی وظیفے حاصل کئے۔

''دسمبر 1939ء میں سر چوہدری محمد ظفر اللہ خان نے جماعت احمدیہ میں 25 سال خلافت ثانیہ

کے گذرنے پر جوبلی فنڈ کی تجویز کی اور تین لاکھ روپیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو پیش کیا۔حضور نے جلسہ سالانہ 1939ء میں اعلان فرمایا کہ نوجوانوں کی ہمت بڑھانے کیلئے اعلان کرتا ہوں کہ جو طالبعلم جماعت احمدیہ کا اپنے سکول میں اوّل آئے گا اسے اس فنڈ سے تیس روپے ماہوار کا وظیفہ ایف اے کے دوسال میں دیا جائے گا۔پھر جو ایف اے میں اوّل آئے گا اسے 45 روپے ماہوار (وظیفہ) بی۔اے کلاسوں میں دیا جائے گا۔ازاں بعد جو بی۔اے میں اوّل آئے گا اسے ایم۔اے کلاسز میں دوسال 60 روپے ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔ایم۔اے کرنے کے بعد جولڑ کا مغرب کی کسی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے جائے گا اسے نصف خرچ اس فنڈ سے دیا جائے گا۔‘‘اسی شام ملاقات کے دوران سلام کے والد صاحب نے حضور کو بتایا کہ سلام یہ سب وظیفے لے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ 1949ء میں حضور نے آپ کے خطبہ نکاح کے دوران فرمایا:۔

’’ہر باپ اپنے بیٹے کی تعریف کرتا ہے عزیز (سلام) کے والد نے بھی ایسی توقعات کا اظہار کیا تھا۔الحمدللہ عزیز (اسلام) نے ان سب کو پورا کرنے کی توفیق پائی۔‘‘

سلام کی عاجزی: :’’ڈاکٹر سلام کی عزت اور مرتبہ کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی کانفرنس ہو رہی ہو اور اس میں روس، امریکہ اور دیگر ممالک کے چوٹی کے سائنسدان شریک ہوں اور یہ (یعنی ڈاکٹر عبدالسلام۔ناقل) بعد میں کانفرنس ہال میں داخل ہوں تو.....سارے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ کوئی خیال نہیں کہ میں اتنا بڑا انسان ہوں اور دوسروں میں اور مجھ میں کوئی فرق ہے۔‘‘(روزنامہ الفضل 22 دسمبر 1996ء:صفحہ 5) انکے نیک انجام سے میری توجہ نیک آغاز کیطرف ہوگئی

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے خطبہ جمعہ فرمودہ 22 نومبر 1996ء میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے آپ کی فضیلت عقل کی روشنی کے لحاظ سے ساری دنیا میں مسلم ہے بلکہ اخلاقی قدروں اور عظمت کردار کے لحاظ سے یہ سائنسدان ہے جس کی کے بڑے بڑے بادشاہ بھی عزت کرتے تھے لیکن ان باتوں کے باوجود تکبر کا نام ونشان نہیں تھا۔آپ

نے فرمایا کہ ان کے نیک انجام سے میری توجہ نیک آغاز کی طرف گئی۔ ان کی توحید کے ساتھ وابستگی اور وفا خدا کی وحدانیت پر غیر متزلزل ایمان، غیر اللہ کو مسلسل رد کرتے چلے جانا۔ آپ سائنس کی دنیا میں اتنے بلند مرتبہ پر پہنچنے کے باوجود کامل طور پر خدا کی ہستی کے قائل تھے پھر خدائے واحد ویگانہ کی عظمت کو ماننے کے نتیجہ میں جو انکسار پیدا ہوتا ہے وہ پوری طرح آپ کی ذات میں رہا ہے۔ حضور نے محترم ڈاکٹر صاحب کی خلافت سے وابستگی اور وفا اور اطاعت وخلوص کا بھی ذکر فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ وہ اتنے بڑے انسان تھے اس کے باوجود آپ میں کسی قسم کے غرور یا تکبر کا شائبہ نہیں تھا۔ اپنے تمام تر مقام کے باوجود خلافت سے اتنا گہرا اطاعت اور عاجزی کا تعلق رکھتے تھے کہ میں حیران ہو جاتا تھا۔ حضور نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کی رفعتوں کی جو جان ہے یعنی دعاؤں کا پھل وہ جان اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں اور نسلوں میں آگے جاری فرمائے۔ آمین

(بحوالہ ماہنامہ خالد جنوری 97ء صفحہ 3)

ڈاکٹر عبدالسلام اپنے دونوں نوبیل انعام یافتہ سائنسدانوں کے ساتھ

سائنس کی خوش نصیبی تھی کہ عبدالسلام نے یہ مضمون پڑھنے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن میں

مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب۔لاہور

کیمبرج یونیورسٹی میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالسلام نے نظری طبیعیات میں ریسرچ کا کام بھی جاری رکھا۔انہوں نے متعدد سائنٹیفک مقالے لکھے جن کی وجہ سے انہیں سائنس کی دنیا میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔کیمبرج یونیورسٹی میں سائنس کے میدان میں شاندار کارکردگی دکھانے کی وجہ سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔وہاں پڑھاتے ہوئے انہیں تین سال بھی نہیں گزرے تھے کہ امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن نے انہیں اپنے ہاں پروفیسر کے عہدہ کے لئے پیش کش کی جوان کے لئے اور پاکستان کے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔امپیریل کالج لندن میں ان کی تقرری کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

امپیریل کالج لندن کے شعبہ فزکس کے چیئر مین پروفیسر بلیکٹ Blacket جنہیں 1948ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا ایک مرتبہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی تشریف لے گئے۔وہاں ان کی ملاقات پروفیسر بیتھی Bethe جو امریکن جرمن نژاد تھے سے ہوئی۔پروفیسر بیتھی کو 1967ء میں فزکس کا نوبل انعام دیا گیا تھا۔1930ء کی دہائی میں پروفیسر بلیکٹ اور پروفیسر بیتھی کیمبرج یونیورسٹی میں بطور ریسرچ سکالر کام کرتے رہے تھے۔اس لئے وہ دونوں گہرے دوست تھے۔پروفیسر بلیکٹ کو امپیریل کالج لندن کیلئے نظری طبیعیات (Theoratical Physics) پڑھانے کیلئے ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔انہوں نے اپنے دوست پروفیسر بیتھی سے پوچھا کہ اگر انکی نظر میں کوئی موزوں شخص ہو تو وہ انہیں بتائیں۔اس پر پروفیسر بیٹی نے انہیں مشورہ دیا کہ اس منصب کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام نہایت موزوں رہیں گے۔اتنا سنتے ہی پروفیسر بلیکٹ ڈاکٹر سلام کے

کمرے کی طرف گئے۔ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی اندر داخل ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ڈاکٹر سلام کو بیٹھے پایا۔ ڈاکٹر سلام اور پروفیسر بلیکٹ کے درمیان جو بات ہوئی وہ کچھ یوں تھی۔

Professor Blacket: Do you want a Chair Salam astonished said: Yes Sir Blackat: "Thankyou

اس کے بعد ضابطہ کی کاروائی پوری کرنے کی غرض سے پروفیسر ٹمپل نے ڈاکٹر سلام کا انٹرویو لیا۔ پروفیسر ٹمپل علم فلکیات کے ماہر Eddington کے بے حد مداح تھے انہوں نے ڈاکٹر سلام سے پہلا اور آخری سوال پوچھا کہ ''علم فلکیات پر Eddington کی کتاب کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔'' بدقسمتی سے ڈاکٹر سلام کی اس کتاب کے بارے میں رائے اچھی نہیں تھی لیکن یہ جانتے ہوئے کہ پروفیسر ٹمپل Eddinton کے مداحوں میں سے ہیں انہیں یہ جواب دیا۔

I have not read the book with the detachment of a neutral mind.

یعنی میں نے آزادی فکر سے علیحدہ ہو کر اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر سلام کا یہ جواب سن کر پروفیسر ٹمپل مسکرائے اور کہا۔ Young man you should go to diplomatic service

یکم جنوری 1957ء سے ڈاکٹر سلام کو امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی لندن میں Professor of Theoratical Physics تعینات کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی امپیریل کالج لندن میں پروفیسر کے عہدہ پر تقرری کے بارے میں انگلینڈ کے اخبارات میں جب خبر شائع ہوئی تو وہاں پاکستانی طلباء نے بے حد خوشی منائی۔ کیونکہ بھارت کے ایک سابقہ صدر ڈاکٹر رادھا کرشن کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام صاحب دوسرے ایشیائی تھے جنہیں انگلینڈ کی کسی یونیورسٹی نے پروفیسر مقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر رادھا کرشن آکسفورڈ یونیورسٹی میں فلاسفی کے پروفیسر تھے جب کہ ڈاکٹر سلام سائنس کے شعبہ سے منسلک تھے یہ ایک انتہائی عزت کا مقام تھا جو پاکستانی طلباء کیلئے زیادہ خوشی کا باعث بنا۔

حسن اتفاق سے ان دنوں پاکستان کے ایک منجھے ہوئے سیاست دان میاں افتخار الدین صاحب جنہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا تھا لندن میں قیام پذیر تھے۔ میاں صاحب

نے ڈاکٹر عبدالسلام کی بطور پروفیسر تقرری کی خبر سنی تو انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خبر کی تصدیق کیلئے انہوں نے ڈاکٹر سلام کو تلاش کیا اور ڈاکٹر سلام سے بار بار پوچھتے تھے کہ سلام کیا یہ خبر صحیح ہے'' اس کے بعد انہوں نے اپنے اخبار پاکستان ٹائمز لاہور میں ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں ایک پورے صفحہ کا فیچر لکھا جس سے ڈاکٹر عبدالسلام اپنے وطن عزیز میں بھرپور طریق سے متعارف ہوئے۔ اس فیچر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر سلام نے کہا

He was radiscovered by Pakistan

امپیریل کالج لندن میں ایک روایت چلی آتی ہے کہ ہر نئے پروفیسر کو عہدہ پر فائز ہونے کے بعد باضابطہ طور پر افتتاحی تقریر (Inaugral Lecture) کرنا ہوتی ہے۔ اس تقریب میں کالج کے تمام استاد، اس شعبہ کے طلباء اور دیگر معززین جنہیں وہ پروفیسر مدعو کرنا چاہیں شرکت کرتے ہیں۔ میں ان دنوں لندن میں تھا چنانچہ اپنے بھائی جان کی دعوت پر مجھے بھی اس تقریب میں شامل ہونے کا اعزاز ملا۔

یہاں ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ اپنی افتتاحی تقریر کے موقع کی مناسبت سے ڈاکٹر سلام نے نیا سوٹ سلوانے کا ارادہ کیا وہ لندن کے مشہور علاقہ پکاڈلی (Picadilly) کے قریب ایک جگہ (savillrow) (بازار کا نام) کے مشہور درزی (Hawks) سے نیا سوٹ بنوانا چاہتے تھے۔ اس بازار کے درزی اس لئے مشہور ہیں کہ وہ سوٹ کی سلائی مشین کی بجائے ہاتھ سے کرتے ہیں (Hand stitched) اس لئے ان کے دام بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں اور وہ ہر کس و ناکس کا کام بھی نہیں کرتے وہ صرف اس شخص کو سوٹ تیار کر کے دیتے ہیں جس کے پاس ان کے کسی گاہک کا Letter of Recommendation ہو۔ میں بھائی جان کے ہمراہ وہاں گیا تو انہوں نے پہلی بات یہی دریافت کی کہ Have you gat a letter of recommendation

جب بھائی جان نے بتایا کہ ان کی تو کسی لارڈ یا کسی اور بڑی شخصیت سے واقفیت نہیں لہذا ان

کے پاس کسی کی Recommendation نہیں ہے۔اس پر ان لوگوں نے سوٹ تیار کرنے سے معذرت کر لی۔ان کے اس جواب سے مایوس ہوکر جب ہم دونوں دوکان سے باہر آ رہے تھے تو ان کے ایک معمر سیلز مین نے ہمیں آواز دیکر اپنے پاس بلایا اور اس نے بھائی جان سے پوچھا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں جس پر انہوں نے بڑی انکساری سے کہا میں امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں پروفیسر ہوں۔اتنا سننا تھا کہ اس سیلز مین نے کہا کہ سر آپ اندر تشریف لائیں ہم آپ کے لئے سوٹ تیار کر دیں گے۔ یہ تو ہمارے لئے ایک بہت بڑی عزت کا مقام ہو گا کہ ہم ایک پروفیسر کو سوٹ بنا کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ناپ لیکر پندرہ دنوں کے اندر سوٹ تیار کر دیا۔جب کہ عام حالات میں ایک سوٹ تیار کرنے کیلئے کئی ماہ لیتے تھے۔اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگلینڈ میں ایک پروفیسر کو کتنی عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے۔

افتتاحی تقریر امپیریل کالج کے ایک ہال میں منعقد ہوئی جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اس تقریب کی صدارت پروفیسر بلیکٹ نے کی تھی۔انہوں نے ڈاکٹر سلام کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ 1946ء میں جب سلام کیمبرج میں داخلہ لینے کے لئے پہنچا تو اس کے سامنے اس بات کا فیصلہ کرنے کا مشکل ترین کام یہ تھا کہ وہ آیا ریاضی پڑھے یا انگلش لٹریچر کیوں کہ اس نے بی اے میں انگلش لٹریچر میں آنرز کیا ہوا تھا اس کے اور پروفیسر بلیکٹ نے کہا

Lucky for us and lucky for science that salam had dacided to study science"

یہ ایک نوبل انعام یافتہ کا مستقبل میں نوبل انعام حاصل کرنے والے کے لئے زبردست خراج تحسین تھا۔اس تعارف کے بعد ڈاکٹر صاحب ے تقریر کی جو ایک گھنٹہ جاری رہی جس کے اختتام پر ہال میں موجود تمام حاضرین نے کھڑے ہوکر پورے پانچ منٹ تالیاں بجا کر انہیں داد دی۔

اب بھی پھرتی ہے نگاہوں میں وہ صورت تیری ہمارے بھائی جان کی

بھائی چوہدری عبدالرشید صاحب

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہمارے سب سے بڑے بھائی تھے۔ان کو ہم سب بھائی جان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔21 نومبر 1996ء کو آپ اس دنیائے فانی کو ہمیشہ ہمیش کے لئے چھوڑ کر اپنے حقیقی آقا د مولا سے جا ملے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کے وقت آپ کی عمر 70 سال اور دس ماہ تھی۔آپ انگلستان/ اٹلی میں رہ رہے تھے۔گاہے بگاہے پاکستان اور دنیا کے باقی ممالک کا دورہ بھی کرتے رہتے تھے۔ان کی بھرپور زندگی اتنی مصروف رہتی تھی کہ سمجھ نہیں آ رہی کہ کہاں سے ان کے ذکر خیر کو شروع کیا جائے۔آپ نے آسٹریلیا کے علاوہ سارے براعظموں کا کئی بار دورہ کیا تھا۔سفر کرنے سے ہرگز نہیں گھبراتے تھے۔ہوائی جہاز میں چند گھنٹے نیند پوری کر کے تازہ دم ہو جاتے تھے۔میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے 35 / 36 سال سے کچھ زائد عرصہ انگلستان میں ان کے ساتھ گزارنے کا موقعہ ملا۔آپ پہلے مسلمان سائنسدان تھے کہ جن کو فزکس میں ان کے اپنے ریسرچ کے کام پر 1979ء میں نوبل پرائز دیا گیا۔آپ دنیا کے چند چوٹی کے سائنسدانوں میں سے ایک تھے کہ ساری دنیا آپ کا لوہا مانتی ہے اور انشاءاللہ مانتی رہے گی۔آپ غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے۔یہ اللہ کا خاص فضل وکرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا زرخیز دماغ عطا فرمایا تھا۔ آپ اگر ایک بار کسی چیز کی طرف توجہ کرتے تو وہ چیز ان کو بھولتی نہ تھی۔کام کرنے کی بڑی لگن تھی۔ اپنے ہر امتحان میں اوّل رہنے کی تمنا تھی اور اوّل ہی رہتے تھے۔پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے تھے۔تقریباً پندرہ سولہ گھنٹے روزانہ مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔محنت اور مشقت بہت کرتے تھے۔

الحمدللہ مجھے مکرمی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ 36، 35 سال کا عرصہ گزارنے کا موقع انگلستان

میں ملا۔ان کے ساتھ کئی بار بیٹھا۔مختلف موضوعوں پر بات چیت ہوئی۔ان کے ساتھ سفر بھی کیا۔ ان کو کار میں کالج، ایئرپورٹ مسجد وغیرہ بھی لے جاتا رہا۔ان کو ایک دوست، ایک باپ، ایک استاد کی مانند پایا۔آپ کا کلام بڑا وسیع تھا۔بات کر کے بھولتے نہیں تھے۔اللہ تعالیٰ نے روشن دماغ دیا تھا جو کہ سب کچھ جلدی جذب کر لیتا تھا۔لوگ اکثر ہم بھائیوں سے پوچھتے تھے کہ میاں تم اتنے ہوشیار کیوں نہیں ہو تو ہمارا جواب ہوتا تھا پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔آپ کا وجود اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت عظمیٰ تھا۔خداداد ذہانت پائی تھی۔

آپکو سادہ کھانا کھانے کا بڑا شوق تھا۔اکثر ایک سالن ہی پسند کرتے تھے۔آلو گوشت، سیخ کباب، شامی کباب، پشاوری کباب، مچھلی کے کباب، قیمہ مٹر، دالیں، دال چنا گوشت میں، بھنڈی گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے۔آم کا اچار، آم کی چٹنی بھی پسند کرتے تھے۔دیسی مٹھائیوں میں برفی بڑی پسند تھی۔پتیسہ بھی بڑا پسند تھا۔

مسجد میں انصار اللہ اور خدام الاحمدیہ کے اجلاس میں انہوں نے کئی بار تعلیم کی اہمیت پر لیکچرز دیتے تھے۔آخر عمر میں بائیو کیمسٹری پڑھنے کا شوق تھا۔ان کا خیال تھا کہ بائیو کیمسٹری میں ایک بار پھر نوبل پرائز مل سکتا ہے۔اس بارے میں انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ لیا تھا۔حضور کو ان کی بات پسند آئی تھی۔ایک بار حضور سے ملاقات پر میں ساتھ تھا تو ملاقات 45 منٹ جاری رہی۔سارے پروگرام لیٹ ہو گئے۔بڑے مزے سے پاکستان، تعلیم، نوبل پرائز پر باتیں ہوتی رہیں۔

جب انگلستان میں ہوتے تو شام کو گھر تشریف لا کر بچوں کے ساتھ جس کا آپ کو بہت دکھ تھا۔ گھل مل جاتے۔ان کے ساتھ کھانا کھاتے۔بچوں سے سارے دن کی کارروائی کے بارے میں پوچھتے۔ذہین اور غریب بچوں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کی کوشش ہوتی کہ سارے جہاں کے غریب ممالک میں اور خاص طور پر پاکستان میں خواندگی کی شرح بڑھے۔پاکستان میں غریب طلباء کو خطوط لکھتے۔ان کو وظائف دیتے اور ان کے بارے میں دوسرے پروفیسروں کو خط لکھتے

تھے۔ ان کی دلی خواہش اور کوشش تھی کہ کسی طرح پاکستان میں سائنس کی تعلیم میں فروغ ہو لیکن افسوس کہ پاکستان نے ان کی اس بارہ میں کوئی خاص مدد نہ کی اور آپ 1992ء کے جلسہ سالانہ انگلستان میں میرے ساتھ جلسہ گاہ ٹلفورڈ اسلام آباد میں حضور کی تقریر سن رہے تھے۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نام سنے پر آنسو نکل رہے تھے۔ اس موقعہ پر میں نے کہا ''بھائی جان ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے احمدیت کو قبول کر لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم احمدی... ہیں''۔ اس بات کو سنتے ہی فرمانے لگے ''ہاں میاں تم نے ٹھیک کہا ہے۔ اگر والدین نے احمدیت قبول نہ کی ہوتی تو ہمارا آج کیا حال ہوتا۔ پھر فرمایا کہ ''میں تو والدین کو اپنی ہر نماز میں یاد رکھتا ہوں اور ان کے اس احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ احمدیت نے ہی ہماری زندگی تبدیل کر دی ہے ورنہ ہم باقی لوگوں کی طرح جگہ جگہ بھٹک رہے ہوتے، نہ ہمارا کوئی امام ہوتا نہ لیڈر نہ کوئی دعا کرنے والا ہوتا۔ دیکھو حضور کی تقریر میں کتنی معرفت کی باتیں ہیں۔ پھر فرمانے لگے کہ کیا تم قرآن مجید کو ترجمہ کے ساتھ پڑھتے ہو'' میں نے ہاں میں جواب دیا تو آپ بڑے خوش ہوئے۔

اپریل 1969ء میں ہمارے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی وفات پر ہم سب بھائی حضور پرنور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کو ملنے گئے حضور نے دلی طور پر افسوس کا اظہار کیا۔ مکرمی بھائی جان نے فرمایا کہ ''حضور ہمارے والد صاحب بڑے دعا گو انسان تھے ان کے چلے جانے پر اب دعا کا منبع ختم ہو گیا ہے'' حضور نے از راہ شفقت مکرمی بھائی جان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ آپ کا خلیفۂ وقت آپ کے والد ماجد کی جگہ آپ کے لئے دعا کرے گا اور انشاء اللہ آپ کے والد ماجد کی دعائیں پوری ہوں گی۔ میں بھی دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نوبل پرائز سے نوازے۔ چنانچہ پورے دس سال بعد 1979ء میں اللہ تعالیٰ نے اس انعام سے بھی نوازا۔ انعام کی خبر سنتے ہی آپ مسجد فضل میں شکرانے کے نفل پڑھنے چلے گئے۔ سبحان اللہ

حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب اور صاحبزادہ مرزا مظفر احمد صاحب کے ساتھ بھی ان

کی کافی بے تکلفی تھی ان سے اکثر مشورہ نیا کرتے تھے۔ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے بڑے لڑکے عزیزم احمد سلام کو کہا کہ تم سائنس کے مضمون پڑھا کرو لیکن اس نے سائنس میں کوئی خاص دلچسپی نہ دکھائی اور اکنامکس کے مضمون کو پڑھنے میں شوق کا اظہار کیا۔ دوسرے دن حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب جو کہ اکثر ناشتہ مکرمی بھائی جان کے ساتھ ان کے مکان پر کرتے تھے سے شکایت کی یہ دیکھیں چوہدری صاحب میں عزیزم احمد سلام کو کہتا ہوں کہ فزکس اور حساب کے مضامین پڑھا نے اور یہ اکنامکس میں دلچسپی رکھتا ہے۔حضرت چوہدری صاحب نے مکرمی ڈاکٹر صاحب کے تشویش کے اظہار کو سمجھ لیا اور فرمانے لگے ''ڈاکٹر صاحب اگر دنیا کے سارے طالب علم سائنس دان بن جائیں تو دنیا تو ختم ہو جائے گی آپ عزیزم احمد سلام کو اکنامکس پڑھنے دیں۔انشاءاللہ اسی میں چمکے گا آپ اسکے لئے بھی دعائیں کرتے رہیں والدین کی دعائیں تیر کی طرح سیدھی نشانہ پر لگتی ہیں'' الحمدللہ عزیزم احمد سلام نے ایم اے اکنامکس میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی۔

1957ء میں آپ جھنگ شہر والدین کے پاس تشریف لائے تو ایک رئیس زمیندار نے حضرت والد صاحب سے ذکر کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے ملانا چاہتا ہے بعد دوپہر ایک دن وہ اپنے لڑکے کو لے کر ہمارے جھنگ والے مکان میں حاضر ہوا تو آتے ہی اس نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ ولایت میں پڑھے ہوئے ہیں میرے لڑکے کی آنکھیں خراب رہتی ہیں اس کے لئے کوئی دوائی تجویز کریں'' مکرم بھائی جان کچھ پریشان ہو گئے۔انہوں نے کہا۔''ابا جی آپ ان کو جواب دیں''۔والد صاحب نے زمیندار صاحب سے کہا

ڈاکٹر عبدالسلام میڈیکل ڈاکٹر نہیں یہ تو فزکس کے پی ایچ ڈی ہیں یہ آنکھوں کا علاج نہیں کر سکتے۔'' زمیندار نے کہا۔''تُہاڈے وِلایت پڑھن دا سانوں کی فیدا ہویا''

والد صاحب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی ایک سرمہ کی شیشی اندر سے لے آئے اور فرمایا۔

اس کو استعمال کریں اللہ شفا دے گا'' چنانچہ ایک ماہ کے اندر شفا ہو گئی۔الحمدللہ

مکرم بھائی جان کو ”رب زدنی علما“ اور ”رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ“ کی دعائیں پڑھنی پسند تھیں۔ والدین کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کی بڑی خدمت کرتے تھے۔ ان کی دعاؤں کا ثمر ساری عمر کھایا۔ مکرمی بھائی جان کو چار مرتبہ خواب میں دیکھ چکا ہوں آپ بڑے خوش تھے۔ الحمدللہ۔ خلافت سلسلہ کے ساتھ آپ کی وابستگی فدائیت اور اطاعت مثالی رنگ رکھتی تھی جو حضور فرماتے اس پر عمل کرتے اور اپنا سوال بھی حضور سے پھر نہ پوچھتے۔ حضور کو بھی ان کا بڑا خیال رہتا تھا۔ حضور ان کو ہومیوپیتھی دوائی دیا کرتے تھے۔ وہ ایک ہیرا تھا۔ ایک مرد مجاہد تھا۔ باقی طلباء کیلئے روشنی کا منور چراغ تھا۔

مکرم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا نام اس لئے روشن رہے گا کہ وہ واحد مسلمان سائنس دان تھا جس نے فزکس میں نوبل انعام حاصل کیا اور ثابت کر دیا کہ قابلیت صرف مغربی ممالک کی میراث نہیں۔ ان کا نام اس لئے زندہ رہے گا کہ وہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس شخص نے انعام ملنے پر شاندار مکان نہیں خریدا۔ اپنی ذات پر رقم خرچ نہیں کی بلکہ اس نے تیسری دنیا کے غریب طلباء کیلئے صدقہ جاریہ کے طور پر ٹرسٹ قائم کیا اور ان بچوں کو سکالرشپ عنایت کیں۔ خدا تعالیٰ کی واحدانیت پر اس کو ایمان تھا اور اس کو سائنس سے ثابت کیا اور اللہ کے حی قیوم واحد ہونے پر اس کا ہمیشہ یقین تھا وہ نماز روزہ زکوٰۃ اور دینی شعار کا پابند رہا۔ 1947ء میں مسجد فضل لندن میں اعتکاف بھی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بے شمار اعزازی ڈگریاں تھیں لیکن کبھی اس شخص نے اپنے نام کے ساتھ ان کو استعمال نہیں کیا تھا اور نہ ہی ڈگریاں لے کر وہ مغرور ہوا۔ وہ منکسر المزاج تھا اور ایسا ہی رہا۔ ہمیشہ دھیما بولتا تھا۔ وطن سے محبت کا عالم یہ تھا کہ اس شخص نے اپنی پاکستانی شہریت کو کبھی نہیں چھوڑا حالانکہ اس کو برطانیہ، ہندوستان اور دیگر کئی ممالک اپنا شہری بنانا فخر سمجھتے۔

اللہ تعالیٰ اس فرزند پاکستان اور فرزند احمدیت کو اپنی رحمت کی چادروں میں لپیٹ لے اور جنت

الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔مکرمی ڈاکٹرعبدالسلام صاحب فرمایا کرتے تھے کہ

’’مجھے دو کتابوں سے عشق ہے ہر مسلمان کی طرح قرآن مجید سے خصوصیت سے اس کے سننے اور اس پر عمل کرنے سے اور دوسرے شمائل ترمذی سے حضرت امام ترمذیؒ نے اس کتاب میں ان احادیث کو جمع کیا ہے جن میں آنحضرت ﷺ میں کی ذاتی زندگی، طرز کلام، رہائش، حضور کی ذاتی شفقتیں حضور کا فقر اور حضور کی پاکیزہ ذات کا حال جمع ہے۔‘‘

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ ’’میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کو ہسپتال ملنے گیا۔ جب کہ آپ کچھ بیمار تھے اور میں شمائل ترمذی ساتھ لے گیا اور ان کو دکھا کر عرض کی کہ اللہ مجھے توفیق دے تو میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔ پھر آپ اٹلی Trieste اپنے کام پر چلے گئے اور کتاب چوہدری صاحب کو پڑھنے کیلئے دی۔ حضرت چوہدری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے چھپوالیا اور ڈاکٹر صاحب کو تحفہ دیا ڈاکٹر صاحب نے کہا حضرت چوہدری صاحب اس کا ترجمہ تو میں نے خود کرنا تھا تو چوہدری صاحب فرمانے لگے۔ ’’میں نے سوچا کہ شاید تمہیں وقت نہ ملے میرے پاس ہسپتال میں وقت تھا تو میں نے ہی ترجمہ کر دیا۔‘‘

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے سب طلباء کو قرآن مجید اور شمائل ترمذی بار بار پڑھنی چاہئیں۔ دسمبر 1979ء میں نوبل انعام حاصل کرتے وقت ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بادشاہ کے محل میں ایک مختصر مگر جامع تقریر کی جس میں پاکستان کا نام سر بلند کیا اور قرآن مجید کی سورۃ الملک میں سے 5/4 کی تلاوت ترجمہ کے ساتھ فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں قرآنی آیات فریموں میں آویزاں تھیں ۔لیکچرز میں قرآن پاک کو Quote کیا کرتے تھے۔ اٹلی کے سنٹر میں نماز جمعہ کی امامت خود کرتے تھے۔

میرے پیارے بھیا!

(مکرمہ حمیدہ بشیر صاحبہ کراچی ہمشیرہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب)

کسی نے کتنی پکی بات شعر کے رنگ میں ڈھالی ہے۔

موت اس کی ہے زمانہ کرے جس پہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں جانے کیلئے

اس عظیم انسان کیلئے جس نے دنیا میں یاد آنے کیلئے اپنا نام اور یوں اپنے کئے تمام کام بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ میں تو کبھی بھی ان کے مرتبے کے مطابق نہ لکھ پاؤں گی۔ یہ ایک وسیع مضمون ہے لیکن اظہار نہیں ہوسکتا۔ ان کا بچپن اپنے والدین کے زیر سایہ ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ گزارا۔ الحمد للہ بہت ہی اچھا گزرا۔ جس کی یاد اکثر دل میں چٹکیاں لیتی ہے اور یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دور پھر لوٹ آئے۔ اس وقت تو ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ میرے بھائی جان اتنے عظیم المرتبت انسان بن کر دنیا کے سامنے مثالی انسان بن کر اپنا نام روشن کریں گے۔ اور ہمارے ابا جی مرحوم کا کشف اس طرح پورا ہوگا۔ عبادت کے دوران اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندہ کو کشف میں دکھایا تھا کہ ایک فرشتہ ان کو بچہ پکڑا رہا ہے۔ جس کا نام بھی عبدالسلام بتایا گیا۔

بہترین والدین:: اولاد کی تربیت میں والدین کا اپنا نمونہ ایک حرف آخر ہوتا ہے۔ ہمارے والدین (اللہ تعالیٰ انہیں اپنے قرب میں اعلیٰ مقام دے۔) بہترین والدین اور بہترین استاد تھے۔ وہ ہم سب کیلئے ایک مقدس اور نیک نمونہ تھے۔ انہوں نے ہی ہمیں اللہ تعالیٰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ کے روحانی فرزند حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفائے کرام سے متعارف کرایا۔ انہوں نے ہمیں قرآن کریم پڑھایا اور ہر قدم پر ہمیں اچھی باتوں کی تلقین کی۔ ابا جی اکثر کہا کرتے تھے اگر والدین اپنی پہلی اولاد کی پرورش ٹھیک طور پر کریں تو وہ چھوٹے بچوں کیلئے نمونہ ہوتی ہے۔

مشعل راہ بھائی:: بھائی جان سلام ہمارے لئے مشعل راہ تھے۔ سب پیار و محبت سے

رہتے۔اپنے اپنے کام سے مقصد وقت پر سونا وقت پر جاگنا۔وقت پر نماز کی ادائیگی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ملتی۔یہ خاص وصف ابا جی نے ہی ذہن میں ڈالا تھا۔وہ کہا کرتے تھے کہ اگر اپنی جگہ پر رکھی ہوئی چیز اندھیرے میں بھی تلاش کرو تو مل جائے گی۔اس پر عمل بھائی جان کا مجھے یوں یاد ہے۔لاہور ہوسٹل میں تھے وہاں سے لکھا کرتے تھے کہ میری الماری میں فلاں جگہ پر میری کتاب موجود ہوگی وہ مجھے بھجوادیں۔اس طرح کوئی بھی دقّت نہیں ہوتی تھی۔

پھلوں کا تحفہ اور بہن بھائیوں کی محبت

ابا جی دفتر سے واپسی پر ہر موسم کا پھل ضرور خرید کر لایا کرتے تھے اور وہ ہم سب میں برابر کا بانٹ دیتے تھے۔ہم سب خاموشی سے ایک دوسرے سے اتفاق کر کے اپنے حصہ سے کچھ نکال کر بھائی جان کی پلیٹ میں رکھ آتے۔وہ بولتے تو نہیں تھے۔لیکن ہمارے اس ایثار کو دیکھ کر مسکراتے اور کبھی کہہ بھی دیتے کہ تم اپنا اپنا حصہ کھاؤ۔لیکن ہماری خوشی کی انتہائی تھی کہ انہیں زیادہ حصہ ملے دل میں شاید یہ بات ہوتی تھی کہ یہ پڑھتے زیادہ ہیں۔بہن ہونے کے ناطہ میری محبت اس رنگ میں ہوتی۔میں فارغ وقت میں خربوزہ کے بیج کی گریاں نکال کر ان کی مٹھی میں دے آتی۔وہ ایک بار ہی منہ میں ڈال لیتے اور میں خوش ہوجاتی۔

تازہ مچھلی:: میں اب سوچتی ہوں ان کیلئے یا شاید سب ہی ایسا کرتے ہوں گے۔دل میں ایک تمنا اور خواہش ہوتی تھی کہ ہم اپنے اپنے رنگ میں ان سے اظہار محبت کریں۔ملتان میں ہمارے گھر کے قریب ایک چھوٹی نہر بہا کرتی تھی اور اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیرتی ہوئی نظر آتیں۔میرے چھوٹے بھائی ایک چادر لے جاتے اور پانی چھان کر مچھلیاں ایک برتن میں جمع کرتے جاتے۔جب کافی ساری ہوجاتیں تو غالباً وزن میں آدھ سیر سے بھی کم ہوتی ہوں گی گھر لے آتے۔انہیں صاف کر کے فرائی کر کے ہم اپنے بھائی جان کو تازہ مچھلی پیش کرتے۔حالانکہ مچھلی تو بازار سے بھی آسکتی تھی۔لیکن بھائیوں کی اپنی ہی محبت تھی۔جو خاموش رنگ میں ہوتی تھی۔

پہلا انعام

جب وہ چھوٹے بچے تھے تو ان کو اچھی صحت والے پیارے بچے کے طور پر چاندی کا خوبصورت چھوٹا سا گلاس ملا تھا۔ اس کے بعد ہر کامیابی پر اللہ تعالیٰ نے گویا کہ ان کیلئے انعامات لکھ ہی رکھے تھے۔ جس کے لئے والدین اور ہم سب اپنے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔

پڑھنے لکھنے کا طریقہ اور معلومات

بھائی جان کی زندگی کا محور تعلیم سے شغف ہوتا تھا۔ اس لئے بے کار باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اور تعلیم کی طرف ہی بھر پور توجہ ہوتی تھی۔ ہمارے ابا جی کا معمول تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اکثر بھائی جان کے سکول ضرور جاتے۔ بھائی جان اور باقی بچوں کی تعلیمی رپورٹ دریافت کرتے کہ کسی کی تعلیم میں کوئی کمی تو نہیں آ رہی۔ لیکن وہاں تو ان کے اساتذہ کرام کی طرف سے رپورٹ یہ ہوتی کہ جو سبق ہم نے پڑھانا ہوتا ہے وہ تو سلام کو ازبر ہوتا ہے۔ بلکہ بلیک بورڈ پر کلاس کو سوال بھی وہی سمجھاتے ہیں۔

گھر میں ان کا ٹائم ٹیبل کچھ یوں ہوتا تھا۔ صبح اٹھے، نماز، قرآن کریم کی تلاوت کے بعد ناشتہ کرنا۔ گھر کے دھلے استری سے بے نیاز کپڑے پہنے بستہ بغل میں دبانا اور سب کو خدا حافظ السلام علیکم کہہ کر جب تک سائیکل نہیں خریدا تھا، پیدل سکول چلے جاتے۔ رستہ میں کوئی ہم کلاس مل گیا تو پہاڑے یاد کرتے ہوئے سکول جا پہنچتے۔ سادگی عاجزی اور اطاعت کا دخل ان کی زندگی میں بہت تھا۔ لکھنے اور پڑھنے میں ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ ایک طرف میز پر کتابیں ایک طرف کاپیاں پنسل، سلیٹ سلیٹی ہمارے بچپن میں سکول میں ہولڈر اور نب، قلم دوات اور تختی ہوا کرتی تھیں۔ جس سے سب بچے لکھا کرتے تھے۔ قلم سے ہی تختی پر خوشخطی کی مشق کرائی جاتی تھی۔

رات کو جلدی سونا اور صبح جلدی جاگنا

ذہن میں یہ عادت ڈال دی گئی تھی کہ رات کو جلدی سو جانا ہے اور صبح اذان کے ساتھ ہی اٹھنا ہے۔ لیکن بھائی جان تو سب سے پہلے جاگ کر اپنے کمرہ میں پڑھ رہے ہوتے تھے۔ یہ ان کا معمول ہی دیکھا۔ چھٹی کے دن بھی نہیں سویا کرتے تھے۔

چھوٹوں کی مدد

چھوٹے بہن بھائیوں نے اپنا کوئی کام سکول کا کرنا ہوتا جو نہیں آتا تھا ان کے پاس لے جاتے تو وہ کہا کرتے خود کر کے لاؤ۔ جو غلط ہوگا میں کرادوں گا۔ اس طرح سے اپنے دماغ سے کام کرنے کی عادت ہو جاتی تھی۔

بچپن کے پسندیدہ کھیل

مٹی کے چھوٹے چھوٹے سپاہی بنانے اور ان کے ہاتھ میں تنکا پکڑا دینا۔ مٹی گوندھنا اور ایک انگلی کے برابر سپاہی بنانا یہ میرے ذمہ ہوتا تھا۔ ایک طرف ان کی فوج اور دوسری طرح میری فوج وہ اپنے سپاہی میری طرف کے سپاہی سے لڑا کر خود جیت جاتے۔ اور خوش ہوتے کہ وہ جیت گئے ہیں۔ لیکن اس کھیل میں زیادہ وقت نہیں صرف ہوتا تھا۔ اس طرح دماغ کو آرام دینا مقصد ہوتا ہوگا۔

ایک بار تریموں ہیڈ کا مٹی کا بہت خوبصورت ڈیزائن بنایا۔ چند دن پہلے تریموں کا پل دیکھ آئے تھے۔ اباجی انہیں اکثر سیر کیلئے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ رستہ میں پل گاڑی اور مختلف چیزیں دکھاتے جاتے تھے تاکہ ان کے علم میں اضافہ ہو۔ یہ پیاری پیاری اور چھوٹی چھوٹی کھیلیں تھیں۔ جو کبھی کبھار ہم سب مل کر کھیل لیتے تھے اس میں خوشی اور محبت کا رنگ تھا۔ اس طرح ہمارا بچپن ختم ہوا۔

شخصیت کا کھلنا

میٹرک کا رزلٹ آیا۔ وہ اس وقت گھر سے باہر تھے۔ جیسے ہی لوگوں نے انہیں دیکھا تو انہیں کندھوں پر اٹھالیا۔ یہ چھوٹے سے شہر میں مسلمان بچہ اتنے زیادہ نمبر حاصل کر کے پرانا ریکارڈ توڑ گیا ہے۔ (ہندو لالے) باوجود متعصب ہونے کے بھائی جان کو بار بار پیار کر کے اپنے تحفے اور خوشی منا رہے تھے۔ جھنگ شہر میں یہ خبر اتنی جلدی پھیلی کہ فوٹو گرافر خود ہی ہمارے گھر پہنچ گئے۔ ایک خوشی اور مسرت کا سا سماں تھا۔ والدین شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے۔ بھائی جان اس وقت دبلے پتلے نوجوان تھے۔ فوٹو گرافر نے فوٹو لیں۔ کوٹ پہنا ہوا تھا اور سر پر کلاہ والی پگڑی تھی۔ فوٹو اس وقت

کے مختلف اخباروں میں چھپ گئیں۔ بلکہ پنجاب کتاب گھر لاہور پبلشر نے تو ایک صفحہ پر بھائی جان کی فوٹو اور دوسرے صفحہ پر چار دوسرے پوزیشن لینے والے لڑکوں کی جن میں ہندو بھی تھے چھاپیں اور لفافے بنا کر کتابیں ڈال کر طالبعلموں کو دیتے۔ ہر ایک کا خوشی کا انداز اپنا اپنا تھا۔

عزیزوں سے ملاقات کا اعزاز

ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ڈاکٹر محمد عبدالقادر ملتان میں رہائش رکھتے تھے۔ صرف ہمیں ملنے کیلئے (وہ جب بھی پاکستان آئے ہوتے تھے تو ملتان کا پروگرام ضرور رکھتے۔ چند گھنٹہ میں وہ ہم سب سے ملتے۔ ہم اپنی بڑی بہن کے گھر جمع ہوتے تھے، احباب جماعت اور اباجی کے ملنے والے دوستوں سے ملاقات کرتے۔ دعائیں لیتے اور اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو جاتے۔ ان کا زیادہ وقت سفر میں گزرتا۔ ان کی محبت اور دریا دلی کی ایک زندہ مثال تھی کہ ہمیں ملے بغیر وہ کبھی بھی پاکستان سے واپس نہ جاتے۔ ہم ان کی اس محبت سے اتنے خوش ہوتے کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتی۔

انکساری اور کام سے لگن

ایک دفعہ ملتان آئے تو میرے میاں ملک بشیر احمد صاحب کو بتایا کہ میرے پیٹ میں ہلکا سا درد محسوس ہوتا رہتا ہے۔ میں ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب سے چیک اپ کرانا چاہتا ہوں۔ ملک بشیر احمد صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے رابطہ کیا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں خود آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ آپ ڈاکٹر سلام صاحب کو لے کر نہ آئیں۔ لیکن آپ اس وقت خود نشتر ہسپتال ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ اپنڈکس کا خدشہ ہے۔ کہنے لگے کہ اب تو میرے پاس وقت نہیں۔ لندن جا کر دیکھوں گا کام سے لگن اور انکساری کا عجب امتزاج تھا۔

اپنی ذات کی کوئی فکر نہ تھی

آپ درویش صفت پاک وصاف انسان تھے۔ کراچی آئے ہوئے تھے تو ان کی روانگی سے پہلے ایک بہت ہی قریبی عزیز نے کہا حالات ٹھیک نہیں لوگ مخالفت میں کئی کام کر جاتے ہیں جو تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ آپ کے بکس کو تالا نہیں لگا ہوتا۔ کنڈے تو کھل بھی سکتے ہیں۔ اس

وقت تو اس عزیز کی بات کو خاموشی سے سن لیا۔ ایئر پورٹ پہنچ کر سامان لے جانے والے ذمہ دار افسر کو کہا کہ بھائی میرا بکس بند نہیں ہوتا دیکھ لیا کرو کہ کوئی غلط رنگ میں کام نہ ہو جائے۔ اور میں بدنام ہو جاؤں۔

عفوودرگزر

اپنی بیماری سے پہلے دورہ پر سنگاپور گئے۔ سامان میں ایک بکس تو ہوتا تھا۔ وہ بھی اٹامک انرجی کی گاڑی میں ہی رکھا ہوتا کہ جلدی ائرپورٹ جانا ہوتا تھا چند گھنٹے کا قیام گھر آئے کھانا کھایا اور کوئی ملنے آ گئے۔ تو مختصر سی ملاقات سب کا حال دریافت کرنا، پھر روانگی یہ سفر اسلام آباد لاہور کراچی اور پھر سنگاپور کا تھا۔ سنگاپور خود تو بخیریت پہنچ گئے لیکن بکس لاہور سے کراچی کیلئے نہ رکھا گیا۔ اس کی بجائے کسی اور کا بکس آ گیا۔ جو سنگاپور بھی پہنچ گیا۔ سنگاپور ریسٹ ہاؤس سے فون آیا کہ میرا بکس میرے ساتھ نہیں آیا۔ میرے کپڑے اور ضروری کاغذات جن کی مجھے یہاں ضرورت ہے وہ اس میں ہیں اور وہ لاہور ہی رہ گیا ہے۔ لاہور رابطہ کریں کہ وہ اگلے جہاز پر میرا سامان سنگاپور بھیجوادیں۔

جہاز والوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کپڑے نئے خرید لیں بل ہم ادا کریں گے۔ ہم جلدی آپ کا سامان سنگاپور بجھوادیں گے۔ ان کی طرف سے کیا ہی پیارا اور صاف ستھرا جواب انہیں ملا کہ کپڑوں کی مجھے ضرورت نہیں اور نہ ہی میں یہاں سے خریدونگا۔ میرے کاغذات ضروری ہیں وہ مجھے جلدی مطلوب ہیں خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ جلدی لاہور سے وہ بکس کراچی آیا اور کراچی سے سنگاپور روانہ کرادیا گیا۔ لندن پہنچ کر مجھے خط لکھا کہ تمہاری طرف سے مجھے فون پر جواب ملتا کہ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا سامان خدا کے فضل سے ضائع نہیں ہوگا تو مجھے تسلی ہو جاتی۔ اتنی پریشانی کے بعد بھی کسی سے باز پرس نہیں کی۔ کہ کس کی غلطی سے سامان جہاز میں نہیں رکھا گیا۔

وقت بچانے کا سادہ طریقہ

سردی ہو یا گرمی ایک بڑا سا کوٹ زیب تن ہوتا تھا۔ اس کی اندر کی جیب میں چھوٹے سائز کا

ترجمہ قرآن کریم۔ دعاؤں کی کتاب پاسپورٹ کاغذات او پر سامنے کی جیب میں لاتعداد پن موجود ہوتے۔ غالباً ان کے وزن کے برابر کا کوٹ تھا۔ ایک بار جانے لگے تو وہ کوٹ میں نے ہی ان کو پہنایا اور بے تکلفی سے پوچھا کہ آپ اتنا وزن کیوں اٹھاتے ہیں۔ فالتو چیزیں بکس میں رکھ لیں۔ فرمایا یہ ضرورت کا سامان ہوتا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہوتا کہ بار بار بکس سے نکالوں۔

امام جماعت اور مرکز سے محبت

جب بھی پاکستان آئے تو ربوہ کا پروگرام لازمی ہوتا تھا۔ مقصد صرف حضرت امام جماعت سے ملاقات اور بزرگوں سے ملاقات بزرگوں کے مرقد پر دعاؤں کیلئے جانا، تھوڑے وقت میں سب عزیزوں سے ملاقات کسی کو کبھی گلہ نہیں ہوتا تھا کہ مجھے نہیں ملے۔

کتابوں سے لگاؤ اور خریداری

پاکستان میں آمد پر ایک ضروری امر یہ ہوتا تھا کہ وہ تقریباً جہاں بھی جاتے مختلف کتابیں ضرور خریدتے اگر خود نہ لے جاسکتے تھے تو بعد میں پارسل کے ذریعہ پہنچ جاتیں کسی پر بار نہیں ہوتا تھا کہ کوئی آئے تو لیتا آئے۔ کسی پر بوجھ ڈالنا تو عادت نہ تھی۔ بک سیلرز خود ہی پارسل کرتے تھے۔ اکثر کتابیں اٹلی لے جاتے تھے۔ لندن میں آپ کا گھر حقیقتاً کتابوں سے ہی سجا ہوا ہے۔ کمرہ میں کئی شیلف نہایت سلیقہ سے کتابوں سے ترتیب سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن میں ایک بہت بڑا حصہ مختلف ممالک سے لائے ہوئے قرآن کریم سے بھی مزین کیا ہوا۔

دیسی عطر کا شوق

دیسی عطر خریدنے کا بہت شوق تھا۔ جو کراچی سے ضرور خرید کر ساتھ لے جاتے تھے۔ وہاں لوگوں کو تحفہ دیا کرتے تھے۔

نوبل انعام پانے کے بعد پاکستان آنا اور واپسی پر مصروفیات

نوبل انعام پانے کے بعد محترمہ بھائی جان کے ساتھ پاکستان آئے۔ ہم سب کو اپنا انعامی تمغہ

دکھایا۔ ربوہ اور دیگر شہروں میں گئے۔ تقریبات میں شامل ہوئے۔ تقریریں کیں۔ شدید تھکاوٹ بھی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ کے احسانوں پر شکر بھی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے گلے میں مَیں نے گلاب کے پھولوں کا ہار ڈالنا چاہا تو مسکراتے ہوئے بولے کہ پہلے اپنی بھابی جان کے گلے میں ڈالو۔ انہیں یہ احساس رہا کہ بھائی جان کی خوشی مقدم ہے۔ واپس لندن جا کر خط لکھا کہ اس یادگار دورہ کی دلکش یادیں دل میں لے کر گیا ہوں۔ الحمدللہ۔ اس کے بعد دنیا بھر میں دورے کئے۔ اور اپنی مساعی میں اضافہ کر دیا۔ انعام ملنے سے جو توقیر ہوئی تھی۔ آپ کی خوشی اور کوشش یہ تھی کہ اس کے ذریعہ تیسری دنیا بالخصوص اسلامی ممالک میں سائنسی ترقی کیلئے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں وقت کا فرق اور ہوائی جہاز کا سفر آپ کے جسم پر بہت بار ڈالتا تھا۔ لیکن آپ نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ غالباً سفر ہی ایک ایسا وقت ہوتا تھا جس میں آپ اپنی کھوئی ہوئی نیند کا کچھ حصہ حاصل کر لیتے۔ اس غریب صفت درویش کی بس یہ تمنا تھی کہ غریب انسانیت بھی سائنس کے پھل کھائے اور اپنی حالت بہتر بنائے۔ اس مقصد کیلئے آپ ملک ملک جاتے۔ غریبوں کو سائنس کی اہمیت کا احساس دلاتے اور شہنشاہ مزاج فرمانرواؤں کو آمادہ کرتے کہ اس میدان میں بھی کچھ اپنے خزانے کھولیں۔ لیکن غرباء کیلئے سائنسی جہاد کی راہ میں قدم قدم پر آپ کو تعصّبات اور جہالت کے عفریتوں سے مقابلہ کرنا پڑتا۔ جس کا آپ کو بہت ملال تھا۔

ایک جذباتی واقعہ

جس کی یاد کا احساس مجھے کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ شدید بیماری میں وہیل چیئر پر ہی کویت آئے ہوئے تھے۔ وہاں کا دورہ لازمی ہوگا۔ ایک صحافی یہاں سے کویت گئے۔ انہوں نے فون پر مجھ سے دریافت کیا کہ میں آپ کے بھائی جان کے پاس جا رہا ہوں کوئی پیغام۔ میں نے انہیں کہا کہ میرا محبت بھرا اسلام ہی انہیں پہنچادیں۔ کویت سے واپسی پر صحافی صاحب کا فون آیا اور وہ بتانے لگے کہ تقریریں ختم ہونے کے بعد میں سٹیج پر انہیں ملا اور آپ کا سلام انہیں پہنچایا تو سنتے ہی بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے مجھے کہا کہ

میرا بھی اس کو سلام کہہ دینا۔ ان صحافی کا بیان ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان کے دل میں کیا کیا جذبات آئے ہوں گے۔ میں بھی بھائی ہوں لیکن ایسا منظر تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

محو ہوگی نہ کبھی دل سے محبت تیری

ڈاکٹر عبدالسلام...........میرا بھائی

(مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب۔لاہور)

ہوش سنبھالنے سے لیکر ان کی وفات سے چند سال قبل تک مجھے ان کے ساتھ رہنے اور انہیں بہت قریب سے دیکھنے کے کئی مواقع ہے۔ آخر وہ ایک فعال اور بھرپور زندگی گزار کر اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے جو نصرت الٰہی کے جلووں اور ذرہ نوازیوں سے بھری پڑی ہے۔ ان کے واقعات کارہائے نمایاں اور اقوال کو ایک مختصر سے مضمون میں بیان کرنا ایک مشکل کام ہے تاہم میں ان کی زندگی کے بارے میں کچھ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ وہ بشارت الٰہی کے تحت پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد ایک راجپوت خاندان کے شہزادہ تھے جنہوں نے حضرت بہاؤالحق زکریا کے ہاتھوں دین الٰہی قبول کیا اور پھر انہی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے نانا جان حضرت حافظ نبی بخش صاحب ان معدودے چند احباب میں سے تھے جنہیں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے دعویٰ سے قریب دس برس قبل آپ کی پاک صحبت نصیب ہوئی۔ ان کے ماموں حضرت حکیم فضل الرحمٰن صاحب کو مغربی افریقہ میں قریباً ربع صدی تک بطور مربی انچارج خدمت کی توفیق ملی۔ ان کے تایا جان حضرت چوہدری غلام حسین صاحب جو ان کے خسر بھی تھے کو متعدد جماعتوں کے بطور امیر خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے والد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی وفات سے 14 روز پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی بعد میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ جماعت احمدیہ ضلع ملتان کے کئی سال امیر رہے۔

ان کی والدہ ماجدہ ایک خدا ترس اور دعا گو خاتون تھیں۔ایک دفعہ بچپن میں بھائی جان نے غلطی سے چوہے مارنے والی زہریلی گولیاں کھالیں جو تھوڑی دیر بعد قے کے ذریعے خارج ہوگئیں والدین نے جب انہیں قے کرتے دیکھا تو ان سے پوچھا کہ ''سلام تم نے کیا کھایا تھا'' انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ ''ابا میں نے آپ کے سائیکل کے تھیلہ سے پھلیاں نکال کر کھائی تھیں'' یہ سنتے ہی والد صاحب انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے ان کے معدہ کو صاف کیا اس طرح اللہ نے انہیں نئی زندگی دی۔ سچ ہے جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

جھنگ شہر میں ایک ہمارا آبائی مکان ہے جیسے بھائی جان نے نوبل انعام ملنے کے بعد 1979ء میں حکومت پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کو ''ان ہاؤس'' میوزیم بنانے کیلئے دے دیا تھا۔ دوسرا مکان ہمارے والد صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔جس میں تین کمرے ایک بیٹھک، ایک سٹور اور ایک برآمدہ ہے کمروں کے سامنے ایک کشادہ صحن ہے۔ایک کمرہ میں ٹرنک اور دوسرا گھریلو سامان رکھا ہوتا تھا۔ بھائی جان اسی کمرہ میں پڑھائی کرتے اور سوتے بھی تھے۔ان کی چارپائی کے ساتھ ایک میز رکھی ہوئی تھی جس پر وہ اپنی کتابیں وغیرہ رکھتے تھے۔ چونکہ ان دنوں جھنگ میں بجلی نہیں تھی اس لئے وہ مٹی کے تیل کے لیمپ میں پڑھتے تھے۔لیمپ کی چمنی ہماری بڑی ہمشیرگان محترمہ باجی مسعود بیگم صاحبہ مرحومہ اور باجی حمیدہ بیگم صاحبہ روزانہ صاف کرتیں تھیں جب کہ مجھ سے بڑے بھائی محترم چوہدری محمد عبدالسمیع صاحب اور میں لیمپ میں تیل ڈالا کرتے تھے۔ بھائی جان رات کو جلد سو جانے کے عادی تھے۔وہ زیادہ تر پڑھائی صبح کیا کرتے کیونکہ اس وقت ہر طرف خاموشی ہوتی جس سے انہیں یکسوئی میسر آتی۔ باجی مسعودہ صاحبہ انہیں صبح 4 بجے جگا دیا کرتی تھیں بلکہ اکثر وہ سب سے پہلے جاگے ہوئے ہوتے تھے۔گرمی کے موسم میں وہ پڑھائی بیٹھک میں کیا کرتے تھے کیونکہ اس کے دو طرف گلیاں ہونے کی وجہ سے ہوادار تھی وہ اپنا کورس امتحان سے کم از کم دو ماہ قبل مکمل کر لیتے تھے اور امتحان سے پہلے اسے دو مرتبہ دوہرا لیا کرتے۔

جس روز میٹرک کا نتیجہ نکلا تھا بھائی جان اس دن حضرت والد صاحب کے پاس ان کے دفتر میں

بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت والد صاحب کو معلوم ہو گیا تھا اس دن نتیجہ آنے والا ہے لہذا انہوں نے اپنے دفتر کے ایک آدمی کو مگھیانہ ریلوے اسٹیشن نتیجہ کا گزٹ لینے کیلئے بھجوایا۔ جب وہ گزٹ لے کر آیا تو اس کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا کہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ کے طالبعلم عبدالسلام رولنمبر 14888 نے صوبہ بھر میں اوّل پوزیشن لی ہے۔ ان کے نمبر 850 / 765 تھے۔ ان سے پچھلے سال اوّل آنے والے لڑکے نے 737 نمبر لئے تھے اس طرح بھائی جان نے پچھلے سال کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ اپنے ایک انٹرویو میں بھائی جان نے بتایا کہ

''نتیجۃً اسے ایک روز پہلے مَیں ایک حجام کی دکان پر اپنے بال کٹوانے گیا تو اس نے مجھے اپنے ایک شاگرد کے حوالے کر دیا جس نے میرے بال کاٹتے کاٹتے اتنے چھوٹے کر دیئے کہ ''میری ٹنڈ'' نکل آئی۔ جسے چھپانے کیلئے میں نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ نتیجہ سنتے ہی میں اپنے سائیکل پر سوار ہو کر جھنگ شہر کی طرف چل پڑا جو مگھیانہ سے دواڑھائی میل دور تھا۔ اسی اثنا میں ان کے فرسٹ آنے کی خبر پورے جھنگ شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مزید بتایا کہ ''جب میں جھنگ پہنچا تو مجھے ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک جانا تھا جھنگ میں کل چار دروازے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تمام دکاندار جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے میرے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ حالانکہ وہ دوپہر کا وقت تھا جب اکثر لوگ دوکانیں بند کر کے ستاتے ہیں'' انہوں نے مزید بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی میں میرا فرسٹ آنا ہندوؤں اور سکھوں کیلئے ایک عجوبہ تھا کیونکہ ہمیشہ سے ہندو یا سکھ لڑکے پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آتے تھے۔ اس لئے لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی سکول جو خالصتاً ایک ہندو سکول تھا کے استادوں نے مجھے دیکھنے کے لئے چند آدمی جھنگ شہر بھجوائے تھے۔''

ایف۔ اے کا امتحان بھی انہوں نے 1942ء میں انٹرمیڈیٹ کالج جھنگ سے پاس کیا اس امتحان میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے تھے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ ''میرا کالج جھنگ اور مگھیانہ کے درمیان تھا اس لئے اس جگہ کو'' آدھی وال'' کہتے ہیں یہ جگہ جھنگ شہر سے

قریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ گرمیوں کے موسم میں سخت گرمی سے بچنے کیلئے میں کالج میں ہی بیٹھ کر اپنا ''ہوم ورک'' ختم کر لیا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جھنگ شہر کے میرے ہم جماعت بھی میرے پاس بیٹھ جاتے اور میرے کام کو نقل کر کیا کرتے تھے۔ جب سائے ڈھل جاتے تو ہم پیدل اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔

انہیں کالج کے میگزین ''چناب'' کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا بتاتے تھے کہ میگزین کی ایڈیٹنگ کرنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کالج میگزین میں ایک تحقیقی مضمون بعنوان'' اسداللہ غالب نے اسد سے غالب کب تخلص اختیار کیا'' شائع کیا تھا جسے بعد میں رسالہ ''ادبی دنیا'' نے بھی شائع کیا تھا۔

1942ء میں آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ آپ کے مضامین ریاضی اے اینڈ بی کورس۔ انگلش آنرز انگریزی اور غیر اختیاری اردو تھے۔ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور کی سٹوڈنٹس یونین کا دو سال کے لئے صدر منتخب کیا گیا اور ساتھ ہی انہیں کالج کے میگزین ''راوی'' کا چیف ایڈیٹر بھی مقرر کیا گیا تھا۔ میٹرک اور ایف۔ اے میں صوبہ بھر میں اوّل آنے کی وجہ سے ہندوؤں کو بڑی فکر ہوئی۔ چنانچہ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور کے چند استادوں نے اپنے کالج کے ایک لائق طالبعلم کو بھائی جان کے مقابل پر بی اے کے امتحان کی تیاری کروانا شروع کر دی تا کہ عبدالسلام یونیورسٹی میں اوّل نہ آئے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بھائی جان بی۔ اے میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ دوم اور سوم آنے والے لڑکے بھی مسلمان تھے جب کہ وہ ہندو لڑکا ساتویں یا آٹھویں پوزیشن پر آیا تھا۔ بی۔ اے کے امتحان میں بھائی جان نے 500 / 451 نمبر لیکر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جو آج تک ہے۔

1946ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انہوں نے ایم۔ اے ریاضی 600 / 573 نمبر لیکر پاس کیا اور ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی میں اوّل آئے۔

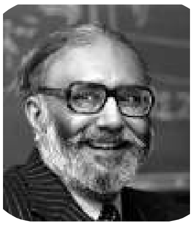

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک خط

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک خط جو کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مکرم چوہدری عبدالحمید صاحب کو لکھا۔

ڈاکٹر صاحب کے خط کا متن ہدیہ قارئین ہے۔ عزیزم حمید خان۔ السلام علیکم ورحمہ اللہ

ابا جان کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کا امتحان 18 اپریل کو شروع ہے میں یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کو شاباش کہوں اور آپ کی ہمت بڑھاؤں کہ آپ کوشش کریں کہ اس بار کم ازکم آپ کا نمبر سب سے آگے ہو۔ شاید یہ خط آپ کو 12 / 13 کے قریب ملے گا۔ جب امتحان 5 چار دن رہ گیا ہوگا اور آپ کی تیاری ہو چکی ہوگی۔ اگر تیاری خواہ نہ بھی ہوئی ہو تو بھی آپ گھبرائیں نہیں امتحان جہاں تیاری پر منحصر ہوتے ہیں اس کے علاوہ Keeping your witsabout you پر بھی انحصار رکھتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کو بہت اچھی طرح آتی ہوں ان سے پورا فائدہ اٹھانا امتحان میں ضروری ہوتا ہے۔ میں اور سب لوگ آپ کے لئے دعائیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی بخشے۔

آپ کو شاید اس وقت تو یہ مضمون حساب فزکس Chemistry وغیرہ بے کار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ ان میں TOP پر رہنے میں دو Point ہوتے ہیں۔ 1۔ اگر آپ ان مضمونوں میں بہتر سے بہتر نتیجہ دکھائیں تو اگرچہ آپ کی ان میں دلچسپی نہ بھی ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ محنت کر سکتے ہیں اور دوسرے آپ ذہین ہیں۔ زندگی میں کامیابی محنت اور ذہانت سے ہے۔ ایک معمولی کلرک بن جانا یا معمولی دکاندار بن جانا یا معمولی Mechanic بن جانا ہمیں یا آپ کو خوش نہیں کر سکتا۔ زندگی Ambiton کا نام ہے اور وہ Ambition کیا ہے۔ سب سے چوٹی پر رہنا۔ جس شخص کی زندگی میں Ambiton نہیں وہ مردہ ہے۔ ماں باپ بھائی کسی کے کام نہیں آسکتے۔ ہر شخص نے اپنی زندگی خود بنانی ہوتی ہے۔ آپ کی عمر میں انسان کو احساس نہیں ہوتا کہ وقت کس طرح خرچ کرنا چاہئے۔ زندگی بھر میں کونسی چیزیں کام آئیں گی۔ لیکن محنت کی عادت ایسی چیز ہے کہ ایک بار پڑ

جائے تو کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے۔محنت کرنا کوئی آسان چیز نہیں۔بہت کڑوی چیز ہے۔ (جی کہتا ہے) کہ یہ مصیبت ہے۔لوگ مزے کر رہے ہیں۔یاد رکھیں جو لوگ اس عمر میں مزے کرتے ہیں وہ ساری عمر روتے رہتے ہیں۔مزے کرنے کا بھی وقت ہو اور کام کرنے کا بھی وقت ہو تو زندگی حسین ہوتی ہے۔آپ کا مطمع نظر یہ ہونا چاہئے کہ آپ رات کو جب سوئیں تو سونے سے پہلے یہ سوچیں کہ کیا آپ کا دن اچھا گزرا ہے۔پڑھنے کے وقت آپ پڑھے ہیں۔کھیلنے کے وقت کھیلے ہیں۔یاد رکھیں ہم بہت غریب ہیں۔ہمارے پاس سوائے محنت اور ذہانت کے کچھ نہیں کہ ہم اونچے چڑھ سکیں۔گھر میں ننھوں سے لڑنا یا ناراض ہونا زندگی کا نام نہیں۔آپ کے سامنے ہزاروں میدان ہیں آپ محنت کریں تو کل Prime Minstar ہو سکتے ہیں۔بڑے سے بڑے (سیٹھ بن سکتے ہیں) بڑے سے بڑے Mechanic ہو سکتے ہیں۔ایک بار عزم کریں اور پھر محنت اس وقت آپ کے سامنے Studies کا میدان ہے۔آپ یقیناً اس قابل ہیں کہ آپ سب کو پیچھے چھوڑ سکیں۔ اگر پہلے وقت ضائع ہو گیا ہے تو کوئی حرج نہیں۔عزم کے ساتھ کیا ہوا دو دن کا کام لوگوں کے مہینوں کے کام سے بہتر ہوتا ہے۔2۔آپ کی تعلیم کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ریاضی،فزکس وغیرہ آج کی دنیا کی کلید ہیں۔بجلی،موٹریں،انجینیئر نگ سب کچھ ریاضی کے بغیر ناممکن ہے۔یہ لوہا کیسے بنتا ہے۔یہ کاریں کیسے چلتی ہیں۔آپ کی عمر کے بچے یہاں خود Radio set اور کار بنا لیتے ہیں۔آپ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔صرف چھوٹی چیزوں کا خیال چھوڑ دیں۔ بہت بڑی چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔اگر آپ کا رجحان کسی خاص طرف ہو تو مجھے لکھیں میں آپ کو کتابوں (کتابیں۔ناقل) بھیجوں گا۔لیکن اس وقت اللہ کا نام لے کر امتحان دیں اور اس میں اعلیٰ منزل پر پہنچیں۔اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔کوشش کریں کہ آپ کے والدین آپ سے خوش ہوں۔آپ کی طبیعت میں کوئی چھوٹی چیز نہ ہو۔والسلام۔آپ کا بھائی (عبدالسلام)

بات مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ امتحان کے بعد انہوں نے حضرت والد صاحب کی خدمت میں کیمبرج سے خط لکھا تھا کہ ان کا تجرباتی فزکس کا پرچہ ٹھیک نہیں ہوا دعا کریں اللہ معجزانہ رنگ میں

پاس کردے ورنہ مجھے کوئی امید نہیں کہ میں یہ امتحان پاس کرسکوں لیکن جب نتیجہ نکلا تو وہ امتحان بھی انہوں نے فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ ایک مرتبہ میں نے بھائی جان سے یہ بات پوچھی کہ فزکس کا امتحان دینے کے بعد انہوں نے حضرت والد صاحب کی خدمت میں ایسا خط لکھا تھا اس کی کیا وجہ تھی جس پر انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا پریکٹیکل پورے دن کا تھا۔ سارا دن پریکٹیکل کرنے کے بعد جب انہوں نے نتائج جمع کرنے شروع کئے تو انہیں پتہ چلا کہ اپنے تجربہ کیلئے انہوں نے جو طریقہ کار اپنایا تھا وہ غلط تھا جس کی وجہ سے پریشان ہوکر وہ خط لکھا تھا۔ پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ باوجود اس بات کے کہ ان کا پریکٹیکل غلط ہوگیا تھا ان کی فرسٹ کلاس کیسے آ گئی۔ فرمانے لگے کہ یہی تو دعاؤں کا معجزہ تھا۔ پھر بتایا کہ پریکٹیکل کے ساتھ تھیوری بھی پڑھنا پڑتی ہے میرے تھیوری کے پرچے خدا کے فضل سے اتنے اچھے ہوئے تھے کہ میرے پروفیسروں نے میرے پریکٹیکل کی غلطی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے پورے نمبر دے دیئے تھے۔

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زور دعا دیکھو تو

وہ ایک شفیق بھائی تھے۔ غالباً 1943ء کا واقعہ ہے کہ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کیلئے لاہور سے ملتان آئے ہوئے تھے۔ انہی دنوں میری دائیں ران پر ایک پھوڑا نکل آیا جس سے مجھے بے حد تکلیف تھی۔ چنانچہ بھائی جان مجھے سائیکل پر بٹھا کر سول ہسپتال جو ہمارے گھر سے تقریباً دو میل دور تھا لے گئے۔ میرے پھوڑے کا اپریشن کروایا اور جب تک میرا زخم مندمل نہیں ہوگیا مجھے روزانہ مرہم پٹی کے لئے ہسپتال لے جاتے تھے۔

1952ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جب وہ وطن واپس آئے تو انہوں نے کچھ عرصہ ملتان میں والدین کے پاس گزارا۔ کچھ بڑے بھائی ہونے کے ناطے اور کچھ ان کی قابلیت کی وجہ سے میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرسکتا تھا یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک شدید احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ انہیں میری اس کیفیت کا احساس ہوگیا۔ ایک دن انہوں نے مجھے میز پر

اپنے سامنے بٹھالیا اور کہا کہ ''میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ انہوں نے دوبارہ کہا کہ ''میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو'' لیکن میں پھر بھی ایسا نہ کر سکا۔ پھر انہوں نے گرج دار آواز میں کہا کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ اس پر میں نے ہمت کر کے بمشکل دو یا تین سیکنڈ کے لئے ان کی طرف دیکھا جس کے بعد میرا وہ احساس کمتری جاتا رہا اور اس کے بعد حد ادب میں رہتے ہوئے میں ان سے کھل کر باتیں کر لیتا تھا۔ وہ اپنے استادوں کا بے حد ادب کرتے تھے۔ وہ اکثر حضرت والد صاحب کو اپنے استادوں میں تقسیم کرنے کیلئے پیسے بھجوایا کرتے تھے۔ وہ جب بھی جھنگ تشریف لاتے تو اور استادوں کے علاوہ حضرت شیر افضل جعفری صاحب مرحوم کے دولت خانہ پر ضرور حاضری دیتے اور دیر تک ان سے نشست رہتی۔

بھائی جان کو اپنے والدین سے عشق تھا ان کی کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت والد صاحب کی آخری بیماری کی خبر سن کر نیو یارک سے اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر کراچی پہنچے اور ان کی وفات تک ان کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بھائی جان ذہانت و فطانت وقار و تمکنت دانائی اور زبان آوری اور سخن فہمی میں خاص مقام رکھتے تھے اور استدلال ایسا کہ ان کے سامنے کوئی اپنی دلیل بازی کی جرات نہیں کرتا تھا۔ وہ حقیقت اور خوش فہمی کے فرق کو نہایت اچھی طرح سمجھتے تھے اور مکمل طور پر حقیقت بین تھے۔ 1976ء میں ڈاکٹر رابرٹ والگیٹ نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ ''سلام ایک ایسا شخص ہے جس کی زندگی ولولہ جذبہ اور جوش سے بھری پڑی ہے اس کے سامنے کئی عقدے ہیں لیکن اس کے پاس وقت نہیں ہے دنیا کے لئے یہ انتہائی نقصان دہ بات ہے کہ اسے دوہری زندگی نہیں مل سکتی۔''

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند سے بلند تر کرتا چلا جائے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

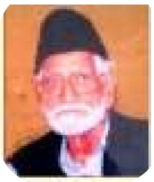

سائنس دانوں کو ناز تھا اس پر

مکرم سلیم شاہجہانپوری صاحب

ہو گئے ڈاکٹر سلام بھی فوت	موت عالم ہے اک جہاں کی موت
جب بلایا رفیق اعلیٰ نے	پھر نہ کی دیر مرد دانا نے
ماہر علم طبیعیات تھا وہ	کاشف راز کائنات تھا وہ
جب مرض نے اسے کیا مہجور	چلنے پھرنے سے ہو گیا معذور
کام کرتا رہا دماغ اس کا	جنگ میں روشن رہا چراغ اس کا
سائنس دانوں کو ناز تھا اس پر	اس پر عاشق تھے اسود و احمر
طاقتیں چار تھی مدار حیات	اور انہیں پر تھا انحصار حیات
اس نے ثابت کیا کہ تین ہیں وہ	اثر انداز ہیں زمیں پہ جو
تین کو دو وہ کرنے والا تھا	فہم اس کا بہت ہی اعلیٰ تھا
دو کو پھر ایک ہی بنا دیتا	یہ کرامت بھی وہ دکھا دیتا
دو کو جب ایک کر دکھاتا وہ	راہ وحدانیت پہ لاتا وہ
پھر وہ کہتا کہ ایک ہی طاقت	حکمراں ہے یہاں بلا شرکت
نام ہے اس کا خالق اکبر	ہے وہی کائنات کا محور
ایک ہی طاقت عظیم ہے وہ	حی و قیوم ہے قدیم ہے وہ
اس نے ایسا عظیم کام کیا	جگ میں اونچا وطن کا نام کیا
بالیقین یہ وہ کارنامہ ہے	معترف جس کا اک زمانہ ہے
کام اس کا جو ناتمام رہا	اس کو خالق کرے گا خود پورا
ایسا انسان بھی کوئی آئے گا	تین کو ایک کر دکھائے گا

آغاز کس طرح کروں اس داستان کا

آپکے اہل خانہ بیگمات اور بچوں انٹرویوز

مکرمہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہ اہلیہ صاحبہ ڈاکٹر صاحب

انٹرویو محترمہ ڈاکٹر امتہ الرشید صاحبہ

تحریر وترتیب محترمہ سعدیہ ایاز صاحبہ

سوال:۔سب سے پہلے آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کی شادی ڈاکٹر صاحب سے کب ہوئی؟

جواب:۔ ہماری شادی 1949ء میں ہوئی تھی۔تو اس طرح تقریبا 47 سال کا عرصہ مجھے ان کی رفاقت میں نصیب رہا۔

سوال: آپ یہ بتائیں کہ جب ڈاکٹر صاحب گھر میں ہوتے تھے ویسے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت مصروف زندگی گزارتے ہوں گے لیکن پھر بھی جتنا وقت وہ گھر میں گزارتے تھے آپ کا اور ان کا آپ کے ساتھ کیسا وقت گزرتا تھا۔

جواب: آپ نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کہ ان کی زندگی اتنی مصروف تھی کہ اپنے کام کے سوا بہت کم کوئی چیز بھی جو ان کی توجہ اپنی طرف لیتی ہے۔گھر میں وہ صبح بہت Early اٹھنے کے عادی تھے اور ہمیشہ ان کا اصول میں رہا۔

شام کو جلدی ہونے کا پروگرام ہوتا تھا اور صبح جلدی اٹھ کر تقریباً چار پانچ بجے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے اور اسی طرح کافی جلدی چھ سات بجے تک ان کی یہ روٹین تھی کہ تیار ہوئے ناشتہ کیا کالج کیلئے آٹھ بجے تک کالج جانے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔سارا دن ان کا کالج میں گزرتا تھا۔شام کو آتے تھے کھانا کھایا اور اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کے لئے لیٹ جاتے تھے اور تھوڑا سا

سونے کے بعد پھر اٹھ کے اپنے کام میں کبھی گیارہ بجے اٹھ کے اپنے کام میں مصروف ہیں کبھی دو بجے اٹھ کے مصروف ہیں یعنی پورا وقت ان کا، توجہ جو تھی اپنے کام کی طرف ہوا کرتی تھی۔ کھانے کے دوران بھی کھانے کا ٹائم جو ہوتا تھا اس میں بھی ان کا یہی دستور تھا کہ ہاتھ میں کاغذ قلم ساتھ ہی ہے۔ کائنڈ نہیں تو قلم تو ضرور ہوتی تھی ان کی جیب میں اور اخبار ہے تو اخبار پر ہی لکھ رہے ہیں یا کوئی اور .... ہے، پیپر لیکن اس پر لکھ رہے ہیں ہر وقت سوچ اور کام کئے جا رہے ہیں ۔ یہ ان کی زندگی کا دستور رہا ہے ہمیشہ سے اور اپنے کام میں منہمک ہمیشہ رہے ہیں۔

سوال: آپ نے ان کے ساتھ ایک بہت طویل عرصہ گزارا اس عرصہ کی کوئی خوشگوار یادیں بھی یقینی طور پر ہوں گی کچھ اگر اس وقت آپ کے ذہن میں ہوں تو بتائیں۔

جواب: اس وقت اس بارہ میں کچھ کہنا ہے تو بہت مشکل ہے زندگی کا بہت سا وقت ہے وہ لوگوں کی بہت کم ہوتی ہے کیونکہ انہیں صرف اپنے کام کی دھن ہوتی ہے اس لئے کم موقعہ ہمیں ملتا تھا کہ ہم یعنی کسی قسم فیملی لائف یا سوشل لائف جس کو کہتے ہیں وہ چیز بہت کم ہوتی تھی۔ باہر آنا جانا سفر کی مصروفیات رہتی تھیں ان کی کہ فیلی لائف میں بہت کم ہی ٹائم ملا ہے کچھ کرنے کا۔ میں بھی اس چیز کو سمجھتی تھی کہ ایسے مصروف انسان کے لئے جتنا بھی میں کرسکوں ان کے لئے کہ ان کا وقت ضائع نہ ہو کسی لحاظ سے بھی میں نے کوشش کی۔

سوال:۔ اپنی اتنی سخت مصروفیت میں سے کیا وہ کچھ وقت نکال پاتے تھے کہ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں وہ آپ کی کوئی معاونت کرسکیں۔

جواب:۔ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں انہوں نے (بہت) نگرانی کی ہے ہر لحاظ سے اور پڑھائی کی بچوں کے لئے انہیں بہت فکر ہوتی تھی بچوں سے ہمیشہ پوچھا کرتے تھے سکول سے ان کے آنے کے بعد کیا کچھ ہوا ہے۔ کیا کام تم نے کیا ہے کوئی دقت تو نہیں۔ کوئی کسی قسم کی پریشانی تو نہیں۔ ان کا اس لحاظ سے بہت خیال رکھتے تھے بچوں کی تربیت میں ان کو توجہ اس بات میں تھا کہ بچوں کو یہ نصیحت کہ جھوٹ سے نفرت۔ جھوٹ سے ہمیشہ اس طرح توجہ دلائی کہ جھوٹ نہیں بولنا۔

کبھی بھی کسی لحاظ سے بھی۔ یہ بہت بری چیز ہے۔ جھوٹ سے ہی سب برائیاں پیدا ہوتی ہیں تو اس کا خیال ہمیشہ رکھیں۔ محنت کی طرف ہمیں ہمیشہ توجہ دلائی ہے کہ اپنا جو کام کرو ایماندار ہو کے اور پوری محنت سے جہاں تک تمہاری کوشش ہے تم اسے کرو باقی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر چھوڑ دو۔ یہ سبق انہوں نے بچوں کو بھی دیئے اور اس لحاظ سے اللہ کا فضل ہے کہ بچے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ تعلق رکھنے والے اور اپنے والد کی اس نصیحت پر عمل کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ آئندہ بھی انکو توفیق دے کہ یہ ان کی نصیحتوں پر عمل کرنے والے ہوں۔

سوال: ہمارے معاشرے میں ایک یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ عزیز و اقارب کے ساتھ بہت زیادہ نبھانا پڑتا ہے ان کے فنکشنز اٹینڈ کرنے پڑتے ہیں ان کی ہر خواہش ہر غمی میں ضرور شرکت کرنی ہوتی ہے تو اس قسم کے جو معاملات ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کسی طرح اپنی مصروفیات میں سے نبھا پاتے تھے۔

جواب: اس لحاظ سے تو ڈاکٹر صاحب ایک مثالی نمونہ تھے۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری ان پر آتی تھی اور انہوں نے ہر لحاظ سے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ چھوٹے بھائیوں کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری اٹھائی۔ بہنوں کی شادیوں کے لئے پوری ذمہ داری انہوں نے اٹھائی اور ہمیشہ اپنے دل میں یہ درد محسوس کرتے کہ جہاں تک ہو سکے میں اپنے بہن بھائیوں کی خدمت کروں اور جتنی بھی میں مدد کر سکتا ہوں کروں اس لحاظ سے یہ ہوتا تھا کہ اپنے خرچ ضروریات بالکل سادہ تھے انتہائی سادگی سے زندگی گزاری ڈاکٹر صاحب نے اور گھر میں بھی ہمارے بے حد ہی سادگی رہی ہے ہمیشہ سے ان کی میں کوشش ہوتی تھی کہ جو بھی ہو سکے میں اپنے بہن بھائیوں کے لئے اپنے وطن کے لئے جو بھی میں کر سکتا ہوں کروں۔ پوری کوشش اور کامیابی کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک ان کا ہر طرح کا خیال رکھنے کی پوری پوری ذمہ داری ادا کی ہے ہر لحاظ سے۔

سوال: آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گی کہ جب وہ گھر میں آپ کے ساتھ اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے تو کس طرح کا ان کا رویہ یا برتاؤ ہوتا تھا۔

جواب:۔ رویہ تو بہت محبت والا پیار والا وجود تھا اس میں کوئی شک نہیں مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے پاس ٹائم بہت تھوڑا ہوتا تھا۔ باہر کے سفر اتنے تھے کہ اس کی مثال مجھے یاد آ رہی ہے میں آپ کو وہ بتادوں اکثر چونکہ سفر میں رہتے تھے آتے جاتے تھے آج یہاں جا رہے ہیں کل وہاں جا رہے ہیں تو ہمارے ہمسائے میں ایک Polish فیلی رہتی ہے۔ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب آئے ہوتے تھے تو ان کا لڑکا آیا شام کے وقت اس نے بیل دی تو ڈاکٹر صاحب نے دروازہ کھولا تو ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگا کہ Can I See the Land Lady اس نے کہا کہ یہ Land Lady مسز سلام ہیں۔ یہ آدمی کوئی مسافر ہی ہے یا کوئی آتا جاتا رہتا ہے۔تو ڈاکٹر صاحب اندر آئے میں نے پوچھا ہنس کے کہنے لگے وہ کہتا ہے۔Can I See the Land Lady تو میں نے کہا ناں بس یہ حال تھا ان کے آنے کا۔ آج یہاں ہیں۔ ہفتہ میں مجھے یاد ہے کہ بعض دفعہ تین تین دفعہ انہیں ایئر پورٹ پر چھوڑنا ہوتا تھا یا چار چار دفعہ لینے جا رہی ہوں لا رہی ہوں۔آج جینوا گئے۔کل لندن جانا ہے فرانس جا رہے ہیں اٹلی جا رہے ہیں یہ سفر اتنے رہے ہیں ان کی زندگی میں کہ میں سوچتی تھی کہ جب یہ ریٹائر ہو جائیں گے تو بغیر سفر کے ان کا وقت کیسے گزرے گا بہت ہی زندگی سفر میں کٹی ہے۔مصروف زندگی اتنی رہی ہے کہ اس کے لئے ایک یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہر کام میں اپنے کام میں انتہائی مصروف مگر اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت گہرا تعلق تھا نمازوں کی ادائیگی۔قرآن پاک کی تلاوت ہر وقت سفر میں بیٹھتے تھے میں نے دیکھا ہے کہ کار میں بیٹھتے ہی ایک چھوٹی سی حمائل جیب میں ہوتی تھی وہ نکال لیا کرتے تھے اور بعض اوقات پورا کار کا سفر اٹلی سے وینس تک ہم By Road جایا کرتے تھے۔ دو گھنٹے کا سفر ہے اور ڈاکٹر صاحب قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہوتے تھے۔ جہاز میں بیٹھے ہیں تو بس قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ہر لحاظ سے دین میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت اپنے فضل سے حصہ بخشا اور دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر لحاظ سے انعامات دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا انجام بھی بخیر کیا۔

اللہ تعالیٰ بچوں کو بھی اب ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

سوال:۔ایک سوال آپ سے اور پوچھنا چاہوں گی کہ ڈاکٹر صاحب اتنے مصروف ہوتے تھے تو کبھی آپ کو ان سے کوئی اس قسم کی شکایات تو نہیں ہوئی یا آپ نے اس چیز کو کبھی بوجھ تو نہیں محسوس کیا کہ ساری ذمہ داریاں بچوں سے متعلق اور مختلف قسم کی آپ کے سر پر یقینی طور پر زیادہ ہوں گی۔ آپ نے ان کو خوشی خوشی نبھایا یا کسی سٹیج پر آپ کو یہ مشکل محسوس ہوئی کہ ایک سائنسدان کی بیوی ہونے کی وجہ سے آپ کو زیادہ ذمہ داریاں نبھائی پڑ رہی ہیں۔

جواب: یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل اور احسان مجھ پہ رہا ہے کہ خدا نے مجھے توفیق دی کہ مَیں نے ہر رنگ میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر صاحب اس چیز کو اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے 28 سال بطور لجنہ اماء اللہ لندن انگلستان کی صدر مجھے خدمت کا موقع ملا ہے میں نے اپنے اوقات کو اس طرح تقسیم کیا ہوا تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب کا یہ روٹین ہوتی تھا کہ دو ہفتے اٹلی میں ہوتے تھے دو ہفتے لندن میں تو جن دنوں ڈاکٹر صاحب لندن ہوتے تھے اس وقت میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے میں لجنہ کا جتنا کام کر سکتی ہوں وہ ختم کر دوں تا کہ مجھے گھر میں زیادہ فون نہ آئیں یا کوئی اور زیادہ میری توجہ اس طرف نہ ہوتی کہ میری پوری توجہ ڈاکٹر صاحب کی طرف ہو ان کی خدمت میں کر سکوں تو اللہ تعالیٰ کا احسان ہے مجھے اس رنگ میں کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان بچوں پر بھی ہے کہ بچوں نے اس چیز کو سمجھا کہ ہمارے باپ کی زندگی and he is very excepational person اور بچوں نے بھی پوری اس چیز کی قدر کی ہے اور جو بھی جتنا بھی وقت والد کی طرف سے ملا۔ انہوں نے اس کو دلی خوشی اور احترام کے ساتھ قبول کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی محترمہ عزیزہ صاحبہ سے انٹرویو

سوال: عزیزہ صاحبہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ بطور باپ کے آپ نے انہیں کیسا پایا اور کس طرح کا آپ کے ساتھ ان کا سلوک تھا۔

جواب: ۔ان کا سلوک ہم سب بچوں کے ساتھ جیسے امی بتا رہی ہیں اتنی محبت والا تھا جیسے کہ امی بتا رہی ہیں مصروف وہ بہت ہوتے تھے بچپن کی یادیں کچھ میرے ذہن میں ہیں جب ہم کیمبرج میں رہا کرتے تھے جب میں چھوٹی تھی بہت چھوٹی تھی اس وقت اتنی مصروفیت نہیں تھی جب تک Trieaste کا کام شروع نہیں ہوا اور مجھے اس وقت کے زمانے میں یاد ہے کہ میں اور شاید میری چھوٹی بہن جو بالکل ہی چھوٹی تھی ساتھ ہی گھر کے جو دریا ہے کیمبرج میں تو باقاعدہ ہم جاتے تھے Boat ہوتی ابو نے وہ چلائی ہم دونوں نے بیٹھنا اس میں، پھر جب لندن آئے تو اس وقت بھی ہوتا تھا کہ ہفتہ کے روز ہمیں لیکے جاتے تھے شاپنگ کیلئے اور پھر انگلینڈ کا مشہور کھانا Fish and Chips لینی اور سب کو اکٹھے کرتے ہم نے بیٹھ کر کھانی، گھر لے آتے جب Treast کا کام شروع ہو گیا پھر بہت ہی مصروفیت ان کی بڑھ گئی۔ جب بھی آتے تو بچوں کو سب کو پوچھنا، ملنا، کیا کیسی پڑھائی جا رہی ہے۔ پڑھائی کی طرف تو ان کی بہت ہی زیادہ توجہ ہوتی تھی اور سب سے بڑی نصیحت یہ ہوتی تھی کہ ٹائم بہت قیمتی ہے ٹائم نہ ضائع کرو۔ جو سمجھتے تھے کہ یہ چیز فضول وقت ضائع کرنے والی چیز ہے اس سے منع کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں ٹیلی ویژن نہیں ہوتا تھا۔ ان کو یہ تھا کہ TV وقت ضائع کرتا ہے تو ہم لوگ واقعی میرا خیال ہے کہ زیادہ تر کتابوں کے پڑھنے پہ لگاتے تھے۔ ہم بچے تھے ہوتا تھا ہمیں کہ ہمارے گھر کیوں نہیں سب کے گھر میں TV ہے مگر وہ اس پہ بہت قائم رہتے تھے کہ نہیں TV نہیں آنا۔ بلکہ ایک دفعہ یوں ہوا کہ جب انڈیا پاکستان کی جنگ ہوئی ہے تو خبریں سننے کیلئے کرایے پہ TV لیا اور پھر ایک دو ماہ کے بعد واپس بھی کر دیا۔ تو ہمیں افسوس تو تھا کہ TV بھی نہیں۔ مگر اب بڑے ہو کر انسان کو سمجھ آتی ہے کہ کتنی قیمتی باتیں تھیں اور ہمارے لئے بہتری کی باتیں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی محترمہ آصفہ صاحبہ سے انٹرویو

سوال: ڈاکٹر صاحب کی دوسری صاحبزادی ہیں آصفہ صاحبہ۔ آصفہ آپ یہ بتائیں کہ ڈاکٹر

صاحب کا آپ کی تربیت میں کسی حد تک دخل تھا۔

جواب: دخل تو بہت ہی تھا جیسے امی بتا رہی ہیں کہ یہ جو خاص طور پر جیسے جھوٹ بولنا، ایسی چیزوں سے تو بہت سخت منع کرتے تھے۔تو تربیت میں تو امی نے تھوڑا بہت بتا دیا ہے ایک دو باتیں ہیں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔کبھی کام کی وجہ سے ان کو زیادہ ٹینشن ہوتی تھی تو غصہ بھی آجاتا تھا کسی بات پر تو اکثر یہ ہوتا تھا سفر بھی جیسے امی کہہ رہی ہیں ہفتہ میں تین چار دفعہ ان کو کبھی ادھر کبھی ادھر تو وہ نکلنے سے پہلے کبھی ان کو کسی بات پر غصہ آجاتا تھا تو مجھے بھی ایک دو دفعہ ڈانٹ پڑی تھی وہ پھر یہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب چلے جاتے تھے تو ائرپورٹ سے ہی فون آجاتا تھا۔ بہت احساس ان کو ہوتا تھا کہ میں نے تمہیں ڈانٹا ہے مجھے پریشانی تھی اتنا سخت احساس پھر ان کو ہوتا تھا کہ جہاں بھی جاتے تھے خط لکھ دیتے تھے۔ واپس آتے تھے تو یقیناً لازمی ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی تحفہ سب کیلئے بچوں کے لئے بھی۔ مَیں کہنا چاہ رہی ہوں کہ تھوڑا بہت ان میں ہوتا تھا یہ سختی کبھی کبھی ان میں آجاتی تھی جو باپ کا حق ہوتا ہے۔لیکن پیار بھی اتنا زیادہ ان کو پھر بہت احساس ہوتا تھا۔ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ باقی تربیت تو اپنی جگہ پر انہوں نے بہت کی جیسے امی نے آپ کو بتایا ہے۔بس یہی باتیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیٹی محترمہ بشریٰ صاحبہ

سوال:۔ڈاکٹر صاحب کی تیسری بیٹی ہیں بشریٰ صاحبہ۔ بشریٰ آپ بھی ہمیں کچھ بتائیں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں۔

جواب:۔ یہ جو سب بتا چکی ہیں امی جان اور میری بہنیں اور صفیہ بھی۔اس کے علاوہ مجھے یاد آتا ہے کہ ان کا دھیان چاہے وہ کام کی ہی طرف ہوتا تھا پھر بھی وہ کبھی اپنی ذمہ داری نہیں بھولتے تھے۔اور جیسے کہ آصفہ نے ذکر کیا کہ جہاں بھی جاتے تھے خاص طور سے اس ملک کی چیز لیکے آتے تھے ہمارے لئے۔ ہر ایک کے لئے جس طرح ایک خاص چیز تھی مثلاً گڑیا، اس ملک کے کپڑے

نیشنل کا سٹیوم وغیرہ ہمارا ایک بہت بڑا Collection بن گیا تھا وہ خاص پوچھتے تھے کس کی گڑیا یہ ہے اور کس طرح رکھی ہے۔ آپ لوگوں نے پھر پوسٹ کارڈ کا بہت شوق تھا جہاں بھی جاتے تھے پوسٹ کارڈ ہمیں بھیجتے تھے۔ اس جگہ اور پھر اس کا Collection کسی کے ذمہ ہوتا تھا وہ کرنا۔ جو وہ ہمارے ساتھ چھوٹے چھوٹے Trips کرتے تھے ہمیشہ ان کا دھیان رکھا کہ ہمارے اخلاق کی کوئی بہتری ہو تو میوزیم کیلئے ہمیں لے جاتے تھے یا اس طرح کے نمائش وغیرہ ان کی طرف جیسے کہ باجی عزیزہ نے ذکر کیا ہے کہ وقت کے ضائع کرنے کی عادت ان کو اتنی ناپسند تھی کہ بالکل ناراض ہوتے تھے کہ کبھی ہم دیر سے اٹھیں صبح یا کام میں نہیں لگیں ہوں اس طرح جب جاتے تھے کہیں تو ہمیں دے دیتے تھے کہ اتنا کام کرنا ہے میرے واپس آنے تک اور ہم پوری کوشش کرتے تھے اس کام کو مکمل کرنے کی وہ جہاں بھی جاتے تھے یہ بات فون پر بات کرتے اور خط لکھتے تھے جس میں اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

ایک بہت پیارا وجود

پھر کسی پیارے کی یادوں نے کیا ہے بے قرار
دل ہے بر آیا اور آنکھیں بھی مری ہیں اشکبار

اہلیہ ثانی ڈاکٹر صاحب محترمہ لوئس جانسن سلام صاحبہ سے ایک انٹرویو

(انٹرویو محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ فضل عمر ہسپتال ربوہ بنت حضرت مولانا عبد المالک خان صاحب مرحوم)

زندگی کیا ہے، فقط ایک سہارا دل کا
موت کا جام ہر اک شخص پئے جاتا ہے

تیری فرقت ہے کہ آنکھوں سے لہو بہتا ہے
ذکر تیرا ہے کہ دل چاک کئے جاتا ہے

مکرم پروفیسر عبدالسلام صاحب ایک جانی پہچانی عظیم شخصیت جنہوں نے ایک طرف دنیاوی لحاظ سے اعلیٰ اعزازات حاصل کئے تو دوسری طرف خلافت سے وابستگی کی سعادت پائی اور خلیفۃ وقت کی دعاؤں کے وارث ہے۔بیگم پروفیسر عبدالسلام صاحب جو ان کے جنازے کے ساتھ ربوہ تشریف لائی تھیں اپنا قیمتی وقت نکال کر اس وقت سٹوڈیو میں موجود ہیں۔تو آیئے ان سے پروفیسر صاحب کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرتے ہیں۔

سوال: ہم مشہور لوگوں کو عام طور پر ان کے اعزازات اور کامیابیوں کے سبب پہچانتے ہیں۔ آپ ان کی ذاتی شخصیت کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی۔

جواب: بے شک وہ ایک عظیم آدمی تھے اور ان کی عظمت جانی جاتی ہے۔لیکن بہت سے عظیم لوگوں کی طرح ان کے ساتھ رہنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔انہیں اپنے کام میں مگن رہنے کی دھن غالب رہتی تھی۔شاید اسی طرح وہ بہتر کام کر سکتے تھے۔رات جلدی سو جاتے اور جلدی اٹھتے تھے اور صبح کے تین بجے بہترین کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔سماجی زندگی میں شرکت کیلئے ان کے پاس وقت کم ہوتا تھا۔بہر حال ان کی ان عادات کے اپنے فوائد تھے۔اس طرح وہ فزکس کی دنیا میں کامیابیاں حاصل کر سکتے تھے۔ترقی پذیر ملکوں کی حوصلہ افزائی کیلئے کاوش کر سکتے تھے اور دنیا میں قیام امن کیلئے جدوجہد کر سکتے تھے۔ان میں ایک بہت بڑا وصف دوسروں کو متاثر کر کے ان میں کام کا جذبہ ابھارنا اور پوشیدہ صلاحیتیں اجاگر کرنا تھا۔اگرچہ آج وہ خود تو ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن اس Inspiration کی رمق آج بھی باقی ہے۔جب وہ صحتمند تھے تو انعامات کو ایک تمکنت اور وقار کے ساتھ قبول کیا۔دکھاوے کو کبھی پسند نہیں کیا۔جب وہ بیمار ہوئے اور ان کو علم ہوا کہ وہ ایک (بظاہر) لاعلاج بیماری میں مبتلاء ہیں تب بھی اس صورتحال کو سکون اور وقار سے قبول کیا۔اور کوئی شکوہ زبان پر نہ لائے۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔زندگی کے آخری ایام میں گھر میں

عزیزوں کے درمیان بہت ہی صبر اور سکون کے ساتھ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ پھر ہم ان کو ربوہ لائے آپ سب کے درمیان۔ یہ ان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ان کی تدفین ربوہ میں ہو۔ یہ بات ان کے لئے بہت اہمیت کی حامل تھی اور ہمارے ذہنوں میں بھی ہمیشہ سے یہ بات اتنی پختہ تھی کہ ہم نے ان کو یہاں لانا ہے۔ گذشتہ رات جب ہم ربوہ پہنچے تو جوق در جوق لوگ قطاروں میں ہاتھ تھامے استقبال کیلئے نظر آئے۔ راستوں کے دونوں طرف کھڑے خوش آمدید کہنے والے بڑے اور بچے سبھی موجود تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر ان کو ملنے کیلئے اُمڈ آیا ہے۔ اور یہ عجیب سماں تھا۔ جس نے ہمارے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس موقع پر یہ خیال آیا کہ وہ جن کو لوگوں کے جذبات کی گہرائی نے ہمیشہ متاثر کیا اور جنہوں نے جواباً ہمیشہ نہایت اخلاص سے اس کا اظہار کیا آج اگر وہ ان لوگوں کے درمیان زندہ موجود ہوتے تو پھر شاید ہم ربوہ پہنچ ہی نہ پاتے۔ اس لئے کہ وہ گاڑی سے اتر کر لوگوں سے ملنے لگتے اور ان سے مصافحہ کر کے اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ کاش کہ لوگ تصور کر سکتے کہ وہ کیا حسین منظر ہوتا۔ یہ سب کچھ درست ہے ان کو یہاں لانا بہت صحیح فیصلہ تھا کیونکہ وہ پاکستان کے وجود کا ایک حصہ تھے اور جماعت کے لوگوں کا حصہ تھے۔ میرے بیٹے نے ان کی وفات پر کہا تھا کہ یہ اب ہمارے نہیں رہے۔ مجھے امید ہے کہ جو Inspiration انہوں نے ہمیں اپنی زندگی میں دی تھی وہ ہمیشہ قائم رہے گی اور جو آج کی نسل وہاں موجود تھی وہ کل یاد کرے گی جب یہ ایک عظیم انسان ربوہ آیا تھا۔

سوال: میرے علم کے مطابق پروفیسر صاحب کو Parkinsonism کی بیماری تھی۔ لیکن آپ سے معلوم ہوا کہ انہیں ایک مختلف قسم کی اعصابی تکلیف تھی جس کے اب تک چھ ہزار کیس انگلستان میں رپورٹ ہو چکے ہیں۔ کیا آپ اس کے متعلق ہمیں مزید کچھ بتانا چاہیں گی؟

جواب: ان کو ایک قسم کی اعصابی بیماری تھی۔ جس کی علامات Neuro Degenerative Disease ابتدائی مراحل میں Parkinsonism سے مشابہت رکھتی ہیں۔ جس میں پٹھوں کی حرکت متاثر ہوتی ہے۔ تقریباً چار سال قبل ہمیں اندازہ ہوا کہ بعض علامات Parkinsonism کی

نہیں ہیں۔ نیز Parkinsonism کی ادویات بھی اپنا اثر نہیں دکھا رہیں۔ آخرکار ایک Specialist نے تشخیص کیا کہ ان کو (PSP) Palsy Progressive Supranuclear اوقات اپنے تین دریافت کرنے والوں کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے۔ یہ بیماری پہلی دفعہ 1963ء میں تشخیص ہوئی لیکن تقریباً اس سے پہلے بھی موجود ہوگی لیکن اس کی تشخیص نہیں ہوسکی ہوگی۔ انگلستان میں تقریباً 6 ہزار مریض اس مرض میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ واضح گمان یہ ہے کہ اس سے زائد ہوں گے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے بیماری کو کوئی نام دے دیں اس کی نہ تو وجہ معلوم ہے اور نہ علاج۔ بعض ادویات سے کچھ افاقہ ہوتا ہے جس سے پٹھوں کی حرکت میں کچھ آسانی پیدا ہوتی ہے مگر صرف ابتدائی مراحل میں۔ اس بیماری سے متعلق زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ شاید کسی اور ایسے بیمار کی مدد ہو سکے۔ اور تیماردار کے علم میں اضافہ ہونے سے مریض کی نگہداشت صحیح طریقے سے ہو سکے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر ہم کچھ ایسا کر سکیں۔

سوال: میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت سے ہمیں بھی کچھ وقت دیا اور میں امید کرتی ہوں کہ آپ آئندہ بھی ضرور ربوہ تشریف لائیں گی۔

جواب: اگرچہ ہمارے لئے بڑے دکھ کی بات ہے اور ان کے لئے بھی جو ان کی جدائی کو محسوس کرتے ہیں لیکن پروفیسر صاحب کیلئے تو یہ ایک خوشی کا موقع تھا کہ وہ زندگی کے جھمیلوں سے فراغت پا کر واپس ربوہ پہنچ گئے۔

آپ کے صاحبزادے عمر سلام صاحب

میزبان:۔ عمر آپ کا بہت شکریہ کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ یہاں تشریف لائے ایک بیٹا ہونے کی حیثیت سے آپ کے اپنے عظیم والد کے بارے میں کیا تاثرات ہیں۔

جواب: مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا مگر اپنے باپ کی دو خوبیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جن میں سے

پہلی خوبی ان کا عجز اور انکسار ہے۔ کیونکہ جب میں ایک بچہ تھا تو مجھے اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا کہ میرے والد کتنے عظیم آدمی ہیں اور انہوں نے کیا کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ انہوں نے کبھی اس بات پر فخر محسوس نہیں کیا کہ مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔ مجھے بڑے ہو کر خود ہی ان ساری باتوں کا اندازہ ہوا۔ 1979ء میں جب ان کو نوبل پرائز ملا تو میری عمر صرف 5 سال تھی۔ انہوں نے اسکول میں چاکلیٹ کا ایک ڈبہ مجھے بھجوایا تو میں اپنے دوستوں کے سامنے کچھ خفیف سا ہوا اور مجھے تعجب بھی ہوا کہ میرے والد کا عام حالت میں یہ رویہ نہیں ہے۔ شائد اس موقع کی اہمیت نے ان کو اس اظہار پر مجبور کر دیا تھا۔

دوسری خوبی جو بیماری کے حالات نے مجھ پر ظاہر کی اور اس کا ذکر میری والدہ نے بھی کیا ہے وہ بیماری کے ایام میں ان کا صبر تھا۔ آخری تین چار سال تو شدید بیماری کے تھے مگر شاید اس سے بھی چند اس سال پہلے بیماری کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے بیماری کی حالت میں بھی اپنی شخصیت کو نہیں بدلا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنا کام صبح تین بجے شروع کرنا چاہتے تھے۔ ہر ہفتے وہ کسی نئی جگہ پر جا رہے ہوتے اور نئے لوگوں سے ملتے۔ انہوں نے اپنا کام جاری رکھا حتیٰ کہ وہ اٹھ کر چلنے کے قابل نہیں رہے۔ شدید بیماری کی حالت میں بھی کبھی شکوہ نہیں کیا۔ کبھی غصہ نہیں دکھایا اور کبھی بے قراری کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے اس چیز کا اندازہ ہے کہ وہ کس کرب میں مبتلا تھے لیکن ہم سے انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ بس اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

(یہ لوگ بہت کچھ اور کہنا چاہتے ہوں گے لیکن دکھ اور کرب کی کیفیت جو اشک رواں کی صورت میں آنکھوں سے عیاں تھی اور ان کی رندھی ہوئی آواز سے ظاہر تھی جس کی وجہ سے باتوں کا سلسلہ بار بار ٹوٹتا تھا۔ اور مجبوراً گفتگو کو ختم کرنا پڑا۔)

ادارہ محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں صاحبہ کا ممنون ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس انٹرویو کو Transcribe کیا۔ فجزاھما اللہ احسن الجزاء

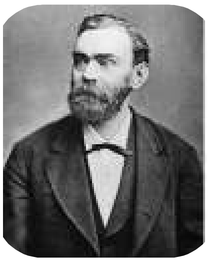

نوبل انعام کا بانی۔الفریڈ نوبل

تحریر مکرم ڈاکٹر سلطان احمد مبشر صاحب

نوبل انعامات کا بانی الفریڈ نوبل تھا۔نوبل سویڈن سے تعلق رکھنے والا عظیم کیمیادان،صنعتکار اور مشہور دھماکہ خیز''ڈائنامیٹ'' کا موجد تھا۔یہ سٹاک ہوم سویڈن میں 21 اکتوبر 1833ء کو پیدا ہوا۔اس کا والد عمانویل نوبل ایک ٹیکنیشن تھا۔نوبل کا خاندان 1842ء میں سینٹ پیٹرز برگ (روس) میں نقل مکانی کر گیا۔جہاں اس کا والد روسی حکومت کیلئے آبدوز سرنگیں اور تارپیڈو تیار کرتا تھا۔

1859ء میں سویڈن واپسی پر الفریڈ نوبل نے سٹاک ھوم کے نزدیک Heleneborg میں آتش گیر مادوں کی ایک تحقیقاتی لیبارٹری میں کام شروع کیا وہاں اس نے نائٹروگلیسرین پر تجربے کئے۔3 ستمبر 1864ء کو ایک دھماکے سے اس کی فیکٹری تباہ ہوگئی۔اس حادثے نے اس کے چھوٹے بھائی کی جان بھی لے لی۔اس کے بعد اس نے ایسی دھماکہ خیز چیز کی تلاش میں تجربات شروع کئے جو کم خطرناک ہو اور جس کی نقل وحرکت میں آسانی ہو۔ 1863ء میں اس نے Blasting Cap on Detonator کی انقلابی ایجاد کی۔ 1864ء میں اس نے نائٹروجن گلیسرین کارپوریشن کی بنیاد رکھی جو اپنی نوعیت کی دنیا میں پہلی کارپوریشن تھی۔ 1865ء میں اس نے Krummel جرمنی میں آتش گیر مادوں کی فیکٹری پائی اور 1866ء میں اس نے ڈائنامیٹ ایجاد کیا۔اس عظیم کامیابی کے بعد اس نے اپنی فیکٹری اور کاروبار کا جال دنیا کے بیشتر مہذب ملکوں میں پھیلا دیا۔

نوبل صرف ڈائنامیٹ کا ہی موجد نہ تھا بلکہ وہ مصنوعی چمڑے اور مصنوعی ربڑ اور مصنوعی ریشم سے بھی متعلق رہا۔مختلف ممالک میں اس کے جو Patent رجسٹرڈ تھے ان کی تعداد 355 تھی۔اس

کی ایجادات میں ڈائنامیٹ کی علاوہ Blasting Gelatinاور Smoke Less Powder بھی شامل ہیں جسے بعد میں Ballistite کا نام دیا گیا۔ 1893ء میں اس نے سویڈن میں Barors Qullspong کمپنی قائم کی۔ یہ کمپنی اس وقت دنیا کی مشہور اسلحہ ساز کمپنی ہے۔

اپنے کاروبار کے علاوہ اس نے باکو(روس) میں کام کرنے والے اپنے بھائیوں رابرٹ اور لڈوگ کے پڑولیم نکالنے کے منصوبوں میں بھی سرمایہ کاری کی۔1865ء سے 1872ء کے درمیان اس نے ہیمبرگ جرمنی میں 1873ء سے 1890ء کے درمیان پیرس (فرانس) میں اور 1891ء میں سان ریمو (SanRemo) اٹلی میں پہلی لیبارٹری کا قیام کیا اسی شہر میں اس کا انتقال 10 دسمبر 1896ء کو ہوا۔اس کے اثاثے ایک فنڈ کے قیام میں صرف ہوئے جس کے منافع سے نوبل انعامات دیئے جاتے ہیں۔

نوبل پرائز

الفریڈ نوبل نے اپنی جائیداد کے متعلق یہ وصیت کی کہ اس کی جائیداد کو رقم کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے اور اصل زر (یہ رقم اس وقت کے زرمبادلہ میں 83 لاکھ 11 ہزار ڈالر تھی) کو محفوظ اور نفع بخش کاروبار میں لگا دیا جائے۔اس طرح اس جمع شدہ سرمایہ سے ایک فنڈ قائم کیا جائے اور اس فنڈ سے حاصل کردہ منافع میں سے ایسے اشخاص کو ہر سال انعامات دیئے جائیں جو گزشتہ ایک سال کے عرصہ میں نوع انسانی کی بہبود و بھلائی کے لئے نمایاں کارنامے اور خدمات انجام دیں۔نوبل نے مزید وصیت کی کہ یہ منافع پانچ مساوی حصوں میں ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جایا کرے جو فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی یا میڈیسن، ادب اور امن کے میدانوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیں۔ امن انعام اس کو دیا جائیگا جس نے مختلف قوموں میں دوستانہ تعلقات پیدا کرنے اور فوجی طاقت کو ختم کر دینے یا تخفیف کر دینے اور قیام امن کی انجمنوں کی تشکیل و ترقی کے سلسلہ میں نمایاں ترین خدمات سرانجام دی ہوں۔نوبل نے اپنی وصیت میں انعامات کے بارے میں فیصلہ کرنے کیلئے

ادارے بھی نامزد کئے جو یہ ہیں۔

فزکس اور کیمسٹری: سویڈش اکیڈمی آف سائنس

فزیالوجی اور میڈسن: کیرولین انسٹی ٹیوٹ آئی سٹاک ہوم

ادب سویڈش اکیڈمی اور امن کے انعام کا فیصلہ Norwegian Storting یا پارلیمینٹ کے منتخب کردہ پانچ افراد پر مشتمل کمیٹی کرے۔ (یادرہے ناروے اس وقت سویڈن کے ساتھ United Kingdom میں تھا۔) نوبل نے اس امر کو بھی واضح کیا کہ ان انعامات کی ادائیگی میں کسی شخص کی قومیت زیر بحث نہ ہو سکے گی بلکہ جو سب سے زیادہ مستحق ہوگا اسے انعام دیا جائے گا خواہ وہ سکنڈے نیوین ہو یا نہ۔ نوبل کی وفات کے بعد اس کی وصیت کے مطابق نوبل فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا اور یکم جنوری 1901ء سے فاؤنڈیشن لے فنڈز کا انتظام و انصرام سنبھالا۔ فاؤنڈیشن نے انعامات کے سلسلہ میں یہ توضیحات کیں کہ ”گزشتہ سال سے مراد“ صرف وہی کام زیر بحث آ سکیں گے جو اس میدان میں سب سے تازہ ہوں لیکن پرانے کام صرف اسی صورت میں کہ ان کی اہمیت ابھی تک واضح نہ ہوئی ہو۔ اس انعام کی رقم مساوی طور پر دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے اس طرح یہ بھی کہ کوئی آئندہ سال پر موخر بھی کیا جا سکتا ہے یا اصل زر میں جمع بھی کیا جا سکتا ہے اگر کوئی قابل ذکر کام نہ ہوا ہو تو یہ اس صورت میں بھی لاگو ہوتا ہے جب کوئی انعام لینے سے انکار کر دے یا وقت پر اسے وصول نہ کرے۔ ہر انعام کو پانچ سال کے عرصہ میں کم سے کم ایک دفعہ ضرور تقسیم ہونا چاہئے تاہم گزشتہ دو عالمی جنگوں کے عرصہ کو چھوڑ کر 1901 سے مسلسل نوبل پرائز دیئے جا رہے ہیں۔ وصیت کے مطابق قائم شدہ ادارے نے تین سے پانچ افراد پر مشتمل نوبل کمیٹی قائم کر رکھی ہے۔ Prize Awarder کی مدد کیلئے خصوصی ادارے جنہیں نوبل انسٹی ٹیوٹ کہا جاتا ہے بنائے گئے ہیں۔ ان اداروں میں لائبریریاں اور تحقیقی کام کیلئے دیگر شعبے قائم کئے گئے ہیں۔ نوبل کمیٹیاں تجاویز کا جائزہ لیتی ہیں اور اپنی آراء کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ سفارشات خفیہ ہوتی ہیں اور

ان کے فیصلہ کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوسکتی۔ کسی بھی انعام کے لئے تجاویز تحریری طور پر داخل کرنا ہوتی ہیں جس میں مجوزہ فرد کے بارہ میں پوری تفاصیل درج کی جاتی ہیں اور اس کے مطبوعہ کام اور دوسری دستاویزات کو منسلک کرنا لازمی ہوتا ہے جن کا نوبل کمیٹیاں تفصیلی جائزہ لیتی ہیں۔ یہ تجاویز صرف وہی افراد دے سکتے ہیں جنہیں ہر سال مرکزی ادارے نامزد کریں تجاویز دینے کے اہل افراد یہ ہیں۔ Prize Awarding Body کے ممبران، گزشتہ نوبل انعام یافتہ، متعلقہ فیلڈ کے مخصوص کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر نیز ادب کے انعام کیلئے سویڈش اکیڈمی سے منسلک اکیڈمیرل، انسٹی ٹیوشن اور سوسائٹیوں کے ممبران اور امن کے انعام کیلئے حکومت کے نمائندے اور بعض مخصوص بین الاقوامی اداروں کے اراکین۔ دیگر حکومتیں یونیورسٹیاں، اکیڈمیاں بذات خود کسی کو امیدوار نامزد نہیں کرسکتیں۔ فنڈ ہر سال وصیت کے مطابق ایک سالانہ رقم اور اس رقم کے جمع کرنے سے جو تقسیم نہ ہو بڑھتا رہتا ہے۔ پہلے انعامات کی کمی بیشی ٹیکس کی وجہ سے تھی لیکن اب فاؤنڈیشن کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ہر انعام کی رقم شروع میں 32000 ڈالر تھی۔ کسی ایک مختصر کی دوبارہ اسی فیلڈ میں یا کسی اور فیلڈ کیلئے نامزدگی پر کوئی قدغن نہیں ہے۔

انعامات ہر سال نوبل کے یوم وفات پر 10 دسمبر کو امن کیلئے اوسلو میں اور دیگر انعامات کیلئے سٹاک ہوم میں منعقد ہونے والی تقریبات میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی انعام یافتہ نہ پہنچ سکتے تو اس کا انعام قانون کے مطابق اس کے ملک کے سفارتی نمائندے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ رقم کے ساتھ ایک ڈپلوما سند اور ایک گولڈ میڈل بھی دیا جاتا ہے۔ گولڈ میڈل کے ایک طرف نوبل کی تصویر اور دوسری طرف انعام یافتہ کی فیلڈ کی علامتی شبیہ کندہ ہوتی ہے۔ نوبل انعام یافتہ تقریب میں اپنے کام کے بارے میں لیکچر دیتا ہے جنہیں نوبل لیکچرز کہا جاتا ہے۔ ان لیکچرز کو بعد میں لوبل فاؤنڈیشن کے سالانہ رسالے Lex Prix Nobel میں شائع کیا جاتا ہے۔

نوبل انعام کی تقریب

ڈاکٹر صاحب کا قرآنی آیات کا تلاوت کرنا

(مکرم منیر الدین احمد صاحب سابق مشنری انچارج سویڈن)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم سائنس سیکھنے اور بار بار تجربات کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحدی کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور خلق میں کسی قسم کا تفاوت اور کمی نہیں پائی جاتی۔ جوں جوں سائنسدان کائنات کی گہرائی میں جاتے ہیں وہ میں بات پکار اٹھتے ہیں اور آخر اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ بات پاکستان کے نامور اور ممتاز سائنسدان اور جماعت احمدیہ کے مخلص فرزند ڈاکٹر عبد السلام صاحب نے سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہالم میں کہی۔ آپ دس دسمبر 1979ء کی شام کو نوبل پرائز کی تقریب میں شامل ہونے والے سکالرز، سفراء پروفیسرز، طلباء، ممبران کابینہ، ممبران پارلیمینٹ، ممتاز شہریوں، شاہ سویڈن، ملکہ اور شاہی خاندان کے دیگر افراد کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ آغاز تقریر میں آپ نے فزکس میں انعام پانے والوں کی نمائندگی کرتے ہوئے حاضرین اور نوبل فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا کیا اور اردو میں یہ بھی کہ ''ہم آپ کے ممنون ہیں''۔

اس کے بعد آپ نے سورۃ الملک کی یہ آیات تلاوت کیں:۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ۔ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ

كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ إِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (الملك 2-5)

''تو رحمٰن کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا۔تو اپنی آنکھ کو ادھر ادھر پھیر کر اچھی طرح دیکھ لے کیا تجھے خدا کی مخلوق میں کوئی رخنہ نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نظر کو چکر دے۔ وہ آخر تیری طرف ناکام لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی مگر اسے کوئی رخنہ نظر نہ آئے گا۔'' (سورۃ الملک: آیت 5 تا7)

آپ نے ان آیات کا انگریزی میں ترجمہ بیان کر کے نہایت لطیف تفسیر بیان کی جو کہ ان (حاضرین) کے لئے بڑی حیرت اور ازدیادِ علم کا باعث ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس تقریب میں لوگوں نے قرآن کریم کی آیات سنیں اور ان کی پر معارف تفسیر سے مستفیض ہوئے۔ (یہ بھی کتنی خوبصورت اور صاحب بصیرت کے لئے ایمان افروز بات ہے کہ برسوں سے نوبل انعام دینے کی کاروائی ہوتی رہی ہے لیکن اس بار یہ پہلا موقع تھا کہ قرآن کی آیات کی تلاوت اس پر وقار محفل میں کی گئی اور اسی طرح کی ایک منفرد بات اقوام متحدہ کی تاریخ میں بھی رقم ہوئی تھی کہ جب ایک ''کافر'' نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی صدارت کرتے ہوئے اس اجلاس کی کاروائی کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ ''کافر'' بھی عجیب ہیں۔)

یہ کافر کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

اس تقریب کی روایات میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں شامل ہونے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاص قسم کا لباس پہنیں جسے سول ڈریس کہا جاتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب پاکستان کے قومی لباس پگڑی، شیروانی، شلوار اور کھسہ پہن کر اس تقریب میں شامل ہوئے اور آپ اس لباس میں تمام حاضرین میں سب سے نمایاں تھے۔ آپ نے قومی لباس پہن کر اس میں حصہ لیا۔ تقریب سے پہلے ہی منتظمین کو اطلاع دے دی تھی کہ وہ اپنا قومی لباس پہن کر تقریب میں شامل ہوں گے۔ اخبارات نے نمایاں سرخی کے ساتھ یہ بات شائع کی اور لکھا کہ یہ لباس سول ڈریس سے بہتر ہے اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ کسی انعام لینے والے نے اس تقریب میں اپنا قومی لباس پہن کر اس میں حصہ لیا۔ اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے خاکسار کو بھی دعوت نامہ ملا تھا۔ چنانچہ خاکسار اس

تقریب میں شامل ہونے کے لئے گوٹن برگ سے سٹاک ہام پہنچ گیا۔ ڈنر کے موقعہ پر سویڈن کے بادشاہ سے ملاقات کر کے اپنا تعارف کرایا اور ان کی خدمت میں کتاب ESSENCE OF ISLAM پیش کی جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کی۔ اس موقعہ پر کئی دیگر نامور شخصیات کے علاوہ سویڈن کے وزیر اعظم سے بھی تعارف حاصل ہوا۔ اس تقریب سے ایک دن قبل بھی میں اس استقبالیہ میں شامل ہوا تھا جو انعام حاصل کرنے والوں کے اعزاز میں نوبل کمیٹی کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس استقبالیہ میں بھی بہت سے نامور سکالرز سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ کتاب مذکورہ کا ایک ایک نسخہ چیئرمین نوبل فاؤنڈیشن، پاکستانی سفیر، فزکس میں انعام لینے والے امریکن سائنسدان اور RUANDA کے سفارت خانہ کی سیکرٹری کو تحفہ کے طور پر دیا اور اپنا تعارف بھی کرایا۔

نوبل پرائز کی تقریب حسب روایات دس دسمبر 1979ء کو سٹاک ہالم کے Concert Hall میں منعقد ہوئی تھی۔ پروفیسر عبدالسلام صاحب کی فیملی کے افراد کے علاوہ مکرم آفتاب احمد صاحب سابق سفیر پاکستان اور مکرم حمید احمد صاحب ابن چودھری غلام حسین صاحب مرحوم ربوہ لنڈن سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تقریب میں شامل ہونے کے لئے تشریف لائے تھے اور مبارک احمد صاحب راجپوت اوسلو سے سٹاک ہالم پہنچ کر تقریب میں شریک ہوئے۔ دیگر مہمانوں میں پاکستان کے سفیر عظمت بخش اعوان بھی شامل تھے۔

کاروائی ساڑھے چار بجے شروع ہونا تھی۔ سوا چار بجے سے پہلے سب مہمان اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سٹیج پر ایک طرف نوبل اداروں کے عہدیداران بیٹھے تھے اور دوسری طرف گذشتہ سالوں میں نوبل انعام لینے والے تشریف رکھتے تھے۔ ان کے درمیان الفریڈ نوبل کا مجسمہ سجا ہوا تھا۔ ہال کی پہلی قطار میں شاہی خاندان کے افراد جن میں بادشاہ سلامت کی دو ہمشیرگان بھی شامل تھیں اور انعام لینے والوں کی بیگمات بیٹھی تھیں۔ پچھلی قطاروں میں انعام لینے والوں کے دوست اور دیگر رشتہ دار بیٹھے تھے اور گیلریوں میں سویڈن کے وزراء، ممبرز آف پارلیمنٹ، اخباری نمائندگان اور دیگر معززین تشریف فرما تھے۔ شاہی بینڈ بھی گیلری میں موجود تھا۔ سوا چار بجے بادشاہ

اپنی ملکہ، ولی عہد اور ان کی بیگم کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ بینڈ نے بادشاہ کا نغمہ گایا اور یہ نغمہ ختم ہونے بعد چاروں اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بگل بجا اور دوسرے دروازہ سے انعام لینے والے ایک جلوس کی شکل میں سٹیج پر آئے اور شاہی کرسیوں کے سامنے دوسری طرف بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بینڈ نے قومی ترانہ بجایا اور سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے تقریب کی کاروائی شروع ہوئی۔ نوبل فاؤنڈیشن کے انچارج نے بادشاہ، ولی عہد، سکالرز اور دیگر مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور نوبیل اداروں کا تعارف کروایا۔ اس کے بعد انعامات تقسیم ہوئے۔ ہر کمیٹی کے انچارج نے اپنی تقریر میں بتایا کہ متعلقہ مضمون میں انعام حاصل کرنے والوں نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے اور اس کی افادیت کیا ہے۔ آخر میں اس سکالر کا نام پکارا جاتا اور بادشاہ سے درخواست کی جاتی کہ وہ انہیں انعام عطا کریں۔ بادشاہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر سٹیج کے درمیان آ کر انعام دیتے۔ سکالر اپنی سیٹ سے اٹھ کر سٹیج کے درمیان آ کر انعام وصول کرتا۔ حاضرین تالیوں سے داد دیتے اور سکالر شکریہ ادا کر کے اپنی سیٹ پر واپس چلا جاتا۔ شاہی بینڈ وقتاً فوقتاً اپنے نغموں سے محفوظ کرتا رہا۔ یہ پروگرام براہ راست ٹیلی ویژن پر کاسٹ ہو رہا تھا اور سارے ملک میں دکھلایا گیا۔ پاکستان ٹی وی نے بھی سیٹلائٹ کی مدد سے ڈاکٹر صاحب والا حصہ براہ راست ٹیلی کاسٹ کیا۔ اس کے بعد سب لوگ سٹاک ہالم سٹی ہال میں گئے جہاں ڈنر کا اہتمام تھا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو یکدم بگل کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ مع دیگر مہمان خصوصی تشریف لا رہے ہیں۔ یہ پارٹی دو قطاروں میں آ رہی تھی۔ ملکہ سلامت ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے ساتھ تشریف لا رہی تھیں اور کھانے کی میز پر بھی انہی کے ساتھ ان کی جگہ تھی۔

کھانے کے دوران یونیورسٹی کے طلباء نغمات گاتے رہے۔ بینڈ بھی وقفے وقفے سے دھنیں بجاتا رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ آئس کریم لائی جا رہی ہے۔ بیرے ہاتھوں میں آئس کریم کی ٹرے تھامے چلے آ رہے تھے اور آگے آگے ملے میوزک بج رہا تھا۔ ہر ٹرے میں ایک بڑا آئس کریم کا ٹکڑا تھا جس

پر حرف ''16'' نمایاں طور پر لگا ہوا تھا۔ 16 سے نوبل کی طرف اشارہ مقصود تھا گویا نوبلی کے نام کی آئس کریم تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد مہمانوں کو کافی پیش کی گئی۔ ازاں بعد انعام حاصل کرنے والوں نے باری باری تقریریں کیں اور یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

(انٹرویو: وارث میر روزنامہ نوائے وقت لاہور)

ایک عظیم توحید پرست سائنسدان

''کبھی خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کو کم علم کہا جاتا تھا اسے خدا کے وجود سے انکار کرنے والے کو کم علم کہا جاسکے گا۔''

نوبیل انعام حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو

(مرسلہ: امۃ الحی آسیہ صاحبہ لاہور)

پاکستان کے ڈاکٹر عبد السلام نے نوبیل انعام حاصل کیا ہے اور ہماری خواہش تھی کہ بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ نوبل انعام کے ''سیاہی پہلو'' پر بھی ان سے تبادلہ خیالات کریں۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی مصروف انسان ہیں ایک طرف تو امپیریل کالج کی نظریاتی طبیعیات کی ''چیئر'' کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں تو دوسری طرف وہ ٹرائسٹ (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھوریٹیکل فزکس کے ڈائریکٹر بھی ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بین الاقوامی مصروفیات ویسے بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ایک ہفتہ لندن میں اور دوسرا ہفتہ کسی دوسرے یورپی ملک میں ہوتے ہیں۔ برطانوی صحافیوں کیلئے انہیں پکڑنا مشکل ہو رہا تھا بہر حال ہمیں اس میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ اور ہم نے ان کے سامنے نوبل پرائز کی سیاست پر بات کر ہی دی۔ ہماری بات ان کے لئے یقیناً

غیر متوقع اور اخبار نویسی کے مہذب ''اصولوں کے منافی تھی لیکن انہوں نے بڑے تحمل اور بردباری سے جواب دیا۔''

''سائنسی تحقیق میری زندگی بن چکی ہے اور میرے لئے رموز فطرت کی تلاش دراصل خدا کی حکمتوں کی تلاش ہے۔ میں اس انعام کو بھی اللہ کا کرم سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اس کی حکمتوں کی تلاش کرنے والا ذہن ہر قسم کی سیاست بازی سے آزاد ہوتا ہے۔ انعام دینے والوں کی پالیسی پر بحث کرنا میرا کام نہیں ہے لیکن دنیا کا ہر قابل ذکر سائنسدان آپ کو بتائے گا کہ میں ان دنوں پاکستان میں ہوتا یا پاکستان سے باہر۔ برقی مقناطیسیت اور کمزور نیوکلیر طاقت کے بارے میں تھیوری دنیائے سائنس سے اپنا لوہا خود منوا رہی ہے کاروبار فطرت چلانے والی چار قوتوں کا تین قوتوں میں تبدیل ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات تو ہے نہیں کہ دنیا اسے نظر انداز کر سکتی۔ آخری تجربات کے بعد یہ تھیوری سو فیصد Establish ہو جائے گی پھر سوال اٹھے گا کہ تین قوتیں دو میں تبدیل ہو جائیں اور دو بھی ایک ہو جائے اور تب یہ ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا نظام دراصل ایک ہی قوت کا کرشمہ ہے۔'' (ڈاکٹر عبد السلام انتہائی منکسر المزاج اور بے تکلف شخص ہیں اور سائنسی نکات پر بھی مذہبی نقطہ نظر سے گفتگو کرتے ہیں۔ (اس گفتگو کی تفصیل پیش ہے)

سوال:۔ برطانوی پریس میں یہ بات عام کہی گئی ہے کہ سائنس کی مکمل تصدیق سے پہلے ہی آپ یہ مذہبی عقیدہ رکھتے ہیں اور اس عقیدے کا ہر ایک سے ذکر کرتے ہیں کہ کائنات پر محیط تمام قوانین میں وحدت ہے اور رفتہ رفتہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ باقی تین قوتیں بھی ایک ہی قوت کا کرشمہ ہے یعنی یہ ساری کائنات ایک ہی ذات کا ظہور ہے۔ تو پھر آپ نے اس پہلو پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ فلسفہ وحدت کے نشے میں سرشار بعض صوفیائے کرام شعراء اور ایمان کی اس منزل پر نسبتاً کم دنیادی علم کے سہارے اور کم عرصے میں کیونکہ پہنچ جاتے ہیں؟ خدا سے تعلق رکھنے والوں کی سائنسدانوں پر یہ برتری کیسی؟

جواب: میں آپ سے متفق ہوں کہ خدا رسیدہ ہستیوں کو سائنس دانوں پر برتری حاصل ہے۔

صوفیائے کرام منتخب لوگ ہوتے ہیں اور سائنس دان ایک عام انسان کی تمام تر بے بضاعتیوں کے ساتھ کائنات کے اسرار پر غور کرتا ہے لہذا دونوں کی اپروچ اور کیفیت میں فرق ہے۔صوفی کو بھی مقام حیرت سے منزل یقین تک پہنچنے میں جدو جہد کرنی پڑتی ہے لیکن سائنس دان عمر بھر مقام حیرت کے اردگرد بھٹکتا رہتا ہے اور اس بھٹکنے میں اس کی جدو جہد کی مسرتوں کا راز پوشیدہ ہے۔فیض نے کہا ہے۔

کئی بار اس کی خاطر، ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں ، جس کی حیرانی نہیں گئی

میں بھی سائنس کے ایک طالب علم کے طور پر اسرار کائنات پر غور کرتے ہوئے، مقام حیرت پر ہوں لیکن ساتھ ہی اس کوشش میں ہوں کہ پوری انسانیت پر اس مذہبی عقیدے کی حقانیت واضح ہو جائے۔کہ کائنات کی تمام قوتوں میں وحدت کا اصول کارفرما ہے اور ہم سب منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ یہ کیفیت خدا رسیدہ لوگوں سے پھر بھی مختلف ہی ہوگی، مغرب کے کئی دانشور، مجھے سوال کرتے ہیں کہ سائنس کے اصولوں میں خدا کہاں سے آ ٹپکتا ہے تو میں انہیں ہمیشہ میں جواب دیتا ہوں۔''خدا ہی انسانی ذہن کو ایک خاص نکتے کی طرف مائل کرتا ہے اس کی مرضی ہو تو وہ اپنا کوئی راز انسان پر منکشف کرتا ہے۔''میں دنیا کے بیسیوں سائنس دانوں اور سینکڑوں دانشوروں سے ملا ہوں اور میرا یہ مشاہدہ ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے والا انسان، بہرصورت، خدا کو نہ ماننے والے انسان سے بہتر ہوتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے برٹرینڈ رسل سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ بات بتائی۔

''ایوب خان برطانیہ کے دورے پر آئے۔بھٹو صاحب بھی ان کے ساتھ تھے ان دنوں ایک بنگالی مسلمان اے ٹی ایم مصطفیٰ وزیر تعلیم تھے۔اتفاق سے ایوب خان کے دورہ برطانیہ کے دنوں میں برٹرینڈ رسل سے میری ملاقات طے تھی۔اے ٹی ایم مصطفیٰ نے بھی برٹرینڈ رسل سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ چل دیئے۔اے ٹی ایم مصطفیٰ نے خدا کے وجود کے مسئلے پر

برٹرینڈ رسل سے بڑی زوردار بحث کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تو چلے گئے اور میں برٹرینڈ رسل کے پاس رہ گیا۔ بوڑھے برٹرینڈ رسل نے کہا۔

''لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں 96 سال کے برٹرینڈ رسل کو آدھ گھنٹہ کی گفتگو سے خدا کے وجود کا قائل بنایا جاسکتا ہے۔'' چنانچہ یہ بحث میرے ساتھ بھی شروع ہوگئی۔ مَیں نے کہا خدا کو مانے بغیر انسان کے کردار میں بہت سی بنیادی خرابیاں رہ جاتی ہیں اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ خدا کے ماننے والوں نے انسانیت کی خاطر زیادہ قربانیاں دیں اور وہ خدا کو نہ ماننے والوں کے مقابلے میں بہتر انسان ثابت ہوئے۔ برٹرینڈ رسل نے کہا۔'' کوئی مثال دو'' ظاہر ہے مثال دیتے ہوئے مجھے بہت محتاط ہونے کی ضرورت تھی کسی ایسے نام کی تلاش تھی جس پر برٹرینڈ رسل اتفاق کرسکے۔ میرے ذہن میں گاندھی کا نام آیا۔ گاندھی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آخری سالوں میں اس نے متعصب ہندوؤں کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا اور غالباً مسلمانوں کی طرف نرم رویہ رکھنے کی پاداش میں انہیں قتل بھی کردیا گیا۔ مَیں نے برٹرینڈ رسل سے کہا۔'' گاندھی کی شخصیت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔'' برٹرینڈ رسل نے بڑی حیرانی سے میری طرف دیکھا اور کہا۔'' کس کا نام لیتے ہو گاندھی کا؟ وہ تو نہایت ظالم اور سنگدل انسان تھا۔'' مَیں نے کہا'' وہ کیسے؟'' برٹرینڈ رسل نے کہا۔ ''اس ظالم نے 40 سال کی عمر میں اپنی بیوی کو تمام ازدواجی مسرتوں سے محروم کردیا تھا اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے۔

سوال: برطانیہ میں ذرائع ابلاغ نے میں تاثر دیا ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کا اعزاز برطانوی سائنس کا اعزاز ہے۔ میرے خیال میں ایسے انتظامات بھی کئے جائیں گے کہ اب آپ پاکستان کبھی نہ لوٹ سکیں۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟ مغرب ہی کو اپنی سائنسی تحقیقات کا مرکز بنائیں گے یا وطن لوٹنے کی خواہش بھی دل میں رکھتے ہیں؟

جواب: یورپ ہی میں رہ جانے کے سامان تو بہت پیدا ہورہے ہیں۔ مثلاً ٹرسٹے کے سنٹر کو میرے نام سے توسیع دینے کا فیصلہ کیا جارہا ہے اس مقصد کیلئے 100 ملین ڈالر کا ایک فنڈ شروع کیا

گیا ہے جس کی مدد سے اس قسم کے مزید سنٹر قائم کئے جائیں گے۔ اٹلی کے صوبہ ٹرسٹے نے مجھے ایک گولڈ میڈل دیا ہے۔ اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی جارہی ہے اور مزید ایک نئے میڈل اور ایک نئے مکان کا انتظام بھی کیا جارہا ہے۔ لیکن یہ جان کر آپ کو حیرانی ہوگی کہ میں نے اپنی تحقیقی زندگی کا بیشتر حصہ انگلینڈ اور یورپ میں گزارا اور برطانوی شہریت اختیار کرنے کا خیال تک کبھی دل میں نہیں آیا۔ برطانوی اخبارات کچھ بھی کہیں میں اب بھی اپنے پاکستانی ہونے پر اصرار کرتا ہوں اور مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ برطانوی شہریت لینے سے محترز رہنے کی وجہ یہ بھی رہی کہ میں اپنے اعزاز میں پاکستان کو شریک کرنا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں ابتدائی تین سالہ قیام کے دوران میں تحقیقی کارکردگی صفر کے برابر تھی۔ وہ سارا عرصہ تو میں طالب علموں کو فٹ بال کھیلاتا رہا۔

سوال: فٹ بال کھلاتے رہے؟ آپ کے تعلیمی و تحقیقی کیریئر کا یہ حصہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے ...... وضاحت ہوجانی چاہئے؟

جواب: میری زندگی میں تین اہم موڑ آئے ہیں اور یہیں سے میری زندگی کی نئی راہیں ہموار ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً شروع ہی سے والدین کی خواہش تھی کہ میں آئی سی ایس بن جاؤں۔ ممکن ہے میں خود بھی اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ نہ بن سکتا لیکن اچانک جنگ شروع ہوگئی اور اس سال مقابلے کے امتحانات ہی نہ ہو سکے۔ اگر امتحانات ہو جاتے اور میں ان میں شریک ہو جاتا تو اس وقت تک میرے کیریئر کی معراج چیف سیکرٹری کا عہدہ ہوتا۔ دوسرا اہم واقعہ 1942ء میں پیش آیا میں نے اسی سال ریاضی میں ایم اے کیا تھا۔ وظیفہ ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا قدرت نے اس کی تدبیریوں پیدا کی کہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے جنگ کے لئے جمع شدہ چندے میں سے کسانوں کے لئے بہبود فنڈ قائم کیا تھا۔ اس چندے میں سے بیرونی ممالک میں تعلیم کیلئے چھ وظائف کا اعلان کیا گیا۔ ڈاکٹر فضل حسین مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے انٹرویو لیے بغیر مجھے وظیفہ دے دیا۔ بقیہ 5 وظائف کیلئے کسی کا انتخاب نہ ہو سکا اور اگلے سال تک پاکستان بن جانے

کے بعد یہ وظائف ہی ختم ہو گئے۔ قدرت کے انتظامات دیکھئے! 4 ستمبر کو کیمبرج میں داخلہ ملا، 5 ستمبر کو وظیفہ ملا اور 7 یا 8 ستمبر تک میں ملک چھوڑ چکا تھا۔ تیسرا موڑ گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت کے زمانے میں کاٹنا پڑا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوا۔ کالج کے پرنسپل سمجھتے تھے کہ اس کالج کے استادوں کا کام ریسرچ کرنا نہیں۔ گورنمنٹ کالج کے مزاج کے مطابق ''معیاری کالجیٹ'' پروان چڑھانا ہے۔ پرنسپل صاحب نے فرمایا ''ہاسٹل کے وارڈن بن جاؤ'' کالج اکاؤنٹس کے انچارج بن جاؤ، یا فٹ بال ٹیم کے صدر بن جاؤ۔ میں فٹ بال ٹیم کا صدر بن گیا۔ ہر شام طالب علموں کو چوبرجی کی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلاتا اور ان کے لئے دودھ وغیرہ کا انتظام کرتا۔ دو اڑھائی سال کے بعد پرنسپل نے ہماری سالانہ خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص گورنمنٹ کالج کے مزاج کے مطابق نہیں ہے انہیں پنجاب یونیورسٹی میں بھیج دیا جائے۔ 1953ء میں مجھے کیمبرج یونیورسٹی نے پیش کش کی تھی اور میں نے تین ماہ یہ سوچنے میں گزار دیئے تھے کہ پیش کش قبول کروں یا نہ کروں؟ میں اپنا وطن کسی صورت میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وطن نہ چھوڑتا تو میں سائنس کا ''معیاری'' استاد کبھی تسلیم نہ کیا جاتا۔

سوال: نوبل انعام کی روایت، علمی دنیا کو ایک نفسیاتی نقصان بھی پہنچا رہی ہے کہ انعام مل جانے کے بعد علم کے اس میدان میں اس شخصیت کے نام کی ایسی اتھارٹی قائم ہو جاتی ہے کہ مخالف یا متضاد نقطہ نظر کا آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جواب: سائنس کی دنیا میں کسی کو سند تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کوئی سچا سائنس دان کسی بڑے نام یا ذہنی تعصب کی بنا پر آگے بڑھنے سے نہیں رک سکتا۔ ایک پادری صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی (Relevarce of Physics) اس کتاب میں اس نکتے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا کہ مختلف اوقات میں مختلف فزسسٹ غلط ثابت ہوتے رہے ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ایک انیس سالہ نوجوان مسٹر پاول کی مثال دی تھی کہ اس کے سپرد آئن سٹائن کے کام پر ریویو لکھنا تھا اس انیس سالہ نوجوان نے آئن سٹائن کے نظریات پر انتا زوردار اختلاف کیا اور اس پر ایسی سخت

تنقید کی کہ کسی نے شاید و باید ہی کی ہوگی۔ سائنس میں اسناد نہیں ہوتیں۔ ہر سائنس دان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ سائنس دانوں کی نامکمل تحقیقات کو آگے بڑھانا ہی نئے سائنس دانوں کا کام ہے۔ پاکستان میں بھی اختلاف اور تنقید کی روایت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ سائنس اور علم کی دنیا میں فرسودہ سوچ اور عمل کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سوال: آپ پاکستان کی سائنس پالیسی کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

جواب: پاکستان کی سائنس پالیسی؟ کیسی پالیسی؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کا نام بھی سیاسی حکمت عملی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ پاکستان سائنسدان کیلئے قید خانہ ہے اس پر مزید علم اور تجربہ حاصل کرنے کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستان میں سائنس کا علم کہاں سے آئے گا۔ اگر سائنس کے طالب علم کا ملک سے باہر جانا ناممکن بنا دیا جائے گا۔ بھارت کے مقابلے میں چھوٹا ملک ہونے کے باوجود ٹرسٹے میں پاکستان کے ساتھ کبھی غیر مساویانہ سلوک نہیں کیا گیا لیکن اب کسی پاکستانی سائنسدان کو ملک سے باہر جانے کے لئے چھ مختلف ایجنسیوں اور دفتروں سے اجازت نامے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ اہل علم ملک سے باہر جانے پر پابندیاں کمیونسٹ ممالک کے بعد پاکستان میں سب سے زیادہ ہے۔

سوال: پاکستان کو تو سائنس کے میدان میں اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ سائنسدانوں کے ملک سے باہر رہ جانے پر تو مناسب پابندیاں ہونی چاہئیں۔ انہیں ملک سے باہر نہ جانے کا پابند بنانے کی پالیسی کہاں سے اور کب آئی؟

جواب: میری وجہ سے اٹلی میں تھیوریٹکل فزکس کے سنٹر میں پاکستانی طالب علموں کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ اب الا ماشاء اللہ پاکستانی طالب علموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پاکستان میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوا تو بھٹو صاحب کے لئے میری یہ جرات نا قابل برداشت تھی۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ استعفیٰ واپس لینے پر اصرار کرتے رہے اور کہا:۔

میں آپ کو کسی صورت بھی ضائع نہیں کر سکتا میری مجبوریوں کا احساس کریں۔ مجھ پر اتنا سیاسی

دباؤ ہے کہ راتوں سے سو نہیں سکا میری نیند اڑ گئی ہے۔''

میں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا اور بھٹو صاحب نے ٹرسٹ کے سنٹر میں پاکستانیوں کا داخلہ ہی بند کر دیا۔ صرف مجھ سے انتقام لینے کے لئے انہوں نے طالب علموں کو باہر بھجوانے کے سارے اختیارات منسٹری آف اکنامک افیرز کے سپرد کر دیئے۔ موجود حکومت کے ایک وزیر نے مجھے بتایا تھا کہ طالبعلموں کے باہر آنے کا معاملہ بھٹو صاحب نے فنی طور پر اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ طریق کار میں فوری تبدیلی ذرا مشکل بات ہے۔ بھٹو صاحب باقاعدہ فائل پر لکھ گئے تھے کہ طالب علموں کے باہر جانے کے قواعد میں زیادہ سے زیادہ سختی پیدا کر دی جائے۔ ٹرسٹ کے ادارے سے پاکستان کا تعلق ختم کرنے کیلئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے گئے کہ نا قابل بیان ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کیلئے میرے میمورنڈم کو لاہور کی اسلامی کانفرنس میں پیش کیا گیا۔ یہی کمرہ تھا (میں ڈاکٹر صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا جس میں فرنیچر کی بجائے چاروں طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں) راجہ صاحب محمود آباد کی موجودگی میں اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے خیال کو میں نے ڈرافٹ کی صورت دی۔ یہ ڈرانٹ بھٹو صاحب کو بھیجا گیا۔ تجویز یہ تھی کہ اس فاؤنڈیشن کا مرکز جدہ ہونا چاہئے اور اسلامی ملکوں کو دو بلین ڈالر کے بجٹ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ 1979ء کے آخر میں مسلمان سائنسدانوں کے ایک اجلاس میں میرے ڈرافٹ پر بحث کی گئی لیکن اس اجلاس میں میری شرکت کو ناممکن بنا دیا گیا۔ 1978ء کے آخر میں میری پیش کردہ تجویز پر تمام اسلامی ممالک متفق ہو گئے۔ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کی تجویز میرے ذہن میں صرف اس لئے آئی تھی کہ میں اس فاؤنڈیشن کے ذریعے اسلامی سائنس میں انقلاب لانا چاہتا تھا۔ عرب ملکوں (خاص طور پر سعودی عرب) سے ذمہ دار حضرات میرے پاس آتے رہے کہ ہم آپ کو بلانا چاہتے ہیں لیکن بھٹو صاحب کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ معلوم نہیں بھٹو صاحب کے سیاسی فیصلوں کی بنیاد موجود ہوتی تھی یا وہ بعض فیصلوں کی بنیاد خود مہیا کرتے تھے؟

سوال: آپ نے سعودی عرب کے ذمہ دار حلقوں کا ذکر فرمایا لیکن جس سیاسی فیصلے کا آپ ذکر

کرنا چاہتے ہیں سنا ہے کہ اس پر سعودی عرب بھی اثر انداز ہوا تھا؟

جواب: میں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سعودی حکومت اور شاہی خاندان میں رواداری اور اعتدال کے مظاہرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ نیو یارک سے محمد بن فیصل بن سعود کا مبارک باد کا پیغام آیا ہے جس کے الفاظ ہیں۔ ''آپ کا اعزاز دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے باعث مسرت ہے۔''

الجزائر اور لیبیا کے مختلف وزراء کی طرف سے بھی تار پہنچے ہیں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر کے گھر میں مختلف مسلمان زعماء اور سائنسدانوں نے میری بہت عزت افزائی کی ہے۔ اسلامک کلچرل سنٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر بدوی نے تو بیس مسلمان ملکوں کے سفیروں کو جمع کر لیا تھا اور اپنی استقبالیہ تقریر میں انہوں نے فرمایا ہے کہ ''ایک پاکستانی کو نوبل انعام ملنے کے بعد عالم اسلام پر بین الاقوامی انعامات کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ہمارا یہ احساس کمتری بھی ختم ہو گیا ہے کہ خدا کو ماننے والا کبھی بڑا سائنسدان نہیں ہو سکتا اور نئی نسل کیلئے یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے کہ اتنا بڑا انعام ایک ایسے پاکستانی کو ملا ہے جس کے عقیدے اور عمل میں کوئی تضاد نہیں ہے............''

سوال: ڈاکٹر صاحب! نوبل پرائز کے سیاسی پہلو پر آپ کی گفتگو تشنہ ہی رہی تھی؟

جواب:۔ جہاں تک میرے انعام کا تعلق ہے اس سے مغربی دنیا میں پاکستان کا وقار بلند ہوا ہے نقصان تو کوئی نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انعامات کا سلسلہ 1991ء میں شروع ہوا۔ امریکن نوبل پرائز لینے والوں کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ کل انعام یافتگان کی تعداد (جنگ کے بعد) پانچ سو کے قریب ہے۔ ان میں سے 32 انگریز ہیں اور 12 جرمن ہیں۔ ایک سو امریکی انعام یافتگان میں سے 54 یہودی ہیں۔ امریکہ میں تین فیصد یہودی ہیں۔ لیکن پروفیسر شپ کا دس فیصد یہودیوں کے پاس ہے۔

سوال: یہودیوں میں زیادہ سائنسدان پیدا ہونے کی وجہ؟

جواب: حکومتی اور خاندانی سطح پر علم اور سائنس کی قدر افزائی کی پالیسی یہودی اپنی لڑکیوں کی

شادی کرتے وقت سائنسدانوں اور عالموں کو ترجیح دیتے ہیں ۔ان کے ہاں عالم اور سائنسدان کا معاشرتی مقام بلند ترین تصور کیا جاتا ہے۔اوران کی ترقی کا ایک بڑا راز اس قدری نظام میں پوشیدہ ہے اس کے برعکس پاکستان میں طالب علم آسان مضامین پڑھنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور معاشرے میں عزت واحترام کے معیار سیاست، دولت اور سرکاری عہدوں کے حوالے سے متعین ہوتے ہیں ۔ پاکستان میں سائنسی علوم کے بارے میں نہ کبھی حکومت سنجیدہ ہوئی ہے۔ نہ تعلیمی ادارے اور نہ ہی خاندانی اور معاشرتی سطح پر ان علوم کو کوئی عزت وتوقیر حاصل ہے۔البتہ مذہب اور خدا کا بہت نام لیا جاتا ہے۔میں کہتا ہوں ''پاکستان والو! خدا اور مذہب کی صحیح پہچان پیدا کرنا چاہتے ہو تو سائنس پڑھو ورنہ تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں ۔میں نے تو پاکستان والوں کے لئے Space کمیٹی بھی بنائی تھی اور اٹامک انرجی کمیشن بھی قائم کیا تھا۔

سوال: ہم دونوں نے گفتگو سے پہلے سچ بولنے کا عہد کیا تھا میں ایک ناخوشگوار سا سوال ضرور کروں گا اس اسرائیلی مشن کے بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں، جو پاکستان میں ہمیشہ زیر بحث رہا اور اس کو بنیاد بنا کر آپ کے ہم مسلک بھائیوں پر شدید تنقید بھی کی جاتی رہی ہے اور ممکن ہے آپ لوگوں کے متعلق قومی اسمبلی سے فیصلہ لیتے ہوئے بھی اس ''افواہ'' کو استعمال کیا گیا ہو۔(پاکستانی سادہ لوح عوام کو مشتعل کرنے اور احمدی احباب سے متنفر کرنے کیلئے پاکستانی ''علماء'' اور مولوی ایک بھونڈا سا فقرہ کہا کرتے ہیں کہ جماعت احمدیہ کا اسرائیل میں تبلیغی مشن ہے جس سے ثابت ہوا کہ یہ اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔انٹرویو کرنے والے صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔مدیر)

جواب: یہ پاکستانی مسلمانوں کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ وہ اکثر گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار بنتے ہیں یہ محض بہتان ہے اور میں پوری ذمہ داری سے اس کی تردید کرتا ہوں ۔حقیقت صرف اتنی ہے کہ اسرائیل کے قیام سے پہلے کے زمانے میں بعض عرب بھائی حیفہ میں آباد ہیں اور وہ ہمارے ہم مسلک ہیں ۔اسرائیل ان کا وطن ہے اور ہم انہیں وطن بدر نہیں کر سکتے ۔ یہ محض افواہیں اور بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے۔رہا میری ذات کا تعلق تو مجھ سے سائنسدان ہونے کا اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا۔

چند بے خبر اور لاعلم بھائی میرے بارے میں کچھ ہی کہیں میں ایک سائنس دان تو بہر صورت رہوں گا۔ بوعلی سینا کو اس کی زندگی میں زندیق کہا گیا لیکن وہ فوت ہو گیا تو لوگوں کو صرف سائنسدان بوعلی سینا یاد رہ گیا۔ کتنے لوگوں کو بوعلی سینا کے اخلاقی عیوب کا علم ہے۔ میرے اپنے جذبات تو یہ ہیں کہ میں صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اٹلی کی طرح کے ادارے میں اور ملکوں میں بھی قائم کرسکوں اور دنیائے اسلام کو فائدہ پہنچا سکوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اٹلی کے سنٹر میں بیک وقت چودہ انعام یافتگان 25 ڈالر روزانہ کے معاوضے پر کام کرنا بھی باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اب تو میری حیثیت اور پوزیشن میں پہلے سے کہیں اضافہ ہو چکا ہے۔ ان علماء کی خدمات سے بہتر طریقے سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں سائنس کا ایسا ذوق وشوق پیدا ہو جائے کہ ہر مسلمان سائنسدان ہر سال ایک پرائز حاصل کرے میری تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں سائنسی تحقیقات کا ایک اعلیٰ ترین ادارہ قائم کر جاؤں میں اس سلسلے میں لیبیا جا رہا ہوں۔

سوال: پاکستان آپ کے ذہن میں نہیں ہے؟

جواب: انعام وصول کرنے کے بعد پاکستان جانے کا ارادہ بھی ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے سلسلے میں کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے میں نے ایوب خان اور بھٹو کے ساتھ کام کیا ہے پاکستان کا کوئی حکمران سائنس کی اہمیت سے آگاہ نہیں رہا۔ بھارت کے جواہر لال نہرو خود سائنس کے طالبعلم تھے۔ لینن سائنس کا طالب علم تھا۔ یہ لوگ سائنسی ذوق رکھتے تھے۔ پاکستان میں آج تک سائنس کا کوئی سنجیدہ طالب علم سیاسی طور پر برسراقتدار نہیں آیا۔ جاپان نہایت مختصر عرصے میں صنعتی دوڑ میں مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے اس کی وجہ؟ اس کی بڑی وجہ جاپان کے ابتدائی نظام تعلیم میں سائنس کے مضامین کی بے پناہ اہمیت ہے۔ جاپان میں میٹرک کے امتحانی زمانے کو ''خودکشی کا موسم'' کہا جاتا ہے۔ جاپان کے 1976ء کے انقلابی آئین میں ایک شق بہت اہم تھی۔ ''علم حاصل کیا جائے گا دنیا کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی قیمت پر'' 1935ء میں

ایک جاپانی سائنسدان ''یوکارا'' کو تھوریٹیکل فزکس میں پہلا نوبل انعام ملا تھا۔ جاپان کے فارن آفس کے ایک ذمہ دار افسر نے اس وقت کے اپنی قلبی تاثرات بیان کرتے ہوئے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ یہ وہ دن تھا جب سے مجھے اپنے جاپانی ہونے پر فخر محسوس ہونے لگا اور میں نے تہیہ کرلیا کہ جاپانی سائنسدان ''یوکارا'' کے آئیڈل کو آگے بڑھانے کیلئے زندگی بھر کام کروں گا۔'' اس شخص نے جاپان میں سائنس کو آگے بڑھانے کے لئے واقعی قابل قدر کام کیا۔ ضمناً عرض ہے کہ میرے نوبل انعام کی خبر ملنے پر الطاف گوہر صاحب نے ٹیلی فون کیا کہ ''ڈاکٹر صاحب! میرا احساس یہ ہے کہ یہ انعام آپ کو نہیں مجھے ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں سائنس کا ہر طالبعلم یہی محسوس کرے اور خود بھی انعام حاصل کرنے کیلئے شب و روز مصروف ہوجائے اور سائنس کے میدان میں مغرب کی فوقیت کا تاج اس کے سر سے اتار لے''

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک بہت بڑا سوال ابھی باقی ہے موجودہ تھیوری کو تو آپ نے 1973ء میں ثابت کرایا تھا۔ اس سے آگے کتنا بڑھے ہیں؟

جواب: یعنی آپ تین قوتوں کو دو میں تبدیل کرنے کے لئے بے چین ہیں یہ سوال آپ کو ضرور کرنا چاہئے تھا۔ پاکستان کے بعض حلقوں کو غالباً میری ان کوششوں کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ میں اور جے سی پتی نیوٹرینو (Neutrino) کی تھیوری پر کافی کام کر چکے ہیں۔ اب تک سائنسی عقیدہ یہ چلا آ رہا ہے کہ قدرت نے پروٹون اور الیکٹرون جتنی تعداد میں بنائے ہیں وہ ہمیشہ اتنی ہی تعداد میں رہیں گے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اب سرن میں تجربات ہو رہے ہیں کہ ایسا ممکن ہوسکتا ہے لیکن یہ دیکھنے کیلئے کائنات کی زندگی سے بھی زیادہ عرصہ زندہ رہنا ہوگا یعنی پروٹون (10030) سال کے بعد مثبت الیکٹرون اور نیوٹریو میں تبدیل ہوجائے گا ہم نے پہلی تھیوری 1973ء میں ثابت کردی تھی اس پر اعتراضات کئے گئے۔ لیکن 78ء میں سٹینفورڈ کے تجربات نے بتایا کہ اعتراضات غلط تھے اور ہم صحیح کہتے تھے پارٹیکل فزکس میں ہماری نئی تھیوری کی رہنمائی میں امریکہ اور سرن والوں کے دو گروپ بن گئے ہیں اور ان کا باہمی مقابلہ شروع ہوگیا ہے۔ ایک میل گہرے غار میں دس ہزار

ٹن پانی رکھا جائے گا۔کل پروٹون میں سے جب کبھی ایک پروٹون Decay کرے گا تو ایک شعاع نکلے گی جس دن یہ شعاع دیکھ لی گئی سمجھ لیجئے گا کہ دوسری تھیوری بھی صحیح ثابت ہوگئی۔آج کل اس تجربے کیلئے غار کی تلاش جاری ہے۔ یہ غار بھارت میں تو یقیناً مل جائے گی۔ پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔کھیوڑہ کی پہاڑیاں بہت چھوٹی ہیں اور غار کا کافی گہرا ہونا ضروری ہے۔73ء میں افریقہ کی ایک غار میں تجربہ کیا گیا تھا لیکن پانی کا وزن صرف سوٹن تھا اور سوٹن پانی میں روشنی دیکھنے کیلئے سوسال کی ضرورت تھی۔

سوال: نوبل انعام پانے والا کتنے ہی مضبوط دل و دماغ کا انسان کیوں نہ ہو یہ انعام اس کی شخصیت پر کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور ڈالتا ہے ایسے بھی ہوں گے جو اپنے کام میں پہلے سے زیادہ مگن ہو جاتے ہوں اور ایسے بھی ہوں گے جو خوشی سے پھول جاتے ہوں گے۔آپ پر کیا اثر ہوا؟

جواب: میں تو اللہ کا شکر بجالایا۔ویسے انعام کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے کئی پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔علم کا شعبہ کون سا ہے؟ معاشرہ کون سا ہے اور شخصیت کا مزاج کیسا ہے؟ مثالی نظریاتی طبیعیات میں اتنا زبردست مقابلہ ہوتا ہے کہ دو ایک سال کے لئے پاؤں پسار لینے والا سائنسدان زندہ نہیں رہ سکتا۔انعام پانے کے بعد چوڑا ہو جانے والی بات پاکستان میں ممکن ہوسکتی ہے یہ بات جنگ سے پہلے جرمنی میں بھی ممکن تھی اور کسی حد تک امریکن معاشرے میں بھی اس قسم کے خطرات محسوس کئے جاسکتے ہیں۔امریکنوں میں یہ انعام بھی تو بہت تقسیم ہوتا ہے لیکن میرے دائرہ کار میں ایسا کوئی عنصر یا محرک نہیں پایا جاتا جو سائنس میں میرے انہماک کو تقسیم کردے۔

سوال: ہر عہد کے سائنسی نظریات نے فلسفے کی دنیا کو بھی متاثر کیا ہے اور نظریاتی فزکس کی طرح اب تو بڑا اور سائنٹفک فلسفی بننے کیلئے ریاضی دان ہونا بھی ضروری ہے آپ کی تھیوری عصر حاضر کے نمایاں فلسفیانہ رجحانات پر کیونکر اثر انداز ہوگی؟

جواب: خدا بیزار اور وجود پرست فلسفے کی ''ڈاچی'' کی مہار بے یقینی سے یقین کی طرف موڑ دی جائے گی۔کبھی خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والے کو کم علم کہا جاتا تھا۔اب خدا کے وجود سے انکار

کرنے والے کو کم علم کہا جا سکے گا............''(بشکریہ ''نوائے وقت'' 3 دسمبر 1979ء)

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا

پروفیسر عبدالسلام ۔ایک عہد ساز شخصیت اور عظیم استاد

(پروفیسر ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب ڈین فیکلٹی آف نیچرل سائنسز
قائداعظم یونیورسٹی ۔اسلام آباد)

پروفیسر عبدالسلام جن کے افکار سے نصف صدی تک فزکس کی دنیا منور ہوتی رہی، 21 نومبر 1996ء کی صبح آٹھ بجے طویل علالت کے بعد اس دارفانی سے کوچ کر گئے ۔اس طرح نہ صرف پاکستان بلکہ ساری تیسری دنیا اس عظیم محسن کی مزید خدمات سے محروم ہوگئی۔

سلام صاحب فزکس کے میدان میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور وقت کی دیوہیکل شخصیات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔سلام صاحب نے تقریباً تین سو تحقیقی مقالے لکھے ہیں اور پارٹیکل فزکس کے کئی ایک شعبہ جات میں ایسے قابل ذکر کارنامے انجام دئے ہیں جن سے مادے کے بنیادی ذرات اور قدرت کی بنیادی قوتوں کے متعلق انسانی علم میں نمایاں پیش رفت ہوتی ہے۔

سلام صاحب کا ایک شہرہ آفاق کام

Parity Violation in Weak Interactions

سے متعلق تھا۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دو امریکی سائنسدانوں کو اس پر نوبل پرائز دیا گیا۔ ہماری نظر میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ سلام صاحب اور روسی سائنسدان جن میں Landau کو بھی اس میں شامل کیا جاتا۔کیوں کہ انہوں نے بھی الگ الگ اس پر کام کیا تھا۔ سلام صاحب کا سب سے مشہور کام Urification of Weak and

Electromagnetic Forces تھا۔ جس پر انہوں نے دو امریکی سائنسدانوں کے ساتھ سن اناسی کا نوبل انعام Share کیا تھا۔ اس کام میں دو بنیادی قوتوں Weak اور electromagnetic کو یکجا کیا گیا ہے۔ گویا وہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں ۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میکسویل (Maxwell) نے تقریباً سوسال پہلے Electricity اور Magnetism کو یکجا کیا تھا اور اس سے ڈیڑھ سوسال پہلے نیوٹن نے فلکی اور ارضی کشش ثقل کو۔ چنانچہ سلام صاحب کا یہ کام اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس وحدت کے نظریے کے بعد سلام صاحب اور دوسرے سائنسدانوں نے عظیم وحدت Grand Unification کا نظریہ پیش کیا۔ جس میں Weak فورس اور Electromagnetic فورس کے ساتھ Strong Nuclear Force کو شامل کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں پروٹون جو ایک Stable پارٹیکل سمجھا جاتا ہے unstable قرار پایا۔ مذکورہ ماڈل کے حوالہ سے پروٹون کا 1031 Lifetime سال سے زائد ہے۔ اس نظریہ کو پرکھنے کیلئے دنیا کی کئی ایک تجربہ گاہیں سرگرم عمل ہیں۔ سلام صاحب کیلئے Grand Unification سفر کی آخری منزل نہ تھی۔ شاید انہی کے لئے کہا گیا تھا کہ ''ستاروں آگے جہاں اور بھی ہیں'' چنانچہ انہوں نے نت نئے خیالات اور نظریات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن میں

super symmetry Theory of Everything, super gravity,Super strings

شامل ہیں۔ سلام صاحب کے فلسفہ حیات کے مطابق زندگی ایک مسلسل سائنسی عمل ہے۔ جس کو وہ مذہبی فریضہ بھی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے خیالات وافکار کو قرآنی آیات سے ہم آہنگ کرتے تھے۔ ان کی ایک پسندیدہ آیت کریمہ جس کو انہوں نے بار بار اپنے لیکچرز میں دہرایا ہے پیش خدمت ہے۔

.... الَّذِی خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِی خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُورٍ۔ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ إِلَیۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِیرٌ۔

''اس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے (اے دیکھنے والے) کیا تو رحمٰن کی آفرینش میں کچھ نقص دیکھتا ہے؟ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ تجھ کو (آسمان میں) کوئی شگاف نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ (سہ بارہ) نظر کر۔ تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔''

سلام صاحب کو بے شمار انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے دنیا میں تیس سے زائد اکادمیوں اور سوسائٹیوں نے انہیں اپنا فیلو یا ممبر بنایا ہے اور چالیس سے زیادہ یونیورسٹیوں نے اعزازی D.Sc ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگریاں دی ہیں۔

سلام صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ان کا شمار نہ صرف اس صدی کے اعلیٰ ترین سائنسدانوں میں ہوتا تھا بلکہ وہ ایک زبردست ایڈمنسٹریٹر بھی ثابت ہوئے۔ اٹلی میں انٹرنیشنل سنٹر کا قیام اور اس کے ذریعہ علوم طبیعیات کی تحقیق اور فروغ ان کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ان کی ذات تیسری دنیا کے سائنسدانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ سلام صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ تیسری دنیا میں تحقیق کی کوئی روایات نہیں ٹیکنالوجی بہت پسماندہ ہے اور نظام تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ۔ چنانچہ انہوں نے سنٹر کے ذریعے بہت سے ایسے پروگرام دیئے جن سے تیسری دنیا کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں سرعت کے ساتھ پیش رفت ہو سکے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے انہوں بحیثیت سائنسی مشیر صدر پاکستان نظام تعلیم کی منصوبہ بندی کی اور ریسرچ اور ڈویلپمنٹ کے متعدد پروگرام دیئے۔ سلام صاحب کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک کو ''سائنس برائے اقتصادی ترقی'' کی زیادہ ضرورت ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے سنٹر میں Applled Physics کے پروگرام شروع کروائے۔ مثلاً لیزرز، سولر انرجی، پلازما فزکس اور کنٹرولڈ فیوژن، بائیو فزکس، جیالوجی Soll Physics,Climatalogy وغیرہ۔ ساتھ ساتھ لیبارٹری ٹریننگ کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اب تک سنٹر میں چار ایسی لیبارٹریاں قائم کی جا چکی ہیں۔

Microprocessor, Laboratory, Supercanductivity, Laboratary, Lasers and Fibers Laboratary and Climatalgy Laboratary.

پروفیسر سلام نے ذاتی طور پر بھی تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے ممالک کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے Applled Physics کے مختلف مضامین کی طرف توجہ دیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ خاص طور پر انہوں نے پاکستانیوں کو اس کام پر آمادہ کیا۔ چنانچہ چند دوسرے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی اپنے سابقہ مضمون کو خیر باد کہا اور Plasma Physics and Controlled Fusion کو اپنایا۔ آج میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے پندرہ میں سال کی کوشش کے نتیجے میں آج یہ مضمون پاکستان میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔ درجنوں سائنسدان مختلف اداروں اور مختلف یونیورسٹیوں میں اس مضمون میں تدریس کا کام کر رہے ہیں۔ میرے لئے یہ اطمینان بخش بات ہے کہ میں نے اپنے عظیم اور محترم استاد پروفیسر عبد السلام کی خواہش کے مطابق اور ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے یہ کام کیا۔ اور اس طرح پاکستان کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔

سلام صاحب سنٹر کو کس طرح چلاتے تھے اس کی نظیر شاید ہی دنیا میں کہیں ملتی ہو۔ آیئے اس کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ سلام صاحب 1964ء میں ٹریسٹ سنٹر کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ چار سال تک یہ سنٹر ٹریسٹ شہر کے بیچ Piazza Oberdan میں واقع ایک بلڈنگ میں عارضی طور پر چلتا رہا اور بالآخر 1968ء میں اس کی اپنی نئی عمارت مکمل ہوگئی جو ٹریسٹ کے مضافات میں خوبصورت مقام Miramore میں واقع ہے۔ اس موقعہ کی یاد میں سلام صاحب نے ایک انٹر نیشنل کانفرنس منعقد کروائی جس کا موضوع تھا Contemporary Physics ''ہمعصر طبیعیات'' یہ کانفرنس فزکس مضمون کے پورے سپیکٹرم پر محیط تھی۔ اس مہینہ بھر کی کانفرنس میں تین سو سے زائد لوگوں نے شرکت کی جن میں بہت سے تیسری دنیا سے تھے۔ میں بھی ان خوش نصیبوں میں تھا۔ غور کریں کہ تیسری دنیا کا ایک سائنسدان جو عام طور پر کنویں کے مینڈک کی طرح دنیا سے الگ تھلگ (Isolated) رہتا ہے۔ مہینہ بھر ایک ایسے ماحول میں گزارتا ہے جہاں اس صدی کے نامور

سائنسدان موجود ہیں۔ایسی ہستیاں جن کا ذکر کتابوں اور رسالوں میں پڑھا ہوتا ہے آپ ان کے ساتھ کئی دن گزارتے ہیں۔ان کو سنتے ہیں ان سے باتیں ہوتی ہیں۔اس کانفرنس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ دن کے معمول والے اجلاسات (Sessions) کے علاوہ شام کو سپیشل لیکچرز کا اہتمام کیا گیا اوراس کے لئے موجودہ صدی کے چوٹی کے چھ سائنسدانوں کو مدعو کیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔

.Oscar Klein Helsenberg, Dirac, Hans Bethe,Wigner

اور Landau(Landau) بیماری کی وجہ سے خودتو نہ آسکے۔ان کی طرف سے ان کے مشہور ساتھی Lifshitz تشریف لائے۔) یہ گرینڈ اولڈ ماسٹرز وہ شخصیات تھیں جنہوں نے اس صدی کی فزکس کی تحقیق وتشکیل میں نمایاں کردارادا کیا تھا۔گویا کہ شام کے یہ لیکچرز''فزکس کی کہانی،اس کے خالق کی زبانی'' کا پروگرام تھا۔جن میں وہ لوگ ان واقعات کیفیات اور پس منظر کا بھی ذکر کرتے جوانہیں اپنے تخلیقی سفر میں پیش آئے تھے۔ایک شام Helsenberg کا لیکچر تھا۔Dirac بھی موجود تھے۔دونوں نوبل انعام یافتہ خیال رہے کہ سلام صاحب ابھی اس ایلیٹ (Elite) کلب کے ممبر نہیں بنے تھے۔میزبان ہونے کی حیثیت سے سلام صاحب سٹیج پر آئے اور یہ واقعہ سنایا۔ صدیوں پہلے ایران کے بادشاہ کے ہاں کسی پڑوسی سلطنت کے بادشاہ مدعو ہوئے دونوں بادشاہ دربار میں تشریف فرماہیں اورساتھ ایران کے بادشاہ کے وزیر باتدبیر بھی بیٹھے ہیں۔مشروبات پیش کی جاتی ہیں وزیر کے لئے اب مسئلہ ہے کہ مشروب پہلے اپنے بادشاہ کو پیش کرے یا مہمان بادشاہ کو دونوں صورتوں میں اعتراض کی گنجائش نکلتی ہے۔پرانے بادشاہوں کے وزیر تو سیانے ہوا کرتے تھے۔اس لئے اپنے بادشاہ کی طرف مشروب بڑھاتے ہوئے کہا۔ایک بادشاہ کو ہی زیب دیتا ہے کہ وہ دوسرے بادشاہ کو مشروب پیش کرے۔

(king to present to anotherIt befits one)

یہ واقعہ سنا کر سلام صاحب نے کہا آج میری بھی وہی کیفیت تھی مگر اس وزیر باتدبیر نے میرا

مسئلہ حل کر دیا ہے تو میں دعوت دیتا ہوں کہ جناب Dirac تشریف لائیں اور Helsenberg کو متعارف کروائیں۔ .It befits ane Noble Laureate to introduce another

اس کانفرنس کا ماحول جداگانہ اور نرالا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک سماں خواب دیکھ رہے ہیں۔ فزکس کی دنیا کے ستارے ہر طرف جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔ اتنا stimulating اور Inspiring ماحول یقیناً یہ ایک Life_time experience تھا۔ یہ کام صرف اور صرف سلام صاحب کی انوکھی اور بے مثال شخصیت ہی کر سکتی تھی۔ نوبل انعام سائنسدانوں کی معراج ہے۔ تحقیق کے میدان میں متعارف لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سائنس کی دنیا کتنی بے رحم ہے اور کس بے دردی سے دوسروں کے خیالات ونظریات کو پرکھتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ امریکہ دوسرے شعبہ جات کی طرح سائنس میں بھی اجارہ داری رکھتا ہے۔ اس کا غرور، نخوت اور تعصب دنیا کے کسی دوسرے علاقہ کے لوگوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ سلام صاحب کے لئے دوہرا مسئلہ تھا۔ ایک تو غیر امریکی اور دوسرے ترقی پذیر ملک کے کالے باشندے۔ مگر آفرین اس جھنگ کے فرزند پر جس نے چند سالوں میں اپنی علمیت کے بل بوتے پر سارا یورپ فتح کر لیا اور اس طرح سلام صاحب امریکہ کے مقابل یورپ کے نمائندہ لیڈر سمجھے جانے لگے۔ سلام صاحب کو پورا اعتماد تھا کہ نوبل انعام ان کا مقدر بن چکا ہے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انہوں نے امریکہ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں اپنا کام پیش کیا۔ دوسرے دن انٹرنیشنل پریس میں تصویریں چھپیں جس میں سلام صاحب اور Professor Oppenheimer جو کانفرنس میں صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے سٹیج پر کھڑے ہیں۔ تصویر کا Caption تھا۔

Salam is asking Prof. Oppenheimar: Give me my noble prize

یاد رہے پروفیسر اوپن ہائمر ایک مایہ ناز تھیوریٹیکل فزسسٹ تھے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹم بم پراجیکٹ کے انچارج تھے جس کا خفیہ نام مین ہٹن پراجیکٹ تھا۔

سلام صاحب کی تمام تر خوبیوں کے باوجود نوبل انعام حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ دو تین دفعہ نوبل انعام کے قریب پہنچ کر بھی کامیاب نہ ہوئے۔ اور اس میں شاید مغرب کا تعصب تھا اور ڈاکٹر صاحب کو اس کا احساس بھی تھا۔ کیونکہ امریکی سائنسدان حسب عادت مذکورہ تھیوری کا بیان کرتے وقت دوسرے امریکی سائنسدانوں کا تو ذکر کرتے مگر سلام صاحب کا نام نہ لیتے۔ اسی احساس کا اظہار کرتے ہوئے اٹھایا۔ انہوں نے ہمیں ایک دفعہ بتایا کہ امریکیوں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ میں ارادتاً کانفرنسوں میں جاتا ہوں اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر سپیکرز کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہوں تاکہ وہ ہمارے کام کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا نام لینا نہ بھول جائیں۔

1979ء میں جس دن سلام صاحب کے نوبل انعام کا اعلان ہوا میری خوش قسمتی کہ میں ٹریسٹ سنٹر میں تھا۔ انعام کی خبر پہنچتے ہی پورے ٹریسٹ شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ریڈیو اور ٹی وی پر سلام صاحب کی باتیں اور پاکستان کے چرچے ہونے لگے۔ اسی طرح کئی دن اخبارات سلام صاحب اور سنٹر کے بارے میں بھرے ہوتے تھے۔ ٹریسٹ کے عام شہریوں نے اس طرح خوشی اور مسرت کا اظہار کیا جیسے سلام صاحب ان کے اپنے ہیں۔ پاکستانیوں کو بڑی عزت ملی عام شہریوں کی نظر میں پاکستان ایک قابل احترام ملک بن گیا اور ٹریسٹ سنٹر میں پاکستانی سائنسدان مستقبل کے نوبل لاریٹس سمجھے جانے لگے۔ پاکستان کو سلام صاحب سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ایمبیسڈر ملے۔

سلام صاحب جو ان دنوں لندن میں تھے اعلان کے دو دن بعد ٹریسٹ تشریف لے آئے۔ جشن کا سا سماں بن گیا۔ استقبال کے لئے سارا سٹاف اور وہاں موجود سائنسدان بلڈنگ سے باہر دروازے پر آن کھڑے ہوئے۔ جونہی سٹاف کار دروازے پر رکی میں نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور سلام دی نوبل لاریٹ سے ہاتھ ملایا۔ اس شام سنٹر میں reception دی گئی۔ سلام صاحب توجہ کا مرکز تھے۔ لوگ باری باری آگے بڑھ کر سلام صاحب سے مل رہے تھے اور اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ میری باری آئی۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ پرانا سٹوڈنٹ

ہونے کے حوالے سے سلام صاحب سے بے تکلفی کی جرات نہ ہو سکتی تھی مگر اس دن خلاف عادت آگے بڑھ کر سلام صاحب سے گلے ملا اور مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

you are the first from the Muslim ,Sir you have created history (.(i.e.Nobel Prize in Scienceworld to have received this honor

اور سلام صاحب یہی کہے جا رہے تھے۔ انشاء اللہ انشاء اللہ۔ افسوس کہ ہم پاکستانیوں نے سلام صاحب کو گونا گوں صلاحیتوں کا پورا فائدہ نہ اٹھایا۔

جن دنوں ICTP کے قیام کی تجویز زیر غور تھی۔ پاکستان میں صدر ایوب کی حکومت تھی۔ سلام صاحب پاکستان کے سائنس ایڈوائزر تھے۔ جنرل ایوب سلام صاحب کے مداح تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ سلام صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ کیوں نہ سنٹر پاکستان میں قائم ہو۔ چنانچہ انہوں نے حکومت وقت سے کہا کہ وہ بھی دوسرے ممالک کی طرح اس سنٹر کے قیام کے لئے پیش کش دیں۔ اس وقت کے وزیر خزانہ تجویز پر غور و فکر کرتے رہے۔ بالآخر صدر ایوب نے وزیر خزانہ سے فون پر جواب مانگا۔ سلام صاحب صدر کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ وزیر خزانہ نے جواب دیا سر یہ تجویز پاکستان میں تھیوریٹیکل فزکس سنٹر کے قیام کے لئے نہیں بلکہ پروفیسر صاحب تو یہاں ایک انٹرنیشنل ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں آ کر سائنسدان اپنی چھٹیاں گزار سکیں۔ افسوس صد با افسوس کاش اس وزیر کو احساس ہوتا کہ وہ ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کاش وہ یہ جانتے کہ ان کے قلم کی ایک جنبش پاکستان کی تقدیر بدل سکتی تھی۔

ایک اور واقعہ سنیئے۔

جب سلام صاحب کو 1979ء کا نوبل انعام ملا۔ تو دنیا جہان سے انہیں اعزازات سے نوازنے کے لئے مدعو کیا جا رہا تھا۔ حکومت پاکستان نے بھی دعوت کا پیغام بھیجا۔ سلام صاحب نے جواب میں پاکستان میں سائنسی ترقی کے متعلق کچھ باتیں کہیں اس سلسلہ میں سلام صاحب کی طرف سے کئی

ایک پیغامات آئے۔ایک پیغام مجھے بھی لانے کا شرف حاصل ہوا یہ پیغام اس وقت کے چیئر مین ایٹمی توانائی کمیشن جناب منیر احمد خان صاحب کے لئے تھا جو ان دنوں حکومت پاکستان کی طرف سے تقریب کے انتظامات کروا رہے تھے۔سلام صاحب نے مجھے کہا کہ منیر احمد خان سے کہیں کہ وہ حکومت پاکستان کو بتادیں کہ مجھے ذاتی طور پر ان کے اعزاز اور میڈل کی کوئی بھوک نہیں مجھے جس میڈل کی تمنا تھی وہ مجھے مل گیا ہے۔ہاں البتہ اگر وہ پاکستان میں سائنس کی ترقی کے لئے کوئی سنجیدہ اقدامات کرنے کے لئے تیار ہیں تو میں ضرور آؤں گا۔انہوں نے یہ بھی خواہش کی کہ اعزاز کی تقریب جھنگ شہر میں ہو۔قصہ مختصر سلام صاحب پاکستان تشریف لائے۔ان کی اور ان کے خاندان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔قائداعظم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔سلام صاحب نے جنرل ضیاءالحق کو یہ پیشکش دی کہ میں اپنے نوبل انعام کی پوری رقم 66 ہزار ڈالر وقف کرنے کو تیار ہوں جس سے پاکستانی طلباء بیرون ملک جا کر سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں گے بشرطیکہ حکومت پاکستان بھی اس کام کے لئے دس لاکھ ڈالر اپنی طرف سے مختص کرے۔جنرل ضیاء نے اصولی طور پر اتفاق کر لیا اور کہا کہ گورنر پنجاب اس کا جائزہ لیکر دوسرے روز با قاعدہ طور پر اعلان جاری کریں گے مگر دوسرے دن جو ہوا وہ بہت مایوس کن تھا۔اعلان کیا گیا کہ حکومت نے سلام صاحب کی تجویز قبول کر لی ہے مگر رقم سلام صاحب کی پیش کردہ رقم کے مساوی ہوگی اس سے زیادہ نہیں۔سلام صاحب کو سخت مایوسی ہوئی۔فوراً جنرل ضیا کے نام تار بھیجا کہ اگر حکومت پاکستان صرف ایک فرد کی طرف سے پیش کردہ رقم کے برابر رقم دیتی ہے تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔اس صورت میں تو میں اپنی الگ فاؤنڈیشن قائم کروں گا۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔حکومت اور بیوروکریٹس کی مہربانیوں سے پاکستان کی کہانی Missed opportunities کی کہانی ہے۔

ایک اور واقعہ جو نہ صرف پاکستان کے لئے بلکہ تمام ترقی پذیر اقوام کے لئے افسوس ناک ہے۔1986ء میں یونیسکو کے نئے ڈائریکٹر جنرل کا انتخاب ہونا تھا۔سلام صاحب کا نام تجویز ہوا۔

اٹلی کے وزیر خارجہ (جو سلام صاحب کے بڑے مداح تھے) کی طرف سے اور کئی دوسرے ممالک کی طرف سے سلام صاحب کی نامزدگی کے لئے کوششیں ہونے لگیں۔حسن اتفاق کہ اس وقت ساری دنیا میں سلام صاحب وہ فرد واحد تھے جو اس پوزیشن کے لئے مطلوبہ معیار پر پورا اترتے تھے۔معیار یہ ہے۔

A person who is an academic of international standing, preferably a Noble Loureate in his field, Who has demonstrated ability in an internation environment, awareness of political dimension of education, science and culture, particularly in the third world, and someone who has exerted an influence on this area even handedly between the East and West, so that he is also acceptable to the (former) Soviet Union.

یوں لگتا ہے کہ کسی نے یہ معیار Crystal Ball میں جھانک کر بنایا تھا مگر افسوس کہ حکومت پاکستان نے سلام صاحب کو نامزد کرنے سے انکار کر دیا اوران کی جگہ کسی اور کو نامزد کیا جو کہ انتخاب بری طرح ہار گیا۔اس طرح یہ معاملہ سیاست کا شکار ہو گیا۔خیال رہے کہ سلام صاحب کو نامزدگی کا مسئلہ نہ تھا۔اٹلی انگلینڈ اور دوسرے ممالک ان کو نامزد کرنے کیلئے تیار تھے۔مگر سلام صاحب کے لئے ذاتی طور پر یہ بات اہم تھی کہ ان کو اپنا ملک نامزد کرے۔ان کی قومی حمیت کو دوسروں کی نامزدگی قابل قبول نہ تھی۔آیئے اب ہم سلام صاحب کی شخصیت کے ایک اور پہلو''وہ استاد کیسے تھے'' کا جائزہ لیں۔

سلام بحیثیت استاد:: مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے امپیریل کالج لندن سے پروفیسر عبد السلام کی سرپرستی میں تربیت حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی سند پائی۔یہ 1962ء کا زمانہ تھا۔میں نے پنجاب یونیورسٹی کی لیکچررشپ چھوڑ کر پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کی ملازمت اختیار کی اور فوراً بعد کولمبو پلان سکالرشپ سکیم کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لئے امپیریل کالج پہنچا۔یہ وہ زمانہ تھا جب پروفیسر

عبدالسلام اور ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی نے مل کر پاکستان اپنی توانائی کمیشن کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے بہت سے پروگرام شروع کرر کھے تھے۔ان میں ایک اہم پروگرام بیرون ملک ٹریننگ کا تھا۔آج پاکستان میں بہت سے سینئر سائنسدان اور انجینئر اسی پروگرام کی پیداوار ہیں اور سلام اور عثمانی کی کوششوں کے مرہون منت ہیں۔

میں نے ParticlePhysics کا انتخاب کیوں کیا؟۔

میں سمجھتا ہوں یہ فیصلہ قدرتی بات تھی۔فزکس اور میتھ کا بیک گراؤنڈ ہو اور ہر طرف پروفیسر عبدالسلام کے چرچے ہورہے ہوں (وہ سائنس کی دنیا میں پہلے ہی سے (Celebrity) بن چکے تھے) اور حسن اتفاق کہ ان کو سننے کا بھی موقع مل گیا ہو۔وہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اورانہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ایک ولولہ انگیز لیکچر دیا۔سلام صاحب یقیناً نوجوان نسل کے ہیرو اور آئیڈیل بن چکے تھے۔

امپیریل کالج میں پی ایچ ڈی میں داخلہ کیلئے DIC کورس نہ صرف پاس کرنا ضروری تھا بلکہ داخلہ کی سیٹ مقابلہ کی بنیاد پر حاصل کرنا ہوتی تھی۔(برٹش گریجواٹیٹس اس شرط سے مستثنٰی تھے) خیر ہم نے DIC کورس شروع کر دیا۔ پروفیسر عبد السلام کے گروپ میں دوسرے اساتذہ Kibble P.T.Mathews,Streater اور Lovelace تھے۔یہ چھوٹا سا گروپ Theoretical Particle Physics میں یورپ کا بہترین سنٹر مانا جاتا تھا۔

سلام صاحب کو بحیثیت استاد کیسا پایا؟ وہ یقیناً ان اساتذہ میں سے نہیں تھے جو لیکچر کی تیاری میں محنت کرتے ہیں اور کوشش کے ساتھ اس کو آسان فہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔یہ سٹائل پروفیسر Matthews.P.T کا تھا۔سلام صاحب کا نہیں اور نہ ہی سلام صاحب ان اساتذہ میں سے تھے جو لیکچرز کے باقاعدہ نوٹس تیار کرتے ہیں اور پھر خوبصورت طریق سے بلیک بورڈ پر ہوبہو نقل کر دیتے ہیں۔اس طرح بلیک بورڈ پر لکھا ہوا لیکچر کتاب کی تصویر بن جاتا ہے۔یہ پروفیسر Kibble کا انداز

تھا۔سلام صاحب کا نہیں۔سلام صاحب ان سے مختلف تھے۔ان کا انداز اپنا اور منفرد ان کے نزدیک مذکورہ باتیں خاص اہمیت کی حامل نہ تھیں۔رویہ سے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تکلفات عام انسانوں کے کرنے کے ہیں اور وہ یقیناً ان میں سے نہیں۔یہ بات نہ تھی کہ سلام صاحب یہ کام کر نہیں سکتے تھے۔ہم نے ان کے کئی ایک سیمینار سنے اور ان کو کئی انٹرنیشنل کانفرنسز میں دیکھا اور سنا جہاں وہ (وی آئی پی) سپیکر کی حیثیت سے مدعو ہوتے۔ان کے لیکچر کو سننے کے لئے لوگ بیتاب ہوتے۔ہال کھچا کھچ بھر جاتے۔سحر انگیز لیکچر، باتیں طبیعیات کی ہو رہی ہیں اور انداز بیان لٹریری ہے۔زبان پر کیا عبور ہے کہ اہل زبان بھی عش عش کرتے ہیں۔پھر اس پیکر علمیت و فطانت کو کسی طرح سامعین کی والہانہ داد (Standing ovation) ملتی ہے کہ جیسے سبھی کے دل کی آواز ہے۔

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

بات DIC کورس کی ہو رہی تھی۔سلام صاحب نے اپنے کورس کا آغاز Theory of Life Groups سے کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب Particle Physics میں گروپ تھیوری کے نظریات شامل ہونے لگے تھے۔جس کے نتیجے میں (3)Symmetry Group SU اور Elgthfold way معرض وجود میں آئے اور Omega minus کی دریافت ہوئی۔اور ساتھ ہی ساتھ Quark Model کی باتیں ہونے لگیں۔کچھ دنوں بعد سلام صاحب کے لیکچرز کا انداز بدل گیا۔اب وہ جب کلاس روم میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں Research Journals کے تین چار شمارے ہوتے ہیں۔ جن میں جگہ جگہ Page indicator رکھے ہوئے ہیں۔اب لیکچرز کیا ہیں؟ Frontlers of Physics کی باتیں ہو رہی ہیں۔تحقیقی مسائل کا تجزیہ ہو رہا ہے۔لکھتے لکھتے بلیک بورڈ بھر جاتا ہے خیالات و افکار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔بورڈ پر تیروں کے نشان بکھرے ہوئے مختلف اجزا کو ایک لڑی میں پرو رہے ہیں۔اکثر طلباء کے لئے زیادہ تر باتیں سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔اس کے باوجود بے حد متاثر وجدانی کیفیت میں بیٹھے نوٹس لے رہے ہیں۔سلام صاحب کے لیکچر ایک

Exciting Experience ہوتا جو طلباء میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا۔ سلام صاحب کی خواہش ہوتی کہ ان کے طلباء تیز رفتاری سے آگے بڑھیں اور ایسے لگتا جیسے وہ بہت جلدی میں ہیں۔ اسکے پاس وقت کم ہے اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسروں کے لئے پیغام ہوتا کہ اگر آپ ہمارے شانہ بشانہ نہیں چل سکتے تو کوئی اور راہ اختیار کریں۔ ہم آپ کا انتظار نہیں کر سکتے۔

if you cannot rise to us, we cannot stoop to you

ہمارے شہر میں صرف قدآور بستے ہیں۔ بونوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ تھا سلام صاحب کے کام کروانے کا سٹائل۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کے بے شمار سٹوڈنٹس رہے مگر صرف گنے چنے لوگوں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی جسارت کی۔

سلام صاحب کی بارعب شخصیت، ان کا دبدبہ اور جلالی مزاج اور اس پر طرہ ان کی آنکھوں کی چمک، کسی کی مجال کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ کسی چیز کا جواب معلوم بھی ہوتا تو کہنے کی جرات نہ ہوتی۔ شروع شروع میں ہمیں گمان ہوا کہ یہ سب کچھ ہم مشرقی لوگوں کا مسئلہ ہے مگر جلد ہی اس راز کی بھی قلعی کھل گئی۔ ہم نے دیکھا کہ گوروں کا بھی برا حال تھا۔ وہ بھی اس کشتی میں سوار تھے۔ قصبہ جھنگ کی یہ شخصیت مغرب ہو یا مشرق دونوں پر یکساں طور پر حادی تھی۔

سلام صاحب کی آنکھوں کی خیرہ کن چمک کے متعلق ایک واقعہ ہے کہ سلام صاحب کی سیکرٹری جو mannerism کی مناسبت سے تھیٹر کی دنیا میں شاید زیادہ موزوں ہوتی P.T. Matthews کے پاس شکایت لیکر گئیں آنکھوں میں آنسو کہنے لگیں دیکھیں یہ سلام صاحب کیسے ہیں مجھے دفتر میں بلاتے ہیں میں جاتی ہوں اور سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہوں نہ وہ مجھے ہیلو کرتے ہیں اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بس Dictation شروع کر دیتے ہیں۔ P. T. Mathews نے (جو بڑے شفیق انسان تھے اور سب انہی کے پاس جا کر اپنے دکھڑے سناتے تھے، دلاسا دیتے ہوئے کہا ”شکر کرو اس نے تمہاری طرف نہیں دیکھا ورنہ تم خوف سے لرز جاتیں۔“

ایک دن ایسا ہوا کہ ہم اپنے ساتھی طلباء کے ہمراہ چائے کی میز پر تھے۔ اچانک وہاں P. T. Mathews تشریف لے آئے۔ باتیں سلام صاحب کے متعلق ہونے لگیں۔ موضوع یہی تھا کہ اسلام صاحب کو سمجھنا آسان نہیں P.T.Matthews بتانے لگے کہ میں نے ایک دفعہ سلام سے کہا کہ تم دوسروں کی سہولت کے لئے دقیق موضوعات کو آسان بنا کر کیوں نہیں پیش کرتے۔ ہنس کر جواب دیا اگر میں تمہارے لئے ایسا کروں تو تم کہو گے ارے یہ تو بہت آسان بات تھی۔ میں خود بھی سوچ سکتا تھا۔ (خیر اس قصہ میں مذاق کا پہلو زیادہ تھا) میں نہیں سمجھتا کہ سلام صاحب میں خودغرضی تھی یا تکبر۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنا وقت بیجا صرف کرنے اور سر کھپانے کو تیار نہ تھے۔

And he had no patience for mediocrity

جب ہمارا DIC کورس ختم ہونے کو ہوا تو انہوں نے سب پاکستانیوں کو بلا کر کہا کہ بھئی اب تم لوگوں کا Dic Exam ہونے والا ہے تمہیں ابھی سے اپنے پی ایچ ڈی پروگرام کا خیال کرنا ہوگا۔ یہاں پر ہم لوگ تو اپنے اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں کہ تمہیں وقت نہ دے سکیں گے۔ کسی دوسری یونیورسٹی چلے جاؤ وہاں Supervisor بہت خیال رکھیں گے توجہ دیں گے۔ تمہارے لئے آسانی ہوگی ہم تمہارا داخلہ بھی کروا دیں گے ہم لوگ اس پیغام سے بہت مایوس ہوئے۔ کچھ نے پریشان ہوکر دوسری یونیورسٹیوں میں داخلہ کی کوشش شروع کر دی۔ مگر اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلام صاحب طلباء کی مدد کرنے کو تیار نہ تھے وہ یقیناً طلباء کی مدد کرتے۔ ان کی رہنمائی کرتے، تحقیقی موضوعات تجویز کرتے اور حل کرنے کی راہیں بتاتے مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے DIC کورس مکمل کرنے کے بعد تحقیق کا کام شروع کیا تو سلام صاحب نے سب کو بلوایا Research problems بتائے میرے لئے بھی پرابلم تجویز ہوا۔ سلام صاحب بولتے جا رہے تھے اور میں لکھتا جا رہا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ جلد کامیابی ہوئی۔ مسودہ تیار کر کے سلام صاحب کے پاس لے گیا۔ اس کام میں انہی کا تجویز کردہ ایک ماڈل استعمال کیا گیا تھا اور ساتھ Symmetry Group SU(3) ۔

چند بنیادی ذرات کے Decay process کوسٹڈی کیا گیا تھا۔سلام صاحب نے مسودے کودیکھا۔ ورق پلٹے اور پوچھا کہ اس میں Kaon Praticles کی Contributions کیوں شامل نہیں کی گئیں۔ میں نے جواب دیا کہ دوسروں نے ایسا ہی کیا ہے۔کہنے لگے کہ یہ کوئی جواب نہیں۔سائنسی تحقیق میں دوسروں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر میز پر پڑے ہوئے Physical Review اور دوسرے رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تمہارا کیا خیال ہے کہ اس خرافات کے پلندے پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟(Do you think you can trust all this junk)

خیر ہم نے ان کی تجویز کردہ contributions شامل کیں۔اور مسودے کو اشاعت کیلئے بھجوا دیا۔ یہ ہماری پہلی Publication تھی۔اس پر سیمینار بھی دیا۔ P.T.Matthews اور دوسرے اساتذہ سیمینار میں تھے۔مگر سلام صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔وہ نہ آسکے اور ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا ورنہ شاید ہم سٹیج پر ہی ڈھیر ہو جاتے۔سلام صاحب کا یہ خاصہ تھا کہ ان کی بات سمجھ آئے یا نہ آئے بندہ Inspire ضرور ہوتا وہ ہر وقت Excited state میں ہوتے جس سے دوسرے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جہاں بھی جاتے ہلچل مچا دیتے۔نت نئے خیالات ایسے لگتا کہ انقلاب آنے ہی والا ہے۔ڈیپارٹمنٹ کی حالت یہ تھی کہ مسلسل Visiting Scientists چلے آرہے ہیں۔اکثر سیمینار ہو رہے ہیں۔کیا یورپ، کیا امریکہ دنیا جہاں سے ماہر طبیعیات South Kensington کے طواف کو پا نچ رہے ہیں۔کسی دن Julian Schwinger کا سیمینار ہے اور کسی Steven Weinber کا آج Feldman آئے ہوئے ہیں اور کل J.C.ward ڈیپارٹمنٹ میں لٹریچر کی بھی بھر مار رہتی۔ ہر روز ڈاک میں دنیا کے چاروں کونوں سے Preprints کے ڈھیر پہنچ رہے ہیں۔

سلام صاحب بحیثیت استاد Spoon-feeding تو نہیں کرتے تھے مگر وہ آپ کو ایک آئیڈیل ماحول ضرور مہیا کرتے جہاں آپ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آسمان کی بلندیوں کو چھو سکتے تھے۔

سلام صاحب کے کیئریر پر ایک سطحی نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ہمہ جہت شخصیت اتنی عظیم تھی کہ گورنمنٹ کالج لاہور یا پنجاب یونیورسٹی تو کجا انگلستان کی شہرہ آفاق کیمبرج یونیورسٹی بھی بہت چھوٹی ثابت ہوئی یہاں تک کہ امپیریل کالج لندن جس کو اس بات پر ناز تھا کہ ان کے ہاں نوبل انعام یافتہ ستاروں کا جھرمٹ رہتا ہے (وہ) بھی سلام صاحب کے تخیل کی تسکین نہ کر سکا۔ چنانچہ سلام صاحب نے امپیریل کالج کی چار دیواری سے نکل کر دنیا کے سب سے بڑے فورم اقوام متحدہ میں سائنس اور تیسری دنیا کے حق میں آواز بلند کی اور بالآخر اپنی کرشمہ ساز شخصیت اور عالمی شہرت کے بل ہوتے پر اٹلی میں ایک انٹرنیشنل سنٹر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ICTP کا وجود میں آنا اور پھر کامیابی سے جاری ساری رہنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ مگر اس جھنگ کے قصبہ کے عقابی فرزند کی پرواز یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔ اسے اب بھی نت نئے خیالات کی آمد ہے اور وہ ہمہ وقت اسلامی دنیا اور دوسری ترقی پذیر اقوام کے لئے نئی راہوں کا متلاشی ہے کہیں Third World Acadamyor Sciences قائم کی جا رہی ہے اور کہیں سائنس سٹی بنانے کے ارادے ہیں۔ فزکس کی گرینڈ یونیفیکیشن تھیوری کے ساتھ ساتھ یہ گرینڈ سکیم بھی بن رہی ہے کہ دنیا بھر میں ICTP کی طرح کے بہت سے بین الاقوامی مراکز کا جال بچھا دیا جائے اور ساتھ اقوام متحدہ کے تحت ایک جامعہ تا کہ تمام اقوام عالم اور بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک سائنس اور ٹیکنالوجی کی نعمتوں سے مالا مال ہو سکیں۔

سلام صاحب آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی باتیں نہ ختم ہونے والی ہیں اور ان کے حیرت انگیز کارنامے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا

(بشکریہ ''راوی'' گورنمنٹ کالج لاہور)

دورِ حاضر کا شہرہ آفاق عظیم پاکستانی سائنس دان محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم کے کارناموں اور اخلاق حسنہ کا تذکرہ

(مسعود احمد خان دہلوی۔ سابق ایڈیٹر روزنامہ الفضل ربوہ)

دل حزیں اور افسردہ وغمگیں کیوں نہ ہو، خدائے ذوالجلال والاکرام کا بندہ نیک نام وعالی مقام المسمیٰ عبد السلام دنیائے سائنس اور بالخصوص اس کے شعبہ طبیعیات میں اپنے انقلاب انگیز کارناموں کی وجہ سے دنیا بھر میں تہلکہ مچانے، اچھے اچھوں سے اپنا لوہا منوانے، اقصائے عالم میں اپنے نام اور کام اور فیض رسانی کے مستقل اہتمام و انصرام کا ڈنکا بجوانے، اپنے اکثر ہم عصر سائنس دانوں پر سبقت لے جانے، زندگی میں اولیت کے لاتعداد ریکارڈ قائم کرنے اور مسلمہ طور پر فائز المرام قرار پانے کے بعد مقدرت الٰہیہ کے تحت بالآخر اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس نادر و کمیاب نابغہ روزگار وجود کا دنیا میں آنا بھی خدائے ذوالمنن کا ایک نشان تھا اور یہاں سے اگلے جہاں سدھارنا بھی ایک نشان ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کی پہلے سے دی ہوئی بشارتوں کے عین مطابق اس دنیا میں وجیہ قرار پایا اور اس جہاں کی حیات جاوداں میں بھی اپنے صادق الوعد خدا کی طرف سے اس کا وجیہہ قرار پانا اور مقربین میں شامل ہونا مقدر ہے اس لئے اس کی وفات کا خاموش تو جہ غم خوشی کے شادیانوں کی نوید اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور اس کی رحلت

اگر بر نکوئی بود خاتمت
عروسی بود نوبت ماتمت

کی مصداق بنی ہوئی ہے۔

خدائی نشانوں میں سے ایک نشان

اس کے اپنے وطن میں کہنے والے کچھ بھی کہیں یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ محترم پروفیسر ڈاکٹرعبدالسلام صاحب کو دنیا بھر کے وقیع سائنسی حلقے نیوٹن سے آئنسٹائن تک کے سائنس دانوں کی صف اوّل کے ایک نوبل انعام یافتہ پاکستانی مسلمان سائنس دان کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اس اعتبار سے بجا طور پر ان کی عظمت و رفعت کے گیت گانے والے اہل دنیا میں سے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ احمدیت یعنی حقیقی اسلام کا یہ ذیشان فرزند اللہ کی خاص بشارتوں کے ماتحت اس دنیا میں آیا اور ان بشارتوں کے مطابق ہی اس نے دنیائے سائنس میں عظیم کارنامے سرانجام دے کر ان علمی عظمتوں اور رفعتوں کو چھوا اور ان پر جا فائز ہوا جن تک رسائی ہر کسی کے نہیں کسی کسی کے حصہ میں آتی ہے اور پھر الٰہی بشارتوں کے مطابق اب وہ اس دنیا میں بھی بفضل اللہ تعالیٰ معزز و مکرم قرار پا کر قرب الٰہی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

خدا تعالیٰ میرے مشفق و مہربان اور سراپا احسان مربی حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی مرحوم کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے کہ آنمحترم نے محترم پروفیسر ڈاکٹرعبدالسلام کے والد بزرگوار حضرت چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم (جو ان کے بہت قریبی اور عزیز دوست تھے) کے سوانح حیات کتابی شکل میں مرتب کر کے ان کی متضرعانہ دعاؤں کے جواب میں انہیں ملنے والی بشارتوں کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا۔ حضرت چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم عشق خدا، عشق قرآن، عشق رسول اور عشق مسیح موعودؑ میں سرشار رہنے والے خدائے ذوالمنن کے حقیقی پرستار اور خلافت احمدیہ کے دلی عقیدت مند و دلی اطاعت گزار ہونے کے باعث بفضل خدا مستجاب الدعوات اور زاہد شب زندہ دار بزرگ تھے۔ خدا تعالیٰ آپ کی دردمندانہ و متضرعانہ دعاؤں کو قبول فرما کر آپ کو رویا و کشوف کے ذریعہ عظیم الشان بشارتوں سے نوازتا تھا۔ آپ دعا کے آداب اور

تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے اور ان جملہ آداب اور تقاضوں پر پورا اترنے کی کوششوں میں حتی المقدور کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ان دعاؤں میں نیک صالح اور بلند طالع اولا د عطا ہونے کی دعا بدرجہ اولیٰ شامل ہوتی تھی۔ان دعاؤں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مہتم بالشان بشارتوں سے نوازا۔ان میں سے بعض بشارتیں جن کا تعلق محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی ولادت اور آپ کو ملنے والی ترقیات سے ہے۔درج ذیل ہیں۔

عروج واقبال کی آئینہ دار بشارتیں

1۔ 11 مئی 1925ء کو حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی شادی ہوئی۔شادی ہونے کے ساتھ ہی آپ نے نیک صالح اور بلند طالع اولاد عطا ہونے کے متعلق دعائیں شروع کر دیں۔آپ یہ قرآنی دعا ’’ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریتنا قرۃ اعین واجعلنا للمتقین اماماً‘‘ بہت دردوالحاج سے بکثرت کیا کرتے تھے۔3 جون 1925ء کی بات ہے کہ آپ مسجد احمدیہ جھنگ شہر میں مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد سنتیں ادا کر رہے تھے اور مذکورہ قرآنی دعا پڑے دردوالحاح سے پڑھ رہے تھے۔دعا کرنے کے دوران آپ پر کشفی حالت طاری ہوئی۔کیا دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بہت خوبصورت اور معصوم بچہ اٹھایا ہوا ہے۔وہ اپنے ہاتھ آگے کر کے محترم چوہدری صاحب سے کہتا ہے لیجئے اللہ نے آپ کو یہ بچہ عطا کیا ہے۔آپ نے اس فرشتہ سے دریافت کیا بچہ کا نام کیا ہے۔فرشتہ نے بتایا اس کا نام عبدالسلام ہے۔اس کشف پر آپ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے۔حسب بشارت الٰہی 29 جنوری 1926ء کو بروز جمعۃ المبارک بوقت نماز جمعہ آپ کے ہاں بچہ کی ولادت ہوئی۔

آپ نے اپنے آقا سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔آپ نے خط میں اپنا کشف درج کر کے بچہ کی ولادت کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ حضور بچہ کا نام رکھ دیں۔حضرت مصلح موعودؓ نے اپنے والا نامہ میں تحریر فرمایا جب خدا تعالیٰ نے نام رکھ

دیا ہے تو ہم کیسے دخل دیں۔ بچے کا نام عبدالسلام ہی رہنے دیں۔

2۔آپ نے بشارت ربانی کے تحت عطا ہونے والے فرزند ارجمند کی درازی عمر اور دینی و دنیوی ترقیات کے لئے دعائیں شروع کر دیں ۔ ان دعاؤں میں یہ دعا بھی شامل تھی کہ یہ بچہ "وجیھا فی الدنیا والاخرۃ و من المقربین" ہو یعنی یہ بچہ دنیا اور آخرت میں صاحب منزلت ہو اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں شمار کیا جائے۔ان دعاؤں کے دوران ایک روز آپ پر کشفی حالت طاری ہوئی اور آپ کو اپنا یہ بچہ ایک جوان مرد کی شکل میں دکھایا گیا۔اس کشفی نظارہ پر آپ پہلے سے بھی زیادہ حمد وشکر سے لبریز ہو گئے۔آپ اپنے قدوس ،جلیل الذات رب قدیر کی کیوں نہ حمد بجالاتے اور کیوں نہ پہلے سے بڑھ کر اس کا شکر ادا کرتے جبکہ اس کشفی نظارہ کے ذریعہ آپکو یہ بشارت دی گئی کہ یہ لڑکا دنیا بھر کی نگاہوں میں صاحب منزلت قرار پائے گا اور اللہ تعالیٰ کے مقربین میں شمار ہو کر اسلام کی تعلیم پر کما حقہ عمل پیرا ہوتے ہوئے ترقی کی منزلیں جلد جلد طے کرے گا اور اوج کمال کو پہنچے گا۔حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کا دعاؤں میں شغف بڑھتا گیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے اس فرزند کے عروج واقبال کے بارہ میں مزید بشارتوں سے نوازتا چلا گیا۔

3۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک رؤیا میں عجیب نظارہ دکھایا۔اسے دیکھ کر آپ ورطہ حیرت میں پڑے بغیر نہ رہے۔آپ نے دیکھا ایک بلند اور سرسبز درخت ہے۔اس کا تنا اور شاخیں آسمان کی سمت میں بلند سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہیں ۔آپ کا مبشر فرزند عبدالسلام تو عمر ہونے کے باوجود اس درخت پر چڑھتا ہے اور پھرتی سے اوپر ہی اوپر چڑھنا شروع کر دیتا ہے۔اسے تیزی سے درخت پر چڑھتا ہوا دیکھ کر آپ کے زور زور سے آواز دیتے ہیں سلام اب بس کرو اور نیچے اتر آؤ۔بچہ آپ کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے ابا جان فکر نہ کریں۔یہ کہہ کر وہ پھر اوپر کی طرف چڑھنے لگتا ہے اور چڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اتنی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ گویا نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

4۔ محترم پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام صاحب ابھی بچے ہی تھے۔ آپ کے والد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب نے خواب میں دیکھا کہ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب ایک بہت دلفریب اور بیش قیمت قلعت کو نہایت خوشنما اور چمکدار نقرئی بٹن لگا رہے ہیں۔ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے آپ کی طرف دیکھ کر خوشی سے مسکراتے ہوئے فرمایا یہ خلعت عبد السلام کے لئے تیار کی جا رہی ہے۔

حضرت چوہدری محمد حسین صاحب اپنے رؤیا و کشوف اور خدا تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی بشارتیں اپنی ڈائری میں بھی درج فرماتے تھے اور اپنے ہم وطن نہایت مخلص اور دیندار و تقوی شعار احمدی دوست حضرت میاں ناصر علی صاحب (مرحوم) کو بھی عند الملاقات سنا دیا کرتے تھے۔ 1969ء میں حضرت چوہدری صاحب موصوف کی وفات پر حضرت میاں ناصر علی صاحب نے آپ کی سیرت پر مشتمل جو مضمون رقم فرمایا اس میں ان رؤیا و کشوف کا بھی بطور خاص ذکر کیا۔

(حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو۔ الفضل 4 مئی 1929ء)

خدائی بشارتوں کی مہتم بالشان تکمیل

آج کون نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت چوہدری صاحب مرحوم کے جذبہ اخلاص و فدائیت اور شبانہ روز دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا۔ اس نے اپنے فضل خاص کے نتیجہ میں آپ کو آپ کے اس فرزند ارجمند کے عروج و اقبال کے بارہ میں جو بشارتیں دی تھیں۔ وہ بڑی شان کے ساتھ حرف بحرف پوری ہوئیں۔ ان خدائی بشارتوں کے مصداق محترم پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام صاحب مرحوم اپنے محیر العقول سائنسی کارناموں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہوئے اور ایسے مشہور ہوئے کہ شہرت عام اور بقائے دوام کے مستحق ٹھہرے۔ دنیا بھر کے اعلیٰ ترین سائنسی اداروں اور یونیورسٹیوں نے اعلیٰ ترین اعزازات بصد احترام آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ ان اعلیٰ ترین اعزازات میں سے ایک مشہور زمانہ ممتاز اعزاز ''نوبیل انعام'' بھی ہے۔ آپ کے کارناموں میں

سے ایک عظیم الشان کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں سائنسی علوم کی ترویج کی رو چلانے میں بہت ہمت اور مشقت کا مظاہرہ کیا۔ آپ کی انتھک مساعی اور بے لوث کاوشیں آخر رنگ لائیں۔ بالآخر جہاں آپ تیسری دنیا کی تحقیق کی سہولتوں سے محروم سائنس دانوں کی مزید تعلیم و تربیت اور رہنمائی کے لئے ٹریسٹی (اٹلی) میں سائنسی تحقیق کا ایک بہت بلند پایہ ادارہ قائم کرنے اور اسے کمال خوبی اور مہارت سے چلانے میں کامیاب ہوئے۔ وہاں تیسری دنیا کے دیگر ممالک کے علاوہ علی الخصوص پاکستانی سائنس دانوں کو اعلیٰ ترقیات اور کامیابیوں کے حصول کے قابل بنانے میں آپ نے بہت اہم بلکہ لافانی کردار ادا کیا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے فیض کا ایک چشمہ جاری کر دکھایا۔ آپ نے اپنے رفیع الشان کارناموں اور ان کے آفاق گیر اعتراف کے آئینہ دار لاتعداد اعزازات کے ذریعہ اپنے جان و دل سے پیارے وطن پاکستان کا نام روشن کیا اور ایسا روشن کیا کہ اکیلے ہی اسے چار چاند لگانے کا موجب ہوئے۔ آپ نے وطن کی نیک نامی اور سائنس کے میدان میں اس کی روز افزوں ترقی کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ وار دیا اور اسے اقوام عالم میں سربلند کرنے میں تن تنہا وہ کچھ کر دکھایا جو دوسروں سے بن نہ آیا۔ خدا نے خود اپنی جناب سے آپ کو وہ عزت بخشی کہ دنیا بھر کے چوٹی کے سائنس دانوں نے کسی قسم کے تعصب سے کام نہ لیتے ہوئے آپ کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور آپ کے سامنے احتراماً سر جھکانے میں کمال درجہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا۔ یہ آپ کے رب جلیل کا فضل خاص تھا جو آپ کے شامل حال ہوا۔ وہ رب ذوالجلال والاکرام جسے چاہتا ہے اپنے فضل خاص سے نوازتا ہے اور کوئی نہیں جو اسے اپنے پسندیدہ و برگزیدہ کو اپنے فضل خاص سے نوازنے سے روک سکے۔

خدا تعالیٰ نے اپنی پہلے سے دی ہوئی بشارتوں کے مطابق محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کو قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرما کر سائنسی تحقیق و تدقیق کے میدان میں اس لئے اوج کمال کو پہنچایا اور آپ کو دنیا بھر کے چوٹی کے سائنس دانوں میں اس لئے معزز و مفتخر کیا

کہ آپ کا وجود مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے دور سابقہ دور کے پھر عود کر آنے کی نوید بن کر ابھرے اور اس خدائی تقدیر کو ایک بار پھر آشکار کر دکھائے کہ جماعت احمدیہ کے ذریعہ اسلام کے دنیا بھر میں غالب آنے کے ساتھ ساتھ مسلمان سائنسی علوم میں اپنی برتری پھر قائم کرنے میں کامیاب ہونگے۔ آپ کی اصل عظمت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آپ مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے موعودہ دور کے نقیب و پیش رو ہیں اور اس دور کو عملاً قریب لانے میں اولیت کا فخر آپ ہی کو حاصل ہے اور ہمیشہ حاصل رہے گا۔ اس دور کے آنے کی بشارت دیتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے۔'' (تجلیات الٰہیہ)

سائنسی علوم کے میدان میں یہ پیش خبری اولاً جس وجود کے ذریعہ بڑی شان سے پوری ہوئی ہے وہ بلا شبہ محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ہی وجود ہے۔ ''ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم''

سیرت و کردار کے بعض درخشاں پہلو

اللہ تعالیٰ کی پہلے سے دی ہوئی بشارتوں کے مطابق عظیم الشان سائنسی کارنامے سرانجام دینے اور شہرت عام کے بل پر بقائے دوام حاصل کرنے والے اس عظیم سائنس دان کے فیض رساں وجود کو اللہ تعالیٰ نے دل موہ لینے والی سیرت اور حسین کردار سے مزین فرمایا تھا۔ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے عظیم کارناموں اور سیرت و کردار سے متاثر ہو کر دنیا بھر کے بڑے بڑے سائنس دان اور مملکتوں کے حکمران و سربراہان ہی آپ کی تعریف میں رطب اللسان نہیں تھے بلکہ احد من الناس قسم کے چھوٹے سے چھوٹے انسانوں میں سے جسے بھی آپ سے ملنے کا اتفاق ہوتا آپ کے حسن اخلاق اور عاجزی و انکساری کے اوصاف سے متاثر ہو کر آپ کا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہتا۔ خلافت

حقہ اسلامیہ احمدیہ کے تو آپ قلبی وابستگی کی وجہ سے بدرجہ اولیٰ اطاعت گزار تھے ہی قرآنی احکام کے مطابق آپ والدین کی خدمت واطاعت کے ذریعہ ان کی خوشنودی اور دعائیں حاصل کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے اور انہیں ہر ممکن سہولت وآسانی اور آرام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ پھر اپنے وطن عزیز پاکستان کی محبت بھی آپ کے رگ وریشہ میں سمائی ہوئی تھی اور آپ اسے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی راہوں پر گامزن کر کے اقوام عالم میں بلند مقام پر پہنچانے کے دل سے متمنی تھے۔ ہر چند کہ تعمیر وترقی کی آپ کی تجاویز کو وہ پذیرائی نہ ملی جو ملنی چاہیئے تھی پھر بھی آپ نے تن تنہا ملک وقوم کو ممکن حد تک فائدہ پہنچانے اور اسے ترقی کی راہ پر ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ وطن تو پھر وطن تھا اور اس کے لئے آپ کا تن من دھن ہر وقت حاضر تھا اور آپ نے اپنا سب کچھ وطن عزیز کی عزت وعظمت کے لئے وقف کئے رکھا، آپ تو تیسری دنیا کے ملکوں کی فلاح وبہبود کے لئے بھی ہمیشہ کوشاں رہے اور اپنے وطن کے سائنس دانوں کے ساتھ ساتھ تیسری دنیا کے پسماندہ ملکوں کے ہزاروں سائنس دانوں کو اٹلی کے مقام ٹریسٹی میں قائم کردہ سائنسی ریسرچ کے اپنے ادارہ میں تحقیق کی جدید ترین سہولتیں بہم پہنچا کر انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کی خدمت انجام دے سکیں۔

خلافت احمدیہ کے ساتھ وابستگی

خلافت احمدیہ کے ساتھ آپ کی وابستگی آپ کے اس پختہ ایمان کا ایک شیریں ثمر تھی کہ آپ کی یہ تمام تر کامیابیاں عالمگیر غلبہ اسلام کی آسمانی تقدیر کا ایک حصہ ہیں اور آپ کو ان کامیابیوں کا اہل بنانے والے خدائی فضلوں کو جذب کرنے میں خلفائے سلسلہ عالیہ احمدیہ اور آپ کے والدین کی عاجزانہ ومتضرعانہ دعاؤں کا بہت دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ساتھ آپ کی عقیدت ووابستگی ایک عجب عاشقانہ رنگ کی حامل تھی۔ آپ کو ایک خاص وجہ سے ابتداء ہی میں سیدنا حضرت المصلح الموعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر التفات کا مورد بننے کی

سعادت نصیب ہوئی۔ وہ اس طرح کہ سیدنا حضرت المصلح الموعودؓ نے 1939ء میں خلافت جوبلی فنڈ کی رقم ایسے طلباء کو تعلیمی وظائف دینے کے لئے وقف کردی تھی جو میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں یونیورسٹی بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کریں۔ محترم پروفیسر صاحب نہ صرف ہر امتحان میں اوّل آ کر بلکہ تمام سابقہ ریکارڈ توڑ کر جملہ وظائف کے حقدار قرار پائے۔ حضرت المصلح الموعودؓ کو شروع ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نوجوان خدائے قادر وعزیز کے فضل خاص کے نتیجہ میں جلد جلد ترقی کے منازل طے کر کے اوج کمال کو پہنچے گا۔ چنانچہ آپ حضور کی خصوصی توجہ اور دعاؤں کے مورد بنتے چلے گئے۔ جب حضور نے 1949ء میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کا نکاح پڑھایا تو خطبہ نکاح میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہر باپ اپنے بیٹے کی تعریف کرتا ہے۔ عزیز کے والد نے بھی ایسی ہی توقعات کا ذکر کیا تھا۔ الحمدللہ کہ عزیز سلمہ نے ان سب توقعات کو پورا کرنے کی توفیق پائی۔ **ذالك فضل الله يو تيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم**۔''

گورنمنٹ کالج لاہور سے ریاضی میں ایم اے کرنے کے بعد آپ تین سال کے وظیفے پر ریاضی کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان) چلے گئے۔ وہاں آپ نے تین سال کی بجائے دو سال ہی میں بی اے آنرز ریاضی (ٹرائی پوز) کی ڈگری حاصل کر لی۔ آپ نے ایک سال کا بقیہ وظیفہ چھوڑ کر وطن واپس آنا چاہا اور اس بارہ میں سیدنا حضرت المصلح الموعودؓ سے مشورہ مانگا۔ حضورؓ نے از راہ شفقت تحریر فرمایا ''ہمارے نزدیک یہ آپ کی بزدلی ہوگی اگر ملا ہوا وظیفہ چھوڑ کر آپ واپس آتے ہیں۔'' حضور نے اپنے مکتوب میں دعاؤں سے بھی نوازا۔ آپ نے ایف اے کے بعد فزکس کا مضمون نہیں پڑھا تھا اور اس پر چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ حضورؓ کے ارشاد کی تکمیل میں آپ نے بی اے آنرز (فزکس) کا تین سال کا کورس صرف ایک سال میں مکمل کرنے پر کمر باندھی۔ اللہ پر توکل اور حضور کی دعا اس کی قبولیت کے نتیجہ میں آپ نے بفضل اللہ

تعالیٰ تین سال کے کورس پر صرف ایک سال میں عبور حاصل کر کے نہ صرف بی اے آنرز (فزکس) کا امتحان پاس کیا بلکہ اوّل پوزیشن بھی حاصل کی۔ اس کے بعد آپ فزکس میں پی۔ایچ۔ڈی۔کرنا چاہتے تھے۔کورس تین سال کا تھا اور وظیفہ کا صرف دو سال کے لئے انتظام ہو سکا۔ آپ نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ پہلے سال کے دوران آپ نے ایٹمی ذرات پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ان ذرات کے متعلق بعض ایسے نظریات پیش کئے کہ ان کے اساتذہ ورطہ حیرت میں پڑے بغیر نہ رہے۔ انہوں نے یکسر جدید نظریات پر مشتمل یہ مقالہ طبیعیات کے مشہور عالم سائنس دان پروفیسر آئن سٹائن کے پاس امریکہ بھیج دیا۔ انہوں نے یہ مقالہ اپنے نائب پروفیسر ڈاٹسن کے حوالہ کیا کہ وہ اسے پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع کریں۔ پروفیسر ڈاٹسن پہلے ہی ان ذرات پر تحقیق کر رہے تھے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جو بات ان سے حل نہ ہو سکی تھی اس کا حل طبیعیات کے اس ایشیائی طالب علم کے مقالہ میں موجود ہے۔ انہوں نے پروفیسر آئنسٹائن سے مقالہ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ طالب علم ہے تو ایشیائی لیکن ہے بڑا غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک پروفیسر ڈاٹسن کو ایڈنبرا میں لیکچر کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ وہ جب امریکہ سے ایڈنبرا پہنچے تو انہوں نے محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو وہاں بلا بھجوایا۔ آپ سے نہ صرف ملاقات کی اور نہ صرف یہ کہ آپ سے آپ کے تحقیقی مقالہ کے اہم نکات سمجھے بلکہ ایڈنبرا میں آپ سے لیکچر بھی دلوایا۔ امریکہ واپس جا کر جب انہوں نے پروفیسر آئن سٹائن کو رپورٹ دی تو پروفیسر موصوف نے محترم ڈاکٹر محترم پروفیسر ڈاکٹر صاحب موصوف اور آپ کے نگران استاد کو لکھا کہ وہ دونوں دوسرے سال کا بقیہ حصہ ان کے خرچ پر امریکہ آ کر ان کی یونیورسٹی میں گزاریں۔ اس طرح محترم پروفیسر ڈاکٹر صاحب موصوف کو طبیعیات کے سب سے بڑے ماہر کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ تیسرا سال گزارنے کے لئے آپ امریکہ سے کیمبرج واپس آئے۔ تیسرے سال کے لئے وظیفہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں موجود رہ کر تھیسس (پی۔ایچ۔ڈی۔کا اصل مقالہ)

مکمل کرنا ممکن نہ تھا۔ یونیورسٹی نے آپ کی غیر معمولی لیاقت اور نہایت درجہ کارآمد اور یکسر نئی تحقیق کے پیش نظر اپنے قواعد وضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپ کو اس امر کی اجازت دے دی کہ آپ اپنا تھیسس (Thesis) پاکستان میں مکمل کر کے اسے وہیں سے بھجوادیں۔ چنانچہ 1952ء میں آپ کو کیمبرج یونیورسٹی نے بڑے اعزاز کے ساتھ فزکس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔

اعزازات کی بارش:: آپ کے تھیسس اور سائنس کے دیگر تحقیقی مقالوں کی ایسی دھوم مچی کہ آپ کو سائنسی تحقیق کے عالمی شہرت کے حامل تھے اور اعزازات ملتے چلے گئے۔ 1955ء میں اقوام متحدہ نے آپ کو ایٹم برائے امن کی پہلی کانفرنس کے لئے سیکرٹری چنا۔ 1957ء میں آپ امپیریل کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر 31 سال تھی۔ اس سے پہلے کسی انگریز کو بھی اتنی عمر میں اتنا بڑا عہدہ نہیں ملا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی نے دسمبر 1957ء میں ڈی۔ ایس۔ سی کی اعزازی ڈگری آپ کی خدمت میں پیش کی۔ حکومت پاکستان نے بیس ہزار روپے کا انعام اور ایک تمغہ دیا۔ 1959ء میں حکومت پاکستان نے ستارہ پاکستان کا اعزاز پیش کیا۔ 27 اکتوبر 1960ء کو انگلستان میں ہائی کمشنر پاکستان نے ایک خصوصی تقریب میں صدر مملکت کی حسن کارکردگی کی سند آپ کی خدمت میں پیش کی۔ دنیا بھر میں آپ پہلے مسلمان تھے جنہیں رائل سوسائٹی لندن نے اپنا فیلو بنایا۔ الغرض خدا کے فضل و کرم سے تمغوں، انعامات اور اعزازات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ یہ تو ابھی ابتداء تھی خدا نے عالمی شہرت کے اور بھی زیادہ بڑے وقیع اعزازات آپ کے لئے مقدر کر رکھے تھے۔ جو آگے چل کر آپ کو ملے اور اس کثرت سے دنیا کے ہر علاقے اور ملک میں ملے کہ یہ گویا انعامات کی بارش برستی چلی گئی۔

مشہورِ عالم نوبل پرائز کا حصول:: بارش کی طرح برسنے والے وقیع سے وقیع تر اور ارفع سے ارفع تر انعامات کا یہ سلسلہ خلافت ثانیہ کے زمانہ سے شروع ہو کر خلافت ثالثہ اور خلافت رابعہ کے زمانوں تک ممتد ہوتا چلا گیا۔ ان میں سے سب سے اعلیٰ و افضل اور عالمگیر اہمیت کا حامل اعزاز

نوبیل انعام کا حصول تھا جو آپ نے کائنات میں جاری وساری قوتوں کے ایک ہی قوت سے مستخرج ہونے کے سلسلہ میں ایک درمیانی کڑی سے متعلق بہت محیر العقول وگرانقدر ریسرچ کے صلہ میں حاصل کیا اور اس شان سے حاصل کیا کہ دنیا بھر کے چوٹی کے سائنس دان آپ کی غیر معمولی طور پر حیرت انگیز تخلیقی وتعمیری اور تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف کئے بغیر نہ رہے۔اس انعام کے حصول کے بعد آپ سائنسی دریافتوں کے میدان میں پاکستان اور دیگر اسلامی ملکوں کے ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے ہیرو اور یگانہ روزگار وجود کے طور پر ابھرے اور مشرق ومغرب کے تمام چوٹی کے سائنس دانوں اور دیگر دانشوروں اور مملکتوں کے سربراہوں نے آپ کی خدمت میں خراج تحسین وعقیدت پیش کیا۔ عالمی سطح کا یہ اعزاز واکرام اور تعظیم وتکریم کا انتہائی وسیع اہتمام وانصرام خدا تعالیٰ کے غیر معمولی فضلوں کو جذب کرنے والی خلفائے سلسلہ عالیہ احمدیہ اور محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے والدین کی مقبول دعاؤں کا ثمرہ تھا۔

محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے بھائی برادرم عبدالرشید صاحب مقیم لندن نے ایک ملاقات میں خاکسار کو بتایا کہ 1969ء میں آپ کے والد محترم چوہدری محمد حسین صاحب کی وفات کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کے سب بھائی مل کر ملاقات کی غرض سے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ملاقات کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس امر کا کسی قدر تاسف کے ساتھ ذکر کیا کہ والد صاحب محترم کی وفات سے ہم ان کی متضرعانہ دعاؤں سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ سب بہن بھائیوں کے لئے بہت دعائیں کیا کرتے تھے۔حضور رحمہ اللہ نے فرمایا میں پہلے ہی آپ سب کے لئے دعائیں کرتا ہوں اب اور زیادہ تعہد کے ساتھ دعائیں کیا کروں گا۔حی وقیوم خدا کے فضلوں کا ہمیشہ امیدوار رہنا چاہئے اور اس کے حضور بہت دعائیں کرنی چاہئیں۔حضور نے محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کو مخاطب کر کے فرمایا کہ خدا آپ کو نوبیل انعام حاصل کرنے کی توفیق ضرور عطا فرمائے گا۔محترم ڈاکٹر صاحب موصوف فزکس کی دنیا

میں سال بہ سال نت نئے نظریات پیش کرتے اور ان کے ثبوت فراہم کرتے رہے اور دنیا میں آپ کے کام اور نام کے ڈنکے بھی بجتے رہے۔حتیٰ کہ 1978ء کا سال آ گیا۔ایک ملاقات کے دوران سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب موصوف سے فرمایا مجھے خدا نے خبر دی ہے کہ اس سال تو آپ کو نوبیل انعام نہیں ملے گا لیکن اگلے سال یعنی 1979ء میں آپ کو یہ انعام ضرور مل جائے گا۔جب خدائی بشارت کے مطابق اگلے سال آپ کو نوبیل انعام کا حق دار قرار دے دیا گیا تو اس بارہ میں باضابطہ اطلاع موصول ہونے پر آپ نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ آپ سیدھے مسجد فضل لندن گئے اور وہاں اپنے ارحم الرحمین احسن الخالقین، رب العالمین صادق الوعد خدائے قادر و کریم کے حضور سجدہ شکر بجالائے۔

بعد ازاں خلافت رابعہ کے موجودہ زمانہ میں بھی آپ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز سے پیہم ملاقاتیں کر کے حضور کو اپنی جدید تحقیق اور یکسر نئے نظریات سے آگاہ کر کے حضور سے دعاؤں کی درخواست کرتے رہے۔آپ نے ریسرچ کا سلسلہ جاری رکھا اور طبیعیات میں مزید انقلاب انگیز جدید نظریات پیش کئے جن کی صحت کو جانچنے اور پرکھنے پر دنیا کی بڑی بڑی سائنسی تجربہ گاہوں میں کثیر رقوم خرچ کی جارہی ہیں اور اس سلسلہ میں بہت وسیع پیمانہ تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔کوئی بعید نہیں کہ مستقبل میں محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو آپ کے ان جدید انقلاب انگیز نظریات پر بعد از وفات ایک اور نوبل انعام کا حقدار قرار دے دیا جائے۔

والدین کی خدمت اور اطاعت گزاری

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی سیرت کا ایک اور نہایت درخشندہ پہلو یہ تھا کہ آپ نے دنیا میں بہت بلند مرتبہ حاصل کرنے، سائنسی تحقیق میں مستغرق رہنے اور اس بناء پر نہایت مصروف الاوقات ہونے کے باوجود والدین سے والہانہ محبت کرتے حتی المقدور ان کی خدمت بجالانے، انہیں ہر ممکن سہولت و آرام پہنچانے اور ان کی اطاعت گزاری کا حق ادا کرنے میں کمال کر

دکھایا۔ اس کی تصدیق خود ڈاکٹر صاحب محترم کے برادران کرام نے عند الملاقات کی۔ آپ کی سیرت کے اس درخشاں پہلو پر ایمان افروز واقعات کے رنگ میں تفصیلی روشنی آپ کے بھائی اور دیگر عزیز ہی ڈال سکتے ہیں البتہ اس ضمن میں ایک اہم واقعہ آپ کے والد محترم حضرت چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم کے سوانح حیات مرتبہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی میں ایسا درج ہے جس سے محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کی سیرت کا یہ پہلو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس مضمون میں میں اس کے ذکر پر ہی اکتفا کروں گا۔ جب محترم ڈاکٹر صاحب موصوف امپیریل کالج لندن میں پروفیسر مقرر ہوئے تو آپ نے اپنے والدین کو پاکستان سے لندن بلوانے اور انہیں اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس غرض سے آپ نے لندن کے علاقہ پٹنی میں ایک مکان خریدا۔ یہ مکان امپیریل کالج سے بہت فاصلہ پر واقع تھا۔ آپ کے ایک ساتھی نے آپ سے کہا آپ کو تو مکان ایسے علاقہ میں خریدنا چاہئے تھا جہاں سے آپ کو امپیریل کالج آنے جانے میں آسانی ہوتی۔ پٹی کے علاقہ سے کالج آنے جانے میں خاصا وقت خرچ ہو جایا کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ لندن اور اس کے گرد و نواح کے اعلیٰ سے اعلیٰ علاقہ میں مکان خرید کر بہت ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر سکتے تھے پھر آپ نے پٹنی کے علاقہ کو کیوں ترجیح دی؟ اس کا جواب آپ نے اپنے ایک ساتھی کو یہ دیا کہ میں نے مکان اپنے والدین کی سہولت کے پیش نظر خریدا ہے۔ میرے والد نماز با جماعت کے بہت پابند ہیں۔ جو روحانی تسکین انہیں نماز با جماعت ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے وہ گھر پر اکیلئے نماز ادا کرنے سے نہیں ہو سکتی۔ میں نے مکان ایک ایسے علاقہ میں خریدا ہے جہاں سے مسجد فضل قریب ہے وہاں سے انہیں مسجد آنے جانے میں سہولت رہے گی۔ میرا کیا ہے میں تو لمبا فاصلہ طے کر کے کالج بہر حال پہنچ ہی جایا کروں گا۔

ایک اور امر جس سے اپنے والدین سے آپ کی والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے یہ ہے کہ آپ کی یہ شدید خواہش تھی کہ آپ جب وفات پائیں تو اپنے والدین کی آخری آرام گاہ کے قرب میں مدفون

ہوں۔ چنانچہ بہشتی مقبرہ ربوہ کے اس قطعہ میں جس میں آپ کے والدین کے مزار ہیں ایک خالی جگہ (درخواست کرکے) اپنے لئے مخصوص کرالی تھی۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی تدفین اسی قطعہ میں ہوئی۔ (بحوالہ الفضل انٹرنیشنل 2 مئی 1997ء)

وطن عزیز سے والہانہ محبت

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنی مادر وطن یعنی پاکستان سے والہانہ محبت تھی۔ اس والہانہ محبت کی وجہ سے ہی آپ پاکستان کو اوائل میں ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کی شعبوں میں ترقی کی راہ پر گامزن کرکے اسے دنیا میں عزت وعظمت کے بہت بلند مقام پر فائز دیکھنے کے متمنی تھے۔ آپ نے صدر ایوب کے سائنسی مشیر اور اٹامک انرجی کمیشن آف پاکستان کے ممبر کی حیثیت سے جو آپ ہی کے مشورہ اور تجویز کے مطابق معرض وجود میں آیا تھا ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم عام کرنے سے متعلق بہت ہی مفید تجاویز اور سکیمیں پیش کیں لیکن افسر شاہی کی طرف سے انہیں چنداں اہمیت نہیں دی گئی جس کی وجہ سے ان پر عمل نہ ہوسکا۔ تاہم سائنسی ترقی کے بنیادی تقاضے پورے کرنے کے سلسلہ میں آپ کی مساعی جمیلہ کے نتیجہ میں بہت سے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ آپ کی تجویز اور مشورہ کے مطابق وجود میں آنے والے پاکستان ایٹامک انرجی کمیشن کو آپ مسلسل چودہ سال تک اپنے ماہرانہ مشوروں سے نوازتے رہے۔ Pinsteck کے لئے موقع کی مناسب و موزوں جگہ اور علاقہ کے انتخاب میں بھی آپ کا تعاون بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوا۔ پھر Kanupp کے حصول اور دستیابی پر آپ نے بہت زور دیا اور اس کی بھرپور تائید کی۔ آپ نے حکومت پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ ترقی یافتہ ممالک میں اپنے سائنس دانوں کو ٹریننگ دلوائے اور آپ نے اپنے ذاتی روابط کو بروئے کار لا کر دنیا کی اہم یونیورسٹیوں اور لیبارٹریوں میں ان کے لئے جگہیں نکلوائیں اور ٹریننگ کا انتظام کیا۔ آپ نے پاکستان میں Pakistan Space Upper Atmosphere (SUPARCO Committee) جیسے اہم ادارہ کے قیام کا نہ صرف خواب دیکھا بلکہ اس کے قیام میں

اپنی تمام تر صلاحیتوں کا بڑی ذمہ داری سے بھرپور مظاہرہ کیا۔آپ نے صدر ایوب خان کو پاکستان کے سیم وتھور کے مسائل حل کرنے میں امریکہ کی مدد حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور اس سلسلہ میں عملی اقدامات کر کے ان مسائل کے حل میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔آپ نے 1960ء میں ایٹامک انرجی کمیشن کے سابق چیئرمین جناب منیر احمد خان کی معاونت سے ایٹمی ایندھن کی افزودگی کا پلانٹ قائم کرنے کی سکیم مرتب کی لیکن صدر ایوب خان نے اسے مالی رکاوٹوں کی بنیاد پر التوا میں ڈالے رکھا اس طرح پاکستان نے بنیادی اہمیت کی حامل اس ٹیکنالوجی کے حصول کا سنہری موقعہ ہاتھ سے گنوا دیا حالانکہ تمہیں سال پہلے یہ ٹیکنالوجی بغیر تحفظات کے بہت کم قیمت پر حاصل ہو سکتی تھی۔آپ کی ان عظیم خدمات کا جناب منیر احمد خان نے اپنے مضمون Slaam Passes into History مطبوعہ دی نیوز" لاہور مورخہ 24 نومبر 1996ء میں ذکر کیا ہے۔اسی لئے انہوں نے اپنے اس مضمون میں لکھا:۔"بہت کم پاکستانی ہونگے جو اپنی مادر وطن کو دنیا میں عزت واحترام کا وہ بلند مقام دلانے میں کامیاب ہوئے ہونگے جو ڈاکٹر عبدالسلام نے اسے دلایا"۔

محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب پاکستان کے مایہ ناز فرزند تو تھے ہی اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ سائنس کے میدان میں تیسری دنیا کے ہیرو اور محسن بن کر ابھرے۔آپ نے پسماندہ ملکوں کے سائنس دانوں کو تربیت دینے کی غرض سے "انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس قائم کرنے کی سکیم انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کی منظوری اور اس کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے ایجنسی میں پیش کی۔اس سکیم کی بعض نوبیل انعام یافتہ امریکی سائنس دانوں اور بھارت کے سائنس دان بھابھا نے شدید مخالفت کی۔مسٹر بھابھا دراصل اس سنٹر کے قیام کے حق میں تو تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ یہ سنٹر بمبئی میں قائم ہو۔انہوں نے محترم ڈاکٹر سلام سے کہا کہ اگر وہ ان کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ آپ کی مدد سے اس سنٹر کے بمبئی میں قیام کا انتظام کر دیں گے۔محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔آپ یہ سنٹر پاکستان میں قائم

کرنا چاہتے تھے لیکن اس وقت کی حکومت اس کے لئے مالی امداد فراہم کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ آپ نے ہمت نہ ہاری اور اپنی کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر آپ 1964ء میں بعض چوٹی کے سائنس دانوں کے تعاون اور اٹلی کی معاونت سے اٹلی ہی میں ٹریسٹی کے مقام پر یہ سنٹر قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اصل غرض آپ کی یہی تھی کہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک سے تعلق رکھنے والے سائنس دانوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں پاکستانی سائنس دانوں کو اعلیٰ تربیت کے مواقع فراہم ہوں۔ آپ نے اس ادارہ کے پہلے ڈائریکٹر کی حیثیت سے تیسری دنیا کے تیس ہزار سائنس دانوں کو اعلیٰ سائنسی ریسرچ کے مواقع بہم پہنچائے اور اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد پاکستانی سائنس دانوں کی شامل ہے۔ یہ سنٹر محترم پروفیسر عبدالسلام صاحب کا جاری کردہ ایسا چشمہ فیض ہے جس سے تیسری دنیا کے سائنس دان بالعموم اور پاکستان کے سائنس دان بالخصوص مستفیض ہوتے چلے جائیں گے۔

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی اپنے وطن عزیز پاکستان سے والہانہ محبت کا عالمی سطح پر ایک اور مہتم بالشان اظہار اس وقت ہوا جب 1979ء میں آپ کو مشہور زمانہ نوبیل انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔ اس وقت سب سے پہلے بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اور پھر برطانیہ اور بعض دوسرے ممالک نے آپ کو اپنے ملک کی شہریت اور اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازنے کی پیشکش کی۔ یہ سب ممالک چاہتے تھے کہ آپ ان کے ملک کے شہری کی حیثیت سے یہ اعزاز حاصل کریں اور ان کے ملک کے لئے عزت اور شہرت کا باعث بنیں۔ لیکن آپ نے ان میں سے کوئی ایک پیشکش بھی قبول نہ کی۔ ہر پیشکش کو آپ رد کرتے چلے گئے۔ آپ یہ پیشکشیں کیوں نہ مسترد کرتے جبکہ اپنے پیارے وطن کی محبت تو آپ کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی۔ آپ نے ہر ایسی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے اس امر کا برملا اظہار کیا کہ فرض عین کا درجہ رکھنے والی میری یہ دلی تمنا ہے کہ میں یہ عالمی اعزاز ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے وصول کروں اور اس

طرح میرے وطن عزیز سرزمین پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ہو کہ اس کے ایک فرزند کو فزکس میں نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ وقت آنے پر آپ نے فرض عین کا درجہ رکھنے والی اپنی اس دلی تمنا کا عملاً بہت ہی اچھوتے انداز میں اظہار کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے اس اچھوتے عملی اظہار پر دنیا عش عش کئے اور آفرین کے بغیر نہ رہی۔ جب شاہ سویڈن نے ایک پرشکوہ تقریب میں مختلف ملکوں کی نابغہ روزگار ہستیوں کی خدمت میں نوبل انعامات پیش کئے تو محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے اس موقع پر پاکستان کا نام بلند کرنے اور اس کی عزت وعظمت کو دنیا پر آشکار کرنے کے لئے سر سے پاؤں تک پاکستانی لباس میں ملبوس ہو کر شاہ موصوف سے اپنا انعام حاصل کیا۔ آپ شیروانی اور شلوار میں ملبوس تھے۔ سر پگڑی سے مزین تھا اور پیروں میں اپنے علاقہ کا مخصوص کھسہ پہنا ہوا تھا۔ آپ کے سائنسی کارناموں کے ساتھ اس تاریخی موقع کی یہ تاریخی تصویر دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوئی اور شرق وغرب کے آخری کونوں تک پاکستان کو سر بلند کرنے اور اس کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگانے کا موجب ہوئی۔ دنیا کا کوئی متوقر اخبار اور رسالہ ایسا نہ تھا جس نے محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ساتھ آپ کے وطن پاکستان کو خراج تحسین و عقیدت پیش نہ کیا ہو۔ آپ کا وجود ایک بلند پایہ وفیض رساں سائنس دان کی حیثیت سے دنیا بھر میں پاکستان کی نیک نامی کا موجب ہوا اور جب تک آپ زندہ رہے دنیا کے اعلیٰ ترین سائنسی حلقوں میں آپ کے حوالہ سے پاکستان کے نام کی دھوم مچی رہی۔ مزید برآں آپ کے وجود سے علی الخصوص تیسری دنیا میں سائنسی علوم کی ترویج اور آپ کے پیش کردہ نت نئے سائنسی نظریات کی شکل میں فیض کا جو عظیم چشمہ جاری ہوا ہے آئندہ بھی آپ کے نام اور نیز آپ کے وطن عزیز پاکستان کی دھوم مچتی چلی جائے گی۔ آپ کی وفات پر جو 21 نومبر کو لندن میں ہوئی اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر محترم فاروق احمد خان لغاری نے اپنے تعزیتی پیغام میں ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر بالکل بجا فرمایا ہے۔

’’ڈاکٹر سلام اپنی ذات میں پاکستان کے ایک عالی مرتبت سفیر کی حیثیت رکھتے تھے۔آپ نوبیل انعام یافتہ ہونے کے بل پر دنیا میں سرفرازی حاصل کرنے والے واحد پاکستانی تھے۔اس حیثیت میں آپ اپنی مادر وطن کی عزت بلند کرنے کا موجب بنے اور اس طرح آپ نے اس کی مسلمہ شناخت ہونے کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔آپ نے دنیائے سائنس کے نقشہ پر پاکستان کے نقش کو بڑی مضبوطی اور پائیداری کے ساتھ ابھارنے کا کارنامہ انجام دیا۔(ترجمہ: پاکستان ٹائمز، لاہور 22 نومبر 1996ء)

بڑائی کے باوجود عجز وانکسار کا مجسمہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والی عظمتوں اور رفعتوں نیز اعزازات و انعامات کی پیہم نازل ہونے والی بارشوں کے باوجود آپ میں عجز وانکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور یہ وصف آپ کو احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے طفیل اپنے والد بزرگوار کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔انسان تو سب برابر اور یکساں قابل عزت ہیں ۔دنیوی نقطہ نگاہ کی رو سے اگر کوئی چھوٹا شخص آپ سے ملتا تو آپ اس سے بھی بہت کشادہ دلی خوش روئی اور خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے۔ ملنے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس دور کے شہرہ آفاق عظیم سائنس دان سے باتیں کر رہا ہے۔انگریزی روزنامہ ’’ڈان‘‘ نے اپنے شمارہ 22 نومبر 1996ء میں اور اٹامک انرجی آف پاکستان کے سابق چیئرمین جناب منیر احمد خان صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ ’’دی نیوز‘‘ مورخہ 23 نومبر 1996ء میں آپ کی سیرت کے اس درخشاں پہلو کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے ’’ڈان‘‘ نے تو لکھا ہے کہ وہ Ivory Tower سائنس دان نہیں تھے جس کے معانی ہیں کہ وہ ایسے انسان نہیں تھے جو اپنی انا کے خول میں بند رہنے اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ جناب امیر احمد خان صاحب نے آپ کی اس صفت کا ذکر تو خاصی تفصیل سے کیا ہے لیکن اس میں ایک لفظ ایسا استعمال کیا ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس خوبی کو اس میں سمو کر رکھ دیا ہے اور وہ لفظ ہے Unassuming یہ لفظ اپنے آپ کو نمایاں نہ کرنے والے حلیم الطبع انسان کے لئے بولا جاتا ہے۔

حقیقت میں ہے کہ آپ بہت سلیم الفطرت اور حلیم الطبع واقع ہوئے تھے۔آپ ہر انسان کو انسان ہونے کے ناطے تعظیم وتکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔مجھ ایسے احمد من الناس کو آپ سے بار ہا ملنے کا اتفاق ہوا۔میں نے آپ کو ہو بہو ایسا ہی پایا۔ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے مجھ سے ملنے سے انکار کیا ہو۔یا میری طرف سے پوچھے جانے والے کسی سوال کا برا منایا ہو۔میں اکثر و بیشتر الفضل کے نمائندے کی حیثیت سے ملا کرتا تھا تاکہ آپ کو من جانب اللہ عطا ہونے والی عظیم الشان کامیابیوں اور رفیع الشان اعزازات کی خبر الفضل میں شائع کرسکوں۔

مجھے آپ کو زندگی میں پہلی بار دیکھنے اور باتیں کرنے کا اتفاق غالباً 1949ء یا 1950ء میں اس وقت ہوا جب آپ کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے آنرز (ریاضی) اور بی اے آنرز (فزکس) کے امتحانات اصل سے قریباً نصف مدت میں بہت اعزاز کے ساتھ پاس کر کے وطن واپس تشریف لائے۔مجھے پتہ چلا کہ آپ لاہور میں پرانی انارکلی اور نابھہ روڈ کے علاقہ میں غالباً ربانی روڈ کی کسی گلی میں اپنے ماموں حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب حکیم (جو مغربی افریقہ میں سلسلہ احمدیہ کے نامور مبلغ تھے) کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔میں پتہ کرتا کراتا آخر اس گھر تک جا ری پہنچا جو اس گدڑی کی طرح تھا جس میں لعل بے بہا چھپا ہوا تھا۔میں نے دستک دی۔حضرت مولانا حکیم صاحب کے ایک فرزند ارجمند نے ،جنہیں میں پہلے سے جانتا تھا، دروازہ کھولا اور آمد کا مقصد معلوم کرنے کے بعد بیٹھک کے طور پر استعمال ہونے والے ایک کمرے میں مجھے بٹھا گئے۔تھوڑی ہی دیر میں میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں ہندو طلباء کے قائم کردہ ریکارڈ توڑنے اور کیمبرج میں بی اے آنرز (ریاضی) کا امتحان تین سال کی بجائے دو سال میں اور بی۔ایس۔سی۔آنرز (فزکس) کا امتحان تین کی بجائے صرف ایک سال میں بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کرنے والا نوجوان اپنے بھائی عبدالسمیع کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوا۔میں اپنی توقع اور تصور کے سراسر برخلاف اس نابغہ روزگار نوجوان کو بالکل سیدھے سادے عام نوجوانوں کی طرح سادہ ہی

نہیں بلکہ منکسر المزاج اور خاموش طبع پا کر ہکا بکا رہ گیا۔

ستم ظریفی کا آئینہ دار واقعہ

رپورٹر الفضل کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ آنے کا مقصد بیان کیا۔ سیدھے سادے نابغہ روزگار نوجوان کی محیر العقول کامیابیوں کے کوائف خود اس کی زبان سے سنے۔ میں ایک فری لانس پریس فوٹو گرافر مسٹر عزیز کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ چنانچہ اپنی غیر معمولی لیاقت کی دھاک بٹھانے والے اس نوجوان کا فوٹو کھنچوایا اور واپس چلا آیا۔ الفضل میں تو میں نے خبر شائع کرنا ہی تھی سو کر دی لیکن میں نے ساتھ ہی انگریزی میں بھی خبر بنائی اور وہ خبر مع فوٹو پاکستان ٹائمز کے نیوز سیکشن میں دے آیا۔ دو روز تک انتظار کیا لیکن خبر شائع نہ ہوئی۔ آخر تیسرے روز رات کو پاکستان ٹائمز کے دفتر جا کر نیوز ایڈیٹر کمال صاحب سے ملا اور ان سے کہا کہ اس اطلاع پر مشتمل میں خبر دے گیا تھا لیکن وہ تا حال شائع نہیں ہوئی۔ وہ کہنے لگے خبر تو میری نظر سے بھی گزری تھی لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں آیا کہ ایک نوجوان اتنی کم عمری میں بی۔اے۔ آنرز ریاضی کا امتحان تین سال کی بجائے دو سال میں پاس کرنے کے بعد بی۔اے۔ آنرز فزکس کا امتحان تین سال کی بجائے صرف ایک سال میں پاس کر دکھاتا ہے اور پھر پاس بھی کرتا ہے اس شان کے ساتھ کہ انگریز طلباء کو مات کر دکھاتا ہے۔ میں نے سوچا اگر یہ خبر غلط نکلی تو اخبار کی بہت سبکی ہوگی تاہم میں نے وہ خبر اپنے رپورٹر کو دے دی تھی کہ وہ پہلے اس کی تصدیق کرے۔ ہوا یہ کہ رپورٹر صاحب نے اسے ضائع کر چھوڑا۔ القصہ خبر چھپنی تھی نہ چھپی۔

شبہ اور تذبذب میں پڑ کر پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹر کمال صاحب نے خبر نہ چھاپ کر جس ستم ظریفی کا مظاہرہ کیا تھا قدرت نے انہیں اس کا عجب رنگ میں جواب دیا۔ جب وہی نوجوان 1952ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے اور طبعیات میں یکسر جدید نظریات پیش کر کے دنیا بھر میں تہلکہ مچانے کے بعد 1957ء میں لندن کے امپیریل کالج میں

پروفیسر مقرر ہوا تو اس کا یہ تقرر بھی ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اس وقت اس کی عمر صرف 31 سال تھی اور اس سے پہلے کوئی ایشیائی تو کجا کوئی یورپی یا برطانوی سکالر بھی اتنی کم عمری میں اس بلند علمی مرتبہ کو نہ پاسکا تھا۔ پہلے قلیل ترین مدت میں بیک وقت بی اے آنرز (ریاضی) اور بی ایس سی (فزکس) کے امتحانات خصوصی امتیاز کے ساتھ پاس کرنے پر پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹر کمال صاحب کو یقین نہ آیا تھا۔ اس مرتبہ اسی نوجوان کے امپیریل کالج میں پروفیسر اور صدر شعبہ فزکس مقرر ہونے پر پاکستان ٹائمز کے مالک محترم میاں افتخار الدین صاحب کو یقین نہ آیا۔ ان کے نزدیک یہ اتنی حیران کن بات تھی کہ اس پر یقین کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ انگلستان آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ خود انگلستان جا کر محترم پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام صاحب سے ملے اور واپس آ کر آپ کی حیرت انگیز علمی کامیابیوں اور کارناموں پر ایک تفصیلی مضمون پاکستان ٹائمز میں شائع کرایا۔ وہی مثل صادق آئی کہ چاند چڑھا کل عالم نے دیکھا اور کسی کے لئے بھی شبہ کی گنجائش اور انکار کی مجال نہ رہی۔(الفضل 9 مئی 1997ء)

ایک انوکھی فرمائش کا خوشکن ردعمل

امپیریل کالج لندن میں پروفیسر مقرر ہونے کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب موصوف ایک مرتبہ پاکستان تشریف لائے اور اس دوران ایک روز کے لئے ربوہ بھی آئے۔ انتہائی مصروف پروگرام کے باوجود حسب معمول علیحدہ ملاقات کے بارہ میں میری درخواست کو قبول فرمایا۔ میں وقت مقررہ پر حاضر خدمت ہوا۔ باتوں ہی باتوں میں ایک انوکھی فرمائش کر بیٹھا۔ فرمائش میں نے یہ کی کہ آپ نے ایٹمی ذرات کے متعلق جو جدید نظریات اور اپنی ریسرچ کے حیران کن نتائج پیش کئے ہیں ان کا عام فہم خلاصہ بیان فرمائیں تا کہ عام لوگوں کو بھی اس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ یہ سن کر آپ قدرے مسکرائے اور مجھ سے دریافت فرمایا کیا آپ اپنی تعلیم کسی مرحلہ میں سائنس کے طالب علم رہے ہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔ فرمایا بہت خوب! جو کچھ میں بیان کروں گا اسے آپ خود نہیں سمجھ

پائیں گے تو الفضل کے ذریعہ دوسروں کو کیا سمجھائیں گے۔ مَیں نے عرض کیا یہ الگ بات ہے کہ مَیں کچھ سمجھ سکوں یا نہیں لیکن اپنے آپ پر مجھے اتنا اعتماد ضرور ہے کہ آپ جو کچھ بیان فرمائیں گے۔ مَیں اسے بلا کم وکاست ضبط تحریر میں لا کر اسے دوسروں تک پہنچا دوں۔ مَیں نہ سہی سائنس کی شدھ بدھ رکھنے والے تو سمجھ جائیں گے اور انہیں آپ کی جدید ریسرچ کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ میری یہ بات سن کر آپ حیران بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ یکدم فرمایا اچھا تو پھر سنئے۔ آپ بیان فرماتے رہے اور اس امر کے باوجود کہ جو کچھ آپ بیان فرما رہے تھے وہ میرے سر پر سے گزر رہا تھا۔ مَیں ساتھ کے ساتھ نوٹس بھی لیتا گیا۔ مَیں نے جو کچھ سنا تھا اسے مرتب کر کے الفضل میں شائع کر دیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف تو اسی روز ربوہ سے واپس تشریف لے گئے۔ میری اس رپورٹ کے بارہ میں آپ کی رائے یا تاثر کا تو مجھے علم نہیں ہو سکا۔ تاہم جب میں نے اپنے عزیز دوست برادرم محترم پروفیسر نصیر احمد خان صاحب (مرحوم) صدر شعبہ فزکس تعلیم الاسلام کالج سے رپورٹ کی صحت کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے اس امر کی تصدیق کی کہ میں نے جو کچھ شائع کیا ہے وہ عام فہم خلاصہ کے طور پر بالکل درست ہے۔

اپنی اس انوکھی فرمائش کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ میں کسی اور عالمی شہرت یافتہ سائنس دان سے ایسی فرمائش کرنے کی کبھی جرات نہیں کر سکتا تھا اور اگر موقع پیدا ہونے پر ایسی لغزش رندانہ کر بیٹھتا تو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا۔ مجھ ایسے کندہ ناتراش کو وہ ایسی جھاڑ پلاتا کہ میرے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ اتنا بڑا حوصلہ محترم ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم جیسا متواضع اور منکسر المزاج انسان ہی رکھ سکتا تھا کہ خود اس دور کا عظیم سائنس دان ہونے کے باوجود آپ میری بچگانہ درخواست کو قبول کرنے اور اس طرح میرا دل رکھنے پر آمادہ ہو گئے۔

ایک کوشش خام پر اظہار خوشنودی

ہر چند کہ میں ربوہ اور لاہور میں محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام سے متعدد مرتبہ مل چکا تھا لیکن ان

کے والد بزرگوار حضرت چوہدری محمد حسین صاحب سے ملاقات کی سعادت سے سدا محروم رہا۔البتہ ان کی وفات سے سال ڈیڑھ سال قبل ایک باطنی تحریک کے زیر اثر ان کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔اس طرح ایک خاص امر کے بارے میں خدائی افضال کا مورد بننے میں آپ کی دردمندانہ مقبول دعائیں میرے حصہ میں بھی آئی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ 1969ء میں ان کی وفات میرے لئے بھی از دل گرفتگی اور غم والم کا موجب ہوئی تھی۔میں نے ان کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق حسنہ سے مزین فیض رساں وجود کے بارہ میں ایک مضمون لکھا جو روزنامہ الفضل بابت 9 تا 11 جولائی 1969ء میں قسط وار شائع ہوا۔محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کو وہ مضمون بہت پسند آیا۔ان دنوں حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی حضرت چوہدری محمد حسین صاحب کی سوانح مرتب فرار ہے تھے۔محترم ڈاکٹر صاحب موصوف میرا تحریر کردہ مضمون الفضل میں پڑھ کر حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی گھر واقع رام گلی لاہور میں تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا یوں تو والد صاحب مرحوم کے قریبی دوستوں عزیزوں نے ان کی سیرت پر مشتمل متعدد مضامین اور بہت اچھے انداز میں لکھے لیکن سب سے اچھا مضمون اس شخص نے لکھا ہے جس نے انہیں کبھی دیکھا نہ تھا۔آپ کی مراد خاکسار کے مضمون سے تھی۔آپ نے حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا آج میں آپ کی خدمت میں خاص طور پر اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس مضمون کو اس کتاب میں ضرور شامل کریں جو آپ حضرت والد صاحب کی سوانح کے متعلق مرتب فرما رہے ہیں البتہ اس مضمون کا وہ حصہ حذف کر دیں جس میں مجھے حاصل ہونے والی ترقیات اور اعزازات کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

یہ سارا واقعہ حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی نے عندالملاقات مجھے سنایا۔یہ واقعہ میں نے یہاں اس لئے درج کیا ہے کہ اس سے بھی محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے عجز وانکسار کے وصف پر روشنی پڑتی ہے۔میرا تاثر یہ ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس عاجز پر محترم ڈاکٹر

صاحب موصوف کی شفقت کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا اور گا ہے بگا ہے ملاقات میں پہلے کی نسبت کسی قدر زیادہ گرمجوشی آ گئی۔ دوری کی سہی ان کی نظر کرم کی افزونی میرے لئے فزوں سے فزوں تر ہونے والی طمانیت کا موجب بھی چلی گئی۔ جب ہر نظر ہی نظر کرم میں تبدیل ہو گئی تو میں پر نظر کرم پر سوچا کرتا تھا

یہ درد ہجر اور یہ کیا لذت وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

سن ستر کی دہائی میں مجھے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کے ہمراہ حضور کے ایک خادم کی حیثیت سے متعدد بار انگلستان جانے کا موقع ملا۔ دو مرتبہ ایسا ہوا کہ محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے حضورؒ کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ حضورؒ نے از راہ شفقت دونوں بار آپ کی دعوت کو شرف قبول سے نوازا۔ میں ہر بار کھانے کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی سرے سے ہی کسی چھوٹی میز کے کونے پر بیٹھ جاتا رہا۔ لیکن دونوں بار آپ کی متجسس نگاہیں تلاش کرتی ہوئی آئیں اور مجھے پر آ کر ایسی ٹکیں کہ مَیں اپنی پسند کی نچلی جگہ پر نہ ٹک سکا، فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور آپ نے میرا ہاتھ اپنے ساتھ میں پکڑ کر مجھے مرکزی میز سے ایک سرے کی خالی کرسی پر لا بٹھایا۔ نظر کرم اگرچہ ہر بار ہی پلک جھپکنے میں گزر جاتی رہی لیکن اس کی پیار بھری یاد کبھی نہیں گزری۔ وہ آج بھی میری نظروں اور دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے اور اپنی پوری تر و تازگی کے ساتھ ہمیشہ بسی رہے گی۔

نوبیل انعام ملنے پر تہنیتی خط کا جواب

خلفائے سلسلہ عالیہ احمدیہ، دیگر بزرگان جماعت اور محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے والد بزرگوار کی دعاؤں کی قبولیت مشہور عالم نوبل انعام کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ دنیا بھر سے آپ کی خدمت میں مبارکباد کے خطوط موصول ہوئے۔ دنیا کی عظیم ہستیوں کے تہنیتی خطوط میں مجھ حقیر و بے مایہ فقیر کا خط بھی شامل تھا۔ جواب میں جو مکتوب گرامی موصول ہوا اس میں پس تحریر کے طور پر

محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کا اپنے قلم سے رقم کیا ہوا ایک فقرہ بھی تھا جس میں درد ہجرت اور لذت وصال سے کہیں بڑھ کر نظر التفات کی گرمجوشی سموئی تھی۔مکتوب گرامی کا متن من وعن درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم
وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

79-11-4

گرامی قدر جناب مسعود احمد دہلوی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمارے پیارے امام ایدہ، مرحوم والدین، جماعت کے بزرگان اور دوستوں کی دعاؤں کی بدولت اللہ تعالیٰ نے جس انعام سے اس عاجز کو نوازا ہے اس کے لئے اس پاک ذات کی حمد بیان کرتا ہوں اور آپ کے خط کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے فضلوں سے نوازے۔ آمین۔والسلام۔دعا کا محتاج۔عبدالسلام

(پس تحریر)::''سعودی عرب کے فارن منسٹر صاحب اور Libya کی یونیورسٹی کے Rector کا تار آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا انشاء اللہ جلسہ سالانہ پر نیاز حاصل ہونگے۔اللہ تعالیٰ آپ کو ہر طرح عافیت سے رکھے۔''

آپ کے مکتوب گرامی سے یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ آپ اس انعام کو ایک غیر معمولی فضل سمجھتے تھے اور اس حقیقت کا آپ کو بھر پور احساس تھا کہ یہ فضل ثمرہ ہے خلفائے سلسلہ عالیہ احمدیہ، آپ کے بزرگ والدین اور دیگر دوستوں کی مقبول دعاؤں کا۔اس لئے آپ اس کامیابی پر خدائے بزرگ و برتری حمد بجالائے اور اس امر کا اعلان کیا کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔

پس تحریر کے طور پر رقم فرمودہ عبارت میں ''انشاء اللہ جلسہ سالانہ پر نیاز حاصل ہونگے'' کا فقرہ آپ نے رسماً تحریر نہیں فرمایا بلکہ جیسا کہ میں آگے چل کر بیان کروں گا جب آپ دسمبر کے آخر میں ربوہ تشریف لائے آپ کی نظر کرم بار بار اور ہر بار پہلے سے بڑھ کر خاکسار کو نوازتی بھی رہی بر

ملا۔قبل اس کے کہ میں نظر کرم اور اس کی عنایتوں کا ذکر کروں میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے بھائی مکرم عبدالرشید صاحب کے ایک خط کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے گرامی نامہ کے کچھ عرصہ بعد لندن سے ہی موصول ہوا۔ میں نے اس خط کو بھی محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے گرامی نامہ کے تتمہ اور اختتامی کلمات کے طور پر پڑھا اور اسے بھی گرامی نامہ کے ساتھ محفوظ رکھا۔ برادرم مکرم عبدالرشید صاحب نے خاکسار کو مخاطب کر کے لکھا۔

''امید ہے آپ بخیریت ہونگے۔جس جوش وخروش اور پیار اور محبت سے آپ مکرمی بھائی جان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں اخبار الفضل میں خبریں دے رہے ہیں خدا تعالیٰ آپ کو اس کا اجرعظیم دے۔جزاکم اللہ احسن الجزاء۔واقعی آپ کی بڑی ہمت ہے۔''

نظر کرم کی کرم فرمائیوں کے نت نئے پہلو

نوبیل انعام ملنے اور کل عالم میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص اس کا ڈنکا بجنے کے بعد جب دسمبر 1979ء کے اواخر میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف ربوہ تشریف لائے اور صدر انجمن احمدیہ کے گیسٹ ہاؤس میں فروکش ہوئے تو مغرب کے بعد ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ادھر لاہور سے بھی مختلف کالجوں کے پروفیسر صاحبان کے وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔جب میں وہاں پہنچا تو گیسٹ ہاؤس کا ڈرائنگ روم ملاقاتیوں سے بھرا ہوا تھا۔بس یوں سمجھ لیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مزید لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا اور انہیں برآمدے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو ملاقاتیوں کا اژدہام دیکھ کر میں برآمدے کے ایک کونہ میں کھڑا ہوگیا۔ برادرم محترم پروفیسر نصیر احمد خان صاحب انتظام کے سلسلہ میں اندر باہر آجا رہے تھے۔ان کی جو مجھ پر نظر پڑی تو انہوں نے اندر جاکر محترم ڈاکٹر صاحب سے میرا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا انہیں اندر لے آئیں۔ میں نے اندر جاکر اور بھیڑ میں سے راستہ بنا کر محترم ڈاکٹر صاحب تک رسائی پائی۔حسب معمول لطف وکرم کی آئینہ دار نظر میرے حصہ میں آئی۔سلام دعا اور

مصافحہ کے بعد میں نے آپ کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔ آپ نے از راہ تلطف میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مجھے اپنے قریب کیا اور ساتھ کھڑا کر لیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ برادرم نصیر احمد قمر صاحب جو قریب ہی کھڑے میری باتیں سن رہے تھے جلدی سے آگے بڑھے اور محترم ڈاکٹر صاحب کی دوسری طرف ایستادہ ہو گئے۔ باقی حاضر حجاب میں سے کئی ایک عقب میں آ کر کھڑے ہوئے۔ برادرم مکرم اسماعیل اختر صاحب مالک اختر سٹوڈیو ربوہ نے جو ایسے مواقع پر اپنے کیمروں اور فلیش لائٹ کے ساتھ موجود رہتے تھے انہوں نے میرے نقطہ نگاہ سے اس یادگار فوٹو کو عکس بند کر لیا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب محترم درمیان میں تھے۔ آپ کے ایک طرف ایڈیٹر روزنامہ الفضل تھا اور دوسری طرف ایڈیٹر الفضل کا وہ عزیز دوست تھا جس کے لئے برسوں بعد خلافت رابعہ کے مبارک دور میں لندن سے شائع کئے جانے والے مستقبل کے ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل کا ایڈیٹر بننا مقدر تھا۔ ان دونوں کے درمیان حال اور مستقبل کے سنگم کے روپ میں خدائے قادر وعزیز وہ عبد منیب جلوہ گر تھا جسے اس نے اپنے غیر معمولی فضلوں کا مورد بنانے اور بناتے چلے جانے کے لئے پہلے سے منتخب کیا ہوا تھا۔

میں محترم ڈاکٹر صاحب موصوف سے علیحدگی میں مل کر اس عظیم فضل پر آپ کے تاثرات معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن ملاقاتیوں اور مشتاقان دید کے اژدہام کی وجہ سے علیحدگی میں ملاقات ممکن نظر نہ آتی تھی۔ ادھر ڈاکٹر صاحب موصوف بھی بھانپ چکے تھے کہ میں آپ کے اردگرد کیوں منڈلا رہا ہوں۔ آپ نے اس کی ایک ترکیب یہ نکالی کہ جب آپ ملاقاتیوں سے فارغ ہو کر اپنے بھانجے برادرم مکرم صلاح الدین ایوبی کے گھر وہاں موجود اپنے قریبی رشتہ داروں سے ملنے کے لئے جانے لگے تو آپ نے خاکسار کو موٹر کی عقبی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ راستہ میں جب میں نے آپ کا تاثر معلوم کرنا چاہا تو آپ کو حمد باری تعالیٰ سے لبریز پایا۔ جب مَیں نے یہ ذکر کیا کہ اگر آج آپ کے والدین زندہ ہوتے اور اپنی متضرعانہ دعاؤں کی قبولیت اور بشارتوں کے پورا ہونے کے اس مہتم

بالشان نشان کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے تو ان کی خوشی کا کیا عالم ہوتا تو ڈاکٹر صاحب موصوف یکدم بالکل خاموش ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ اپنے بزرگ والدین کی یاد میں کھو گئے ہیں۔ آپ کی خاموشی اس وقت ٹوٹی جب موٹر برادرم مکرم صلاح الدین صاحب ایوبی کے گھر کے سامنے جا کر رہی۔ موڑے اترتے وقت آپ نے مجھ سے فرمایا آپ موٹر میں بیٹھے رہیں میں سب سے مل کر ابھی واپس آتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ ہی گیسٹ ہاؤس جائیں اور پھر وہاں سے اپنی سائیکل لے کر گھر لوٹیں۔ میں آپ کی بلند اخلاقی اور باریک بینی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہا۔

علم اور اصحاب علم کی قدر

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام تھے تو اس دور کے عظیم سائنس دان اور آپ کے تخصص کا میدان سائنس ہی تھا لیکن آپ بحیثیت مجموعی جملہ علوم کے بہت دلدادہ تھے اور اس لئے کارہائے نمایاں سرانجام دینے والے اصحاب علم کے بے حد قدردان تھے۔ جو اصحاب علم کسی بھی علم میں تحقیق کر کے اس کے لئے نئے گوشوں سے دنیا کو آگاہ کرتے تھے ان کو تو آپ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ان اصحاب علم میں سے ایک حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی (مرحوم) بھی تھے۔ آپ ان کا کئی اعتبار سے بہت احترام کرتے تھے۔ ایک تو وہ آپ کے والد بزرگوار کے پرانے واقف کار اور دوست تھے۔ دوسرے آپ ان کے حصول علم کی لگن اور حاصل کردہ علم سے دوسروں کو فیضیاب کرنے کی دھن کے دل سے معترف اور قدردان تھے۔ تیسرے انہوں نے اپنی ضعیفی اور علالت کے باوجود آپ کے والد بزرگوار حضرت چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم کے سوانح حیات کتابی شکل میں مرتب کرنے میں بہت محنت اٹھائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی آپ کا لاہور آنا ہوتا تو وقت نکال کر آپ لاہور کے گنجان آباد علاقے میں ان کے گھر جا کر ان سے ملاقات کرتے اور ان کے ادبی اور تاریخی کارناموں کی بہت داد دیتے۔ آپ کے دل میں ان کا کس قدر احترام تھا وہ آپ کے اس مکتوب سے عیاں ہے جو حضرت شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی کی وفات پر آپ نے ان کے فرزند برادرم

مکرم شیخ مبارک محمود پانی پتی (مرحوم) کے نام لکھا۔ آپ کا وہ خط میں نے مکرم شیخ مبارک محمود صاحب سے لیا تھا اور آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ خط کا متن ذیل میں ہدیہ قارئین ہے:

بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ و علیٰ عبدہ المسیح الموعود

لندن 1 Campion Road SW 15 8-11-1972

گرامی قدر جناب شیخ صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا غم نامہ ملا۔ حضرت شیخ صاحب کو اللہ تعالیٰ اپنے قرب میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند کرنے اور آپ کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت شیخ صاحب ایک نمونہ تھے جس کا میں کئی بار ایسے لیکچروں میں ذکر کر چکا ہوں۔ ایک صحیح عالم جسے علم کا نشہ ہوایسے سخت حالات میں بھی جن سے شیخ صاحب دو چار تھے بے نیازی کے ساتھ علم کی خدمت کر سکتا ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں کو تحقیق کے لئے آسائشیں بہم پہنچاتے ہیں۔ Air Conditioner کیا ہوتے ہیں، ہر قسم کا سامان ہوتا ہے لیکن وہ پھر بھی کچھ کر نہیں پاتے۔ حضرت شیخ صاحب نے سخت صعوبتیں اٹھائیں لیکن اس کے باوجود علم کی وہ خدمت کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ ان پر راضی ہو۔ ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے سوانح کی تکمیل فرما دی۔ افسوس ہے کہ وہ اس کی اشاعت نہ دیکھ سکے۔ انشاء اللہ العزیز آپ کے ذریعہ ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ گھر میں مضمون واحد۔ شکستہ دل نیازمند عبدالسلام

آخرت میں صاحب منزلت ہونے کی بشارت

اب میں خدا تعالیٰ کے اس بندہ نیک نام المسمی عبدالسلام کی سیرت و کردار کے اس تذکرہ کو ایک خاص امر کی طرف توجہ دلا کر ختم کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ جب پیدا ہوا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کی بشارت لے کر پیدا ہوا۔ کیونکہ خدا نے اس کے بزرگ والد کو ایک فرشتہ کے ذریعہ یہ بشارت دی کہ اس کا نام ''عبدالسلام'' ہے اور اسی طرح وہ جب اس فانی دنیا کی حیات ناپائیدار میں

عظیم الشان کارنامے سرانجام دے کر یہاں سے رخصت ہوا تو سلامتی کے ساتھ رخصت ہوا کیونکہ دنیا بھر کے بڑے بڑے انسانوں نے اسے خراج عقیدت پیش کیا اور ہزاروں ہزار انسانوں نے اس کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کر کے اور مقبرہ بہشتی ربوہ میں اسے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ سپرد خاک کر کے اس کے اس جہان سے سلامتی کے ساتھ رخصت ہونے کی گواہی دی۔ خدائی بشارتوں کے مطابق ہم یقین رکھتے ہیں کہ وہ اگلے جہان میں بھی سلامتی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ ان بشارتوں کے علاوہ جن کا میں مضمون کے آغاز میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں اسی ضمن میں ایک اور بشارت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام مرحوم کے بھائیوں میں سے (جو سب مرحوم کے جنازہ کے ہمراہ ربوہ آئے ہوئے تھے) ایک بھائی برادرم محترم عبدالرشید صاحب آف لندن نے مجھے بتایا کہ جس رات محترم ڈاکٹر صاحب موصوف فوت ہوئے اس رات تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگنے پر انہوں نے اپنے یہ والد بزرگوار محترم چوہدری محمد حسین صاحب کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے سفید براق لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔ اور سفید قمیص پر سبز رنگ کا ایک بہت خوبصورت سویٹر پہنا ہوا ہے اور وہ بہت خوش ہیں حتیٰ کہ ان کے ہشاش بشاش چہرے سے خوشی چھوٹے پڑ رہی ہے۔ عبدالرشید صاحب ان سے پوچھتے ہیں کہ ابا جی آپ اتنے خوش کیوں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کیوں خوش نہ ہوں عبدالسلام پہنچ گیا ہے اور آج آٹھ بج کر بیس منٹ پر پہنچا ہے۔ یہ سن کر یکدم ان کی آنکھ کھل گئی۔ اسی رات محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب لندن میں جب اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے تو اس وقت پاکستان میں 8 بجکر 20 منٹ ہوئے تھے۔ سو جس باپ نے اپنے سلامتی والے بیٹے کے دنیا و آخرت میں صاحب عزّت ہونے کی دعا کی تھی اس نے اپنے ایک اور بیٹے کو خواب میں آ کر بتا دیا کا ان کا یہ سلامی والا بیٹا دنیا میں صاحب منزلت قرار پائے گا۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سلامتی والے اس عبدغیب کے اس جہان میں درجات بلند فرماتا

ہے اور اس کی نسل میں اور جماعت احمدیہ کی دیگر نسلوں میں بھی اس کے ہزاروں قائم مقام پیدا کرے اور ہزاروں ہزار کی تعداد میں پیدا کرے اور سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی یہ دعا:

با برگ و بار ہوویں، اک سے ہزار ہوویں
یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی

آپ کی جسمانی اولاد اور روحانی اولاد ہر دو کے حق میں قبول ہوا اور ہر زمانہ میں اس کی قبولیت کے عملی نظارے ظاہر ہوتے چلے جائیں یعنی کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہوتے چلے جائیں جو علم اور معرفت میں اس قدر کمال حاصل کریں کہ اپنی سچائی کے نور اپنے دلائل اور نشانوں کے رو سے سب کا منہ بند کر دیں۔ اے خدا! اے ذوالمجد والعطاء اے رحیم اور مشکل کشا! تو ایسا ہی کر۔ تجھ کو سب قدرت اور طاقت حاصل ہے۔(الفضل انٹرنیشنل 16 مئی 1997ء تا 22 مئی 1997ء صفحہ 3-4)

''سلام۔عالم اسلام کا سرمایہ افتخار''

از پروفیسر راجہ نصر اللہ خان

21 نومبر 1996ء بروز: جمعرات نوبیل انعام یافتہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی المناک وفات کی خبر مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے دنیا بھر میں بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ گو ڈاکٹر عبدالسلام اوّل و آخر ایک سچے اور پکے پاکستانی تھے لیکن جوانی سے لے کر وفات تک انہوں نے سائنس (خاص طور پر طبیعیات) کے میدان میں ایسے جوہر ہائے نمایاں دکھائے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور بے پناہ علم و دانش کے ذریعہ اقوام عالم کو بلاتخصیص اس طرح فیضیاب کیا کہ وہ کسی ایک ملک کے نہیں بلکہ دنیا بھر کے ممتاز اور دردمند سائنس دان کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ آپ کو اقوام متحدہ میں بھی متعدد عہدے اور اہم ذمہ داریاں سونپی

جاتی رہیں۔ جن کا سلسلہ 1955ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ آپ کی عمر ابھی تیس (30) سال سے بھی کم تھی۔

عظیم ترین اور منفرد عالمی انعام

ڈاکٹر عبدالسلام کے سائنسی دنیا کا قابل رشک عبقری ہونے اور دنیا بھر سے اپنی عدیم المثال قابلیت ذہانت اور لیاقت کا لوہا منوانے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ 1979ء میں انہوں نے دنیا کا عظیم ترین اور منفرد علمی انعام نوبیل پرائز (Nobel Prize) جیتا۔ مرحبا! مرحبا!!

نوبیل پرائز سویڈن کے مشہور سائنس دان ایلفرڈ نوبل Alfred Nobel 1833-1896 نے قائم کیا تھا۔ یہ سائنس دان ڈائنا مائٹ (Dynamite) کا موجد تھا۔ وہ بہت بڑا کیمیا دان اور انسانیت دوست انسان تھا۔ کئی فیکٹریوں کا مالک ہونے کی وجہ سے وہ بہت امیر بن گیا اور اس کے پاس بیس لاکھ پاؤنڈ جمع ہو گئے۔ اس خطیر رقم کا بیشتر حصہ اس نے ''نوبیل پرائز'' کے اجراء کے لئے وقف کر دیا۔ پہلا نوبیل پرائز 1901ء میں دیا گیا۔

سربلندی وشادمانی

اللہ کے بندوں اور انسانیت کے غم خواروں کی دنیا اور سوچ ہی اور ہوتی ہے۔ 1979ء میں ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبیل پرائز کی شکل میں جو رقم ملی انہوں نے اس کا استعمال کس طرح کیا۔ اس کے متعلق ''نوائے وقت'' میں شائع شدہ یہ خبر پڑھیے: ''پیرس 18 اکتوبر پاکستان کے نامور سائنسدان پروفیسر عبدالسلام جنہیں حال ہی میں فزکس کا نوبیل انعام دیا گیا ہے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ نوجوان سائنس دانوں کا ایک بین الاقوامی فنڈ قائم ہونا چاہئے۔ انہوں نے نوبیل انعام میں ملنے والی ساٹھ (60) ہزار ڈالر رقم اس فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا۔ انہیں اس تقریب میں آئن سٹائن گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔ (نوائے وقت 19 اکتوبر 1979ء صفحہ اوّل)

ماشاء اللہ ڈاکٹر سلام نے دنیائے سائنس کا قابل صد رشک نوبیل پرائز جیت کر پاکستان کے

ساتھ ساتھ تمام عالم اسلام کو بھی دنیا بھر میں سربلند اور شادماں کر دیا اور ہر طرف سے انہیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیے اس کی تفصیل۔

انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کراچی 18 اکتوبر 1979ء کے اداریہ بعنوان ''پاکستان کے لئے ایک اعزاز'' میں لکھا ہے۔ ''یہ کوئی معمولی اتفاق نہیں کہ ''ایلبرٹ آئن سٹائن کی سوویں سالگرہ کے برس طبیعیات کے تین سائنس دانوں کو تمام عالمی انعامات میں سے سب سے زیادہ قابل رشک ''نوبیل پرائز'' دیا گیا ہے جو ان کے ایسے میدان میں تحقیق کا نتیجہ ہے جس نے ان کے شہرآفاق پیشرو (آئن سٹائن۔ ناقل) کو پریشان کئے رکھا۔ اور یہ بات کہ انعام جیتنے والوں میں سے ایک پروفیسر عبدالسلام ہیں۔ اس ملک کے لئے زبردست افتخار اور عزت کا باعث ہے''۔

روزنامہ امروز (لاہور) 16 اکتوبر 1979ء صفحہ اوّل کی ایک سرخی ''نہایت اہم سائنسی دریافت پر پروفیسر عبدالسلام کو نوبیل انعام دینے کا اعلان''

''پروفیسر عبدالسلام پہلے پاکستانی ہیں جنہیں نوبیل انعام ملا ہے جو سائنس کی دنیا میں اعلیٰ ترین مانا جاتا ہے............ پروفیسر عبدالسلام کو جب نوبیل انعام ملنے کی اطلاع ہوئی تو اس وقت وہ لندن میں اپنے گھر پر موجود تھے۔ یہ اطلاع ملتے ہی انہوں نے قریبی مسجد میں جا کر نماز شکرانہ ادا کی۔''

روزنامہ ''مشرق'' 17 اکتوبر 1979ء کا اداریہ بعنوان ''پاکستان کے لئے عالمی اعزاز''

''پاکستان کے ممتاز سائنس دان پروفیسر عبدالسلام کو طبیعیات کے شعبے میں اعلیٰ تحقیقی کام کرنے پر اس سال کا نوبیل انعام ملا ہے جو بلاشبہ پاکستان کے لئے ایک اعزاز ہے۔ اس لئے صدر مملکت نے اپنے تہنیتی پیغام میں بجا طور پر یہ بات کی ہے کہ ''پروفیسر عبدالسلام کو نوبیل انعام ملنے پر پاکستان اقوام عالم میں سربلند ہو گیا ہے۔''

روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی مورخہ 17 اکتوبر 1979ء کا اداریہ ''پاکستانی سائنس دان کا اعزاز''

ہر پاکستانی کے لئے یہ بات باعث صد فخر و اعزاز ہے کہ ان کے ایک ہم وطن ڈاکٹر عبدالسلام

نے علم طبیعیات میں اس سال نوبیل پرائز حاصل کیا ہے .... اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ڈاکٹر عبدالسلام کی قوت فکر و ذہانت میں مزید اضافہ کرے اور انہیں ملک وقوم کی خدمت کرنے کا طویل موقع عطا کرے۔ ہم انہیں اور اپنے تمام ہم وطنوں کو اس موقع پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔‘‘

برادر مسلم مما لک کے زعماء کا اظہار انبساط ومباہات

چند جید شخصیات کے نام درج کئے جاتے ہیں:

1۔ شہزادہ محمد بن فیصل السعود (شاہ فہد، فرمانروائے سعودی عرب کے بھتیجے)۔

2۔ ابراہیم السختو، سیکرٹری جنرل الفتح یونیورسٹی طرابلس (لیبیا)

3۔ سالم عظام جنرل سیکرٹری اسلامی کونسل برائے یورپ۔

4۔ ڈاکٹر زیڈ بدیوی مسجد ریجنٹس پارک لندن کے ڈائریکٹر۔

5۔ لیبیا کے وزیر تعلیم۔ 6۔ لیبیا کے ایٹمی توانائی کے نامور سائنس دان ڈاکٹر جمعہ۔

7۔ الجیریا کے وزیر برائے سائنس وٹیکنالوجی۔

8۔ مختلف اسلامی مما لک کے کوئی بیس (20) سفراء اور ہائی کمشنر۔

اب تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

روزنامہ جنگ مورخہ 3 نومبر 1979ء کے صفحہ اوّل کی خبر’’ پاکستانی سائنس دان پروفیسر عبد السلام کو مبارکباد‘‘: (لندن 2 نومبر): اسلامی بنکنگ مومنٹ کے سربراہ محمد بن فیصل السعود نے پاکستانی سائنس دان پروفیسر عبدالسلام کو فزکس میں نوبیل انعام حاصل کرنے پر مبارکباد دی ہے۔ انہوں نے پروفیسر عبدالسلام کو ایک تہنیتی پیغام میں کہا ہے کہ آپ کا یہ اعزاز مسلمانوں کے لئے باعث مسرت ہے۔ ہم آپ کی اس کامیابی پر خوش ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ آپ کو یہ شاندار کامیابی جاری رکھنے کے لئے صحت اور قوت عطا کرے۔

طرابلس (لیبیا) کے الفتح یونیورسٹی کی پیپلز کمیٹی کے سیکرٹری جنرل ابراہیم السختو نے بھی پروفیسر

ڈاکٹر عبدالسلام کو یہ اعزاز حاصل کرنے پر مبارک باد دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کے نوبیل انعام حاصل کرنے کی خبر ہم نے بڑی مسرت کے ساتھ سنی ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے لئے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ اس میں مسلم بھائیوں کی حیثیت سے ہم شریک ہیں۔''

اب روزنامہ ڈان کراچی مورخہ 17 نومبر 1979ء کے صفحہ نمبر 7 کی ایک خبر ملاحظہ فرمایئے۔

''گزشتہ رات اسلامک کلچرل سنٹر اور ریجنٹس پارک (لندن) مسجد کے ڈائریکٹر زیڈ بدیوی کی طرف سے دیئے گئے عشائیہ میں پروفیسر سلام مہمان خصوصی تھے۔ اس عشائیے میں اسلامی ممالک کے کوئی بیس (20) سفراء اور ہائی کمشنر موجود تھے جن میں پاکستانی سفیر بریگیڈئیر ایف۔ آر۔ جان بھی شامل تھے۔ یہ عشائیہ ریجنٹس پارک مسجد میں دیا گیا۔ پروفیسر سلام کو ان کے مسلمانوں اور مسلم دنیا کے لئے حاصل کردہ منفرد اعزاز پر زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے میزبان ڈاکٹر بدیوی نے کہا۔'' پروفیسر سلام نے نوبیل پرائیز حاصل کر کے دنیا بھر کے مسلمان سائنس دانوں کے لئے اس دیوار کو گرادیا ہے جو آج تک ان کے اور نوبیل پرائز کے درمیان حائل تھی۔''

روزنامہ ''ڈان'' مورخہ 17 نومبر 1979ء کی ایک اور خبر پڑھیئے:

''بدھ کے روز یورپ میں اسلامی کونسل کے جنرل سیکرٹری مسٹر سالم عظام کی طرف سے ایک ظہرانہ دیا گیا جس میں پروفیسر سلام مہمان خصوصی تھے۔ اس موقع پر برطانوی سائنس دان اور دوسرے مسلمانوں کے علاوہ برطانوی مسلمان بھی موجود تھے۔ دریں اثناء پروفیسر سلام کو الجیریا کے وزیر برائے سائنس و ٹیکنالوجی، لیبیا کے وزیر اعظم اور لیبیا کے ایٹمی توانائی کے ڈاکٹر جمعہ کی طرف سے تہنیتی پیغامات موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ " پروفیسر سلام کی کامیابی پوری اسلامی دنیا کے لئے اعزاز ہے۔''

ان سب خبروں اور بیانات سے روز روشن کی طرح ثابت ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالسلام کا یہ

اعزاز عظیم الشان اور دوررس نتائج کا حامل قرار پایا۔ساری اسلامی دنیا اس بات پر شاداں وفرحاں نظر آتی ہے۔ یہ اعزاز پاکستان اور عالم اسلام کے لئے ایک نیا اور قابل فخر ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔(الفضل انٹرنیشنل 28مارچ1997ء)

قطرے سے گہر ہونے تک

اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حق بات کو کہنے اور سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ تعصب اور بغض سے بالاتر ہوکر اچھے لوگوں کی اچھائی اور کامیابی کا اعتراف کرتے ہیں اور اسے سراہتے ہیں۔لیکن اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ کچھ لوگ اپنی کم حوصلگی اور ذہنی پستی کی وجہ سے دوسروں کی کامیابی پر جلتے اور تلملاتے نظر آتے ہیں اور غلط پراپیگنڈہ کرنا ان کا شعار ہوتا ہے۔ وہ نہ خود کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی صلاحیت اور قابلیت رکھتے ہیں اور نہ دوسروں کی سرفرازی سے خوش ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے وطن میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جس نے یہ شرمناک افسانہ گھڑا کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبیل پرائز ان کی قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ یہودیوں کی نوازش اور سازش سے ملا اور یہ کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان اور مسلمانوں کے دشمن ہیں (معاذ اللہ)۔

آپ کو حیرت ہوگی یہ جان کر کہ اس گروہ میں زیادہ تر وہ ''عالم فاضل لوگ'' شامل ہیں جن کی اپنی تعلیم پرائمری تک ہی ہے یا جن کا اوڑھنا بچھونا ہی اشتعال اور فریب ہے اور جنہوں نے شروع سے لے کر آج تک کوئی خدمت وطن یا خدمت ملت کی سعادت نہیں پائی اور جن کے متعلق شاعر و مفکر مشرق علامہ اقبال نے کئی تیر بہدف اشعار کہے ہیں جن میں سے ایک مصرعہ یہ ہے۔

''دین ملا فی سبیل اللہ فساد''

اپنے انصاف پسند اور علم کے شائق قارئین کرام کے سامنے حقیقت واضح کرنے کے لئے ہم ڈاکٹر عبدالسلام کے بچپن سے لے کر دنیائے علم و دانش کے عبقری بننے تک کے چند چیدہ چیدہ مستند

واقعات حوالوں کے ساتھ درجہ بدرجہ رقم کرتے ہیں تاکہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہو سکے اور اپنے اور پرائے کا فرق واضح ہو جائے۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم و تربیت

عبدالسلام 29 جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے۔ گو آپ کا خاندان جھنگ جیسے پسماندہ علاقہ میں رہائش پذیر تھا لیکن آپ کے والد محترم چوہدری محمد حسین صاحب بہت روشن دماغ اور لکھے پڑھے انسان تھے اس لئے انہوں نے بچپن سے ہی سلام کی تربیت اور تعلیم پر بھرپور توجہ دینی شروع کر دی۔ یہ پڑھائی کیسی معیاری تھی اور قدرت نے سلام کو کیسی اعلیٰ ذہانت اور محنت کے جذبے سے نوازا تھا اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں ساڑھے چھ برس کی عمر میں سیدھا کلاس چہارم میں داخل کر لیا گیا۔ مستند کتاب ''ڈاکٹر عبدالسلام'' کے قابل مصنف ڈاکٹر عبدالغنی (جو ماشاء اللہ پاکستان کے ایک روشن دماغ مسلمان اور زیرک انسان ہیں اور خود بھی اعلیٰ پایہ کے سائنس دان ہیں اور 1966ء میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے) تحریر کرتے ہیں:

''یوں سلام نے والد کی رہنمائی میں تعلیم کا زور و شور سے آغاز کیا۔ ان کی صحت بے حد اچھی تھی۔ تعلیم سے ان کی دلچسپی بے پناہ تھی۔ نتیجتاً سات سات سال کی عمر میں سلام وہ کچھ سیکھ چکے تھے جو ان سے بڑی عمر کے بچوں کو کافی وقت گزرنے کے بعد آیا کرتا ہے.................سلام کا حافظہ بلا کا تیز تھا۔ چوتھی جماعت میں انہیں تقریباً چالیس تک پہاڑے زبانی یاد تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شرحیں اور مضامین لکھنے کے لئے بے شمار بڑے لوگوں کے اقوال اور تاریخی واقعات زبانی یاد کر رکھے تھے۔ بچپن میں انہوں نے قرآن شریف ترجمے کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے میٹرک میں عربی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے چنا .... عبدالسلام مارچ 1933ء میں جھنگ سنٹر میں ہونے والے چوتھی جماعت کے امتحان میں اوّل رہے۔

("عبدالسلام" از ڈاکٹر عبدالغنی صفحہ 24-25 شائع کردہ شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی)

اس کتاب کے صفحہ 25 پر لکھا ہے کہ 1938ء میں سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب یہ تحریر ریکارڈ پر لائے: ''میں نے اپنی زندگی میں کبھی عبد السلام جیسا بہترین اور لائق ترین طالب علم نہیں دیکھا۔'' اسے کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

گھریلو تربیت کا فیضان:: روزنامہ مشرق مورخہ 19 اکتوبر 1979ء صفحہ 3 پر برصغیر کے بزرگ صحافی م۔ش (جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) اپنے کالم نوبیل پرائز یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کا گھریلو ماحول میں رقمطراز ہیں: ''نظریاتی طبیعیات میں ریسرچ پر نوبیل پرائز حاصل کرنے والے پاکستانی سپوت ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق جھنگ کے متوسط درجے کے خاندان سے ہے۔ ان کے والد ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ''ہیڈ ورینکلر کلرک'' تھے۔ دنیاوی لحاظ سے یہ ایک معمولی منصب تھا۔ لیکن وہ ایک بلند اخلاق انسان تھے۔ جنہوں نے اپنی پاکیزگی اخلاق سے اپنے ماحول کو عموماً اور اپنے اہل خاندان اور اہل وعیال کو خصوصاً متاثر کیا۔ پروفیسر عبدالسلام اپنے مرحوم والد کے درس اخلاق کے بہترین متعلم اور یادگار متصور ہوتے ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ گھر اور دفتر میں ایک مثالی کردار کے انسان تھے۔ ان پر یہ قول لفظ بلفظ صادق آتا تھا کہ ایک ٹن وعظ پر ایک اونس کا حسن عمل بھاری ہوتا ہے۔ انہوں نے رزق حلال کو اپنا ماٹو قرار دیا تھا .... وہ نہ تو اپنے افسروں کی بے جا خوشامد کرتے تھے اور نہ اپنے ماتحتوں کو بلاوجہ جھڑکتے تھے............ ان کے حسن کردار نے بچپن سے ہی عبدالسلام کے دل و دماغ کو متاثر کیا اور انہوں نے شروع دن سے ہی اپنی زندگی کو منظم کرنا شروع کیا............ اگر عبدالسلام کے والد کی طرح پاکستان میں لوگوں نے اپنی اولاد کی طرف توجہ دی ہوتی تو پاکستان میں آج ایک ایسی نسل وجود میں آچکی ہوتی جو حقیقی معنوں میں اقبال کے شاہین کہلانے کی سزاوار ہوتی۔''

ارفع تر کامیابیوں کا سلسلہ

عبدالسلام تعلیمی زینے پر نمایاں سے نمایاں تر ہوتے چلے گئے۔ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

جس معیار پر بھی پرکھا جائے سلام نے اپنے آپ کو میٹرک سے لے کر ایم۔اے۔تک یونیورسٹی کے تمام امتحانات میں اوّل رہ کر ایک انتہائی غیر معمولی اوصاف اور قابلیت کے حامل طالب علم کی حیثیت سے منوایا۔میٹرک اور بی۔اے کے امتحانات میں تو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں جو اعلیٰ ترین نمبر حاصل کئے دو ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔بی۔اے۔میں انہوں نے ہر مضمون میں الگ الگ ٹاپ کیا۔یہ مضامین تھے انگلش، انگلش لٹریچر (برائے آنرز)، اور عملی ریاضی۔یونیورسٹی کی تاریخ میں سلام دوسرے طالب علم تھے جس نے اپنے تمام امتحانات یوں اوّل رہتے ہوئے پاس کئے۔ان کی میٹرک کے امتحان میں اعلیٰ ترین کامیابی یعنی تمام امیدواروں میں اوّل آتا اور ایک نیا ریکارڈ قائم کرنا (رول نمبر 13888) ایک ایسا امر تھا جس نے ہندو اور سکھ طلباء کو یہ بات ذہن نشین کروادی کہ ذہانت اور بے پناہ لیاقت صرف انہی کی میراث نہیں۔مسلمانوں میں بھی ایسے جوہر قابل موجود ہیں جو اس میدان میں ان کا مقابلہ کرتے ہوئے انہیں شکست دے سکتے ہیں۔ہندو اور سکھ طلباء برسوں سے یونیورسٹی کے امتحانوں میں اوّل رہتے ہوئے مسلمانوں کو شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا رکھے ہوئے تھے۔اب سلام کی اعلیٰ کامیابیوں نے ان غیر مسلموں کی ذہنی برتری کا طلسم توڑ دیا اور مسلمانوں کے احساس کمتری کو ختم کردیا"۔(ڈاکٹر عبدالسلام-29) یادرہے کہ یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب 1974ء کی قومی اسمبلی کا وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ناقل)

کیمبرج جیسے شاندار ادارے میں داخلہ

برطانیہ کی دو شہرہ آفاق یونیورسٹیاں کیمبرج اور آکسفورڈ ہیں۔سلام کے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ، محنت اور خوش قسمتی کا ثمرہ تھا کہ 1946ء میں وہ کیمبرج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے برطانیہ روانہ ہو

گئے۔ڈاکٹر عبدالغنی تحریر کرتے ہیں:’’کیمبرج کو سائنسی علوم کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔اس کی یہ شاندار روایات چلی آرہی ہیں کہ اسے جواہر قابل کی شناخت اور ان کو چمکانے، تراشنے اور سنوارنے کا خصوصی تجربہ اور مہارت حاصل ہے۔اس لئے ایسا ہونا فطری تھا کہ کیمبرج والوں نے سلام کی غیر معمولی قابلیت اور لیاقت کو بھانپ لیا تھا اور انہیں فوراً ہی داخلے کے لئے بلوا لیا تھا۔‘‘ (ڈاکٹر عبدالسلام۔36,37)

ڈاکٹر عبدالغنی کیمبرج میں طریقہ تدریس اور عبدالسلام کے مصمم ارادہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:
’’کیمبرج میں سلام کو پہلی بار ان شخصیات سے اعلیٰ علوم میں درس لینے کا اتفاق ہوا جو خود علوم کی سرحدوں پر کام کر رہے تھے۔انہوں نے دیکھا کہ اساتذہ کبھی کوئی مضمون جامعیت کے ساتھ نہ پڑھاتے تھے بلکہ طلباء سے توقع رکھتے تھے کہ وہ از خود مطالعہ کر کے اس کمی کو پورا کرلیں۔ان کی اپنی حیثیت محض ایک نگران اور رہنما کی ہوتی تھی۔اس طرز تعلیم کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ مجوزہ انصاب کی ہر چیز گرفت میں آجاتی تھی................. سلام نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اس غیر ملکی معاشرے کے بداثرات سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھیں گے اور ساری توجہ اپنی تعلیم پر صرف کردیں گے" (ڈاکٹر عبدالسلام۔32) سبحان اللہ! فکر کی یہ بلندی اور روح کی یہ پاکیزگی!!! اب ڈاکٹر عبدالغنی کا یہ بیان پڑھیے۔’’سلام کیمبرج میں روزانہ چودہ تا سولہ گھنٹے کام کیا کرتے تھے۔ان کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق تھا۔وہ نہ صرف علوم ریاضی اور طبیعیات کا مطالعہ کیا کرتے تھے بلکہ تاریخی کتب بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔خصوصاً تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت تاریخ ہند اور تاریخ اقوام عالم۔ یہاں انہوں نے دنیا کی تمام الہامی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا...... یہ ساری کتابیں انہیں سینٹ جان کالج کی شاندار لائبریری میں، جہاں وہ ریاضی کے مسائل سلجھانے کے سلسلے میں کئی کئی گھنٹے گزارتے تھے بآسانی دستیاب تھیں۔انہوں نے اپنا تین سالہ Tripos (کیمبرج میں آنرز ڈگری کا امتحان۔ناقل) دو ہی سالوں میں مکمل کرلیا اور بغیر کسی مشکل کے Wrangler (کیمبرج کا

فرسٹ ڈویژن میں آنرز گریجوائٹ۔ناقل) بن گئے۔''(ڈاکٹر عبدالسلام۔ 39،38)

سلام نے کیمبرج میں تعلیم کے دوران انتھک محنت کرتے ہوئے ریسرچ کا کام بھی جاری رکھا۔جس کے نتیجے میں انہیں 1950ء میں کیمبرج کی طرف سے طبیعیات میں اعلیٰ تحقیقی کام کرنے کے نتیجے میں متھ پرائز Smith Prize)) دیا گیا۔سچ ہے۔جب سونا آگ میں پڑتا ہے تو کندن بن کے نکلتا ہے!۔

استاد کا قابل فخر شاگرد

ڈاکٹر عبدالغنی نے استاد اور شاگرد کا ایک عجیب واقعہ ریکارڈ کیا ہے۔سلام کے متعلق لکھتے ہیں: ''کیمبرج سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے اپنے نگران سے درخواست کی کہ وہ انہیں ایک سفارشی خط لکھ کر دیں کہ انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی۔کرنے کے دوران تسلی بخش طریقے سے اپنا کام سرانجام دیا تھا۔اس پران کے نگران نے کہا۔''تم مجھے یہ تصدیق نامہ لکھ کر دے دو کہ تم نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔'' یہ واقعہ پڑھ کر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔وطن واپسی پر 1951ء میں پروفیسر عبدالسلام کا گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں صدر شعبہ ریاضی کے طور پر تقرر ہوا۔وہ یہ فرائض 1954ء تک انجام دیتے رہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی اس زمانہ میں متذکرہ اداروں کے خشک فرسودہ تعلیمی نصاب اور ڈاکٹر سلام کی علمی اور تحقیقی محرومی و تشنگی کا ذکر یوں کرتے ہیں:''پروفیسر عبدالسلام کو معلوم ہوا کہ وہاں کوئی ایسا تصور موجود نہ تھا کہ ایم۔اے۔کی سطح پر یونیورسٹی کی تعلیم کا تعلق کچھ ریسرچ سے بھی ہو۔تعلیم اور ریسرچ کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوا کرتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں چل سکتے۔وہاں کوئی ذریعہ تحقیق میسر نہ ہونے کے سبب اساتذہ کی صلاحیتیں زنگ آلود ہوتی جارہی تھیں۔کسی محقق کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع بھی میسر نہ تھے..................ڈاکٹر عبدالسلام۔ 49)

کیمبرج یونیورسٹی کی لیکچر شپ

اس دوران ڈاکٹر سلام نے کیمبرج یونیوسٹی کی طرف سے لیکچر شپ کی پیشکش سے جذبہ حب الوطنی کے باعث دوتین بار انکار کر دینے کے بعد بالآخر اپنے ماحول اور عمومی ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر یہ پیشکش قبول کر لی اور جنوری 1954ء میں کیمبرج کے لئے روانہ ہو گئے۔(اس دردناک داستان کے لئے دیکھئے کتاب ''ڈاکٹر عبدالسلام صفحات 52 تا 57)

یورپی سائنس دانوں اور جید اساتذہ کے بالمقابل

ہم مصدقہ حوالوں کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ عبدالسلام نے اپنے سکول اور کالج کے زمانہ طالبعلمی میں غیر منقسم ہندوستان کے ہندو اور سکھ طلباء کے مقابل پر کہیں اعلیٰ کارکردگی دکھا کر ان کی اجارہ داری اور زعم کو توڑ دکھایا۔ آگے چل کر کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے اور اپنی تحقیق اور قابلیت کا لوہا منوانے کے بعد ان کا اس یونیورسٹی میں استاد مقرر ہونا اس بات کا بین ثبوت تھا کہ وہ اب مایہ ناز مغربی اساتذہ اور سائنس دانوں کے مقابل آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس اعزاز اور ناموری کی تفصیل ڈاکٹر عبدالغنی کی زبانی سنیئے: ''عبدالسلام برصغیر ہندو پاک بلکہ اسلامی دنیا کے پہلے سائنس دان تھے جنہیں کیمبرج یونیورسٹی میں لیکچرار کے عہدے کی پیشکش کی تھی اور واضح رہے کہ میں یونیورسٹی برطانیہ کی گئی تھی۔ اور واضح رہے کہ کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ کی دوسری قدیم اور اعلیٰ درسگاہ گئی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی کا اصول چلا آ رہا ہے کہ وہ صرف ایسے لوگوں کو ہی بحیثیت استاد اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو عالم فاضل ہوں، تعلیم و تربیت سے گہری دلچسپی رکھتے ہوں، ان میں تحقیق و جستجو کا مادہ موجود ہو اور جو کچھ دریافت کریں یا تحقیق کریں اس پر تنقیدی مواد لکھ کر شائع کرا سکیں۔ انہی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے سلام کو وہاں لیکچر شپ کی پیشکش کی گئی تھی۔ لاہور کے سائنسی لحاظ سے بنجر صحرا میں رہنے کے باوجود انہوں نے نظراتاتی اعلیٰ توانائی کی طبیعیات میں چھ انتہائی بلند پایہ تحقیقاتی مقالات شائع کروائے تھے اور یہ ایک قابل قدر کام تھا''۔(ڈاکٹر عبدالسلام ص 59)

ڈاکٹر عبدالسلام کیمبرج میں کامیاب تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے تحقیقی میدان میں برابر آگے

بڑھتے رہے۔ وہ ایک سرگرم اور انتھک محنت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے اپنے اعلیٰ پائے کے تحقیقی مقالات تیار کرنے اور شائع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

ترقی کے اونچے زینے پر

کیمبرج میں اپنے عظیم الشان تحقیقی و تدریسی کام کی ۔ وجہ سے ڈاکٹر عبدالسلام نے ایسا مقام پیدا کر لیا کہ برطانیہ کے شہرہ آفاق امپیریل کالج لندن کے شعبہ طبیعیات کے چیئرمین پروفیسر بلیکٹ (Blackett) کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ یہ پروفیسر بلیکٹ ریسرچ اور گونا گوں دریافت کے باوا کے طور پر مانے جاتے تھے اور انہوں نے 1948ء میں نوبیل انعام حاصل کیا تھا۔ انہوں نے خود ڈاکٹر سلام سے ملاقات کر کے انہیں امپیریل کالج میں تھیوریٹیکل فزکس کی کرسی پیش کی۔ اس طرح برطانوی کیمبرج یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کا آغاز کرنے والے ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہو گئے۔ اب یہی بات باندازِ دگر ذرا ڈاکٹر عبدالغنی کے الفاظ میں سنئے ۔''1957ء میں سلام تین سال گزرنے کے بعد 31 سال کی عمر میں کیمبرج کی لیکچرشپ سے امپیریل کالج لندن کے فل پروفیسر بن گئے۔ اس طرح وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے صنعتی انقلاب کے بعد سے ایک اینگلو سیکشن سوسائٹی میں یہ اہم عہدہ حاصل کیا تھا اور ان کے یہ اعزاز حاصل کرنے کے ساتھ ہی ان کے ملک (یعنی پاکستان ۔ ناقل) کو یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ سلام میں اس کا مایہ ناز سپوت موجود ہے۔ جو آگے چل کر اس کے لئے قابل فخر اثاثہ بنے گا۔ (ڈاکٹر عبدالسلام از ڈاکٹر عبدالغنی ۔ 65،64) (الفضل انٹرنیشنل 4 تا 10 اپریل 1997ء)

سرمایہ افتخار

ہم گزشتہ صفحات میں ممتاز صحافی م ۔ش کے الفاظ کا حوالہ دے چکے ہیں کہ اگر پاکستان میں لوگوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت عبدالسلام کے والد کی طرح کی ہوتی تو پاکستان میں نئی نسل اقبال کے شاہین کہلانے کی سزاوار ہوتی ۔ (علامہ اقبال کا شاہین کے متعلق مشہور شعر ہے):۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اب ایک حوالہ ڈاکٹر عبدالغنی کا ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر کرتے ہیں:

''کوئی ملک اس وقت تک دنیا کی نظروں میں عزت و توقیر حاصل نہیں کرسکتا جب تک اس کے پاس کوئی سرمایہ افتخار نہ ہو۔ پاکستان کے پاس میدان علم میں اقبال کی صورت میں قدیم مسلم ورثے کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سلام نے جب برطانیہ میں پروفیسر شپ کے عہدے پر ترقی پائی تو اس نئے آزاد شدہ ملک کے پاس بھی دنیا کو انتہائی اعتماد و فخر کے ساتھ دکھانے کے لئے ایک چیز مل گئی ....سلام کی برطانیہ میں پروفیسر شپ کی بدولت وہاں زیر تعلیم پاکستانی طلبا کا مورال بلند ہوا .... پاکستانی طلباء میں ان کے اس عہدے کو پہنچنے کے سبب تعلیمی میدان میں ترقی کی امنگ اور خوداعتمادی کا جوہر پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے برطانوی یونیورسٹیوں میں ان کی کارکردگی میں اضافہ اور بہتری پیدا ہوئی۔

امپیریل کالج میں سلام نے نظریات کی لگا تار برسات سے اس ادارے میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کی بے پناہ کارکردگیوں اور متاثر کن شخصیت کی بدولت امپیریل کالج برطانیہ اور یورپ میں پائی انرجی تھیورٹیکل فزکس کے لئے کام کرنے کا ایک خاص اور اہم مرکز بن گیا اور امریکہ سمیت دنیا کے تمام حصوں سے متعدد ذہین ماہرین طبیعیات اس جگہ کی طرف کھنچے چلے آنے لگے"۔

(ڈاکٹر عبدالسلام صفحہ 105,106) سچ ہے۔

ہے وہی عظیم جس نے نئی شمع ایک جلا دی !!

ڈاکٹر عبدالغنی نے مندرجہ بالا بیان میں جو ڈاکٹر سلام کے نظریات کی ''لگا تار برسات'' کا ذکر کیا ہے اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ 1985ء میں پروفیسر سلام کے تحقیقی اور بلند پایہ مقالات کی تعداد دو صد پچاس (250) تک پہنچ گئی جو بین الاقوامی معیاری سائنسی جرائد میں شائع ہوئے۔

صدر پاکستان کی قدردانی

ڈاکٹر عبد السلام کی سائنس کے افق پر روز افزوں تمکنت اور چکا چوند نے حکومت پاکستان کو بھی بیدار کیا۔ چنانچہ 1959ء میں انہیں ایجوکیشن کمیشن کا مشیر اور پاکستان کے سائنٹیفک کمیشن کا ممبر بنایا گیا۔ 4 اگست 1959ء کو صدر ایوب خان نے سائنٹیفک کانفرنس میں افتتاحی خطاب کے آخر میں کہا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے کہ میں پروفیسر عبد السلام کو یہاں اپنے ہم وطنوں میں دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے اتنی کم عمری میں (اس وقت ان کی عمر صرف 33 سال تھی۔ ناقل) سائنس کے میدان میں جو اکتساب علم کیا ہے اور تحیر خیز کارنامے انجام دئے ہیں وہ ہم سب کے لئے انتہائی فخر و مباحات کا باعث ہیں مجھے یقین ہے کہ ان کی وابستگی سے کمیشن کی سفارشات کو توقیر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ (ڈاکٹر عبد السلام صفحہ 105-106)

صدر پاکستان پروفیسر عبد السلام کے عظیم کارناموں اور سائنسی میدان میں ان کی حیرت انگیز جولانیوں سے اس قدر متاثر اور خوش تھے کہ 1961ء میں پروفیسر عبد السلام کو صدر پاکستان کا سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ پروفیسر موصوف 1961ء سے 1974ء تک پورے تیرہ (13) سال بلا کسی معاوضہ کے اس عہدے پر پوری ذمہ داری اور جانفشانی سے خدمت انجام دیتے رہے تا وقت یہ کہ 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور کی سیاسی اسمبلی نے احمدیوں کو ''ناٹ مسلم'' قرار دے دیا جس کے بعد ڈاکٹر عبد السلام نے استعفیٰ دے دیا۔

ایک فکر انگیز گفتگو

1977ء میں ایک سفر کے سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالغنی کی ملاقات ڈاکٹر عبد السلام سے کراچی ائرپورٹ پر ہوئی تو ڈاکٹر عبدالغنی نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر عبد السلام نے داڑھی رکھ لی ہے۔ اس پر ڈاکٹر سلام نے جو جواب دیا وہ یہ ہے ''تم لوگوں نے مجھے خارج از اسلام تو ضرور قرار دے دیا ہے لیکن تم مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے سے نہیں روک سکتے۔ (ڈاکٹر عبد

السلام صفحہ 137)

ان لوگوں کے لئے جو ایک دوسرے پر جھٹ سے کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں یہ بات یاد رکھنے اور غور کرنے کے لائق ہے۔

مَیں تیری یاد کو اس دل سے مٹاتا کیسے
تو کوئی ریت پہ لکھی ہوئی تحریر نہیں !!

یہ ایک تلخ اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ گزشتہ تیرہ صدیوں کے طویل عرصہ میں مختلف گروہوں کے علاوہ بڑے بڑوں پر بھی کفر کے فتوے لکھتے رہے ہیں۔ ان میں ایک عالم اسلام کی مشہور عالم و حکیم ہستی بوعلی سینا بھی تھے۔ جنہوں نے جواب میں یہ کہا ''اگر مجھ پر کفر کا فتوی لگاتے ہو تو یہ کوئی آسان بات نہیں کیونکہ (اسلام پر) کسی اور کا یقین اتنا محکم نہیں جتنا کہ میرا ہے۔ جب تم مجھ جیسے یکتا مسلمان کو بھی کافر قرار دیتے ہو تو پھر دنیا میں مسلمان کون باقی بچا؟

تاریخ ساز بین الاقوامی کردار

ڈاکٹر سلام نے سائنس کی دنیا میں جو عظیم ترین بین الاقوامی خدمت کی ہے اور جو لا جواب اور باقی رہنے والا کارنامہ انجام دیا ہے وہ اٹلی کے شہر ٹرسٹے (Trieste) میں ان کا قائم کردہ نظریاتی طبیعیات کا بین الاقوامی مرکز ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر سلام کو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ممالک اور ان کے عظیم سائنس دان زبردست خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔

اس مرکز کا بڑا مقصد یہ تھا کہ خاص طور پر تیسری دنیا کے وہ قابل جواہر اور لائق سائنس دان جن کے پاس نہ ذاتی وسائل ہیں اور نہ ان کے ممالک میں یہ سہولتیں اور اعلیٰ درجہ کے سائنسی ادارے میسر ہیں، فیض یاب ہوں اور ایسے قابل افراد سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنے علم کو مزید بڑھا سکیں اور اعلیٰ معیار کے سائنس دان بن سکیں۔ آخر ڈاکٹر عبدالسلام کی دن رات کی محنت اور لگن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بین الاقوامی شہرت یافتہ مرکز نے 1964ء میں اپنا کام شروع کر دیا اور دنیا کے

بڑے بڑے تربیت لینے والے اور تربیت دینے والے ماہرین طبیعیات کی توجہ اس مرکز کی طرف اٹھنے لگی۔ ڈاکٹر عبد الغنی رقمطراز ہیں ’’امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس جو امریکی ماہرین طبیعیات کی بھاری تعداد کی نمائندہ کہی جاتی ہے، نے سلام کو 1978ء کے ٹرسٹے میڈل کے لئے نامزد کیا۔ سلام کو یہ میڈل دیئے جانے کی تقریب کے موقع پر جو تقریر کی گئی اس کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ’’نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی سینٹر کے بانی عبد السلام نے دنیا بھر میں نظریاتی طبیعیات میں تمام ملکوں کے سائنس دانوں کو اپنی معاونت میں کام کرنے کا موقع فراہم کر کے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ....سلام کی لیڈر شپ میں یہ سینٹر ترقی پذیر ممالک کے ماہرین طبیعیات کو دنیا کے مانے ہوئے ماہرین طبیعیات کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع فراہم کر رہا ہے۔ اس طرح ترقی پذیر دنیا میں یونیورسٹیوں میں ماہرین طبیعیات کی تعداد کو بڑھا رہا ہے اور عالم گیر پیمانے پر سائنسی تعاون کو مضبوط بنا رہا ہے۔‘‘ (ڈاکٹر عبد السلام صفحہ 100) سنٹر کی شاندار کامیابی کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1968ء میں مذکورہ سنٹر کے زیر اہتمام ہونے والے انٹرنیشنل سمپوزیم (Symposium) میں آٹھ نوبیل انعام یافتگان نے شرکت کی جو انتہائی درجہ مفید ثابت ہوئی۔ علاوہ ازیں 1980ء کے اختتام تک سینٹر پر آنے والے سائنس دانوں کی تعداد سولہ سو (1600) تک پہنچ چکی تھی اور اس سینٹر کے قیام کے وقت سے لے کر اس وقت تک تقریباً دس ہزار سائنس دان وہاں سے فیض یاب ہو چکے ہیں"۔ (ڈاکٹر عبد السلام صفحہ 118)

ہم دعا لکھتے رہے ....

نظریاتی طبیعیات کا بین الاقوامی مرکز جو ڈاکٹر عبد السلام نے عملاً ٹرانسٹ (اٹلی) میں قائم کیا اور جس کی ٹھوس اور قابل رشک کامیابیوں اور خدمات کا کچھ تذکرہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہ دراصل ڈاکٹر عبد السلام پاکستان میں قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ وطن عزیز کے اپنے مستقبل کے کامیاب سائنس دان اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں اور دنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن ہو

اور پاکستان کا سائنس کے میدان میں قابل رشک مقام ہے۔ چنانچہ انہوں نے 1963ء میں اس وقت کے صدر پاکستان محمد ایوب خان سے درخواست کی کہ حکومت پاکستان اس سینٹر کے قیام کی منظوری دے۔ چونکہ صدر ایوب خان ڈاکٹر سلام کی زبردست لیاقت، جانفشانی اور جذبہ خدمت وطن سے خوب واقف تھے اور انہی خوبیوں کی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا سائنسی مشیر اعلیٰ بھی مقرر کر رکھا تھا۔ اس لئے انہوں نے پروفیسر سلام کی موجودگی میں اپنے وزیر خزانہ سے اس سلسلہ میں مشورہ مانگا تو جو جواب انہوں نے صدر ایوب خان کو دیا اس کو ڈاکٹر عبدالغنی نے ان الفاظ میں ریکارڈ کیا ہے۔ ’’جناب پروفیسر (سلام۔ناقل) دنیا کی سائنسی کمیونٹی کے لئے ایک بین الاقوامی ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ (ڈاکٹر عبدالسلام صفحہ 117)

اس موقع پر بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے۔

ایک نقطہ نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا
ہم دعا لکھتے رہے وہ دغا پڑھتے رہے

پاکستان کے ارباب اختیار کی کم سمجھی اور بے قدری نے وطن عزیز کو اتنے بڑے اعزاز اور فائدہ سے محروم کر دیا اور اب اٹلی کا شہر ٹرسٹے ڈاکٹر عبدالسلام کے قائم کردہ مرکز کی وجہ سے دنیا بھر میں نام پیدا کرنے والے اور اپنے اپنے ملکوں کو بے پناہ فائدہ پہنچانے والے سائنس دانوں کی تربیت گاہ اور آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ (الفضل 11اپریل 1997ء)

نوبیل پرائیز جیتنے تک

قارئین کرام! انصاف سے کہیے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے زمانہ طالب علمی سے لے کر اب تک جو واقعات اور تفصیلات آپ نے پڑھی ہیں کیا اس سے روز روشن کی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ عبدالسلام کو قدرت نے واقعی غیر معمولی ذہانت، اعلیٰ پائے کا دل و دماغ اور محنت و خدمت کا بے پناہ جذبہ عطا کیا تھا اور انہوں نے ان خداداد انعامات سے بھرپور کام لیتے ہوئے قدم بہ قدم عدیم المثال

کامرانیوں اور کامیابیوں کے زینے پر آگے ہی آگے قدم رکھا اور سائنس کے عالمی افق پر چاند اور سورج کی طرح چمکنے لگے اور دنیا بھر کو اپنی عظیم الشان استعدادوں اور کارناموں سے فیضیاب کیا۔ کیا کوئی ذی شعور انسان کہہ سکتا ہے کہ انہیں 1979ء میں جو نوبیل پرائز ملا وہ ان کی حیرت انگیز محنت اور بے مثال کامیابیوں اور دریافت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ کسی سازشی پروگرام کے نتیجے میں دیا گیا تھا؟ اگر بغض و تعصب اور جہالت کی پٹی کو اتنا بھیانک اور تاریک کر لیا جائے کہ اس میں کالا ہی کالا دکھائی دینے لگے تو ایسے کور چشموں اور کج علموں کو اپنی آنکھوں کی فکر کرنی چاہئے۔ شاعر نے کیا خوب کہا

تم کو ملے ہیں قریہ مہتاب میں گڑھے
ہم کو تو پتھروں میں بھی رعنائیاں ملیں

ہم جوں جوں اس عظیم عبقری کی کامیابیوں کا علم حاصل کرتے ہیں ورطہ حیرت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور ڈاکٹر عبدالسلام کے مقام اور سربلندی و سرفرازی پر بار بار مرحبا کہنے کو جی چاہتا ہے۔ نوبیل پرائز کے سال 1979ء سے قبل بھی ڈاکٹر عبدالسلام عالمی سطح پر کوئی ایک درجن ایوارڈ اور میڈل جیت چکے تھے۔ نیز اقوام متحدہ کے متعدد عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ تبھی تو پاکستان کے نامور سائنس دان ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبیل پرائز ملنے پر بالکل صحیح فرمایا ”ڈاکٹر عبدالسلام کا یہ عظیم الشان اعزاز بڑی دیر سے متوقع تھا“ (ڈان، 16 اکتوبر 1979ء صفحہ 12)

نوبیل پرائز کی کٹھن منزل

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ نوبیل پرائز کسی ایک شخص یا ملک کی صوابدید پر یونہی نہیں دے دیا جاتا۔ اس کے لئے ایک کڑا معیار، طویل جانچ اور لمبا لائحہ عمل ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبیل پرائز ملنے کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یہ نوبیل کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں دیا گیا تھا جو مندرجہ ذیل ذرائع سے موصول ہونے والی تجاویز پر مبنی تھیں:

1۔ رائل اکیڈیمی آف سائنس کے سویڈش اور غیر ملکی ارکان

2۔ طبیعیات کے نوبیل کمیٹی کے ارکان۔

3۔ طبیعیات میں نوبیل پرائز حاصل کرنے والے۔

4۔ سویڈن، ڈنمارک، فن لینڈ، آئس لینڈ اور ناروے اور کرونسا انسٹی ٹیوٹ سٹاک ہوم کے مستقل اور قائم مقام طبیعیات کے پروفیسر۔

5۔ کم از کم چھ یونیورسٹیوں یا یونیورسٹی کالجوں سے مختلف ملکوں اور اپنے کو تعلیمی اداروں کے درمیان مناسب تقسیم کا تعین دلانے کے مقصد کے لئے چنے ہوئے بلند پایہ ماہرین طبیعیات۔

6۔ دوسرے سائنس دان جن کی طرف سے بھیجی ہوئی تجاویز کو اکیڈمی مناسب سمجھتی ہے۔

(ڈاکٹر عبدالسلام صفحہ 100-101)

نشیب پر نہیں اپنی بلندیوں کی اساس
ازل کے دن ہی سے گردوں وقار میں ہم لوگ

فرزند پاکستان کی سج دھج

ہم مضمون کی ابتداء میں پاکستانی پریس کی یہ خبر درج کر چکے ہیں کہ جب ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبیل پرائز ملنے کی خبر ملی تو وہ فوری طور پر رب قدوس کے آگے جھک گئے اور دوگانہ شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام مشرقی روایات کے دلدادہ اور پابند تھے۔ اور سرزمین پاکستان کے سچے فرزند۔ لہذا انہوں نے نوبیل انعامی تقریب منعقدہ سٹاک ہوم، سویڈن (1979ء) کے موقع پر پاکستان کا قومی لباس (شلوار اور شیروانی) زیب تن کیا تا کہ مشرق اور مغرب والے دیکھ لیں کہ اتنا بڑا انعام ماشاء اللہ ایک پاکستانی سائنس دان نے جیتا ہے۔ اس موقع پر اپنی تقریر کے دوران ڈاکٹر عبدالسلام نے اہل مغرب کے سامنے اعلان کیا۔ ''علم طبیعیات کی تخلیق عام انسانیت کا ایک مشترکہ ورثہ ہے۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب یکساں طور پر اس ورثے کے حق دار ہیں۔ اسلام کی مقدس کتاب

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''تم نہیں دیکھتے اللہ کی تخلیق میں کوئی نقص نہیں، نہ ہی کوئی نا مکمل پن۔ اپنی نظریں لوٹاؤ، کیا تم کوئی شگاف، کوئی دراڑ دیکھتے ہو۔ پھر اپنی نظریں پھیرو۔ تمہاری نظر تمہارے پاس لوٹ آتی ہے، خیرہ، تھکی ہاری۔ یہی تمام ماہرین طبیعیات کا ایمان ہے۔ ہم جتنی گہری جستجو کرتے ہیں اتنا ہی ہمارا تحیر بڑھتا ہے۔ اتنی ہی ہماری نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں ۔'' (ڈاکٹر عبدالسلام صفحہ 102)

وطن عزیز کی لاجواب اور بے لوث خدمات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ڈاکٹر عبدالسلام کی غیر معمولی قابلیت اور عالمی سطح پر غیر معمولی شہرت وعزت کی بنا پر انہیں 1961ء میں صدر پاکستان کا سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر پینتیس (35) سال تھی۔ وہ پورے تیرہ سال تک اس منصب پر فائز رہ کر پاکستان کی بلا معاوضہ اور بے لوث خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی یہ خدمات اتنی بنیادی نوعیت اور ایسے دور رس نتائج کی حامل ہیں کہ وہ آج بھی منفرد اور نادر حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی تفصیل تو بہت وقت اور طوالت چاہتی ہے اس لئے کچھ اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ **پوسٹ گریجوائیٹ سٹڈیز:** ڈاکٹر سلام نے پاکستانی سائنس دانوں کی علمی ترقی اور ریسرچ کے مواقع مہیا کرنے کے لئے چھ سالانہ وظائف کا بندوبست وزارت تعلیم سے کروایا۔ جس کے نتیجے میں ملک کے بعض ہونہار اور ابھرتے ہوئے سائنس دانوں نے برطانیہ سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ملک کے لئے عزت کمائی۔

2۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی

(Pinstech): کے قیام کی تجویز اور صدر ایوب خان سے اس کی منظوری حاصل کرنا۔ اس زمانہ میں اس منصوبہ کے لئے حکومت پاکستان نے دس کروڑ روپے کی خطیر رقم مختص کی اور یہ عظیم ادارہ اسلام آباد میں قائم ہوگیا۔

3۔ نیوکلیئر پاور پروگرام کے سلسلے میں کراچی میں ایک سو چالیس میگاواٹ پاور ری ایکٹر کی تجویز جو آگے چل کر دوررس نتائج کی بنیاد بنی۔

4۔ میزائل ریسرچ اور بالائی فضائی تحقیق کے لئے ''سپارکو'' کا قیام جس کے وہ بانی چیئرمین تھے۔'' 5۔ سوشل سائنسز کے میدان میں غربت و افلاس کو دور کرنے کے لئے ٹیکنالوجی کے استعمال کی ترغیب و تلقین۔ اس سلسلہ میں پروفیسر سلام کا کہنا یہ ہے کہ ''پہلے تو ایک معاشرہ کو مطلوبہ ٹیکنالوجیکل مہارت ولیاقت حاصل کرنی چاہئے۔ دوسرے اسے قومی آمدنی کا پانچ فیصد بچانا چاہئے اور اسے پیداواری منصوبوں میں انویسٹ کرنا چاہئے۔ اقتصادی خود کفالت کے لئے یہ دو اہم بیاری چیزیں ہیں'' (ڈاکٹر عبدالسلام۔110)

سید و شریف کی سوات سائنس کانفرنس

ڈاکٹر عبدالسلام کے مشورہ پر یہ خاص الخاص سائنس کانفرنس اگست 1965ء میں سید و شریف کے مقام پر صدر ایوب خان کی سرپرستی میں منعقد ہوئی اور خود صدر ایوب خان نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر پروفیسر سلام نے ریسرچ کے لئے، مجموعی قومی پیداوار کے ''ایک فیصد'' کے لئے درخواست کی تھی اور یہ کہ ریسرچ کے معاملات روایتی بیوروکریسی کے کنٹرول میں نہ دئے جائیں۔

اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کی تجویز

ڈاکٹر عبدالغنی اس بارے میں یہ اہم بات ریکارڈ پر لاتے ہیں:

''سلام نے 1974ء میں لاہور میں منعقدہ پہلی اسلامی کانفرنس کے موقعہ پر اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے قیام کی تجویز پیش کی۔ سلام نے یہ تجویز پیش کی کہ اس فاؤنڈیشن کا قیام اعلیٰ سطح پر ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کو اپنا ہدف بناتے ہوئے اسلامی ملکوں کی مدد سے عمل میں لایا جائے۔ فاؤنڈیشن کی سرپرستی اسلامی ممالک کریں۔ فاؤنڈیشن قطعی طور پر غیر سیاسی اور خالصتاً سائنسی ہو۔ اسے مسلم ممالک کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین چلائیں۔ سلام کی ان تجاویز پر تمام اسلامی

ممالک کی حکومتوں کی طرف سے فوری غور وخوض کیا جانے لگا۔ 1981ء کی طائف کانفرنس کے موقع پر مسلمان ممالک نے فاؤنڈیشن کے قیام کے لئے پچاس ملین ڈالر کی رقم کے حق میں ووٹ دئے۔ (ڈاکٹر عبدالسلام ص 136) جو دشمنان حق وانصاف اور کم فہم لوگ ڈاکٹر عبدالسلام کو بلا جواز ناحق پاکستان اور عالم اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ وہ مندرجہ بالا حقائق اور وطن عزیز کے اس عظیم سپوت کی مخلصانہ اور دردمندانہ خدمات پر بھی غور کریں۔

ڈاکٹر عبدالغنی جدید سائنس کی تاریخ سے متعلق رقمطراز ہیں:

''چودھویں صدی کے بعد یورپ میں جدید سائنس نے ترقی کرنی شروع کی لیکن مسلمانوں کے لئے وہ ''پل'' جوعلوم کی ترسیل کا ذریعہ بن سکتا تھا ٹوٹ چکا تھا۔ مسلمان بتدریج علوم جدیدہ کا میدان چھوڑتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کی پرچھائیں بھی باقی نہ رہی۔ پچھلی تقریباً سات صدیوں میں کسی بھی مسلمان نے کوئی قابل قدر تخلیقی کام نہ پیش کیا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دوجگنوؤں نے اپنی بساط بھر اس تاریکی کو مٹانے کی کوشش کی ہو مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس طویل عرصہ میں اتنی بڑی ملت کوئی ماہتاب، کوئی آفتاب نہ پیدا کرسکی۔ یہ اسلامی تاریخ کا وہ پس منظر ہے جس میں ڈاکٹر عبدالسلام موجودہ صدی میں آفتاب بن کر ابھرے اور گیارھویں صدی کے عظیم مسلم ماہر طبیعیات ابن الھیثم جنہیں وہ بڑے فخر سے اپنا علمی بھائی کہتے ہیں کی صدیوں سے مردہ چلی آرہی تحقیقی وتخلیقی روایت کوزندہ کیا۔ انہوں نے اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنے وطن عزیز سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے عالمی برادری میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے علمی وقار کو بڑی آن بان کے ساتھ بحال کیا۔ اب مغرب کا وہ منہ نہ رہا جو کہہ سکے کہ اسلام کی سرزمین علوم جدیدہ کے لئے بنجر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سلام عالم اسلام کے سرمایہ ہیں۔ (ڈاکٹر عبدالسلام-176)

زمانے نے بہت یاد کیا

ارض پاکستان کا عظیم سپوت، عالم اسلام کا سچا خیر خواہ اور تیسری دنیا کا دردمند مفکر وخادم ڈاکٹر

عبدالسلام بے شمار سائنسی اور علمی خدمات انجام دے کر اور بے شمار و بے مثال کامیابیاں اور سرفرازیاں سمیٹ کر آخر 21 نومبر 1996ء کو عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گیا۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔

(الفضل انٹرنیشنل 18 تا 24 اپریل 1997ء)

ڈاکٹر عبدالسلام ۔ چند یادیں

(بشیر احمد خان رفیق ۔ لندن)

فروری 1959ء میں خاکسار پہلی مرتبہ انگلستان پہنچا۔ محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ان دنوں پٹنی کے علاقہ میں جو مسجد فضل لندن سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے مستقل رہائش پذیر تھے اور امپیریل کالج لندن میں پروفیسر تھے۔ مسجد فضل میں نماز کے لئے آپ تشریف لاتے تو خاکسار کو بھی شرف ملاقات حاصل ہو جاتا۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ اور علمی مقام کے لحاظ سے خاکسار کی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ تھی لیکن محترم ڈاکٹر صاحب بحیثیت مبلغ جماعت احمدیہ کے خاکسار سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور گاہے گاہے اپنے دولت کدہ پر خاکسار کو بھی مدعو فرماتے تھے۔ عام طور پر آپ اپنے دوستوں کو اتوار کے روز ناشتہ کیلئے دعوت دیتے تھے۔ ناشتہ کیا ہوتا، پورا دوپہر کا کھانا ہوتا تھا۔ کھانے کی میز انواع واقسام کی ڈشز سے بھری ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست اور مداح نہ صرف ناشتہ سے لطف اندوز ہوتے تھے بلکہ ان کی علمی گفتگو، حالات حاضرہ پر تبصرے اور شعر و شاعری میں ان کے اعلیٰ مذاق سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ بعد میں جب حضرت چودھری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے مستقلاً لندن میں رہائش اختیار کی تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ معمول ہو گیا کہ جب بھی لندن میں ہوتے اتوار کے ناشتہ پر حضرت چودھری صاحب کو ضرور بلاتے۔ خاکسار بھی اکثر ان مجالس میں شامل ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے سائنسی علوم کی نعمت سے تو مالا مال کیا ہی تھا۔ اس کو شعر و شاعری، اردو اور انگریزی ساتھ ہی آپ کو ادب اور تاریخ کے علم سے بھی وافر حصہ دیا تھا۔ فارسی شعراء میں حافظ آپ کے پسندیدہ شاعر تھے اور حافظ کے سینکڑوں اشعار آپ کو از بر تھے اور موقع و محل کی مناسبت سے حافظ کے اشعار آپ کو لطف دیتے تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی شاعری کا بھی آپ نے بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوا تھا اور اکثر حضور علیہ السلام کے فارسی و اردو اشعار موقع کی مناسبت سے سناتے تھے۔ حضرت چودھری صاحب کو بھی فارسی شعراء میں سے حافظؒ کے ساتھ عشق تھا۔ اس لحاظ سے مکرم ڈاکٹر صاحب اور حضرت چودھری صاحب کی سنانا طبیعتیں آپس میں بہت ملتی تھیں۔ صوفی شعراء میں دونوں بزرگوں کو مولانا روم سے عشق کی حد تک عقیدت تھی اور ان کے سینکڑوں اشعار دونوں کو یاد تھے۔ اس طرح بعض اوقات تو پوری محفل پر حافظ و رومی چھائے رہتے تھے۔ حضرت چودھری صاحب کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی فارسی شاعری سے بڑا لگاؤ تھا اور اگر میں یہ کہہ دوں کہ انہیں قریباً حضور علیہ السلام کی فارسی شاعری کا سارا دیوان حفظ تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کو حضرت چودھری صاحب سے بے حد محبت تھی۔ اکثر اپنے ذاتی معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور حضرت چودھری صاحب جو بھی مشورہ دیتے اس پر عمل پیرا ہوتے۔

خاکسار کے آنے کے کچھ عرصہ بعد محترم ڈاکٹر صاحب کے والد محترم حضرت چودھری محمد حسین صاحب بھی لندن تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے والدین سے عشق تھا اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جو بھی بڑے بڑے لوگ سیاستدان سائنسدان ڈاکٹر صاحب سے ملنے آتے انہیں اپنے والد صاحب سے ضرور ملاتے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کی ملاقات ڈیوک آف ایڈنبرا سے طے ہوئی تو وہاں بھی اپنے والد صاحب کو ساتھ لے گئے اور انہیں ڈیوک سے ملایا۔

ایک دن محترم ڈاکٹر صاحب خاکسار کے پاس مشن ہاؤس تشریف لائے اور فرمایا کہ ان کے

والد صاحب گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے ان کی خواہش ہے کہ وہ انہیں صبح میرے پاس مشن ہاؤس میں چھوڑ جایا کریں اور شام کو کالج سے واپس آتے ہوئے لے جایا کریں اور شام کو کالج سے واپس آتے ہوئے لے جایا کریں۔ اس طرح مشن ہاؤس میں ان کا دل لگا رہے گا۔ احمدی دوستوں سے ملاقات کا بھی موقع ملتا رہے گا۔ خاکسار نے عرض کیا بڑی خوشی سے تشریف لانے لگے اور اکثر میرے دفتر میں اُنہیں لے آیا کریں۔ جماعت کی تربیت کے سلسلہ میں ہم ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس طرح ایک تو ان کا دل لگا رہے گا دوسرے جماعت کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ محترم چودھری محمد حسین صاحب روزانہ مشن ہاؤس میں ساتھ بیٹھ کر علمی و تربیتی امور پر گفتگو رہتی۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دفعہ حضرت چودھری صاحب نے مجھے کہا کہ دعا کرو سلام کو نوبل پرائز مل جائے۔ میں نے عرض کیا آپ خود بزرگ ہیں۔ دعا کریں، میں بھی دعا کروں گا اور چند اور بزرگ دوستوں کو بھی دعا کے لئے کہوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے ایک رات خواب میں ایک شخص کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر سلام کو نوبل پرائز ضرور ملے گا لیکن ابھی ان کی عمر چھوٹی ہے جبکہ بڑی عمر کے سائنسدانوں کی قطار لگی ہے۔ پہلے انہیں یہ پرائز دیا جائے گا اور پھر باری آنے پر ڈاکٹر صاحب کو بھی ضرور یہ انعام ملے گا۔ میں نے اگلے دن حضرت چودھری صاحب نے اپنے اس خواب کا ذکر کیا دوسرے دن مکرم ڈاکٹر صاحب مشن ہاؤس آئے تو مجھ سے خواب سننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خاکسار نے انہیں خواب سنائی تو فرمانے گئے ''عجیب بات ہے ابھی چند روز ہوئے مجھے بھی یہ بات ایک نوبل پرائز کمیٹی کے قریبی شخص نے بھی بتاتی ہے۔''

مکرم ڈاکٹر صاحب جمعہ کے روز اوّل وقت مسجد فضل میں تشریف لاتے اور عموماً پہلی صف میں امام کے عین پیچھے بیٹھا کرتے تھے۔ گرمیوں میں بھی اوور کوٹ اور گرم ٹوپی کا استعمال فرماتے خاکسار جب خطبہ دیتا تو دوران خطبہ مکرم ڈاکٹر صاحب اپنی نوٹ بک نکال کر اس میں کچھ درج

کرتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے بطور لطیفہ ان سے کہا ڈاکٹر صاحب آپ کو شاید میرا خطبہ بہت پسند آتا ہے کیونکہ آپ اس کے نوٹس لیتے رہتے ہیں۔ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور فرمانے لگے بات یہ ہے کہ میرے دماغ میں وقتاً فوقتاً بجلی کی تیز روشنی کی طرح بعض سائنسی نکات آتے ہیں، میں انہیں ہر وقت نوٹ کر لیتا ہوں۔ بعد میں یہ نکات میری تحقیق کی بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ اگر میں انہیں بروقت نوٹ نہ کرلوں تو یہ اہم مضامین ضائع ہو سکتے ہیں۔ ان کا یہ طریق دن رات جاری رہتا تھا۔ حتیٰ کہ کھانے کی میز پر بھی اچانک وہ اپنی نوٹ بک کھول کر کچھ لکھ دیا کرتے اور پھر گفتگو میں شامل ہو جاتے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو احمدیت سے عشق تھا اور جماعت کے لئے بہت غیرت رکھنے والے انسان تھے۔ 1974ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی نے جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی قرارداد پاس کی تو ان دنوں ڈاکٹر صاحب حکومت پاکستان کے سائنسی مشیر تھے اور ان کا درجہ وزیر کے برابر تھا۔ جونہی اس فیصلہ کی خبر سنی تو لندن مشن ہاؤس میں تشریف لائے۔ حضرت چودھری محمد ظفر اللہ خان صاحب بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جیب سے اپنا استعفیٰ نکال کر حضرت چودھری صاحب کو دکھایا اور فرمایا میں ایسی حکومت کے ساتھ کیسے تعاون کر سکتا ہوں جس نے ہمیں دائرہ اسلام سے خارج کر دیا ہو۔

جنرل ضیاء نے جب اپنا رسوائے زمانہ آرڈیننس جاری کیا جس میں جماعت کو بہت سے شعائر اسلام کے استعمال سے روکا گیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کو بہت صدمہ پہنچا۔ کچھ عرصہ بعد جب خاکسار مکرم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا تو خاکسار نے ان سے پوچھا کہ کیا اس آرڈیننس کے جاری ہونے کے بعد بھی ان کی ملاقات جرنیل صاحب سے ہوئی ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہاں ملاقات ہوئی تھی اور اس کی روداد یوں سنائی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جنرل ضیاء کی طرف سے مجھے ٹریسٹ میں کئی فون آئے کہ میں پاکستان جا کر ان سے ملوں لیکن میں ٹالتا رہا۔ بالآخر مجھے پاکستان جانا پڑ گیا۔ جنرل ضیاء کو اطلاع ہوئی تو ملاقات کے لئے مصر ہو گیا۔ چنانچہ میں ملاقات کے

لئے پریذیڈنٹ ہاؤس میں گیا جہاں بعض اور سائنسدان بھی موجود تھے۔ جنرل صاحب نے باہر آ کر میری کار کا دروازہ کھولا اور مجھ سے معانقہ کرنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے والے کمرہ میں لے گئے جہاں اور سائنسدان بھی موجود تھے دوران گفتگو میں نے آرڈیننس کا ذکر کر کے اس پر افسوس کا اظہار کیا۔ جنرل صاحب نے فوراً میرا ہاتھ پکڑا اور کہا آیئے! دوسرے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔ اور مجھے دوسرے کمرہ میں لے مجھے میرے ساتھ اس وقت کے سائنسی امور کے وزیر بھی کمرہ میں لے گئے۔ جنرل صاحب نے کہا بات یہ ہے کہ میرے پاس علماء کا ایک وفد آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ احمدی قرآن مجید میں تحریف کرتے ہیں اس لئے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جنرل صاحب کو کہا کہ قرآن کی حفاظت کا تو خود اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اور قرآن کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لیا ہوا ہے اس لئے احمدی اس میں تحریف کیسے کر سکتے ہیں۔ اس پر جرنیل صاحب اٹھ کر کتابوں کی الماری کی طرف گئے اور تفسیر صغیر اٹھا لائے اور کہا کہ علماء نے ان آیات کی نشاندہی کر دی ہے۔ جہاں آپ نے تحریف سے کام لیا ہے اور ایک نشان زدہ صفحہ کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ یہ آیت خاتم النبیین تھی۔ میں نے جرنیل صاحب سے کہا کہ آیت تو مکمل طور پر درج ہے تحریف کہاں ہوئی ہے۔ جرنیل صاحب نے کہا کہ آپ نے آیت کے معنوں میں تحریف کی ہے اور بجائے ''نبیوں کو ختم کرنے والے کے ''نبیوں کی مہر'' ترجمہ کیا ہے اور یہ ناقابل برداشت ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں نے جرنیل صاحب سے عرض کیا کہ ختم کا لفظ جو بیان استعمال ہوا ہے وہ پنجابی زبان کا نہیں بلکہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کے معنے عربی میں مہر کے ہیں لیکن میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کیا آپ کے پاس اور کسی عالم کا ترجمہ شدہ قرآن بھی ہے۔ جرنیل صاحب اٹھے اور علامہ اسد کا ترجمہ قرآن اٹھا لائے جو مکہ معظّمہ سے شائع ہوا تھا۔ میں نے قرآن مجید کو کھولا۔ آیت خاتم النبیین نکالی تو وہاں بھی ترجمہ SEAL OF PROPHETS لکھا تھا۔

جرنیل صاحب کا مونہہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ علامہ اسد تو احمدی نہ تھے پھر ان کا ترجمہ سعودی حکومت کا شائع کردہ ہے۔ کیا انہیں بھی آپ تحریف کا مجرم قرار دیں گے؟

اس پر جرنیل صاحب کہنے لگے بھئی میں تو ان پڑھ جرنیل ہوں، جو علماء نے مجھے کہا میں نے اسے تسلیم کیا۔ میں نے عرض کیا جناب بات صرف جرنیلی کی نہیں، آپ اس ملک کے صدر بھی ہیں اور بحیثیت صدر مملکت پاکستان کی تمام رعایا کے حقوق کی حفاظت آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ یہیں اسلام آباد میں جماعت احمدیہ کے مربی موجود ہیں۔ جماعت کے افراد موجود ہیں۔ آپ کو جو کچھ علماء نے بتایا تھا آپ کا فرض تھا کہ احمدی علماء کو بھی بلا کر اپنی تسلی کر لیتے اور پھر فیصلہ کرتے۔ اس پر جرنیل صاحب نے زور سے کلمہ شہادت پڑھا اور مجھے بھی کلمہ شہادت پڑھنے کا کہا۔ میں نے کلمہ شہادت پڑھا تو فرمانے لگے سلام! خدا کی قسم میں آپ کو اپنے سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں علماء سے میں مجبور ہو گیا تھا اور یہ کہہ کر بات کا رخ اور طرف موڑ دیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستان سے شدید محبت تھی۔ میں نے جب برٹش پاسپورٹ حاصل کیا تو ایک دن ناشتہ کی میز پر میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ بھی برٹش پاسپورٹ بنوالیں۔ اس طرح سفر میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر وہ چاہیں تو میں برٹش پاسپورٹ کے حصول کے لئے ضروری فارم و کاغذات ان کو لا کر دے دوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا ''امام صاحب میں ہرگز پاکستانی قومیت والا پاسپورٹ نہیں چھوڑوں گا، مجھے امید ہے کہ بہت جلد مجھے نوبل انعام جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ یہ اعزاز کسی اور ملک کے کھاتے میں جائے میں پاکستانی رہوں گا خواہ مجھے سفر میں کبھی پریشانی کا بھی سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ اپنی وفات تک انہوں نے برطانوی شہریت حاصل نہ کی جس کا انہیں حق تھا۔

اپنے والدین سے مکرم ڈاکٹر صاحب کی عقیدت و محبت مثالی تھی اور یوں لگتا تھا گویا انہیں اپنے والدین سے والہانہ عشق ہے۔ جب ان کے والد صاحب کی وفات ہوئی تو مکرم ڈاکٹر صاحب غم سے

نڈھال ہو گئے اور لندن اپنے مکان کے کمرہ میں غم سے نڈھال تنہائی میں رہنے لگے کچھ عرصہ بعد محترمہ مسز سلام کا حضرت چودھری صاحب کو فون آیا کہ آ کر ڈاکٹر صاحب کو سمجھائیں۔ حضرت چودھری صاحب مجھے ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا غم سے برا حال تھا۔ حضرت چودھری صاحب نے انہیں نصیحت کی اور فرمایا کہ اس قدر غم بھی بعض اوقات شرک کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ پھر اپنی مثال دی کہ اپنی والدہ صاحبہ مرحومہ سے عشق ہونے کے باوجود ان کی وفات پر صبر اختیار کیا اور اللہ کی رضا پر راضی ہو گیا۔ بہت دیر تک نصیحت فرماتے رہے پھر اٹھ کر مکرم ڈاکٹر صاحب کو گلے لگایا۔ ڈاکٹر صاحب خوب روئے اور یوں ان کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا اپنے والدین سے عشق اس وجہ سے بھی تھا کہ دونوں اولیاء اللہ میں سے تھے۔ صاحب رویا و کشوف تھے۔ ان کی زندگی کا اوڑھنا اور بچھونا اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا۔ حضرت چودھری محمد حسین صاحب ساری ساری رات عبادت میں گزار دیا کرتے تھے۔ اور دعاؤں میں خاص شغف رکھتے تھے۔

محترمہ مسز سلام صاحبہ ایک لمبے عرصہ تک برطانیہ کی لجنہ اماء اللہ کی صدر رہیں جبکہ خاکسار کو بحیثیت امام و مشرقی انچارج برطانیہ ان کا تعاون حاصل رہا۔ مسز سلام دن رات سلسلہ کے کاموں میں اور لجنہ اماء اللہ برطانیہ کی تعلیم و تربیت میں مگن رہتی تھیں۔ اس کام میں انہیں مکرم ڈاکٹر صاحب کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ مسز سلام ایک طرف سلسلہ کی خدمت میں لگی رہتی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ مکرم ڈاکٹر صاحب مرحوم کے درجنوں مہمانوں کی بیک وقت مہمان نوازی میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں آنے دیتی تھیں۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے دونوں میاں بیوی کا آپس میں تعاون ضروری تھا جو خدا تعالیٰ کے فضل سے انہیں میسر تھا۔

محترم ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ کی اعلیٰ تربیت اور ان کے مرحوم بزرگ والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ان کے سب بچے دین کے خادم، مخلص، خلافت کے

اطاعت گزار اور کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے فرزند اکبر عزیز احمد سلام جلسہ ہائے برطانیہ اور دیگر تقاریب پر کچن میں دن رات ڈیوٹی میں مگن ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک غیر از جماعت معزز مہمان جلسہ سالانہ پر تشریف لائے تو جلسہ کے اعلیٰ اور وسیع انتظامات سے بے حد متاثر ہو کر فرمانے لگے کہ ان تمام کارکنان کو آپ کی جماعت اتنے بڑے کام کے لئے بہت معاوضہ دیتی ہوگی۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہ سارے کا سارا کام رضا کارانہ طور پر ہوتا ہے۔ تو وہ بے حد حیران ہوئے وہ لنگر خانہ کے پاس کھڑے تھے، ان کا تعارف کارکنان کچن سے کرایا گیا۔ عزیز احمد سلام کچن کے بڑے بڑے دیگچے مانجھنے میں لگے ہوئے تھے۔ جب ان کا تعارف معزز مہمان سے کرایا گیا تو وہ بہت حیران ہوئے کہ اتنے بڑے آدمی کا بیٹا کچن میں برتن مانجھ رہا ہے۔ اور اس پر فخر محسوس کرتا ہے کہ اسے خدمت دین کی توفیق مل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اسلام سے کس قدر عشق تھا۔ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل واقعہ ہے۔ کئی سال ہوئے سعودی حکومت کے تعاون سے حج کے بارہ میں ایک فلم ریلیز ہوئی تھی جس میں ارکان حج کے علاوہ مقدس مقامات کی زیارت بھی کرائی گئی تھی۔ خاکسار نے اس فلم کو مشن ہاؤس میں دکھانے کا اہتمام کیا اور محترم ڈاکٹر صاحب کو بھی فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ میرا ارادہ عمرہ کرنے کا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ فلم دیکھنے سے جو لطف مجھے خود ان مقامات پر حاضر ہونے کا نصیب ہوگا کہیں اس میں کمی نہ آجائے۔ خوش الحان قاریوں کی تلاوت کے بے شمار کیسٹ ڈاکٹر صاحب منگواتے رہتے تھے اور انہیں بڑی عقیدت سے سنا کرتے تھے اور اکثر قاریوں کے بارہ میں خاکسار کو بتایا بھی کرتے تھے کہ فلاں قاری کی آواز بہت متاثر کن ہے تو فلاں قاری کی قرات اور الفاظ کی ادائیگی بہت اعلیٰ ہے۔ قاری عبدالباسط سے بے حد متاثر ہوتے تھے اور ان کی تلاوت میں پورا قرآن کریم بالطور خاص مصر سے منگوایا تھا اور اسے سنا کرتے تھے اور کئی مرتبہ حضرت چودھری صاحب کو بھی سنایا کرتے تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب مخفی طور پر درجنوں بیواؤں اور یتیموں اور غریب طالب علموں کی

مالی امداد بھی فرماتے تھے جس کا خاکسار کو بھی علم تھا کیونکہ کئی دفعہ خاکسار کے ذریعہ بھی یہ مدد مستحقین کو جاتی تھی۔ چندوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا کا ایک اعلیٰ وصف یہ تھا کہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ اکثر اپنے ہاتھ سے اور کبھی کبھی اپنے سکریٹری سے ٹائپ کروا کر دستخطوں سے جواب بھجواتے تھے۔ طبیعت تکلیف سے بالکل آزاد تھی۔ چنانچہ اکثر جو بھی پرزہ سامنے آجاتا اسی پر خط لکھ دیا کرتے تھے۔ خاکسار کو تین چار خطوط محض کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر ارسال کئے۔ مقصد جواب دینا ہوتا تھا نہ کہ پیڈ اور اعلیٰ کاغذ کے تکلفات سے غرض مکرم ڈاکٹر صاحب مرحوم اخلاق حسنہ کا ایک خوبصورت گلدستہ تھے جسکی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل گئی تھی۔ (الفضل انٹرنیشنل 4 تا 10 اپریل 1997ء)

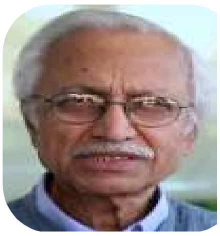

میرا سائنسی شریک کار، عبدالسلام
پروفیسر جوگیش پتی، کیلی فورنیا
ترجمہ مکرم زکریا ورک صاحب کینیڈا

نوٹ: نظری طبیعیات کے ماہر اور پروفیسر عبدالسلام کے سائنسی شریک کار پروفیسر جوگیش پتی Jogesh Pati کی پیدائش 1937ء میں اڑیسہ میں ہوئی تھی۔ آپ عرصہ دراز تک یونیورسٹی آف میری لینڈ کے ڈیپارٹمنٹ آف فزکس کے سربراہ رہے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آجکل آپ سٹین فورڈ نیشنل ایکسل لیٹر لیبارٹری SLAC (سٹین فورڈ کیلی فورنیا) میں برسر روزگار ہیں۔ درج ذیل مضمون آپ نے مجھے فروری 2010ء میں ڈاک سے بھجوایا تھا۔ مئی 1997ء کا تحریر کردہ درج ذیل مضمون، فزکس ٹوڈے، انڈین فزکس ایسوسی ایشن کے میگزین ''فزکس نیوز'' اور انڈین فزکس ایسوسی ایشن کی امریکن برانچ کے رسالہ 'نیوز لیٹر' میں بھی شائع ہوا تھا۔ آپ تحریر کرتے ہیں کہ

عبدالسلام جن کی وفات ستر سال کی عمر میں 21 نومبر 1996ء کو ان کے اپنے گھر آکسفورڈ میں ہوئی تھی، ایک عظیم سائنسدان اور انسانیت نواز شخص تھے۔ ان کی شہرت الیکٹرو ویک یونی فی کیشن کے پیش رو کام کی وجہ سے ہے جو کہ بیسویں صدی کی طبیعیات میں سب سے افضل کارنامہ تھا۔ اس اہم کام کی بناء پر 1979ء کے نوبیل انعام میں آپ شیلڈن گلاشو اور سٹیون وائن برگ کے ساتھ برابر کے شریک قرار دئے گئے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو اس بات کی وجہ سے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے تیسری دنیا میں سائنس کی ترویج کیلئے زریں خدمات انجام دی تھیں۔ اس یقین واثق کی بناء پر کہ سائنس اور ٹیکنالوجی دونوں مل کر آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرنے والی قوت بن جاتے ہیں، انہوں نے سوچا کہ اس قوت کو تمام نوع انسانی کے فائدہ کیلئے استعمال کیا جانا چاہئے خاص طور پر تیسری دنیا کیلئے۔ یوں انہوں نے اپنے فعال کیریئر کا ایک کثیر حصہ اس نصب العین کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ان کی زندگی بھر کی کوششوں کی وجہ سے چند ایک بہترین ریسرچ سینٹرز وجود میں آئے بشمول ٹریسٹ (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے، جس کی داغ بیل انہوں نے 1964ء میں رکھی تھی اور 30 سال تک اس کے ڈائریکٹر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد انٹرنیشنل فاؤنڈیشنز کی بھی داغ بیل رکھی بشمول تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کے اور بین الاقوامی انعامات کا اجراء کیا۔ ان سب کاموں کا مدعا تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو بلند مرتبہ دلانا مقصود تھا۔

فزکس میں اہم خدمات سرانجام دینے کی وجہ سے سلام کو متعدد انعامات دئے گئے بشمول رائل میڈل رائل سوسائٹی آف لندن کا کوپلی میڈل، میکس ویل پرائز اور نوبیل پرائز۔ وہ نیوکلیئر ڈس آرمامنٹ اور پگواش کانفرنس کے زبردست حامیوں میں سے ایک تھے۔ امن اور بین الاقوامی تعاون میں خدمات کی وجہ سے ان کو بڑے بڑے انعامات دئے گئے بشمول 1968ء میں ایٹمز فار پیس ایوارڈ، اور 1989ء میں سائنس فار پیس پرائز۔ 1989ء میں ہی ان کو آنریری نائٹ کمانڈر آف

دی برٹش ایمپائر KBE کا لقب تفویض کیا گیا۔ یہ مان لینا خاصا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک واحد شخص سائنس کی تخلیق اور ترویج کیلئے اتنا کچھ کرسکتا ہے۔ اس لحاظ سے سلام بلاشبہ ایک منفرد انسان تھے بلکہ ایک فینامنن۔

سلام کی پیدائش 1926ء میں جھنگ کے چھوٹے شہر میں ہوئی تھی جو اس وقت برطانوی ہندوستان میں تھا اور آجکل پاکستان کا حصہ ہے۔ چھوٹی عمر سے ہی چھری کی طرح تیز ذہانت کی وجہ سے شہرت پانے پر انہوں نے ہائی سکول اور انڈر گریجوایٹ کی تعلیم اس رنگ میں مکمل کی کہ ان کو پنجاب یونیورسٹی سے 1946ء میں بہت سارے ایوارڈز ملے اور سینٹ جانز کالج، کیمبرج برطانیہ سے سکالرشپ بھی مل گئی تا کہ وہ اپنی گریجوائٹ تعلیم کو مکمل کر سکیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی انہوں نے سب طالب علموں پر سبقت حاصل کر کے فزکس اور ریاضی میں ڈبل فرسٹ حاصل کی۔ اب انہوں نے پال میتھوز سے جو پی ایچ ڈی مکمل کرنے والا تھا، ملاقات کے دوران درخواست کی کہ وہ ان کو ڈاکٹریٹ کرنے کیلئے کوئی سائنسی مسئلہ تجویز کرے۔ اس دور میں تھیوریٹیکل فزکس میں دماغی ہیجان پیدا کرنے والا سائنسی مسئلہ QED (کوانٹم الیکٹروڈائی نامکس) میں ری نار مالائزیشن کا مسئلہ تھا۔ اس مسئلہ کو جولین شونگر، ٹوموناگا، فین مان اور ڈائی سن نے اپنے ٹھوس مقالہ جات میں بیان کیا تھا کہ کسی طرح QED میں ڈائی ورجنز کو دور رکھا جا سکتا جس کی وجہ سے دو دہائیوں سے اس مسئلہ میں دشواریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس کیلئے تجربات نے بھی تھیوری کے ساتھ میل کھایا تھا اور انٹی ٹیز entities کی اقدار بھی مناسبت رکھتی تھیں جیسا کہ anamolous magnetic moment of the electron میتھیوز نے سلام سے کہا کہ وہ دیکھے اس مسئلہ سے گریز کی کوئی راہ نکل سکتی ہے؟ میتھوز ہکا بکا رہ گیا جب سلام نے اس سائنسی مسئلہ کا حل چند ہی مہینوں میں دریافت کر لیا۔ سلام کے اس سائنسی معرکے کا اس فیلڈ میں اچھا اثر ہوا اور اس کی وجہ سے ان کو یونیورسٹی آف کیمبرج نے 1950ء میں سمتھ پرائز کا حقدار قرار دیا۔ یہی وہ سائنسی معرکہ ہے جس کی وجہ سے سلام اپنے کیریئر

کے آغاز میں ہی عالمی شہرت کے حامل ہو گئے تھے۔

کیمبرج میں ڈاکٹریٹ مکمل کرنے کے بعد، سلام 1951 میں پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر آف میتھے میٹکس بن کر پاکستان لوٹ گئے تاکہ وطن عزیز میں نظریاتی طبیعیات میں ریسرچ گروپس کو تشکیل دے سکیں۔ سرکاری سطح پر کوئی حوصلہ افزائی اور حمایت نہ ہونے نیز فزکس کے میدان میں ان کو جس قسم کے اکیلے پن سے واسطہ پڑا، سلام ان امور سے بہت ہی بد دل ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ وہ وطن عزیز کی خدمت ملک سے باہر رہ کر بہتر خدمت کر سکتے ہیں اس لئے وہ 1954ء میں سینٹ جانز کالج میں لیکچرار اور فیلو بن کر واپس کیمبرج آ گئے۔ تین سال بعد انہوں نے 1954ء میں امپریئل کالج، لندن یونیورسٹی میں پروفیسر کا عہدہ قبول کر لیا۔ یہاں وہ دنیا کا اوّل ترین تھیوریٹیکل فزکس گروپ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، خاص طور پر اس گروپ نے جو کام پارٹیکل فزکس کی سمیٹریز میں سرانجام دیا تھا۔ اس عرصہ میں سلام کی بہترین کنٹری بیوشن نیوٹرینو کی ٹو کمپونٹ تھیوری two-component theory of neutrino کی تجویز تھی۔ اور اس کے ہمراہ chirality symmetry کا آئیڈیا تھا جو دو دیگر سائنسدانوں لی اور لانڈاؤ Lee and Landau نے بھی پیش کیا تھا تاکہ نیوٹیرینو کے ماس لیس masslessness of neutrino ہونے کے مسئلہ کو سلجھایا جا سکے۔ اس سائنسی کام اور دیگر کاموں کی بناء پر سلام 33 سال کی عمر میں رائیل سوسائٹی کے سب سے کم عمر والا فیلو چن لئے گئے تھے۔

دس سال کے عرصہ 67-1957ء میں سلام کی ریسرچ کا مرکزی موضوع، جو اوّل انہوں نے جے سی وارڈ کے اشتراک سے شروع کیا تھا، وہ ریڈیو ایکٹیو ویک اور الیکٹرومیگ ٹیٹک فورسز کے مابین اتحاد تھا۔ یہ سائنسی آئیڈیا 1957ء میں جولیئن شونگر نے پیش کیا تھا اور اپنی سپرٹ میں میکس ویل کے الیکٹرک اور میگ نیٹک فورسز کی بظاہر الگ الگ قوتوں میں اتحاد کے مشابہ تھا۔ اس کے بعد شیلڈن گاشو Glashow نے گیج سیمٹری کے فائدہ مند ہونے کے بارہ میں تجویز پیش کی۔ اس

کے بعد پی ڈبلیو ہگز P.W. Higgs نے فیصلہ کن مشاہدہ کیا جو ایف اینگلرٹ اور براؤٹ سے 1964ء میں آزادانہ طور پر تھا بلکہ ان سے بھی پہلے پی ایڈرسن نے دکھایا تھا کہ کس طرح ماس لیس گیج پارٹیکلز گیج سمٹر یز کی سپون ٹینس بریکنگ spontaneous breaking سے ماس mass حاصل کر لیتے ہیں۔ان تحقیقات کے بعد وائن برگ نے 1967ء میں اور سلام نے 1968ء میں الیکٹرو ویک یونی فی کیشن کا ماڈل تجویز کیا جس کی بنیاد گیج سمٹر یز کی سپون ٹینس بریکنگ تھی۔اس ماڈل نے اس وقت سرعت سے قبولیت حاصل کر لی جب جیرارڈ ہوفٹ 'HooftGerard نے یہ ثابت کر دیا کہ اس قسم کا ماڈل ری نارمالائز ہونے کے قابل ہے، جس طرح کہ کوانٹم الیکٹروڈائی نامکس QED ہوتا ہے۔ چنانچہ اس چیز نے پیمائش کے قابل مقداروں کی پیشگوئی کر دی بشمول ڈبلیو W اور زیڈ Z پارٹیکلز کے، نیز نیوٹرل کرنٹ کے درجنوں ویک پروسسز کے۔گزشتہ سالوں میں ان پیشگوئیوں کی تجربات کے ساتھ حیران کن حد تک مطابقت ثابت ہو چکی ہے۔سلام کا یہ سائنسی کام جواب پاٹیکلز فزکس میں سٹینڈرڈ ماڈل کا حصہ ہے، اس کے سبب سلام 1979ء میں گلاشو اور وائن برگ کے ساتھ نوبل انعام میں شریک کار ہوئے تھے۔

1974-75ء کے عرصہ کے دوران سلام نے ایک اور نمایاں کنٹری بیوشن جان سٹرادھی John Strathee کے ساتھ مل کر کی تھی۔انہوں نے سپر سپیس، سپر فیلڈ فارملزم سے دنیا کو متعارف کرایا جو ایک نئی قسم کی سمٹری یعنی سپر سمٹری super-symmetry سے تعلق رکھتی تھی۔ فیلڈ تھیوریز میں سپر سمٹری کے رکھ رکھاؤ کو جانے کیلئے سلام، سٹرادھی کی یہ تھیوری ناگزیر ثابت ہو چکی ہے۔

پروفیسر سلام کے ساتھ میرا سائنسی تعاون

پروفیسر سلام اور میرا سائنسی تعاون 1972ء میں ٹریسٹ کی میری مختصر وزٹ کے دوران شروع ہوا تھا، اور اگلے دس سالوں تک اس میں بہت گہما گہمی رہی تھی۔مئی 1972ء میں جب میں ٹریسٹ پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ ” گلاشو، سلام، وائن برگ ماڈل “ کے اصل سے قدرے مختلف نمونوں پر مقالہ جات کی بھر مار ہو چکی ہے۔سہ پہر کے وقت چائے پینے کے ایک اجلاس میں میں نے سلام

سے ذکر کیا کہ:

there ought to be a compelling reason for the weak-bypercharge assignments of SU (2) xU(1) -model, and that an underlying theory should provide a reason for the co-existence of quarks and leptons.

کوارکس Quarksاور لپٹانز Leptons کوایک ہی multiplet میں رکھنااس زمانے میں غیر رسمی تھا۔بجائے اس کے سلام اس آئیڈیا کے بارہ میں کوئی تذبذب کا اظہار کرتے،جیسا کہ چند دیگر افراد نے کیا تھا،انہوں نے مجھے جواب دیا:" یہ بہت ہی اعلیٰ قسم کا خیال ہے،آؤ ہم دونوں مل کر اس پر مزید کام کرتے ہیں۔'' اس قسم کی فوری ستائش میرے لئے حوصلہ افزائی کا منبع تھی۔یوں ہمارا سائنسی تعاون چائے کی پیالی پر شروع ہوا تھا۔اس کے کچھ روز بعد پروفیسر سلام نے بہت ہی اہم آئیڈیا پیش کیا کہ اگر یہ جان جائیں کہ کیونکر الیکٹران اور پروٹان میں مساوی اور مخالف چارجز ہوتے ہیں،تو انسان فین مین Feynman کے سوال کا جواب دے سکے گا کہ الیکٹران اور پروٹان (بجائے پوزیٹران اور پروٹان کے) have the same sign of longitudinal polarization in Beta decayاب اس آئیڈیا نے اس تحقیق کو اور بھی اہم بنا دیا کہ الیکٹران اور پروٹان کے چارجز کا صحیح طور پر فقدان حاصل کیا جائے۔

دو ہفتوں کے بعد اتوار کے روز دوپہر کے وقت مجھے یہ خیال آیا کوارکس اور لیپٹان کو بڑے عمدہ طریقے گیج سمٹری SU (4) color کو استعمال میں لا کے متحد کیا جا سکتا ہے۔اگر چہ یہ اتوار کا روز تھا،سلام اس وقت سینٹر میں اپنے دفتر میں دفتری کام میں مصروف تھے،اور مجھے کہا کہ میں ان کو ملنے چلا آؤں۔میری خوش قسمتی کہ مجھے اس روز کی آخری بس مل گئی اور دوپہر کے آخری حصہ میں مرکز ICTP پہنچ گیا۔یہ آئیڈیا جو چند گھنٹوں قبل مجھے سوجھا تھا،سلام برجستہ میرے ولولہ اور خوشی میں برابر کے شریک ہو گئے۔ہم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ شاید SU (4) color بنیادی نظریہ ثابت ہو جائے ۔ 1973ء میں ہماری تجویز کہ پروٹان زوال پذیر ہے،اس کے بارے میں فزکس کمیونٹی نے شک و

شبہ کا اظہار کیا تھا۔ ہمارا مقالہ 'فزیکل ریویو لیٹرز' میں شائع نہ ہو سکا کیونکہ ریفری نے اس کو رد کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں جب مَیں نے اس کا تردیدی جواب لکھا تو چیف ایڈیٹر نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ ہم نے اس ضمن میں تجرباتی سائنسدانوں یعنی ماریس گولڈ ہار رائنز Maurice Goldhaber اور فریڈرک رائنز Fredrick Reins سے تعلق قائم کیا کہ وہ پروٹان کے زوال پذیر ہونے کے بارہ میں تجربات دوبارہ شروع کر دیں۔ سلام کی شخصیت کے ایک پہلو پر مزید روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ ہمارا سائنسی تعاون جو دس سال کے عرصہ پر محیط تھا اس دوران لاتعداد خطوط فیکسز، فون پر دلائل اور دلائل کا رد، آمنے سامنے مختلف نظریات کا اظہار اور گرما گرم بحث، فزکس میں نظریاتی بحثیں، مگر یہ سب کچھ اچھے ماحول اور صاف دلی سے کیا گیا تھا۔ ہماری گفتگو کے دوران ان کے چند مخصوص پسندیدہ محاورے ہوتے تھے۔ مثلاً کئی بار ایسا ہوا کہ ان کو کوئی آئیڈیا سوجھتا اور وہ فوراً جوش میں آجاتے تھے۔ اگر میں اس کے جواب میں کہتا کہ میں اس آئیڈیا کو فلاں فلاں وجوہات کی بناء پر پسند نہیں کرتا، تو وہ بے صبر ہو جاتے اور مجھے کہتے: جناب عالی، آپ کیا چاہتے ہیں؟ خون۔ میں اس کے جواب مسکرا کر کہتا نہیں پروفیسر سلام، میں اس سے بھی بہتر کوئی اور چیز چاہتا ہوں۔ چاہے میں صحیح یا غلطی پر تھا وہ کبھی بھی برا نہیں مناتے تھے۔

انسانیت نواز اور سائنس کا پیامبر

جہاں عبدالسلام ایک طرف اپنی سائنسی ریسرچ میں آگے کی طرف قدم رنجہ تھے، وہاں انہوں نے تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کا اپنا مطمح نظر کبھی نظر انداز نہ ہونے دیا تھا۔ حقیقی معنوں میں ان کو اس بات پر دکھ پہنچتا تھا کہ تیسری دنیا میں اتنے قابل نوجوانوں کو مواقع فراہم نہیں ہوئے کہ وہ سائنس میں اپنا لئے مقام پیدا کر سکیں اور جیسا کہ ان کا کہنا تھا کہ ''اتنے خوابیدہ قابلیت والے اعلیٰ درجہ کے سائنسداں ضائع ہو جاتے ہیں'' وہ سائنسدانوں کی عالمی تنہائی سے بھی نالاں تھے جس سے تھرڈ ورلڈ کے سائنسدانوں کو اپنے وطنوں میں واسطہ پڑتا ہے۔ سائنسدانوں کی مدد

کرنے کے مسلم ارادے سے انہوں نے 1960ء میں اقوام متحدہ کے ادارے انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی سے رابطہ قائم کیا تاکہ کسی جگہ پر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس قائم کیا جاسکے۔ سلام کی تجویز کو بڑی شدومد سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ایک ترقی پذیر ملک سے IAEA کے ایک نمائندہ نے تو یہ کہہ دیا کہ ''تھیورٹیکل فزکس سائنس کی رولز رائیس ہے، جبکہ ترقی پذیر ممالک کو صرف بیل گاڑیوں کی ضرورت ہے۔'' چار سال تک سلام اور اس کے دیگر رفقائے کار نے بڑی شدت سے سینٹر قائم کرنے کی مہم جاری رکھی، اور آخر کار 1964ء میں IAEA کی جزوی مدد سے اور اٹلی حکومت کی بنیادی مدد سے سلام ICTP ٹریسٹ کے شہر میں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

عبدالسلام کی ان تھک کوششوں کے طفیل آئی سی اور ٹی پی جلد ہی ریسرچ سینٹر اور ٹریننگ سینٹر کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا، جہاں سے نہ صرف اعلیٰ درجے کے سائنسداں جنم لیتے ہیں بلکہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کیلئے ہر سال ورک شاپس اور سمر سکولز کے ذریعہ باہم ملنے کے مواقع بھی فراہم کئے جاتے ہیں۔ سینٹر کی 33 سالہ تاریخ میں 60,000 تجرباتی سائنسداں اور تھیورٹیکل ریسرچ کے طبیعیات داں مرکز کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، جبکہ ان میں نصف ترقی پذیر ممالک سے تھے۔ ان سائنسدانوں کی ریسرچ کی فیلڈز فنڈامینٹل فزکس سے لیکر اطلاقی اور پیور فزکس پر ممتد ہوتی ہیں، جبکہ اطلاقی فزکس میں فزکس آف میٹریلز، مائیکرو پروسیسرز، انرجی، فیوژن، ری ایکٹرز، سولر اینڈ نان کنونشنل انرجی، لیزرز، اوشینز oceans، سسٹمز انالےسز، جیوفزکس بائیوفزکس اور نیوروفزکس شامل ہیں۔ سینٹر میں آنیوالے صدیوں سائنسدانوں کے ساتھ گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ سینٹر تھرڈ ورلڈ کے طبیعیات دانوں کی سائنسی زندگی کو زندہ رکھنے میں کتنا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ٹریسٹ کا شہر اگرچہ ساحل سمندر اور پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی کام سے چھٹی نہیں کی تھی۔ اس دوران کہ ان کا خاندان برطانیہ میں مقیم تھا وہ بذات خود آئی سی ٹی پی کی عمارت

کے ساتھ کی حویلی میں رہائش پذیر رہتے تھے۔ ہر دو ہفتوں کے لگ بھگ وہ چند روز کیلئے برطانیہ اپنے خاندان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ یوں ان کو زیادہ وقت مل جاتا تھا کہ وہ سینٹر کی ضروریات اور اپنی عالمی جدوجہد پر توجہ دے سکیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ ذاتی طور پر بہت بڑی قربانی دے رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور ذاتی اتحاد ان کیلئے ہر آن اندرونی صلابت کا منبع ہوتا تھا۔ آپ ایک مؤثر مقرر تھے اور مالی تعاون کرنے والے اداروں کے ساتھ بہترین سفارت کار ہوتے تھے۔ آپ کی وہ تقاریر خاص طور پر وہ جو اقوام متحدہ جیسے اداروں کے عام سامعین کیلئے ہوتی تھیں، وہ قصوں، جماعتوں، تشبیہات اور حقائق سے معمور ہوتی تھیں۔ ان کا مقصد تھرڈ ورلڈ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کیلئے مزید امداد کی ضرورت کے نصب العین کو واضح کرتا ہوتا تھا۔ اور آخری بات یہ کہ سلام تیسری دنیا میں مقیم سائنسدانوں کی ضروریات وحوائج کو دلی طور پر محسوس کرتے تھے۔ اپنے احساسات کا عملی رنگ میں اعتبار کرنے کیلئے انہوں نے نوبیل انعام سے ملنے والی ساری کی ساری رقم ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کیلئے دے دی۔ باوجود اس کے کہ ان کی میٹنگز اور ملاقاتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں، وہ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ سینٹر میں آنے والے ہر اس شخص سے جو ملنے کا طالب ہوتا تھا اس سے ملاقات کریں، بلکہ وہ اس کوشش میں رہتے کہ تمام ایسے افراد کی ضروریات کو حتی الوسع کوشش سے پوری کرسکیں۔ ایسی شاندار خصوصیات کا ایک شخص میں مجتمع ہوجانا ہی وہ وجوہات ہیں کہ سلام نے بہت بڑھ کر کامیابیاں حاصل کیں۔

عبدالسلام نے آئی سی ٹی پی جیسے پوری دنیا میں پچھلے 20 سنٹرز قائم کرنے کا سپنا دیکھا تھا جن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں پر ریسرچ کی جاسکے۔ انہوں نے دولت سے مالا ترقی یافتہ اور کئی ایک ترقی پذیر ممالک (خاص طور پر عرب ممالک سے) اس ضمن میں دردمندانہ اپیل کی، نیز اپنے اپنے ممالک میں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی میں زیادہ مالی امداد فراہم کرنے کیلئے کہا۔ انہوں نے 20 سینٹرز کے قیام کیلئے ورلڈ بنک سے بھی رابطہ قائم کیا اور 1990ء میں جزوی یقین دہانی

بھی کی گئی تھی۔ اس دوران سلام ایک عالمی یونیورسٹی کے قیام کا بھی سپنا دیکھ رہے تھے جس کو بین الاقوام سے مالی امداد وصول ہونا تھی۔ اس قسم کی یونیورسٹی نے چلنے کیلئے دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے ایک کنسورشیم سے جڑے ہوئے ہونا تھا۔

ایسے منصوبوں کیلئے سلام کی کوششوں میں ان کی زندگی کے آخری آٹھ سالوں میں ایک اعصابی بیماری کے لاحق ہوجانے سے جو پارکن سن کی بیماری کی طرح تھی، بدقسمتی سے سخت رکاوٹ پڑ گئی۔ تاہم کئی دیگر افراد کی کوششوں سے آپ ایک انٹرنیشنل سینٹر فار جینیٹک انجینئرنگ اینڈ بائیوٹیکنالوجی جس کی شاخیں ٹریسٹ اور دہلی میں تھیں، اور ٹریسٹ میں انٹرنیشنل سینٹر فار سائنس اینڈ ہائی ٹیکنالوجی قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے علاوہ آپ کسی ممکنہ حد تک ایڈنبرا، سکاٹ لینڈ میں انٹرنیشنل سینٹر فار میتھے میٹکس، بوگاٹا کولمبیا میں انٹرنیشنل سینٹر فار فزکس، انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار تھیورٹیکل اینڈ اپلائیڈ فزکس، آئی یوا IOWA سٹیٹ یونیورسٹی امریکہ، اور ایشیا پیسفک سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس، سول کوریا ان اداروں کے قیام میں مصروف عمل رہے تھے۔ اگر عبد السلام نے اچھی صحت میں زندگی کے کچھ سال اور گزارے ہوتے، تو بہت سارے اور ادارے قائم ہوجانے تھے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کو مخاطب ہوتے ہوئے اسلام اکثر یہ محاورہ استعمال کرتے تھے: سائنس سستی نہیں مگر اس پر ہونے والا خرچ دس گنا واپس آئے گا۔

عبد السلام کو بیسویں صدی کے ایک عظیم سائنسدان اور ایک انسانیت نواز شخص کے طور پر یاد رکھا جائیگا جس نے تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقام کو بلند کرنے کیلئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ بیس بین الاقوامی مراکز کے قیام نیز ورلڈ یونیورسٹی کے قائم کرنے کا سپنا دیکھنا شاید اپنے دور سے بہت آگے تھے سائنسدانوں کے آج کے دور کی نسل اور عالمی لیڈروں کا اب یہ کام ہے کہ وہ اس سپنے کو پورا کر دیں۔ (روزنامہ الفضل 3 مئی 2010ء)

پروفیسر عبدالسلام صاحب آئیوری کوسٹ میں

(مکرم نصیر احمد صاحب شاہد، سابق مشنری انچارج آئیوری کوسٹ)

آئیوری کوسٹ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات سے پہلے مجھے صرف دو مرتبہ انہیں ملنے کا موقعہ ملا۔ پہلا موقعہ تو وہ یادگار لمحہ تھا جب آپ نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد پاکستان تشریف لائے تھے۔ ربوہ شہر نے والہانہ استقبال کیا اور قوم و ملک کے ہیرو کو گھروں سے باہر نکل کر سڑکوں پر دو رویہ کھڑے ہو کر اھلا و سہلا و مرحبا کہا تھا۔ اس موقعہ پر جمعۃ المبارک کے بعد مصافحہ اور معانقہ کا موقع ملا۔ دوسری مرتبہ آپ سے ملاقات تحریک جدید کے گیسٹ ہاؤس میں ہوئی۔ آپ لندن سے ربوہ تشریف لائے۔ غالباً تبشیر کی طرف سے محترم ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں چائے کا پروگرام تھا۔ اس موقعہ پر سب سے پہلے آپ نے اپنے خطاب میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی طرف سے ''السلام علیکم'' کا محبت بھرا پیغام پہنچایا۔ پھر چند فقرے اردو میں بول کر کہنے لگے کیوں نہ پنجابی میں بات کروں۔ اور پھر ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کیں اور دنیا کی طرف سے نوبل انعام ملنے پر جو محبت اور قدر کے پھول نچھاور ہوئے ان کا ذکر کیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں خاص کر کویت اور علی گڑھ میں لوگوں کے جوش و خروش اور ان کی محبت کا ذکر کیا۔ اور فرمایا کہ ''علی گڑھ میں تو یوں لگتا تھا کہ گویا وہ میری کار کندھوں پر اٹھالیں گے۔''

تیسری مرتبہ سب سے لمبی ملاقات ہوئی اور وہ غالباً 1987ء میں مغربی افریقہ کے فرانسیسی بولنے والے ایک ملک آئیوری کوسٹ میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خاکسار آئیوری کوسٹ میں خدمت دین کی توفیق پا رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ برادرم انعام الرحمان کے ساتھ آئیوری کوسٹ کی نیشنل یونیورسٹی میں فرنچ زبان بھی سیکھ رہا تھا۔

ایک دن جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہم نے کوٹ پتلون میں ملبوس، ایک پروقار شخص کو یونیورسٹی کے شعبہ حساب کے سربراہ کے ساتھ اس کے دفتر میں جاتے دیکھا۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ہم رک گئے۔ چونکہ ہماری طرف آپ کی پشت تھی۔کبھی کبھی آپ کی عینک اور کچھ کچھ داڑھی نظر آ جاتی تھی۔ یوں ہمارا شک کچھ کچھ یقین میں بدلنے لگا کہ ہونہ ہو یہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ہیں۔ہم نے بھی تیز تیز قدم بھرنے شروع کر دیئے اور جا داخل ہوئے صدر شعبہ حساب کے دفتر میں جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔مختصر تعارف کروایا احمدیت کا رشتہ بھی عجیب ہے۔کتنا دل کو گرما دینے والا اور کتنا آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا بلکہ دوسروں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والا وہاں موجود لوگ اب ہم تینوں کو پتھرائی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ہم اردو اور پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔اپنائیت کے لہجہ میں باتیں کرتے ہمیں دیکھ کر میزبان نے سمجھا کہ ہم نے ان کے محترم مہمان کو مل لیا ہے۔

یہ معلوم کر کے کہ ڈاکٹر صاحب محترم کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں ہم خوش وخرم وہاں سے مشن ہاؤس آ گئے۔لیکن کیا یہ ممکن تھا ہمارے لئے کہ آپ کو مشن ہاؤس میں مدعو نہ کریں۔اس لئے ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کے مطابق ایک شام کا پروگرام بنا لیا گیا۔مشن ہاؤس واپس آ کر ہم نے احباب جماعت اور دوستوں کو یہ خوشخبری سنائی۔ ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ احمدیت کے جس سپوت ذکر سالہا سال سے سنتے تھے وہ اپنی آنکھوں میں اسے دیکھ سکیں گے اور اس سے ہاتھ ملا سکیں گے۔اس کی باتیں سن سکیں گے۔اپنے علاقہ کے میئر کو جب فون پر اطلاع دی گئی اور آنے کی دعوت دی تو اس نے بڑے شکریہ سے اسے قبول کیا کہ ہم نے اس اہم بین الاقوامی شخصیت کی مشن میں آمد کے موقع پر اسے یاد رکھا ہے۔ اس میئر کے بارہ میں یہ بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ موصوف کا نام ''لا سینے ڈانملے'' ہے احمد یہ مشن کے شروع سے ہی دوست رہے ہیں۔اور ابھی تک دوست ہیں اب تو بفضل اللہ ممبر آف پارلیمنٹ ہیں۔امسال جلسہ سالانہ یوکے پر بھی تشریف لائے تھے۔ڈاکٹر صاحب مغرب سے قبل مشن ہاؤس تشریف لے آئے اور میئر صاحب موصوف بھی خوشی

خوشی حاضر ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب نے ان کی بہت عزت افزائی کی ان سے باتیں کرتے رہے۔ برادرم انعام الرحمان نے ترجمانی کا کام کیا۔ پھر نماز مغرب ادا کی گئی اس کے بعد موجود احباب کی خواہش کے عین مطابق خطاب فرمایا۔ اس میں اسلام اور سائنس اور مسلمانوں میں سائنس سے عدم دلچسپی کا ذکر کیا۔آپ کے الفاظ سے مسلمانوں میں سائنسی علوم کی ترویج کا عظیم جذبہ مترشح ہوتا تھا۔آپ نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ قرآن کریم کی آیات کا 8/1 کائنات کے مطالعہ اور سائنسی علوم کے حصول کیلئے ترغیب پر مشتمل ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے خطیب حضرات کو اور علماء کو آٹھ خطبات جمعہ میں سے ایک خطبہ سائنس کے کسی پہلو پر دینا چاہئے۔ محترم امیر صاحب ساتھ ساتھ فرانسیسی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔آپ کی تقریر کے بعد میئر موصوف نے بھی کچھ کہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ چونکہ انگریزی زبان کی کچھ شد بد رکھتے تھے اس لئے انگریزی میں ہی شکریہ کے الفاظ ادا کئے اور اپنی اس خوش قسمتی کا ذکر کیا۔ کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نوبل انعام یافتہ سے ملاقات ہوئی۔ اس مختصر سے پروگرام کے بعد احمدیہ کلینک میں نصرت جہاں سکیم کے تحت کام کرنے والے ہمارے میڈیکل آفیسر جناب ڈاکٹر بدھن صاحب نے پر تکلف چائے کا انتظام کیا ہوا تھا لہٰذا تمام مدعوئین وہاں چائے نوش فرمانے کے لئے تشریف لے گئے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے پروگرام میں صدر مملکت Houphouet Baigne اور وزیر تعلیم و وزیر برائے .... سے ملاقات بھی کرنا تھا۔ اس لئے آپ نے محترم امیر صاحب سے فرانسیسی ترجمہ القرآن کی چند کاپیاں لے لیں۔آپ نے اپنی ملاقات کے دوران صدر مملکت کی خدمت میں اس عظیم کتاب کو پیش کیا۔ آئیوری کوسٹ کے صدر کے بارے میں آپ نے بیان فرمایا کہ گو وہ بہت عمر رسیدہ ہے لیکن مستعد اور باخبر ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک جہاں کے عمر رسیدہ صدور اور سر براہان سے مجھے ملنے کا موقعہ ملا ہے ان سب سے آئیوری کوسٹ کے صدر زیادہ چاک و چوبند ہیں۔ یہ وہی صدر ہیں جن کا 1988ء میں حضور ایدہ اللہ نے اپنے آئیوری کوسٹ کے دورہ کے

دوران ان سے ملاقات کے بعد بہت اچھے پیرائے میں ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ملاقات کے دوران ان کے اپنی قوم کے بارہ میں اخلاص اور ہمدردی کی وجہ سے ان کیلئے میں دعا کرتا رہا کہ خدا تعالیٰ انہیں صحت والی دراز عمر عطا فرمائے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے بارہ میں ایک بڑے کانفرنس ہال میں ایک پروگرام بھی تھا۔ جہاں آپ نے لیکچر دینا تھا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سننے کیلئے یونیورسٹی کے سائنس کے طلباء کے علاوہ پروفیسر، وزیر تعلیم، وزیر سائنسی ریسرچ اور عام شہری بھی موجود تھے۔

آپ کے لیکچر کے بعد وزیر تعلیم اور سائنسی ریسرچ کے وزیر نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سائنٹیفک ریسرچ کے وزیر نے بیان کیا کہ ڈاکٹر صاحب اور صدر مملکت کی ملاقات میں میں موجود تھا۔ صدر مملکت کو چونکہ فرنچ افریقہ میں ''امن کے پیامبر'' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس لئے وزیر موصوف نے کہا کہ جب امن کا پیامبر اور عبدالسلام دونوں باتیں کر رہے تھے تو ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہوئی۔ کیوں نہ ایسا ہوتا کیا یہ ممکن ہے کہ ''عبدالسلام'' کہیں ہو اور امن، سلامتی، ترقی تعلیم اور خلق خدا کی بہبودی کی بات نہ ہو۔ وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ ملاقات کے دوران مجھے ایک کتاب بطور تحفہ ڈاکٹر صاحب نے پیش کی۔ میں نے کہا دیکھیں تو سہی کہ سائنس کی کون سی کتاب محترم مہمان نے مجھے دی ہے۔ جب پیکٹ کھولا تو وہ قرآن کریم تھا۔ یہ بات سننا تھا کہ ہال سے تحسین کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے خوشی کے اظہار کیلئے خوب تالیاں بجائی گئیں۔ اس کے بعد وزیر موصوف نے خود بڑی دلچسپی اور تفصیل کے ساتھ محترم ڈاکٹر صاحب کا تعارف کروایا۔ رات کی خبروں میں ٹی وی پر صدر مملکت سے ملاقات اور اس کانفرنس کو کوریج دی گئی۔ اگلے روز آپ بینن کیلئے روانہ ہو گئے۔ ایک دور دراز کے اجنبی ملک میں عبدالسلام کی کتنی قدر اور احترام میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ خدا نے آپ کے والد بزرگوار کو عبدالسلام کی بشارت دی تھی۔ جب اس نے بتا دیا تھا کہ تمہارا بیٹا بہت بلندی اور عروج پائے گا خدا کی بات پوری ہونی تھی سو ہو گئی قوموں نے استفادہ کیا۔ قوموں نے قدر کی۔ قوموں نے اس کا

اعتراف کیا۔ ہاں ایک چوتھی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ ملاقاتی پیار ومحبت کا جذبہ لئے لمبی قطاروں میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے میں بھی ان میں شامل لیکن اس وقت ''آپ کی اپنی جلاوطنی کی زندگی'' ختم ہو چکی تھی اور آپ اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہو چکے تھے اسی مالک حقیقی سے جس نے حضرت چوہدری محمد حسین کو عبدالسلام کی خوشخبری دی تھی۔ جہاں ہمیں امید ہے کہ ''سلاما سلاما'' کی صدائیں آ رہی ہوں گی۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام اور گورنمنٹ کالج لاہور

ڈاکٹر عبدالسلام۔ کالج کی طلباء یونین کے صدر اور مجلہ ''راوی'' کے ایڈیٹر انچیف بھی رہے۔

کالج کے پرنسپل جناب خالد آفتاب صاحب سے گفتگو۔

ڈاکٹر صاحب کے نام پر ''سلام میڈل'' کا اجراء۔

کالج کے اولڈ ہال کا نام ''سلام ہال'' رکھا گیا ہے۔

شعبہ فزکس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد زکریا بٹ صاحب کا خراج تحسین۔

ڈاکٹر صاحب ہمارا قومی اثاثہ تھے۔

ساری عمر ان کی پوجا کریں تب بھی ان کا دیا ہوا نہیں دے سکتے۔

شعبہ فزکس کے سابق چیئرمین پروفیسر محمد اکرام الحق صاحب سے انٹرویو۔

One of the most God Fearing Scientist.

اس صدی کی فزکس کا سب سے ذہین اور روشن دماغ سائنسدان

(تحریر وترتیب مکرم راشد جاوید صاحب ایم اے ابلاغیات)

تہذیب و تمدن اور علم و ادب کا گہوارہ لاہور جہاں پہ واقع گورنمنٹ کالج اپنے اعلیٰ تعلیمی معیار اور عظیم روایات کی بدولت امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے اور بلا شبہ اسے پاکستان کی بہترین دانش گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ لیکن جیسے ہر مکان کی عزت اس کے مکین سے بنتی ہے اسی طرح تعلیمی اداروں کی شہرت اور عظمت بھی اس ادارے کے فارغ التحصیل طلباء بناتے ہیں اگر وہ دنیا میں عظمت و شہرت کے بلند مقام حاصل کریں تو وہ اپنی مادر علمی کے ماتھے کا جھومر اور اس کیلئے باعث امتیاز و صد افتخار ہوتے ہیں اور گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ ہونے والے بہت سے ایسے طلباء ہیں جنہوں نے مختلف میدانوں میں بلند مقام حاصل کر کے اپنی مادر علمی کی شان و شوکت اور قدر و منزلت میں اضافہ کیا اور گورنمنٹ کالج کے افق پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مانند ہیں۔ لیکن اس ادارہ سے فارغ ہونے والا ایک طالب علم ایسا بھی تھا جو سائنس کی دنیا میں عظمت و شہرت کے بلند و بالا مینار تک جا پہنچا اور اس کے کارہائے نمایاں نے بیرون پاکستان بھی گورنمنٹ کالج کا نام روشن کیا اور بلا شبہ وہ گورنمنٹ کالج کے افق پر چمکنے والا چاند ہے اس چاند کا نام عبد السلام ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام جس نے نہ صرف سائنس کے میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے تہلکہ مچا دیا بلکہ آپ نے دنیا بھر کے پسماندہ ممالک میں سائنس کے فروغ اور دکھی انسانیت کی بھلائی کیلئے بھی نابغہ روزگار کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر عبد السلام 1942ء میں گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کیلئے داخل ہوئے اور یہیں سے آپ نے ایم۔ اے ریاضی کا امتحان پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے دوران ڈاکٹر عبد السلام کا پڑھائی میں شوق اور لگن کا یہ حال تھا کہ یکسوئی کے حصول اور خلل سے محفوظ رہنے کیلئے کالج کے مالی بابا سید سے معاہدہ کیا ہوا تھا جو مقررہ اوقات میں آپ کے کمرہ کو باہر سے مقفل کر جاتا اور بوقت ضرورت آ کر کھانا اور دودھ وغیرہ دے جاتا۔ گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے دوران ڈاکٹر عبد السلام نے غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیا جس کے بارے میں آپ خود تحریر کرتے ہیں کہ

''گورنمنٹ کالج کے قیام کے دوران مجھے کئی طرح سے خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ مثلاً مجھے 1945ء میں کالج یونین کا صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا میں نیو ہاسٹل کمیٹی کا صدر بھی تھا۔ ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میں ''راوی'' کے اردو اور انگریزی حصوں کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اس طرح کالج میں قیام کے دوران بہت بھرپور زندگی گزاری۔''

یہ تو ڈاکٹر عبدالسلام کا گورنمنٹ کالج میں تعلیمی کیریئر تھا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج کا یہی ذہین طالبعلم 1949ء میں شعبہ ریاضی کا ہیڈ اور پروفیسر بن کر لوٹا۔ آپ امنگوں، ولولوں اور جوش سے بھرا ہوا دل لیکر آئے تا اس دانش گاہ سے سول سرونٹس، شاعروں اور فلسفیوں کے ساتھ ساتھ ایسے سائنسدان بھی نکلیں جو آپ کے پیارے وطن پاکستان کو بھی سائنسی ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکیں۔ لیکن ایک طرف تحقیق وسائل کا فقدان اور اچھی لائبریریوں کی کمی دوسری طرف ہوس پرستی، تعلیم سے عدم دلچسپی اور نوکر شاہی کی بے حسی نے کچھ ہی عرصہ میں ڈاکٹر عبدالسلام جیسے شخص کو بھی مایوس کر دیا۔ ہماری نوکر شاہی کا یہ حال تھا کہ ایک طرف وہ عبدالسلام جسے نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان وولف پاؤلی (Pauli) جب بھابھا انسٹیٹوٹ آف انڈیا میں لیکچر دینے آتا ہے تو 25 سالہ پاکستان کے پروفیسر عبدالسلام کی سائنس میں عظیم کامیابیوں کی بناء پر آپ کو سپیشل ٹکٹ بھیج کر اس لیکچر میں شمولیت کی دعوت دی جاتی ہے تا کہ آپ اپنے نظریات کو پاؤلی سے ڈسکس کر سکیں۔ اور دوسری طرف پاکستان میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کا یہ حال ہے کہ آپ کو مجبور کرتا ہے کہ ہاسٹل کے وارڈن یا شعبہ اکاؤنٹس کے انچارج (یہ ذمہ داری اس لئے دی جاتی ہے کہ آپ چونکہ ریاضی کے اتنے عظیم پروفیسر ہیں اس لئے کھاتے روزنامچے بھی چیک کیا کریں) یا فٹ بال کے کلب کے صدر، ان میں سے ایک ذمہ داری بھی قبول کریں کیونکہ آپ کے پاس کافی وقت ہوتا ہے............

پھر اسی پر بس نہیں وہ عبدالسلام جس نے کبھی کیمبرج یونیورسٹی کے لئے درخواست نہیں دی بلکہ اپنے ملک میں خدمت کو ترجیح دی اس کو کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے دو دفعہ بڑے آنرز کے ساتھ لیکچر

شپ کی پیشکش کی جاتی ہے اور دوسری طرف یہاں کی بیوروکریسی کا یہ حال ہے کہ گورنمنٹ کالج کا پرنسپل ڈاکٹر عبدالسلام کی سالانہ رپورٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

Salam is not fit for Goveriment College Lahore. he may be excellent for reserch, but he is not a good college man

چنانچہ یہ حالات تھے جن سے ڈاکٹر عبدالسلام کو بہت دکھ ہوا اور پھر ملک میں مذہب کے نام پر سیاست اور ظلم سے بھی آپ بہت مایوس ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام بادل نخواستہ 1954ء میں کیمبرج یونیورسٹی کی دعوت پر بطور لیکچرار وہاں تشریف لے گئے اور خدا کی قدرت دیکھئے وہاں جاکر بھی آپ کو کس طرح اپنے پیارے وطن پاکستان کی خدمت کی توفیق ملی۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے مادر وطن پاکستان کی طرح اپنے مادر علمی گورنمنٹ کالج جھنگ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بہت پیار تھا۔ گو گورنمنٹ کالج لاہور سے ڈاکٹر صاحب کے چلے جانے کے بعد بھی آپ سے بعض اوقات تعصب کا مظاہرہ کیا گیا۔ مثلاً 1989ء میں گورنمنٹ کالج نے اپنی 125 سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ''راوی'' کا جو خصوصی نمبر شائع کیا اس میں تمام سابقہ ایڈیٹران کی فہرست بھی شائع کی گئی ڈاکٹر عبدالسلام کا نام ہی خارج کر دیا گیا۔

گورنمنٹ کالج کے ایک پروفیسر صاحب نے مجھے بتایا کہ جب میں نے یہ رسالہ اٹلی میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو ڈاکٹر صاحب نے پرمسرت چہرے سے رسالہ کو لیا اور چونکہ ٹائیٹل کے اندر والے صفحہ پر ایڈیٹر آن کی فہرست تھی تو خوشی خوشی اس فہرست کو دیکھا کہ ان کے مادر علمی کے رسالہ کے مدیران میں سے ان کا بھی نام ہے لیکن ''اسوقت انہیں یہ جان کو بہت دکھ ہوا کہ ان کا نام نہیں لکھا گیا۔'' اور موجودہ پرنسپل صاحب کے بقول یہ غلطی سے ہوا اور بعد میں دوبارہ لسٹ تصحیح کے ساتھ شائع کی گئی جب کہ اس وقت کی تحقیقات کے مطابق متعلقہ شعبہ نے محض احمدی ہونے کی وجہ سے تعصب کا مظاہرہ کیا تھا (گو کہ اب جب دوبارہ فہرست شائع کی تب بھی تعصب کی نمایاں جھلک قائم تھی جس کا ذکر اسی رسالہ میں الگ صفحہ پر پڑھا جاسکتا ہے۔ مدیر)

(حیرت ہے غلطی سے صرف احمدیوں کا نام ہی خارج ہوتا ہے۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج سے معذرت کے ساتھ) لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ گورنمنٹ کالج کے موجودہ پرنسپل جناب خالد آفتاب ڈاکٹر عبدالسلام سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں اور 1996ء میں گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر صاحب کی 70ویں سالگرہ بھی منائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی جناب پروفیسر خالد آفتاب صاحب کی سرپرستی میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خدمات کے اعتراف میں مزید کام بھی ہوئے جن کا تفصیلی ذکر ان کے انٹرویو میں شامل ہے۔ مزید برآں پاکستان گولڈن جوبلی کے موقع پر جو ''راوی'' کا خصوصی شمارہ شائع ہوا اس کا انتساب بھی اس وقت گورنمنٹ کالج کی ڈاکٹر عبدالسلام سے عقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور وہ انتساب یہ ہے:۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے عظیم فرزند نوبل انعام یافتہ سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام اور ان تمام شخصیات کے نام کہ جن کی کاوشوں کی بدولت گورنمنٹ کالج ایک روشن روایت بنا۔

راوی کے اس رسالہ میں ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے 23 صفحات پر مشتمل ''گوشہ عبدالسلام'' بھی ترتیب دیا گیا ہے۔

ضروری نوٹ: بیرون ملک شائع ہونے والے اخبارات اور کتب اور اسی طرح ڈاکٹر صاحب کو دی جانے والی اعزازی ڈگریوں میں جو کہ مسلم ممالک کی طرف سے پیش کی گئی ہوں یا دیگر ممالک۔ ان سب میں ڈاکٹر صاحب کو ایک سچا اور مخلص مسلمان وغیرہ لکھا گیا ہے۔ لیکن ملکی قانون کے مطابق کوئی بھی احمدی اپنے مذہب یا عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے آپ کو ''مسلمان'' نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا مجبوراً ہمیں اس کا قانون کے تحت رسالہ میں ایسے مضامین شائع کرتے ہوئے مسلمان کا لفظ وہاں سے حذف کرنا پڑا۔ اس تکلیف اور ترمیم پر ہم ہر ایک سے معذرت خواہ ہیں۔

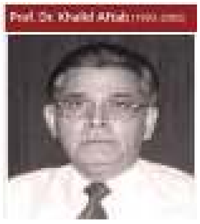

محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جناب خالد آفتاب صاحب سے گفتگو

سوال: ڈاکٹر عبدالسلام صاحب گورنمنٹ کالج کے طالب علم اور استاد بھی رہے اور انہوں نے سائنس کے میدان میں جو عظیم کارنامے سرانجام دیئے بحیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ جناب خالد آفتاب صاحب: اصل میں تو ڈاکٹر صاحب کے دور میں میں یہاں تھا نہیں۔ وہ لوگ جو اس دور میں یہاں پڑھتے ہیں یا جو یہاں تھے سبھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو ان کے ساتھی رہے اور وہ بھی شامل ہیں جو ان کے شاگرد رہے۔ ہم نے پچھلے سال ڈاکٹر صاحب کی سالگرہ منائی تھی اور اس دور کے لوگوں کو بلایا تھا۔ جو ان کے تاثرات سے اس سے یہی پتہ چلا کہ واقعی بڑا سیانا، ذہین نوجوان استاد تھا جو گورنمنٹ کالج میں تھا۔ بعد میں انہوں نے جو بھی کامیابیاں حاصل کیں اس پر گورنمنٹ کالج کو بہت فخر اور ناز ہے۔

سوال:۔ گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے اعتراف میں کوئی اقدامات کئے ہیں؟

جناب خالد آفتاب صاحب: گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر دو میڈل جاری کئے ہیں جن کا نام سلام میڈل رکھا گیا ہے۔ جو ہر سال فزکس اور ریاضی کے شعبہ میں اوّل آنے والے طالب علم کو دیا جائے گا۔ دوسرے ہم اپنے اولڈ ہال کا نام بھی ڈاکٹر سلام ہال رکھ رہے ہیں۔ اس کی تختی بن چکی ہے۔ صرف لگانے کی تقریب ہونی ہے۔ اس ہال کے اندر ڈاکٹر صاحب کی بڑی سی تصویر لگائی جائے گی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالسلام کے نام پر گورنمنٹ کالج میں ایک چیئر قائم کرنے کا بھی اصولی فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کالج نے گرانٹ کی منظوری بھی دے دی ہے۔

سوال: ہمیں پتہ چلتا ہے کہ چیئر کے لئے فنڈز کی منظوری گذشتہ حکومت نے دی تھی اور وہ رقم بھی بہت تھوڑی تھی اور اب گرانٹ ملنے میں کچھ مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔

جناب خالد آفتاب صاحب: نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ سب کام ہو چکا ہے صرف یونیورسٹی گرانٹ کمیشن سے گرانٹ لینی ہے۔

سوال: پاکستان میں سائنس کے فروغ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جو کردار ادا کیا اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جناب خالد آفتاب صاحب: پاکستان میں سائنس کی ترقی میں انہوں نے کافی کردار ادا کیا ہے جیسے وہ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر بھی رہے۔ اس طرح انہوں نے اور بھی بہت سے کام کئے۔ (تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں)

سوال: پاکستان میں سائنس کے فروغ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جو خدمات کیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی طرف سے ان کا حق ادا کیا گیا۔ جناب خالد آفتاب صاحب: نہیں، بالکل نہیں۔

سوال: گورنمنٹ کالج کی 125 سالہ تقریبات کے سلسلہ میں جو راوی کا خصوصی نمبر شائع ہوا اس میں ایڈیٹرز کی فہرست سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا نام خارج ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جناب خالد آفتاب صاحب: غلطی سے ایسا ہو گیا تھا۔ بعد میں تصحیح کے ساتھ دوبارہ فہرست شائع کر دی گئی تھی۔

سوال: محترم پرنسپل صاحب اس طرح ایک اور ناگوار سی لیکن قابل افسوس بات کے متعلق پوچھنا چاہوں گا۔ گذشتہ دنوں جب وزیر اعظم نواز شریف صاحب گورنمنٹ کالج آئے تو انہوں نے کالج میں پڑھنے والی نمایاں شخصیات کے نام لئے ان میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا نام نہیں تھا۔ تو اس کی کیا وجہ تھی؟ ڈاکٹر عبدالسلام کوئی ایسا نام نہیں تھا کہ از خود نظر انداز ہو سکتا۔

جناب خالد آفتاب صاحب: میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔ اس بارے میں تو آپ نواز شریف صاحب سے پوچھیں۔ آخر پر جناب خالد آفتاب صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ایک ذہین، بہت سیانے، لائق،

نہایت محنتی اور بہت اعلیٰ پائے کے سائنسدان تھے۔اس پر گورنمنٹ کالج کو بھی فخر ہے، بلکہ پوری پاکستانی قوم کو فخر ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ فزکس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد زکریا بٹ سے گفتگو

پروفیسر ڈاکٹر محمد زکریا بٹ گورنمنٹ کالج آف لاہور، شعبہ فزکس

for Advanced Studies in Physicsi Center

کے چیئرمین ہیں۔آپ کو فزکس کے شعبہ میں نمایاں تحقیقی کام کرنے پر 14 اگست 1997ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے ''تمغہ امتیاز'' سے بھی نوازا گیا۔اس کے علاوہ بھی آپ نے بہت سے ایوارڈز حاصل کئے۔آپ پاکستان انسٹیٹیوٹ آف فزکس کے نائب صدر بھی ہیں۔ 1984ء میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (ICTP) ٹریسٹ آف اٹلی کی طرف آپ کو ایسوسی آف ایوارڈ ملا۔جس کے تحت آپ چھ سالوں کے دوران تین دفعہ تین سے چھ ہفتوں کے لئے ٹریسٹ جاسکتے تھے۔ ICTP (ٹریسٹ) میں اس عرصہ قیام کے دوران آپ کو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور آپ ان سے بہت متاثر ہوئے۔

قارئین خالد کے لئے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو جو اپنے پیارے وطن پاکستان سے محبت تھی اس بارے میں زکریا بٹ صاحب بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے جو میری ملاقاتیں ہوئیں ان میں میں نے دیکھا کہ پاکستانیت ڈاکٹر صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہاں پاکستان میں رہنے والوں کو شاید اتنا لگاؤ نہ ہو جتنا ڈاکٹر صاحب کے دل میں پاکستان کا درد تھا۔ٹریسٹ میں کسی پاکستانی کو کوئی مسئلہ ہو خواہ مالی نوعیت کا ہو یا انتظامی نوعیت کا اگر ڈاکٹر صاحب کے علم میں آجائے تو فوراً اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔اپنے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے زکریا بٹ صاحب نے بتایا کہ مجھے ٹیسٹ سے ایک ہفتہ کے لئے لندن جانا پڑ گیا۔

میری خواہش تھی کہ مجھے جو ڈیلی الاؤنس ٹریسٹ کے قیام کے دوران مل رہا ہے وہی لندن میں قیام کے دوران بھی ملتا رہے۔ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے فوراً اس کی منظوری دے دی۔ بعد میں فنانس سیکشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اس پر اعتراض کیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جو میں نے فیصلہ کر دیا وہی فائنل ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی یہ عادت تھی کہ کوئی بھی پاکستان سے جا کر ملتا اس سے پاکستان کے حالات کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ اگر کوئی تشویشناک خبر ملتی تو آپ کو بہت دکھ ہوتا۔ڈاکٹر صاحب سائنسی علوم کے تو سمندر تھے۔آپ ہمیشہ پاکستانیوں کو مشورہ دیتے رہتے کہ وہ فزکس کے جدید علوم کی طرف توجہ کریں تاکہ ترقی یافتہ مما لک کا مقابلہ کر سکیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی شدید خواہش تھی کہ کاش میرا ملک پاکستان بھی ترقی یافتہ مما لک کی برابری کر سکے۔

زکریا بٹ صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالسلام عام انسانوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ کسی کا کسی بھی نوعیت کا مسئلہ ہوا گر ڈاکٹر صاحب کے علم میں آ جاتا تو ڈاکٹر صاحب ممکن حد تک اس کی ہر طرح سے مدد کرتے۔آپ ایک انسان دوست اور وطن پرست شخصیت تھے۔اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا ہمارے میڈیا اور قوم نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا ہے یا نہیں زکریا بٹ صاحب نے فرمایا کہ ہمارے میڈیا نے ڈاکٹر صاحب کو جس طرح حق تھا اس طرح کی کوریج نہیں دی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ جس میں تو تعلیم عام نہیں۔ یہاں اہمیت ان لوگوں کی ہے جو لوگوں کو جیل بھجوا سکے یا جیل سے چھڑا سکے۔ پٹواری کی عزت ہے جو زمین کو ادھر ادھر کر سکے۔ فنکاروں اور کرکٹروں کی عزت ہے کیونکہ ان میں گلیمر ہے اور ہمارا میڈیا صرف گلیمر کے پیچھے دوڑتا ہے۔کوئی فنکار فوت ہو جائے تو کئی کئی دن اس کو کوریج دی جاتی ہے۔ ہمارا یہ رویہ جہالت کی وجہ سے ہے۔ یہاں سائنسدان اور عالم کی کوئی عزت نہیں۔ اس کے برعکس اگر ترقی یافتہ قوموں کی طرف دیکھیں تو ان رویہ میں توازن ہوتا ہے۔وہ اپنے سائنسدانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی بہت عزت کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کو اوپر لے جانے والے ہیں۔ان کا یہ بہت احترام کرتے ہیں۔ زکریا صاحب نے کہا اس کا عملی واقعہ جو میں

نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ بتاتا ہوں ۔ٹریسٹ (اٹلی) میں سائنس کے بارے میں ایک تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اس میں ایک لمبی سی میز تھی جس کے درمیان ڈاکٹر عبد السلام صاحب تشریف فرما تھے اور دونوں طرف پانچ پانچ کرسیاں تھیں۔ایک طرف پانچوں سائنسدان تھے جب کہ دوسری طرف چار سائنسدان بیٹھے تھے اور ایک کرسی ٹریسٹ صوبے کے گورنر کے لئے تھی۔ گورنر کسی وجہ سے لیٹ ہو گئے لیکن تقریب اپنے وقت پر شروع ہو گئی۔ کسی نے گورنر کا انتظار نہیں کیا۔ جب گورنر صاحب تشریف لائے تو تقریب جاری تھی۔ وہ آہستہ سے چلتے ہوئے آئے کہ مبادا تقریب میں خلل پڑے اور پہلے ڈاکٹر سلام صاحب کو جھک کر سلام کیا اور پھر خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور جب تقریب ختم ہوئی تو گورنر صاحب خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے اور کوئی بھی انہیں دروازے تک چھوڑنے نہیں گیا کیونکہ وہاں تو گورنر بھی جانتا ہے کہ وہ تو محض ایڈ منسٹریٹر ہے اور یہ لوگ تو علوم کے ماہرین ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو معاشرے کی ترقی کا باعث بنتے ہیں ۔ یہ ہے ترقی یافتہ قوموں کا رویہ لیکن ہمارے ہاں جب تک تعلیم عام نہیں ہو گی لوگوں میں شعور بیدار نہیں ہو گا اور لوگوں کا ایسا ہی رویہ رہے گا۔

اس کے بعد ڈاکٹر زکریا بٹ صاحب نے فرمایا کہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہاں بعض اوقات بعض تعصبات کی بناء پر ڈاکٹر صاحب سے زیادتیاں کی گئیں جس کی مثال دیتے ہوئے زکریا بٹ صاحب نے بتایا کہ 1989ء میں گورنمنٹ کالج لاہور نے 125 سالہ تقریبات کی خوشی میں ''راوی'' کا خصوصی نمبر نکالا اور 1990ء میں مجھے ٹریسٹ جانے کا موقع ملا اور میں وہ خصوصی شمارہ ڈاکٹر صاحب کے لئے لے گیا۔ میرا خیال کہ ڈاکٹر صاحب رسالہ دیکھ کر خوش ہوں گے اور میں نے جاتے ہی ''راوی'' کا خصوصی شمارہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔انہوں نے فورا پہلا صفحہ نکال کر دیکھنا شروع کیا تو وہاں جب سے راوی نکلنا شروع ہوا اس وقت سے اب تک کے ایڈیٹرز کے نام درج تھے کہ فلاں فلاں عرصہ میں فلاں صاحب ایڈیٹر رہے۔ڈاکٹر صاحب نے صفحہ پر انگلی پھیرتے ہوئے تیزی سے وہ فہرست دیکھنی شروع کی اور ایک جگہ آکر رک گئے اور کہنے لگے میرا نام

کہاں ہے۔ اس عرصہ کے دوران تو میں ایڈیٹر تھا لیکن میرا نام غائب ہے۔ زکریا بٹ صاحب بتاتے ہیں یہ صورتحال دیکھ کر بجائے اس کے کہ تحفہ دے کر مجھے خوشی ہوتی مجھے انتہائی شرمندگی ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ دیکھو یہ بندہ ہم پاکستانیوں کے لئے کیا کر رہا ہے اور ہم نے اس کا کیا حال کیا ہے کہ محض اس کے احمدی ہونے کی وجہ سے اس کا نام ایڈیٹرز کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے اور یہ Intellectual Dishonesty تھی۔ میں نے واپس جا کر پرنسپل گورنمنٹ کالج سے بات کی اور تحقیق کے بعد میں پتہ چلا کہ مذہبی تعصب کی بناء پر لسٹ بنانے والے نے ان کا نام ڈراپ کر دیا تھا۔ بعد میں وہ لسٹ دوبارہ شائع کی گئی لیکن کیا فائدہ ہوا۔ ہم نے ایک دفعہ تو اس بندہ کو ذہنی صدمہ پہنچا دیا۔ تو بعض اوقات ہمارے مذہبی تعصب کی یہ انتہا بھی ہے۔

آخر پر ڈاکٹر زکریا بٹ صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب تو ہمارا قومی اثاثہ تھے۔ یہ تو قوم کی بدقسمتی ہے کہ ان کی وہ قدر نہیں کی گئی جو کرنی چاہئے تھی ورنہ تو ساری عمر ان کی پوجا کریں تو تب بھی یہ ان کا دیا ہوا نہیں دے سکتے۔

گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ فزکس کے سابق چیئرمین پروفیسر محمد اکرام الحق سے انٹرویو

آپ نے بی اے آنرز کا امتحان 1947ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اوّل پوزیشن میں پاس کیا اور یہیں سے 1950ء میں فزکس میں ایم ایس سی کی ڈگری نمایاں پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ آپ کو 60-1959ء میں امپیریل کالج لندن میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ 1972ء میں شعبہ فزکس کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے آپ کی تقرری گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی۔ آپ کو وزارت خارجہ کے تحت بیرون ممالک میں پاکستانیوں

سفارتخانوں میں بھی خدمات کی توفیق ملیں۔آپ نے اقوام متحدہ میں ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی کمیشن میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔

آپ نے انٹرمیڈیٹ اور ڈگری سطح کے لئے فزکس کی بہت سی کتب بھی تحریر کیں۔آپ اس وقت پاکستان فورم لاہور کے سیکرٹری جنرل بھی ہیں۔

آپ نے رسالہ خالد کے ڈاکٹر عبدالسلام نمبر کے لئے جو انٹرویو دیا وہ پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر اکرام الحق کو امپیریل کالج میں ڈاکٹر سلام صاحب سے پڑھنے کا موقع ملا۔ بحیثیت ٹیچر ڈاکٹر سلام صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ تیاری کر کے آتے تھے اور مضمون سے متعلقہ جتنے حوالوں کی ضرورت ہوتی وہ سب کے سب ڈاکٹر صاحب کے پاس ہوتے تھے اور ہمیں بھی ڈاکٹر صاحب کا لیکچر سمجھنے کے لئے پہلے بہت سے کورسز سے گزرنا پڑتا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے جس موضوع پر لیکچر دینا ہوتا اس بارے میں وہ بہت تیاری کرتے تھے اور یہ ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خوبی تھی اور بہت بڑے بڑے نام ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ہمارے دور میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی تھے۔منیر ڈاکٹر فیاض اور ڈاکٹر ریاض تھے۔ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر نی مان (Miman) تھا۔وہ ڈاکٹر صاحب کا لیکچر خصوصی طور پر سنے کے لئے آیا کرتا تھا حالانکہ وہ امپریل کالج سے پی۔ایچ۔ڈی کر چکا تھا اور برطانیہ میں اپنے ملک کے سفارت خانے میں بہت بڑے عہدے پر تھا۔اس کی ریسرچ اتنی زیادہ تھی کہ اس کا نام کئی دفعہ نوبل انعام کے لئے Mention ہوا۔ہم اس سے پوچھتے تھے کہ تمہیں کیا ضرورت ہے لیکچر سننے کی تم تو زندگی کی Peak پر پہنچ چکے ہو۔ وہ کہا کرتا کہ اسرائیل میں اس کی کوئی قدر نہیں کہ تم ڈی سی یا وزیر بن گئے ہو یا تمہیں بہت بڑا عہدہ مل گیا ہے وہاں تو سب سے بڑا مقصد یہی ہوتا ہے کہ تعلیمی میدان میں آپ سب سے اونچے مقام تک پہنچ جائیں۔بعد میں وہ اپنے ملک میں سائنس کا وزیر بھی بنا۔گو اسے ابھی تک نوبل انعام تو نہیں ملا

لیکن اس کا نام بڑے بڑے سائنسدانوں میں لیا جاتا ہے۔ تو اس قسم کے عظیم سائنسدان بھی ڈاکٹر سلام صاحب کے شاگرد تھے۔ ایمپیریل کالج میں تو بعض اوقات شعبے کا سارا سٹاف ڈاکٹر سلام صاحب کا لیکچر سننے کے لئے آیا ہوتا تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے لیکچر میں بہت سی نئی چیزیں پتہ چلتی ہیں۔

اس کے بعد سلام صاحب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر اکرام الحق نے کہا کہ ڈاکٹر سلام One of the most God fearing scientist تھا۔ یورپ میں ایک کتاب بھی شائع ہوئی میں اس کا نام بھول رہا ہوں اس میں ایک باب ڈاکٹر سلام کے بارے میں تھا جس میں لکھا تھا کہ وہ اس صدی کی فزکس کا سب سے ذہین اور روشن دماغ سائنسدان، خوف خدا رکھنے والا اور مذہبی شخص تھا۔ ڈاکٹر اکرام الحق صاحب نے بتایا کہ قرآن کریم سے تو ڈاکٹر سلام صاحب کو حد سے زیادہ عشق تھا۔ سب سے بڑی مثال اس کی یہ ہے کہ جب نوبل انعام وصول کرنے جانا تھا تو وہاں نوبل انعام لینے والے کو اڑھائی منٹ دیئے جاتے ہیں کہ آپ اتنے وقت میں بتاؤ کہ کیا کیا ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جو نوبل پرائز لینے والے تھے گلیشو اور وائنز برگ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کہا کہ آپ (معتبر اور) فلاسفر آدمی ہیں آپ ہی ہماری نمائندگی کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب گئے اور آپ نے سورۃ الملک کی چار آیات پڑھیں اور کہا کہ خدا نے اس کائنات میں اس قدر سمٹری رکھی ہے کہ ہم کوئی نقص نہیں نکال سکتے اور اسی کائنات کے سربستہ رازوں کے بارے میں ہم کام کر رہے ہیں۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ ایسے پلیٹ فارم پر قرآن کریم کو Quote کرنا بڑی جرات اور اعتماد کی بات ہے اور بعد میں دونوں سائنسدانوں نے ڈاکٹر سلام صاحب کو کہا کہ آپ نے ہماری ترجمانی بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔ سائنس کے میدان میں ڈاکٹر سلام کی Contributions کا ذکر کرتے ہوئے اکرام الحق صاحب فرماتے ہیں کہ 19 ویں صدی سے 14 ویں صدی عیسوی تک جیسے آج نیوٹن اور آئن سٹائن کا نام لیا جاتا ہے اس طرح کے مسلمان سائنسدان جو

ٹاپ کے ہوتے تھے اور اس کے بعد بیسویں صدی تک ہمیں کوئی بڑا سائنسدان نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر سلام نے اس سلسلہ کو دوبارہ گویا کہ جاری کیا اور اس تاریخ کو دوبارہ جوڑا ہے۔

ڈاکٹر سلام کی یہ بھی خوبی تھی جب وہ فزکس کی کلاس میں لیکچر دیتے تو ان کا لیکچر بہت علمی ہوتا لیکن وہی سلام جب عوامی سطح پر سائنس کی بات کرتے تو ان سے زیادہ عام فہم انداز میں کوئی بات نہیں کرسکتا تھا۔ ان کی زبان میں روانی تھی اور ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ تھا اور He was a great lover of purjabi یعنی وہ پنجابی زبان کے بھی عاشق تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ امرتسر یونیورسٹی نے انہیں اعزازی ڈگری دینے کے لئے بلایا تو ڈاکٹر سلام نے وہاں ساری کی ساری تقریر پنجابی میں کی۔ تقریر کے بعد ایک سکھ سائنسدان نے پنجابی میں سوال کیا کہ ''تسیں دواں قوتاں نوں ملا کے چاراں تو تن کردتا اے۔ ھن تے تاڑے کول جدید سامان وی اے۔ کمپیوٹر وی ہیں تے ھن Unity ثابت ھون چے کن سال لگن گیں گے'' (یعنی آپ نے دو قوتوں کو ملا کر تین قوتیں ثابت کردی ہیں۔ اب تو آپ کے پاس جدید ذرائع ہیں۔ کمپیوٹرز ہیں۔ اب ایک قوت ثابت ہونے میں کتنی دیر لگے گی) فوراً اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے پنجابی میں ہی دیا اور کہا کہ ''سردار جی سائنسداناں کول کوئی جھرلو نئیں این جس نال اوا ے کرسکن۔ دوسو سال وی لگ سکدے نیں تے تین سو سال وی''۔ (یعنی سائنسدانوں کے پاس کوئی جھرلو نہیں ہے جس سے وہ فوراً ثابت کرسکیں۔ اس پر دیر بھی لگ سکتی ہے)۔ ڈاکٹر صاحب کے اس جواب کو ہندوستان کے ایک پنجابی اخبار نے اسی طرح شائع کیا۔

ڈاکٹر اکرام صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے نظریات کی بنیاد مذہب پر تھی۔ مثلاً اس وقت تک سائنسدانوں کا خیال ہے کہ پروٹان غیر فانی ذرہ ہے جب کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب فرماتے تھے کہ جب خدا نے کہہ دیا ہے کہ **كل من عليها فان و يبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام** تو پروٹان کیسے لافانی ہوسکتا ہے۔ آپ کی بیٹی نے بھی جب ایم ایس سی کا

امتحان دیا تو لکھ دیا کہ ہوسکتا ہے کسی وقت ثابت ہو جائے کہ پروٹان بھی تقسیم ہوسکتا ہے۔اس پر کالج کے پروفیسروں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔اس طرح تو کائنات کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی اور اب ڈاکٹر صاحب اس پر بھی کام کر رہے تھے۔

پاکستان میں سائنسی ترقی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اکرام الحق صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر سلام صاحب صدر پاکستان کے سائنسی مشیر رہے ہیں ۔ پاکستان میں بہت سے ادارے ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے معرض وجود میں آئے اور اس وقت فزکس کے میدان میں جتنے بھی پاکستان کے نمایاں سائنسدان ہیں ان کی ٹریننگ میں ڈاکٹر سلام صاحب ہی کا بنیادی کردار ہے۔ان کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ فزکس میں پاکستانی ماہر لڑکوں کو مزید تعلیم کے لئے باہر ایڈ جسٹ کروائیں ۔ ڈاکٹر اکرام الحق صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے فزکس ڈیپارٹمنٹ کے چیئر مین ڈاکٹر مجاہد کامران کا حوالہ دیتے ہوئے کہا مجاہد کامران تو کہا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو پاکستان کے ساتھ جنون کی حد تک محبت تھی۔جب انہیں پتہ چلتا کہ فزکس کا فلاں پروجیکٹ شروع ہو رہا ہے تو فوراً بتاتے کہ اس میں فلاں پاکستانی سائنسدان کو ایڈ جسٹ کرواؤ۔ڈاکٹر اکرام صاحب نے کہا کہ اب دیکھیں پاکستان میں فزکس کے چند سائنسدان ہیں اور 15 فی صد یہاں کی شرح خواندگی ہے۔ پھر ڈاکٹر عبد السلام کی یہ کوشش تھی کہ ICTP کا ادارہ پاکستان میں بنے لیکن اس کے برعکس یہاں کے ارباب حل وعقد کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے اکرام صاحب نے بتایا جب اس ادارہ کے لئے سلام صاحب نے صدر ایوب سے بات کی تو اس کے اخراجات کا تخمینہ مانگا اور اس تخمینہ پر اس وقت کے سیکرٹری فنانس نے صدر کو خفیہ رپورٹ دی کہ پروفیسر اپنے پروفیسر بھائیوں کے لئے انٹر کانٹینٹل ہوٹل بنانا چاہتا ہے۔ہمارا ملک اس عیاشی کو افورڈ نہیں کرسکتا۔حالانکہ اس سینٹر پر بہت بڑی رقم خرچ نہیں ہونی تھی کیونکہ تھیوریٹیکل فزکس کے لئے کیا چاہئے عمارت کمپیوٹرز لائبریری اور ذرائع ابلاغ۔ لیکن اس پر ہمارے حکمرانوں کا رویہ کیسا تھا۔اور اس کے برعکس مختلف ممالک نے کوشش کی کہ ڈاکٹر

سلام ان کی شہریت لے لیں ۔مثلاً ....ڈاکٹر سلام صاحب کو کہا کہ آپ تقسیم ہند سے پہلے تو انڈین تھے ۔ایک دفعہ انڈیا آ جائیں ۔ہم جیسا ادارہ آپ کہیں گے بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب بھلا کیسے ماننے والے تھے ۔ بلکہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کی علالت کے دوران انڈین اخبارات کے تراشے دیکھے ہیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے بار بار کہا کہ ہم آپ کو 300 کروڑ آفر کرتے ہیں اور ''سلام یونیورسٹی'' سری نگر میں بنائیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہ آپ میرے نام پر جو مرضی بنائیں میں اوّل وآخر پاکستانی ہوں ۔اس کے بعد بڑے دکھ بھرے انداز میں ڈاکٹر اکرام صاحب نے بتایا کہ جھنگ کی سرزمین نے دونوبل انعام یافتہ پیدا کئے ۔ایک سلام اور دوسرے ھری گوبند سرانہ ۔موٴخرالذکر کو 1969ء میں DNA میڈیسن میں نوبل انعام ملا تھا ۔اس نے کنگ ایڈورڈ سے ایم بی بی ایس کیا تھا اور امریکہ میں رہ کر سرچ کر رہا تھا جب اسے نہرو نے کہا تم انڈیا واپس آ جاؤ اور ہم تمہارے نام سے بائیالوجیکل ریسرچ لیبارٹریز آف انڈیا بنائیں گے اور پورے بھارت میں ان لیبارٹریز کی ایک (Chain) زنجیر بنا دیں گے ۔ ہری گوبند نے کہا کہ مجھے مزید تعلیم کے لئے امریکہ نے مواقع فراہم کئے اس لئے میرا سب کچھ امریکہ کا ہی ہے ۔مجھے بھول جاؤ میں کبھی واپس نہیں آؤں گا ۔اس کے برعکس دیکھئے دوسرا اسپورت بھی جھنگ کا ہی تھا یعنی ڈاکٹر عبدالسلام اس کو اپنے وطن پاکستان سے اس قدر محبت تھی کہ کہا زندگی میں نہ سہی مرنے کے بعد مجھے دفن تو پاکستان میں کریں ۔ پاکستان ڈاکٹر سلام کی First Prirolty تھا اور پاکستان ہی ڈاکٹر سلام کا first and Last Love تھا ۔وہ کہتے تھے کہ پاکستانوں میں بہت Potential ہے لیکن اس کے لئے ملک میں حالات سازگار نہیں کہ وہ آگے آسکیں ۔

اس مرکز کے قائم ہونے میں عبدالسلام کو کن کن صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی طاقتوں کے نمائندوں سے کیا کیا جنگ کرنی پڑی اس کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے ۔ یہ مرکز عبدالسلام کے عزم محکم ، جہد مسلسل اور جذبہ صادق کا نادر نمونہ ہے ۔ یہاں ہر سال تیسری دنیا کے ہزاروں

سائنس دان مختصر قیام کے لئے آتے ہیں اور علوم جدیدہ کے ماہرین سے فیض یاب ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ان ایک جدید سائنس دانوں کے سفر اور قیام کے اخراجات مرکز خود برداشت کرتا ہے۔ یہ مرکز کیا ہے وحدت انسانی کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ یہاں سیاست دانوں کی بنائی ہوئی ساری سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں ۔ یہاں مشرق و مغرب ہاتھ ملاتا ہے۔ گورا کالے کو خوش آمدید کہتا ہے اور اشتراکیت سرمایہ داری کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔تنہا اس مرکز کا قیام ہی عبدالسلام کا وہ کارنامہ ہے جس پر ایک اور نوبل انعام ان پر نچھاور کیا جا سکتا ہے۔عبدالسلام کی شخصیت بڑی ہی پیاری اور دلاویز ہے۔سامنے ہوں تو بے اختیار عقیدت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں ۔ مجھے ان سے پہلی ملاقات کا شرف 1971ء میں آئی۔سی۔ٹی۔پی تریسٹے میں ہوا جس کے وہ ڈائریکٹر ہیں ۔اس وقت تک ان کو نوبل انعام نہ ملا تھا۔مگر ان کے علمی اور دیگر کارناموں کو سن سن کر دل پر ایک رعب بیٹھ چکا تھا۔ان سے ملنے میں ایک قسم کی جھجک مانع تھی اور ملاقات کو جی بھی بہت چاہ رہا تھا۔ بالآخر ایک روز ہمت کر کے ان کے پاس پہنچ ہی گیا۔تعارف ہوا پھر تو شفقت کی وہ بوچھاڑ ہوئی کہ یکسر بھول گیا کہ ابھی چند منٹ قبل مجھے ان سے ملاقات کرنے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ گفتگو اردو میں ہوئی (وہ اردو جاننے والوں سے اسی زبان میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں)اور زیادہ تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں ۔ وہ تو اس یونیورسٹی سے کبھی منسلک نہیں رہے پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ اس ادارے سے ایک قسم کا قلبی لگاؤ رکھتے ہیں ۔جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ہماری یونیورسٹی سائنسی تحقیق کے میدان میں کافی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے تو بہت خوش ہوئے اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ وہ اس کو کیمبرج اور آکسفورڈ کے ہم پلہ دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ پھر کسی ہندوستانی عبد السلام کو حصول علم کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر انگلستان نہ جانا پڑے۔کاش! ہم ان کے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پنا سکیں۔

پروفیسر عبدالسلام ۔ ایک مطالعہ
آئی سی ٹی پی ۔ تیسری دنیا پر ایک احسان عظیم

(مکرم پروفیسر اسرار احمد صاحب علی گڑھ یونیورسٹی ۔ بھارت)

عبدالسلام اگر 29 جنوری 1926ء کی بجائے اس سے سو سال قبل پیدا ہوئے ہوتے تو وہ ماہر طبیعیات پروفیسر عبدالسلام نہ ہوتے بلکہ شمالی ہند کے ٹیپو سلطان ہوتے۔ ان کا حب وطن اہل اسلام کو سربلند دیکھنے کا اضطراب اور ظلم واستحصال کے خلاف جذبہ جہاد آتش فرنگ میں بے خطر کود پڑنا۔ مختلف طاقتوں کو ایک لڑی میں پرو دینے کا ان کا ہنر، ان کا عزم، ان کا ولولہ انگریز تاجروں کے مکروہ مقاصد کے سامنے ایک ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کر دیتا۔ لیکن قدرت نے ان کے لئے کچھ اور ہی کام تفویض کر رکھا تھا۔ وہ ایک غیر معروف قصبہ جھنگ میں اس وقت پیدا ہوئے جب انگریزوں کا پنجہ استبداد مدتوں پہلے ہندوستان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور بات کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ جب تک ہم ان علوم وفنون میں مہارت نہ حاصل کریں جو فی الحقیقت ہمارا ہی گم شدہ مال ہے اور جس کی بدولت مغرب مغرب ہے اس وقت تک مکمل آزادی اور عالمی برادری میں ایک باوقار مقام کی تمنا خیال خام ہے۔

یہ عبدالسلام کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو امیر بھی تھا اور غریب بھی۔ ان کا خاندان علم کی دولت سے بھرا تھا مگر اس کے پاس مادی وسائل کی کمی تھی جس کے نتیجے میں بچپن سے ہی ان کے دل میں علم کی عظمت جاگزیں ہوگئی اور ان کو وہ مواقع ہی نہ ملے جو اکثر بچوں کی بربادی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے والدین نے اپنے محدود

وسائل کے باوجود ان کی تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لی جس کی وجہ سے اسکول کی سطح سے لے کر یونیورسٹی تک کوئی بھی امتحان ایسا نہ تھا جس میں کامیاب ہونے والوں میں ان کا نام سرفہرست نہ رہا ہو۔غیر منقسم ہندوستان میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اپنا آخری امتحان 1946ء میں ایم۔اے ریاضی کا دیا اور 95فی صد سے زیادہ نمبر حاصل کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

نوجوان عبدالسلام کی تعلیمی میدان میں یہ قابل رشک کامیابیاں صرف ان کی خداداد ذہانت اور بہتر سر پرستی کی وجہ سے ہی نہ تھیں بلکہ اس میں ان کی دن رات کی مسلسل محنت اور لگن کا بھی کافی ہاتھ تھا۔انہیں شروع سے ہی وقت کی قیمت کا احساس تھا اور وہ شب و روز کے 13-13 گھنٹے حصول علم پر صرف کرتے تھے۔اسکول کے زمانے میں بھی ان کے شوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے کھلی رہتی تھی۔ایک بار تو یہ بھی ہوا کہ وہ مطالعے میں کچھ ایسے غرق ہوئے کہ مرغی ان کی سالن کی پلیٹ سے بوٹیاں نکال کر لے گئی اور ان کو کچھ پتہ بھی نہ چلا۔

عبدالسلام جیسا شاندار تعلیمی ریکارڈ اور اپنے سماج میں سول سروس کے اعلیٰ عہدیداروں کی اہمیت بہت ممکن تھا کہ وہ اس راہ پر لگ جاتے مگر قدرت ان کی پشت پر تھی۔اس نے ان کی عبقریت کو فائلوں کی نذر ہونے سے بچانے کا کچھ اور ہی انتظام کر رکھا تھا۔اوّلاً دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے سول سروس کے مقابلے کے امتحانات بند کر دیئے گئے تھے جس سے اس راہ پر لگنے کا امکان ہی باقی نہ رہا۔دوم اس جنگ عظیم میں انگریزوں کی مدد کے لئے ایک مشہور زمیندار خضر حیات ٹوانہ نے 15 لاکھ کی رقم اکٹھی کی تھی وہ 1945ء میں جنگ بند ہو جانے کی وجہ سے استعمال ہونے سے رہ گئی۔بعد میں یہی رقم چھوٹے زمینداروں کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وقف کر دی گئی تھی۔عبدالسلام کو اس فنڈ سے پانچ سو پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملا۔یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس کے ایک سال بعد ہندوستان کے تقسیم ہو جانے کی وجہ سے کسی اور کو اس فنڈ سے وظیفہ نہ مل سکا۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ فنڈ خاص طور سے عبدالسلام ہی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔

عام ایشیائی نوجوانوں کے لئے مغربی تہذیب بڑی کشش رکھتی ہے۔وہاں کی چکا چوند بہت جلد

انہیں مسحور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب سے نہ صرف برگشتہ ہو جاتے ہیں بلکہ الٹے اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ البتہ ذہین اور حساس نوجوانوں کے لئے اسی مغرب کا قیام ایک تازیانے کا کام کرتا ہے۔ گاندھی سوٹ بوٹ میں گئے، دھوتی چپل میں واپس آئے۔

اقبال مغرب کیا گئے سراپا مشرقی بن گئے

عبدالسلام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ان کا قیام کیمبرج (انگلستان) میں 46 تا 1949ء رہا۔ اس دوران جہاں انہوں نے اعلیٰ امتیازات کے ساتھ بی۔ اے (آنرز) ریاضی کا کورس دو سال میں اور سہ سالہ بی۔ اے (آنرز) فزکس کا کورس ایک سال میں پاس کیا اور متعدد اعلیٰ پیمانے کے تحقیقی مقالے لکھے وہیں انہیں اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے اعلیٰ ہونے کا عرفان بھی ہوا۔ وہ نیوٹن اور میکسویل کے دیس میں رہتے ہوئے بھی دن بدن بوعلی سینا اور ابن الہیثم کے قریب ہوتے گئے۔ ان کا جذبہ حب الوطنی شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اپنے وطن پاکستان کی خدمت کے جذبے سے سرشار اور اسے عالمی برادری میں ایک اعلیٰ علمی مقام دلانے کی آرزو سینے میں دبائے 1951ء میں وہ واپس آئے جہاں گورنمنٹ کالج میں انہیں ریاضی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ایک سائنس دان غیر سائنسی مزاج کی سوسائٹی میں نکما بن جاتا ہے۔ عبدالسلام جس دور میں واپس پاکستان لوٹے وہاں کی سوسائٹی نہ صرف غیر سائنسی تھی بلکہ سائنس کش بھی تھی۔ سائنس کی اہمیت کا زبانی اقرار تو کیا جاتا تھا مگر عملاً اس کے فروغ کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ سائنس میں تحقیق کو فروغ دینے کی کوششوں کو ہی تضیع اوقات سمجھا جاتا تھا اور کالج کی انتظامیہ اس عمل کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس ماحول میں سائنس دان عبدالسلام جلد ہی اپنے آپ کو ماہی بے آب محسوس کرنے لگے اور جب بات یہاں تک پہنچی کہ ایک علمی مباحثے کے سلسلے میں گرمیوں کی تعطیل میں ان کے بمبئی آنے پر تنخواہ کاٹ لی گئی تو انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بے موت مرنے سے بچانے کے لئے پھر انگلستان کی طرف رجوع کیا۔ وہاں امپریل کالج لندن میں ان کی تقرری بحیثیت لیکچرر ہوئی۔ اس کے دو سال بعد وہیں پروفیسر کا عہدہ ملا جس پر وہ آج تک قائم ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی تحقیق کا میدان نظریاتی ذراتی طبیعیات ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں کام کرنے سے بڑے بڑے لائق سائنسدان گھبراتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیقات میں ہمیشہ ہی بنیادی اہمیت کے مسائل کو اٹھایا ہے اور اس کا خوبصورت حل پیش کیا ہے۔ اب تک انہوں نے تقریباً دوسو پچاس بنیادی اہمیت کے بین الاقوامی ایوارڈ اور میڈل حاصل کئے ہیں۔

صرف 33 سال کی عمر میں ہی ان کو فیلو آف رائل سوسائٹی چن لیا گیا اور دنیائے علم کا سب سے بڑا انعام نوبل انعام 1979ء میں ان کو ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے علمی اور دیگر کارناموں پر دیئے گئے اعزازات کی فہرست کافی لمبی ہے اور اس کا بیان اس تعارفی خاکے میں ممکن نہیں۔

انسان کی عظمت کا معیاری پیمانہ وسیع القلبی ہے۔ کوئی کتنا ہی زورآور کیوں نہ ہو اگر اس کا دل تنگ اور درد سے خالی ہو تو وہ بونا ہے۔ بڑا وہ ہے جس کا دل بے در و دیوار ہو۔ تنہا آگے بڑھنا آسان ہے مگر اپنے ساتھ مفلوجوں کی فوج لے کر آگے بڑھنا مشکل۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو عبد السلام عظیم ترین ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل میں اپنوں میں سائنس کو فروغ دینے کی تڑپ ہو۔ عبدالسلام کے دل میں ہے۔ پاکستان کے جس سائنسی ماحول نے جنوری 1952ء میں ان کو اپنے وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا وہ اسے بھولے نہیں۔ ذاتی کامیابیوں اور اعزازات کی بارش میں بھی انہوں نے تیسری دنیا خصوصاً عالم اسلام کے اس سائنسی ماحول کو یاد رکھا جس میں نہ جانے کتنے عبدالسلام پیدا ہونے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ تیسری دنیا میں سائنس کو فروغ دینے اور وہاں ایک سائنسی ماحول پیدا کرنے کے لئے وہ مستقل بے قرار رہے۔ اس بے قراری کو بالآخر ''انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس'' کی شکل میں سکون ملا۔ یہ مرکز جو آئی۔ سی۔ ٹی۔ پی کے نام سے مشہور ہے 1964ء میں اطالیہ کے شہر تریسٹے میں قائم ہوا۔ یہ عبدالسلام کا تیسری دنیا کی سائنس پر وہ عظیم احسان ہے جسے نسل در نسل یاد کیا جاتا رہے گا۔

انٹرویو پینل۔ مکرم حافظ راشد جاوید صاحب (نمائندہ خصوصی)، مکرم منصور احمد صاحب، مکرم انصر رضا صاحب

چند یادیں چند باتیں

مدیر ہفت روزہ ''لاہور'' جناب ثاقب زیروی صاحب کی خصوصی تحریر

ایاز صاحب (مدیر خالد) کا اصرار ہے کہ میں ان روح پرور یادوں کی جگالی کروں جن میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام (نوبل انعام یافتہ) کے خلق ومروت کی مہک رچی بسی ہو۔مگر یہ سلسلہ تو ربع صدی پر محیط ہے دو چار برس کی بات نہیں۔لہٰذا آج کی صحبت میں بڑے اختصار کے ساتھ صرف مبادیات اور عنوانات ہی پر اکتفا کیا جائے گا۔

(1) یہ اغلباً 1972ء کی بات ہے میں جو ایک دن دفتر سے گھر پہنچا تو بیگم نے بتایا کہ کوئی صاحب یہ ''سیزنل اوورکوٹ'' دے گئے ہیں اور جاتے ہوئے سلام کہہ گئے تھے اور میں حیران کہ یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے اپنا نام بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔یہ عقدہ رات گئے کھلا جب ایئر پورٹ سے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا فون آیا جس میں اوورکوٹ کا ذکر تھا۔میں نے کہا بھائی آپ اتہ پتہ تو بتا جاتے۔کہنے لگے میں نے نام تو بتایا تھا۔اگر میں ان سے کہتا کہ میں ہوں ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن میں فزکس کا پروفیسر تو وہ تکلف میں پڑ جاتیں۔پھر مجھے کچھ جلدی بھی تھی۔بس نام بتایا اور چلتا بنا۔مگر بیگم اس نام کو سلام سمجھیں۔اس پر اس منکسر المزاج نے ہنستے ہوئے کہا کہ گویا نام کے علاوہ میرا اسلام بھی پہنچ گیا''

(2) ڈاکٹر صاحب کو نوبیل انعام مل چکا تھا وہ ربوہ کے جلسہ سالانہ پر تشریف لائے۔امام وقت نے انہیں اسٹیج پر بلا کر گرمجوش مصافحہ اور معانقہ سے نوازا۔انہوں نے گلوگیر آواز میں حاضرین جلسہ سے چند منٹ کیلئے خطاب بھی کیا۔اس کے بعد میں نے نظم پڑھی جس کے دو شعر یوں تھے۔

ہجوم غم سے شب خوں فشاں سے گزریں گے
کھلیں گے پھول وہاں ہم جہاں سے گزریں گے
فراز دار سے کس نے ہمیں پکارا ہے
ہم آ رہے ہیں کہو ہم وہاں سے گزریں گے

مَیں جلسہ کے ایام میں عام طور پر ''الکیمسٹ'' کے مدار المہام جناب لطیف قریشی کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اگلی صبح نماز سے فراغت کے معاً بعد ایک بچے نے آ کر بتایا کہ کوئی سلام صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کون سلام؟ دماغ پر زور دینے کے باوجود کوئی واضح شکل سامنے نہ آئی عرض کیا بلاؤ تو دیکھا کہ وہ تو پروفیسر عبد السلام ہیں جنہیں پچاس سے زائد یونیورسٹیاں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں پیش کر چکی ہیں اور جنہیں درجن سے زائد حکومتیں بڑے فخر و ناز سے اپنے ملک کے اعلیٰ ترین اعزازات وتمغات سے نواز چکی ہیں۔ میں نے عرض کیا بھائی مجھے بلوالیا ہوتا کہنے لگے میں رات بھر آپ کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ کل جو نظم آپ نے پڑھی اس کا ہر شعر میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ کاش! وہ میں نے کہی ہوتی کاش یہ سعادت میرے حصہ میں آئی ہوتی اور میں ان کی دعوت الی اللہ کیلئے تڑپ کے تصور میں گم ہو کر رہ گیا۔

(3) ایک دن دارالذکر لاہور میں جمعہ کی نماز کے بعد ملے تو فرمایا کہ آج پانچ اور چھ بجے کے درمیان آپ کے ہاں چائے پئیں گے۔ عرض کیا ''زہے نصیب'' مگر چھ بج گئے ساڑھے چھ ہو گئے۔ سات بج گئے ساڑھے سات ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہیں نام ونشان نہ تھا جب کہ میں نے دوایک دوستوں کو بھی یہ کہہ کر چائے پر بلا رکھا تھا کہ'' آج بعد دوپہر کی چائے میرے ہاں پئیں تا کہ کل اس قلق سے دو چار نہ ہونا پڑے کہ ڈاکٹر عبد السلام کو نہیں دیکھا۔ اس ہستی کو جس کے جان و دل وطن عزیز پر قربان ہیں مگر وطن والوں نے اسے جلا وطنی کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا میں گلی کی نکڑ پر جا کر کھڑا ہوتا ہوں۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے

کہیں آگے نکل گئے ہوں گے مگر پونے آٹھ بجے آپ آ گئے اور آتے ہی بڑی سادگی اور بے تکلفی سے فرمایا ''پھر میں نے سوچا۔ چائے کا کیا پینا ہے کھانا کھائیں گے تا کہ کچھ دیر بیٹھیں بھی۔''

کھانے کے دوران ''لاہور'' کے پیکٹ اور بنڈل (ڈاک سے) اٹھوائے جانے کا ذکر چھڑا تو میں نے بتایا کہ 2754 گا ہک ٹوٹے ہیں تو جنرل ضیاء کا اصرار ہے کہ میں اس سے ضرور ملوں۔ پہلے میرا ارادہ نہیں تھا۔ مگر اب ضرور ملوں گا اور لاہور سے ہونے والی زیادتی کا ذکر کروں گا۔ عرض کیا اگر آپ کی ملاقات ہو ہی جائے تو متعدد اور جماعتی امور ذکر کرنے کے ہیں۔ ''لاہور'' کا ذکر نہ ہی چھیڑیئے گا۔ دراصل میں اسے یہ مسرت نہیں پہنچانا چاہتا کہ ثاقب نے اذیتوں سے ہار مان کر سفارشیں شروع کر دی ہیں۔ متردد ہوئے پھر یہ کہتے ہوئے لپٹ گئے۔ ''تو یوں کہو ناں کہ کشتیاں جلا کر میدان میں اترے ہو۔''

(4) ڈاکٹر صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی لاہور یاد آ جاتا تو چندہ بھجوا دیتے بعض اوقات تو سال میں تین تین چار دفعہ بھجوایا۔ 95ء کے جلسہ سالانہ لندن میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تو ڈاکٹر صاحب کی عیادت کا خیال قلب و ذہن پر سوار ہو گیا۔ بشیر احمد آرچرڈ محترم کا بھلا ہو کہ انہوں نے ہماری ملاقات کرانے کی ذمہ داری لے لی۔ چوہدری حمید نصر اللہ خان اور میں ''آکسفورڈ'' میں کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی اقامت گاہ پر بیٹھے رہے۔ چائے پی بالآخر رخصت کی اجازت لی۔ مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھائے مگر ڈاکٹر صاحب تو ہاتھ چھوڑتے ہی نہ تھے ان کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کی گرفت لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ ہونٹ تھر تھرا رہے تھے مگر بولنے کی سکت نہ تھی۔ بالآخر رو پڑے اور میری آنکھیں بھی غمناک ہو گئیں۔ واپسی پر تمام وقت یہ احساس قلب و ذہن پر مستولی رہا ایک شریف النفس انسان، ایک مؤحد سائنسدان جس نے تمام عمر وطن عزیز کیلئے خیر و برکت کی دعائیں مانگیں۔ نوبیل انعام پا کر عالم اسلام کو سربلند کیا، نوبیل انعام میں ملنے والی رقم بھی وطن عزیز کی نذر کر دی۔ مگر اجہل ملاؤں میں گھرے ہوئے حکمرانوں نے اس کے خلوص کی کوئی قدر نہ کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خدمات جلیلہ
اور اوصاف جمیلہ کے تذکرے
(تحریر و ترتیب: امۃ الحیٔ آسیہ صاحبہ۔ لاہور)

ہماری سیہ بختی ہے کہ ہم نے انہیں جلاوطنی اور بے توقیری کے عذاب میں ڈالا۔
انہوں نے ہمیشہ قرآن کو مشعل راہ بنائے رکھا۔
ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی میں دو دکھ۔ پاکستان اور عالم اسلام کی سائنس سے بے توجہگی
سائنس کی کانفرنس کا آغاز ڈاکٹر صاحب نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم پڑھ کر کیا اور روسی
سائنسدان کی حیرانی۔ڈاکٹر صاحب کے ارشاد پر دنیا بھر کے سائنسی۔سائل مجھے ملنے لگے۔
کسی یونیورسٹی، علاقہ یا سڑک کو ''عبدالسلام'' کے نام سے موسوم کیا جائے۔
خدا حافظ! جایئے پاکستان کی خدمت کیجئے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی سترھویں سالگرہ کے موقع پر ''بزمِ ڈاکٹر عبدالسلام کراچی'' کے زیر اہتمام ایک سیمپوزیم

سابق چیف سیکرٹری سندھ جناب کنور ادریس صاحب، معروف صحافی خاتون زاہدہ حنا صاحبہ، آنسہ مہناز زینب صاحبہ، پروفیسر میاں محمد افضل، ڈاکٹر عزیز حسن اشرفی صاحب اور سائنس میگزین کے ایڈیٹر سید قاسم محمود صاحب کی تقاریر۔ یہ مضامین محترم عبد المالک صاحب آف لاہور نے ہمیں ارسال کئے ان کے ہم مشکور ہیں اس طرح محترمہ عزیزہ امتہ الحی آسیہ صاحبہ کے بھی مشکور ہیں کہ جنہوں نے اس تقریب کی ویڈیو کیسٹ سے تمام تقاریر سن کر ان مضامین کو از سر نو اس نمبر کیلئے تحریر و ترتیب دیا۔

''بزم ڈاکٹر عبدالسلام'' کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالسلام کی 70ویں سالگرہ مورخہ 13 مارچ

1996ء کو (کراچی) ہوٹل میں منائی گئی۔تقریب کی صدارت پاکستانی حقوق انسانی کمیشن کے تا حیات چیئرمین (ریٹائرڈ) جسٹس دراب پٹیل نے فرمائی۔مقررین میں سابق چیف سیکرٹری حکومت سندھ جناب کنور ادریس کے علاوہ زاہدہ حنا،عرفان رضا ایڈووکیٹ، ماہ ناز زینب، سید قاسم محمود، ڈاکٹر عزیز الحسن اشرفی،ایس ڈبلیو احمد، پروفیسر میاں محمد افضل اور کریم بخش خالد شامل تھے۔

تقریب کا آغاز اللہ تبارک وتعالیٰ کے بابرکت کلام سے ہوا اس کے بعد سیکرٹری بزم ہذا جناب ممتاز حسین شاہ بخاری نے ڈاکٹر عبدالسلام کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جو اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے خصوصی طور پر روانہ کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے پیغام میں فرماتے ہیں کہ:۔''آپ سب جانتے ہیں کہ میں ایک طبعی بیماری ''پروگریسو سپرا انیوکلیئر پالسی'' میں مبتلا ہوں یہ ایک ایسی بیماری ہے جو رفتہ رفتہ جسم کی طبعی حرکات معکوسہ کو تباہ کرنے کا موجب بنتی ہے۔یہی وہ بیماری ہے جس نے مجھے میرے وطن کا سفر کرنے کے قصد سے دور رکھا ہوا ہے۔ مجھے میرے وطن کی یاد بہت ستاتی ہے اور بے حد دل چاہتا ہے کہ میں وطن لوٹوں اور اپنے پیاروں اور اپنے دوستوں اور اپنے عزیز و اقارب سے ملوں۔یقین کیجئے کہ اس وقت بھی آپ کی یاد میرے دل و دماغ میں تازہ ہے میں آپ کو یاد کر رہا ہوں۔میں ممنون رہوں گا اگر مجھے تقریب کی ویڈیو مل جائے۔پاکستان کو قابل ولائق دانشوروں کی ضرورت ہے۔میں نے کوشش کی کہ لوگوں کو بتا سکوں کہ ایک پاکستانی کیا کچھ کر سکتا ہے۔آپ بھی ایک دانشمند و قابل شخصیت کے طور پر اپنی اہلیت ولیاقت کے سفر کو جاری رکھتے ہوئے آنے والی نسلوں کو مزید بلندیوں تک پہنچائیں۔جب میں وطن عزیز سے آنے والے بعض والدین کے خطوط پڑھتا ہوں تو مجھے یہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے اپنے بچوں کے لئے چند حوصلہ افزاء الفاظ لکھنے کی التجا کرتے ہیں۔بزرگ اپنے خطوط میں اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ یہاں ایسی قابل فخر ہستیاں (Role Models) نہیں رہیں جنہیں وہ اپنے بچوں کی رہنمائی کیلئے نمونے کے طور پر پیش کر سکیں۔یہ آپ سب پر فرض ہے کہ ارض پاک کے نونہالوں کو قابل فخر وسر بلند ہستیوں سے متمتع کریں۔

ہم بحیثیت بزرگ نسل کے اپنے وطن کیلئے آئیڈیلز پیدا کرنے اور وطن عزیز کی مانگ میں کامیابیوں کی افشاں بھرنے میں ناکام رہے ہیں ۔ہمیں ہر حال میں اپنے اختلافات، ذاتی خواہشات کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔ایک بہتر پاکستان کی تعمیر کرنا ہوگی۔ہم نے اپنا بہت وقت اور توانائیاں برباد کردیں اور دوسروں کو یہ موقع دیا کہ وہ تعلیم وتربیت کی دوڑ میں ہم سے بہت آگے نکل جائیں۔اب یہ غفلت بند ہونی چاہئے۔کبھی مت بھولیئے کہ آپ دنیا کے لئے بہت کچھ تخلیق کرسکتے ہیں۔لیکن یہ بھی یاد رکھیئے کہ اعلیٰ تخلیق صرف اور صرف بے حد محنت انہماک اور مستقل مزاجی کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے۔بحیثیت مسلمان ہمارے پاس دوسروں کو متاثر کرنے اور خود آگے بڑھنے کا گرانقدر اثاثہ موجود ہے۔ہمیں کبھی نہیں بھلانا چاہئے کہ ہمارے مسلمان علماء و دانشوروں نے صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کی ہے۔''

آنسہ مہناز زینب:: ڈاکٹر عبداسلام کے خصوصی پیغام کے بعد سب سے پہلی مقررہ آنسہ مہناز زینب صاحبہ نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان کا عظیم ترین دماغ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی کامیابیاں نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ تیسری دنیا کے لئے سائنسی میدان میں سنگ میل ثابت ہوئیں ۔انہوں نے طبیعیات کے شعبہ کو جہاں ایک نیا رخ دیا وہاں انہوں نے اپنی شخصیت سے مسلم ثقافت کو تمام عالم میں روشناس کرایا یہی وجہ تھی کہ انہیں 1979ء میں طبیعیات کے شعبے میں ان کی گرانقدر خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ ترین اعزاز نوبیل پرائز سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا پاکستان کیلئے ایک خواب تھا کہ یہاں ایک انٹرنیشنل ریسرچ سنٹر قائم کیا جائے جہاں پر طبیعیات کو فروغ دیا جائے مگر ان کا یہ خواب اس وقت کے مفاد پرست حکمرانوں کی ذاتی پسند اور ناپسند کی نذر ہو کر شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔چنانچہ یہ ادارہ انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کے نام سے اٹلی کے شہر ٹریسٹے میں قائم کیا اس کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب نے متعدد بار اپنی خدمات پاکستان میں سائنس کی ترقی وترویج کے لئے پیش کیں مگر انہیں نظر انداز کیا جاتا رہا۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے طبیعیات کے شعبہ میں نئی جہتوں کو روشناس کروایا۔باوجود اس کے پاکستان

کو تیسری دنیا کا پسماندہ ملک شمار کیا جاتا ہے مگر اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ڈاکٹر عبدالسلام کی شکل میں ایک نوبل انعام یافتہ گوہر نایاب پیدا ہوا جس نے نہایت خلوص کے ساتھ سائنسی شعبے کی خدمت کی۔ ان کی انتھک کوشش اور بار بار کی نشاندہی کی بناء پر پاکستان میں پسٹیک (Pinstech) اور اٹامک انرجی کمیشن جیسے دو اہم تحقیقاتی ادارے وجود میں آئے مگر ان کے پاکستان سے ہجرت کر جانے کے بعد مزید کوئی معتبر تحقیقاتی مرکز وجود میں نہ آ سکا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارا تعلیمی معیار بڑی تیزی سے انحطاط پذیر ہے اور ایک بڑا طبقہ تعلیم کے زیور سے محروم ہے اگر ہم سنجیدگی سے اپنے اعلیٰ معیار کو بتائیں اور سائنس کی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں اور جہتیں متعین کریں تو پاکستان میں ایسے زرخیز اور غیر معمولی اذہان کی کمی نہیں۔

انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالسلام ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک ایماندار انسان دوست شخصیت تھے جنہوں نے خود کو سائنس کی ترقی، معلومات کی فراہمی کیلئے وقف کر دیا۔ یہی وقت ہے کہ ان کی لازوال خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے سائنسی میدانوں میں نئے جہانوں کی تلاش کیلئے ایسے مراکز قائم کریں جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے نہ صرف لائحہ عمل ترتیب دیں بلکہ ڈاکٹر عبدالسلام کے تحقیقی شعبوں میں کام کو مزید آگے بڑھائیں اور دنیا کو پاکستان کے نام سے روشناس کرائیں۔

پروفیسر میاں محمد افضل: ''ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت کے چند پہلو'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ان اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس پر ان کا کوئی دیرینہ رفیق کار ہی لب کشائی کر سکتا ہے۔ عام طور سے انسانی کا شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ کسی ایک جہت کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں ہوتا اور خاص کر ڈاکٹر عبدالسلام جیسے شخص کی قدر اور شخصیت پروفیسر میاں محمد افضل نے ڈاکٹر صاحب کی طالبعلمی کے زمانے کے کارنامے اور اس وقت ان کی شخصیت کے بعض بہت اہم گوشوں سے سامعین کو روشناس کروایا اور اس بات کا بڑے دکھ کے ساتھ ذکر کیا

کہ ڈاکٹر صاحب سے ان کے مادر وطن کے علمی گہوارے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہ کر سکے اور پاکستان میں ان کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا گیا۔ وہ پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اپنے علم سے اسی ملک کے نونہالوں کو سیراب کرنا چاہتے تھے مگر جس کالج میں وہ لیکچرار مقرر ہوئے وہیں کے پرنسپل نے حکومت وقت کو یہ لکھا کہ یہ شخص کالج کے تعلیمی ماحول سے مطابقت نہیں رکھتا لہذا اس کا تبادلہ کہیں اور کیا جائے۔ دوران ملازمت انہیں تدریسی سرگرمیوں سے دور رکھ کر اور ان کے ریسرچ کرنے کے جذبے کا گلا گھونٹ کر انہیں کالج کے فٹ بال کلب کا انچارج بنانے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان سے ڈاکٹر عبدالسلام کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر میاں محمد افضل نے ایک واقعہ سنایا کہ انہیں بزرگوں نے مشورہ دیا کہ آپ کی ساری عمر تو یورپ میں گذر گئی لہذا اٹلی یا انگلستان کی شہریت لے لیجئے بے شک پاکستانی شہریت بھی برقرار رکھیئے۔ مگر ڈاکٹر عبدالسلام نے ایسا کرنے سے قطعی انکار کر دیا ان کی سوچ یہ تھی کہ اگر انہیں نوبل پرائز مل گیا تو وہ اسے بطور ایک پاکستانی کے حاصل کر کے یہ طرہ امتیاز پاکستان کے سر باندھنا چاہیں گے وہ کہتے تھے کہ پاکستان کو یہ فخر حاصل ہونا چاہئے کہ دنیا کا سب سے بڑا اعزاز پاکستان کے حصے میں آیا اور انہیں 1979ء میں جب یہ اعزاز ملا تو وہ اس کیلئے مکمل پاکستانی لباس پہن کر پہنچے اور پاکستان کو مزید عزت اس وقت ملی جب ڈاکٹر عبدالسلام نے ایڈریس اُردو میں پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی اس موقع فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تقریر میں قرآنی آیات کا حوالہ دیا اس طرح پاکستان کے ساتھ اسلام کا جھنڈا بھی بلند کیا۔ یہ اعزاز اپنے ساتھ ایک خطیر رقم بھی لایا۔ روپیہ ملنے پر انسان کے لاکھوں منصوبے ہوتے ہیں۔ کوئی گھر خریدتا ہے کوئی جائیداد بناتا ہے، بیوی اور بچوں کیلئے خوشیوں کے سامان خریدتا ہے مگر ڈاکٹر عبدالسلام کے ذہن میں صرف ایک خیال فقط ایک مقصد تھا کہ یہ رقم پاکستان کے سائنسدانوں پر اور پاکستان میں سائنسی ترقی پر صرف ہوگی سو آپ نے تقریباً ساری رقم سائنس کے لئے لنڈھا دی اور وقف کر دی پاکستانی سائنس دانوں کے لئے۔ اس وقت میں بھی آپ اپنے اولین مادر علمی یعنی

چھوٹے سے جھنگ کالج کونہیں بھولے اوراس کی سائنسی لیبارٹری کی بھی معقول مالی معاونت کی۔ ایسی مثال تاریخ عالم مشکل ہی سے پیش کر سکے گی کہ کسی شخص کو بھاری رقم حاصل ہوئی ہواوراس انعام یافتہ نے وہ رقم نہ خوداپنے اوپر خرچ کی ہواور نہ ہی بیوی بچوں پر بلکہ وہ ایک ہی جذبے سے سرشار ہوکہ آج میں اس قابل ہوا ہوں کہ مالی طور پر بھی اپنے وطن عزیز کی خدمت کرسکوں اور پھر وہ شخص اپنا سب کچھ اپنے ملک کو پیش کردے۔کتنا عظیم جذبہ حب الوطنی ہے اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی انگلی اٹھائے تو وہ انگلی اس قابل ہے کہ اسے کاٹ دیا جائے۔

انہوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹرعبدالسلام جو 1947ء سے سمندر پار کی بڑی یونیورسٹیوں میں کام کر رہے تھے انہیں اپنے ملک یعنی پاکستان میں پہچانا ہی نہیں گیا۔ پذیرائی کا ملنا تو دور کی بات ہے:۔

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے

باغ تو سارا جانے ہے

خوش قسمتی سے 1957ء میں میاں افتخار الدین انگلستان پہنچے تو یہ معلوم کرکے دنگ رہ گئے کہ وہ ایک پاکستانی سائنسدان ہی تھا جس نے سائنس کی دنیا میں پورے یورپ میں ایک تہلکہ مچادیا تھا اور ابھی تک پاکستان اس سے بے خبر تھا۔ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے اس ابھرتی ہوئی سائنسی شخصیت کو پاکستان میں متعارف کرادیا مگر پھر بھی سرکاری حلقوں میں کوئی ہل چل نہ ہوسکی۔ مزید چارسال گذر گئے کہ 1961ء میں صدر پاکستان کی نگاہ الفقات اس طرف اٹھی اور ڈاکٹر صاحب کوصدر پاکسان کا چیف سائنٹفک ایڈوائزر بنایا گیا اور پھر اس محب وطن سائنسدان کی ساری سوچیں پاکستان کی سائنسی ترقی کے گرد گھومنے لگیں۔اب وہ اس پوزیشن میں تھے کہ پاکستان کی سائنسی ترقی کے لئے کوئی عملی قدم اٹھاسکیں۔ڈاکٹرعبدالسلام کی مساعی کے نتیجے میں ایک کے بعد دوسرا ادارہ وجود میں آیا اٹامک انرجی کمیشن میں چستی آئی Pinstech قائم ہوا Sparco وجود میں آیا۔Pinstech ایٹم کی بات ہوئی، نیوکلیرانرجی کی بات ہوئی۔فضائی تسخیر کی بھی ابتداء ہوئی

مگر سائنسدانوں کو بھی پوچھا جائے ان کے لئے بھی تو کچھ کرنا چاہیے سو پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کی بنیاد کی گئی۔ یہ سب ادارے پاکستان میں سائنسی ترقی کے ضامن مگر ڈاکٹر عبدالسلام نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے لئے بھی سوچتے ہیں۔ انہیں اسلامی ممالک کی بہتری اور ترقی بھی مقصود ہے اپنی اس سوچ کو عملی شکل دیتے ہوئے انہوں نے اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کی ایک تجویز پیش کی اور اسلامی ممالک سے ان کی ایکسپورٹ کی آمدنی کا صرف ایک فیصد اس کے فنڈ کیلئے تجویز کیا۔ اس طرح چار سالوں میں ایک بلین ڈالر کا سرمایہ اکٹھا ہوسکتا تھا مگر مسلمان کہاں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر ان کی تعیّشات کہاں اجازت دیتے ہیں کہ ایک فیصد ہی سہی ان فضول قسم کی لیبارٹریوں پر لگایا جائے۔ ڈاکٹر صاحب عالم اسلام کی اس بے حسی پر تڑپتے رہے، آواز اٹھاتے رہے مگر ان کی آواز میں صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ مگر ان کی یہ تجویز ان کے اس جذبے کی آئینہ دار ہے جو وہ ترقی پذیر اسلامی ممالک کی بہتری اور خوشحالی کے لئے رکھتے ہیں۔ ان کا دل ایک حساس دل ہے وہ نہ صرف تیسری دنیا کے سارے ممالک کی غربت و افلاس تنگدستی اور بیماری پر کڑھتے رہے بلکہ اپنے لیکچروں میں اس کا اظہار بھی کرتے رہے اور ان کو دور کرنے کی عملی تجاویز بھی سوچتے اور پیش کرتے رہے۔ ڈاکٹر عبداسلام نہ صرف ایک سائنسدان ہیں بلکہ ایک بہت اچھے اکانومسٹ اور ایک اعلیٰ پایہ کے فلسفہ دان بھی ان کی سوچ ان کی قابل عمل تجاویز ایک انقلاب پیدا کرسکتی ہیں اگر حاکم ویسا ہی دردمند دل رکھیں۔

ہندوستان میں تو ان پر جگجیت سنگھ نے کتاب لکھ دی مگر ہمارے ہاں ان پر بہت ہی کم لکھا گیا۔ پاکستان نے جو سرد مہری برتی اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ایک وزیر اعظم نے تو ان سے ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ ایک نے گورنمنٹ کالج میں بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ گویا اس ادارے سے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ پاکستان میں پاکستان کی ترقی کیلئے کوشاں رہے۔ اس عظیم سائنسدان کی یہ صفت بھی بے مثال ہے کہ وہ تیسری دنیا کے ملک پاکستان

کی پیداوار ہونے پر اتراتے ہیں۔فخر کرتے ہیں، نازاں ہیں، کتنا محب وطن ہے یہ عظیم سائنسدان کتنا بڑا پاکستانی۔

مایہ ناز دانشور اور صحافی محترمہ زاہدہ حنا

آپ نے مختصر اور جامع مقالہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے حوالے سے پیش کیا۔آپ کہتی ہیں۔

کیا ہم آج اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دنیا کا ایک ذی وقار شہری اور مایہ ناز سائنسدان ستر برس کا ہوگیا۔کیا ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ اس انسان کو اس کے سائنسی کارناموں پر داد دیں، اس کے علم و فضل کے باب میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہائیں اور واپس چلے جائیں۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ یہاں اس لئے آئے ہوں لیکن معافی کی طلب گار ہوں کہ میں یہاں اس لئے نہیں آئی۔ وہ شخص جو مغرب و مشرق کی دو درجن سے زیادہ یونیورسٹیوں کا اعزازی ڈگری یافتہ ہے، جسے دو درجن سے زیادہ اعلیٰ ترین بین الاقوامی اعزازات سے نوازا جاچکا ہے جو دو درجن سے زیادہ اہم ترین سائنسی اور تحقیقی کام کرنے والی سوسائٹیوں کی فیلو شپ اور ممبر شپ رکھتا ہے اسے آپ کی اور میری تعریف و توصیف کی ذرہ برابر بھی ضرورت نہیں۔

میں یہاں حاضر ہوئی ہوں تو اس لئے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی 70 ویں سالگرہ کے موقع پر خود اپنی اور اپنی قوم کی بدبختی پر گریہ کروں۔اس بات کو کہوں کہ ہم نے نوبل انعام یافتہ عبدالسلام کے ساتھ وہی کچھ کیا ہے جو سینکڑوں برس سے ہم اپنے علماء اور فضلاء کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔ ہم تاریخ کے اتنے بڑے جھوٹے ہیں کہ کل اپنے جن خرد افروز اور علم دوست مفکروں، دانشوروں اور فلسفیوں پر ہم نے کفر و الحاد کے فتویٰ لگائے تھے۔جن پر زیست حرام کردی تھی۔آج ہم ان ہی کے ناموں کے آگے رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اور ان کے نام سے پہلے ''امام'' نہ لکھنے کو کفر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ہم بھول چکے ہیں کہ ابن حزم کا مدرسہ اور کتب خانہ ہم نے جلایا تھا اور اسے قید و بند کی

صعوبتوں سے ہم نے گزارا تھا۔آج وہ ہمارے لئے امام ابن حزم ہے۔ہم کسی کو نہیں بتاتے کہ ہم نے ابن تیمیہ کی کتابیں جلائیں اسے قید کیا اور جب اس پر بھی ہمارا جی خوش نہ ہوا تو قید کے دوران اس سے تصنیف و تالیف کی آزادی سلب کر لی۔اس کی کتابیں اور مسودے ضبط کر لئے۔آج ہم اسے''امام'' لکھتے نہیں تھکتے اور تاریخ کا یہ سچ چھپاتے ہیں کہ کاغذ اور قلم سے محروم ہونے والے ابن تیمیہ نے اپنے قید خانے کی دیواروں پر اپنے ناخنوں سے کھرچ کر کیا جملہ لکھا تھا۔

مسلم دنیا کا آخری نابغہ روزگار ابن رشد جو اپنے خیالات و افکار کے سبب ذلیل و رسوا ہوا جسے مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر نمازیوں کے جوتے صاف کرنے کی سزا دی گئی، جسے جلاوطن کیا گیا جس کی کتابیں قرطبہ کے چوک پر جلائی گئیں۔آج اسی ابن رشد کے حوالے سے ہم یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ راجر بیکن نے 1230ء میں ابن رشد کی کتابوں کے لاطینی ترجمے کو یورپ کی علمی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ قرار دیا تھا۔عالم اسلام میں علم پروری اور عقل دوستی کا زوال ابن الہیثم اور البیرونی سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور یہ عمل بارہویں صدی کے آخری برسوں میں ابن رشد کی ذلت آمیز جلاوطنی کے ساتھ مکمل ہوا۔اس عظیم سانحے کو ہزار برس گزر چکے لیکن پستیوں میں مسلسل اترتے رہنے، یورپی استعمار کی نوآبادیات بن جانے اور نام نہاد سیاسی آزادی کے بعد مغرب کی اقتصادی غلامی میں آنے کے باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی کے باب میں ایک روشن خیال اور وسیع المشرب سماج کی تعمیر کے سلسلے میں ہمارے رویے آج بھی دسویں گیارھویں اور بارہویں صدی عیسوی سے آگے نہیں بڑھے۔

ابن رشد کو ہسپانیہ کے یہودیوں نے سینے سے لگایا اور اس کے خیالات و افکار یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کا نقطہ آغاز بنے اور آج ہم آٹھ سو برس بعد بھی اتنے ہی بدبخت ہیں کہ ہم نے اپنے ایک نابغہ روزگار کے لئے اس کے اپنے ملک میں اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ دیار غیر میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے ڈاکٹر عبدالسلام سے مغرب و مشرق کی ذہانتیں استفادہ کرتی ہیں۔

یہ شخص طبیعیات کا نوبل انعام لینے جاتا ہے تو سویڈن کے بادشاہ اور ملکہ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ شاہی خاندان کے سامنے اس کی آمد کا اعلان بگل بجا کر کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے ہزار ہا سائنسدان، دانشور اور طالب علم سروقد کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کرتے ہیں لیکن میں نوبل انعام یافتہ سائنسدان جب اپنے ملک کا رخ کرتا ہے تو برسر اقتدار خواتین وحضرات اسے ملاقات کا وقت نہیں دیتے۔ معمولی سرکاری اہل کار سائنس کی ترقی کے لئے اس کی بیش قیمت تجاویز اور پیشکشوں کے معاملات کو سرد خانے میں ڈال دیتے ہیں اور اسی شہر کا ایک تعلیمی ادارہ اسے اپنے یہاں مدعو کرتا ہے تو مذہبی جنونیوں کا ایک ٹولہ اس کی آمد کو کفر واسلام کی جنگ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

آج ہم تباہی وبربادی کی جس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اس کا بنیادی سبب ہماری علم دشمنی، جہل دوستی اور اپنے عالم وفاضلوں کی توہین وتذلیل ہے۔ ہم اپنی ذہانتوں کو دیس نکالا دیتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہم اس ملک میں نظر اور تدبر کے سوتوں پر پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ ہم اپنی دانش گاہوں میں ذہانتوں کو پنپنے نہیں دیتے اور انہیں کبھی ملحد، کبھی کافر اور کبھی بے راہ رو قرار دے کر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ دیار غیر کا رخ کریں اور ان کی ذہانتیں یورپ وامریکہ میں گل وگلزار کھلائیں ۔ہم جس تیزی سے زوال اور ذلت آمیز غلامی کی طرف جا رہے ہیں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما اور ہمارے دانشور منافقت میں مبتلا ہیں۔ کسی بھی قوم کی رہنمائی اس کے سیاستدان مدیر، مفکر اور دانشور کرتے ہیں اور جب یہی طبقہ مصلحت ومنافقت کا شکار ہو جائے تو قوم کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارا ہے۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اٹھ کر باآواز بلند یہ کہہ سکیں کہ یہ وہ پاکستان نہیں ہے جس کا وعدہ جناح صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں سے کیا تھا۔ آج ہم میں سے کتنے ہیں جو اس پر اصرار کرتے ہیں کہ 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بانئ پاکستان نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ

''پاکستان ایک مذہبی ریاست نہیں ہوگا اور یہ کہ اس نئے وطن میں مذہب، نسل، رنگ اور زبان

کو تفریق کا سبب نہیں ٹھہرایا جائے گا اور پاکستان کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔'' ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام ہر مرتبہ تنگ نظر مذہبی راہنماؤں کو مسترد کر دیتے ہیں اور جمہوریت پسندی اور روشن خیالی کے دعویدار سیاستدانوں کو حق حکمرانی سونپتے ہیں لیکن ایسی ہر جماعت اقتدار میں آنے کے بعد منافقت اور سیاسی مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے سول اور فوجی نوکر شاہی اور جاگیردار اشرافیہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ لبرل، عوام کی نمائندہ اور بانی پاکستان کے سیاسی افکار کی پیروکار ہونے کی دعویدار جماعتیں Establishment سے جس قدر خوف زدہ رہتی ہیں اس کی بہترین مثال پاکستان کا آئین ہے ان جماعتوں نے Establishment کے دباؤ میں آ کر آئین میں ایسی تبدیلیاں کیں یا ایسی ترامیم کو تحفظ فراہم کیا جس نے پاکستانی آئین کو بانی پاکستان کی سیاسی فکر سے یکسر متصادم آئین بنا کر رکھ دیا۔

آج اگر ڈاکٹر عبدالسلام اس محفل میں موجود نہیں اور وطن سے دور شدید ذہنی اذیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر وہ وطن میں اپنی بے وقعتی اور ناقدری پر غمزدہ ہیں اور اگر آج وہ اس ملک کے دوسرے درجے کے شہری ہیں تو اس کے ذمہ دار نہ پاکستانی عوام ہیں اور نہ بانی پاکستان۔ اس تمام صورت حال کی ذمہ داری ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو خود کو قائداعظم کا وارث کہتی ہیں لیکن عملاً ان کے افکار کی نفی کرتی ہیں۔ اس کی ذمہ داری ان ترقی پسند اور روشن خیال تنظیموں پر عائد ہوتی ہے جو پاکستان کے روادار اور کشادہ دل عوام کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں اور سب سے بڑھ کر اس پر اصرار کرنے سے دامن بچاتے ہیں۔ الم ناک صورت حال کے ذمہ دار ہیں ایسے تمام دانشور جو اپنی جماعتی وابستگی یا کسی خوف یا کسی مصلحت کے سبب سچ بولنے اور سچے موقف پر اصرار کرنے سے دامن بچاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام اس صدی میں طبیعیات کے شعبے کی عظیم ذہانتوں میں سے ایک ہیں۔ جس دھرتی سے ان کا خمیر اٹھا اسے ان پر ناز کرنا چاہئے تھا لیکن یہ ان کی نہیں ہماری سیہ بختی ہے کہ ہم نے انہیں جلاوطنی اور بے توقیری کے عذاب میں ڈالا۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے منافق رہنماؤں کی عمر اور

صحت انہیں لگے۔ مغرب سے متعدد معاملات پر شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ہمارے جلاوطنوں کو پناہ وہیں ملتی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر مغرب کے شہر ہمارے اس نابغہ روزگار کو پناہ نہ دیتے تو آج وہ بھی ابن تیمیہ کی طرح کسی قید خانے میں ہوتا، اسے بھی کاغذ اور قلم کی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا ہوتا اور اپنے ناخنوں سے کوٹھڑی کی دیوار پر یہ جملہ کھرچ رہا ہوتا کہ ''اگر مجھے کوئی حقیقی سزا دی گئی ہے تو وہ یہی سزا ہے۔''

سابق چیف سیکرٹری سندھ وممتاز دانشور جناب کنور ادریس

پروفیسر عبد السلام حقیقتاً ایک سچے پاکستانی تھے جس کا اظہار انہوں نے اسٹاک ہوم میں 1979ء میں ہونے والی نوبل پرائز کی تقریب سے اردو میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ جو کہ ان کا اس دھرتی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

انہوں نے ہمیشہ قرآن کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے رکھا یہی وجہ تھی کہ پہلی دفعہ سویڈن کا وہ رائل ہال قرآنی آیات سے گونج اٹھا۔ کنور ادریس نے کہا کہ آج کی محفل دراصل اس عظیم سائنسدان کو جو کہ انسانوں سے پیار کرتا ہے، محب وطن ہے، بے داغ کردار کا حامل ہے کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے۔ اس آدمی کے لئے جس نے سائنس کی ثقافت اور مذہب کے درمیان حائل وسیع خلیج کو پُر کیا۔ وہ شخص جس نے سائنس کا سب سے اعلیٰ اعزاز حاصل کیا لیکن اپنی مٹی اور اپنے وطن کو نہیں بھولا۔ ان کو ملنے والا نوبل انعام ایک ایسا اعزاز ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ ڈاکٹر عبد السلام کو اعزاز کے ساتھ جو انعامی رقم ملی اس کے لئے انہوں نے کہا یہ خدا کا ایک تحفہ ہے اور اس کی راہ میں خرچ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کا کچھ حصہ فلاح و بہبود کے شعبے میں چلا گیا اور زیادہ تر تعلیم کے شعبے میں۔ اس موقع پر کنور ادریس صاحب نے حکومت کے سامنے کچھ سفارشات پیش کیں جن میں اسلام آباد میں قائم ہونے والے متوقع فزکس سنٹر کا نام ڈاکٹر عبد السلام سے موسوم کرنا۔ لاہور کی کسی سڑک یا اسلام آباد کے کسی علاقے کو ڈاکٹر عبد السلام کا نام دینا ایک ایسے فنڈ کا قیام عمل میں لانا جو کہ ڈاکٹر عبد السلام کے نام سے موسوم ہو اور جس کا کام صرف اور

صرف سائنس کی ترویج ہو۔

ڈاکٹر عزیز حسن اشرفی

نے اپنا مقالہ ''ایک سچا پاکستانی'' کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عبد السلام صاحب سائنسی علوم کا وہ روشن مینار ہیں جن کی وجہ سے پاکستان کا نام روشن ہوا اور پاکستانی قوم کو ان پر بجا طور پر فخر ہے۔ میں نہ تو نظریاتی طبیعیات کے بارے میں کچھ جانتا ہوں نہ ڈاکٹر عبد السلام سے کوئی ذاتی تعلق رہا ایسے شخص کی نہ میں تعریف کر سکتا ہوں نہ تنقید کرنے کا اہل ہوں، ہاں ان سے ایک رشتہ ضرور ہے اور وہ ہے پاکستانی ہونے کا وہ بھی سچے اور کھرے پاکستانی ہیں اور میں بھی۔ اور یہ رشتہ ہر پاکستانی کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہے اس رشتے کو ہم کتنی اہمیت دیتے ہیں اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم خود کو کس قدر پاکستانی سمجھتے ہیں اور ہمیں پاکستان سے کتنی محبت ہے۔

انہوں نے کہا کہ آج کل بے شمار لوگ ملک سے باہر جانے، اپنی قومیت چھوڑ کر امریکہ، آسٹریلیا، برطانیہ یا کسی اور ملک کی قومیت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں اور جو اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں بڑے فخر سے اس پر ناز کرتے ہیں ۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ ان کو پاکستان یا پاکستانی قومیت سے کوئی دلچسپی نہیں ۔ بعض اوقات تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو سبز پاسپورٹ رکھنے میں ذلت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے دور میں ڈاکٹر عبد السلام کی ذات گرامی لائق صد احترام نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنا سبز پاسپورٹ تبدیل نہیں کیا حالانکہ علمی دنیا میں ان کا وہ مقام ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک ان کو اپنا پاسپورٹ دینے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

سائنس میگزین کے ایڈیٹر جناب قاسم محمود صاحب

ڈاکٹر عزیز حسن اشرفی کے مقالے کے بعد ڈاکٹر عبد السلام کے ایک دیرینہ رفیق کار ساتھی اور سائنس میگزین کے ایڈیٹر نے چند یادیں چند باتیں کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب سے اپنے دیرینہ تعلق کے واقعات پر مشتمل ایک طویل مقالہ پڑھتے ہوئے کہا۔

یکم دسمبر 1984ء ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کراچی ویسٹ نے میرے نام کا ''سائنس میگزین'' کا

ڈیکلریشن کیا جاری کیا، میں اپنے آپ میں نہ رہا۔ یوں لگتا تھا کہ اس ملک میں انقلاب لے آنے کی جو نوید عرصہ دراز سے کانوں میں پڑ رہی ہے وہ یہی رسالہ برپا کرے گا۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

رومان خیز خواب اور سوکھے ہوئے پھول نہیں اصل چیز ہے سائنس ہمارے معاشرے کی اولین ضرورت سائنس۔ چنانچہ تلاش بسیار کے بعد ملک کے پچاس بڑے سائنس دانوں کی ایک فہرست بنائی گئی اور انہیں طلبی مضمون کا خط لکھ بھیجا۔ پانچ بڑے عالمی شہرت یافتہ سائنس دانوں سے مضامین کے علاوہ اہل پاکستان کے لئے ان کا پیغام خاص بھی طلب کیا۔ آرتھری کلارک، آئزک اسمو، پروفیسر کارل ساگاں، جاپان کے ڈاکٹر کوڈانشا اور ڈاکٹر عبدالسلام امپیریل کالج لندن۔

سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالسلام کا مضمون، پیغام اور ایک ٹائپ شدہ خط موصول ہوا جو ٹریسٹ اٹلی سے آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے آخر میں اردو میں سرخ روشنائی سے دستخط کرتے وقت اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا۔ ''میں آپ کا دیرینہ مداح ہوں''۔ یہ ایک جملہ ہمیشہ کیلئے میری روح میں اتر کر، جینے کی خواہش کو دوآتشہ کر گیا۔ لفظ ''شاباش'' یا کوئی اور حوصلہ افزا کلمہ آدمیوں کی روحانی زندگی میں غذا کی نہیں، تو سلاد کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ کیا یہ اس پرانے دفتری تعلق کی طرف اشارہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی کے دوران ملازمت پیدا ہو کر وہیں کا وہیں منقطع بھی ہو گیا تھا؟ یا کیا یہ میری ان تحریروں کی طرف اشارہ تھا جو شوق فضول میں مجھ سے سرزد ہو گئی تھیں؟ مگر ان کا دائرہ تو صرف پاکستان تک محیط تھا۔ یہ لندن میں رہنے والا سائنس داں میرے کام سے کیسے واقف ہوا ہو گا؟ یقیناً یہ یونیورسٹی ہی کی ابتدائے جوانی کی یادوں کا زور ہے.....ڈاکٹر صاحب کا پیغام محبت کے ساتھ ''سائنس میگزین'' کے شمارہ اوّل کے صفحہ اول پر شائع ہوا۔ دوسرے شمارے کا سرورق ان کی رنگین

تصویر سے مزین تھا۔شاہد محمود ندیم نے لندن میں ان سے انٹرویو کیا تھا۔ وہ بھی کور اسٹوری کے ساتھ چھپا۔اس کا ایک جملہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔جس میں انہوں نے کہا:

''میری زندگی میں فقط دو دکھ ہیں ۔ایک یہ کہ پاکستان میں سائنس دانوں کی اتنی توقیر نہیں جتنی ہونی چاہئے ۔دوسرے یہ کہ عالم اسلام میں سائنس کی اتنی قدر نہیں،جتنی ہونی چاہئے ۔''

''سائنس میگزین'' طلبہ میں خاصی تیزی سے مقبول ہوتا گیا۔ میں نے تو اسے واقفیت عامہ کی نوعیت کا ایک عام سا معلوماتی جریدہ بنانا چاہا تھا لیکن ڈاکٹر عبدالسلام کے اثر سے، نادانستہ طور پر یہ اچھا خاصا سائنسی رسالہ اردو کے ہاتھ آ گیا۔اب میری ڈاک میں دنیا بھر سے سائنسی لٹریچر آنے لگا۔ نیو سائنٹسٹ ویکلی، نیچر، سائنٹیفک امریکن جیسے بلند پایہ جرائد، استنبول، قاہرہ اور اردن وغیرہ کے اشاعتی اداروں سے کتب و جرائد موصول ہونے لگے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی فرمائش پر آپ کو بھیجے جا رہے ہیں۔کوئی چینی میں،کوئی جاپانی میں،کوئی عربی میں،کوئی ترکی میں ۔

زبان یار من ترکی، ومن ترکی نمے دانم

گویا ایک بہت ہی غیر سائنسی بے عقلے کے کاندھوں پر سائنسی ادب کا بار لاد دیا گیا تھا۔ میں ادب تو پڑھتا رہتا تھا لیکن اب آنکھوں کو اور ذہن کو سائنس کے لئے تیار کرتا تھا۔ جو شخص دور بیٹھا میری خاطر، سائنس کی خاطر، اردو کی خاطر، پاکستان کی خاطر احسانات کئے جا رہا ہے، میرا بھی فرض ہے کہ حسب توفیق ان کا حق ادا کیا جائے۔ میں نے ڈکشنریوں، انسائیکلو پیڈیا اور گائیڈ بکس اور Self Teaching Mentods کے ذریعے آمدہ کتب و رسائل کا لفظاً لفظاً مطالعہ کیا اور طبیعیات، کیمیا فلکیات، جینی انجینئرنگ، حیاتیات وغیرہ یعنی ایک ریاضی کو چھوڑ کر، باقی جدید سائنسی علوم کے جدید تر نظریات سے دوستی کر لی۔ ڈاکٹر صاحب میرے مثالی قاری تھے۔ مَیں دراصل انہی سے پڑھوانے کے لئے یہ پرچہ ایڈٹ کرتا تھا۔ وہ اکثر رسالہ پڑھ کر اپنی رائے، مشورے اور غلطیوں کی نشاندہی سے نوازتے رہتے تھے۔

چند ماہ کے بعد مجھے اٹلی سے ایک تار موصول ہوا کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بنگلہ دیش جاتے

ہوئے راستے میں پاکستان کے فلاں ائرلائن کی فلاں پرواز سے گزریں گے آپ ان سے ملاقات کرنا چاہیں تو کرلیں۔اب سوال یہ درپیش تھا کہ ان سے کس موضوع پر گفتگو ہونی چاہئے۔محض ملنا تو دوسرے کا وقت ضائع کرتا ہے۔کوئی ایسی گفتگو ہونی چاہئے جس کا فائدہ سائنس میگزین کے قارئین کو بھی پہنچے۔اس زمانے میں انگریزی وارددو اخبارات میں ڈاکٹرعبدالسلام اور میجر آفتاب حسن کے درمیان اس دیرینہ مسئلے پر تازہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ اردو میں سائنسی اصطلاحات کا استعمال ہو تو کیونکر ہو۔میرے رسالہ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔میں آدھا ڈاکٹر صاحب کا طرف دار تھا، آدھا میجر آفتاب کا۔نتیجہ یہ کہ آدھی ڈانٹ ڈاکٹر صاحب سے کھائی، آدھی میجر صاحب سے۔ڈاکٹر صاحب کی ساری عمر لندن میں گزری کہتے تھے کہ تمام اصطلاحات کو جوں کا توں اردو رسم الخط میں لکھ لینا چاہئے۔میجر صاحب جامعہ عثمانیہ کے پروردہ کہتے تھے عربی اور فارسی اردو کی مادر زبانیں ہیں ان سے استمداد لازمی ہے۔ میں دونوں کے درمیان کھڑا تھا۔ کہتا تھا کہ کچھ بین الاقوامی اصطلاحیں تو جوں کی توں اردو میں لکھی جاسکتی ہیں، تمام اصطلاحات نہیں۔میں نے ڈاکٹر صاحب کی رائے انہی سے باطل قرار دلوانے کے لئے سندھ ٹیکسٹ بورڈ کی شائع کردہ ''جنرل سائنس'' برائے جماعت نہم کی نصابی کتاب بغل میں داب لی۔

ایئرپورٹ کے وی آئی پی روم میں، میں پہلا شخص تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہشاش بشاش اور تازہ دم لگ رہے تھے۔ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر بہت خوش ہوئے۔صوفے پر بیٹھتے ہی انہوں نے جیبی قرآن مجید نکالا۔کچھ پڑھا۔یا تو متجسس ذہن میں کوئی نیا سوال پیدا ہوا ہوگا جس کی توثیق یا تردید کے لئے قرآن کریم کی مدد لی ہوگی یا سفر خیریت سے طے ہوجانے کی دعا پڑھی ہوگی۔اس کے بعد میرا حال چال پوچھا۔میں نے انگریزی میں بولنا شروع کیا۔کہا ''نہیں سید صاحب پنجابی یا اردو۔انگریزی بول بول کر جبڑے تھک جاتے ہیں۔''

نومبر 1992ء کے آخری ہفتے میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام کویت میں چوتھی

جنرل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پانچوں براعظموں کے 78 ملکوں سے تین سو سے زائد سائنس دانوں نے شرکت کی تھی اور مجھے بھی ''فرض پر محبت کی ترجیح'' کی بنیاد پر بلاوا آ گیا تھا۔ ویسے یہ بات میری ذات تک محدود نہ تھی۔ کانفرنس کے عام شرکاء آپس میں طنزاً کہا کرتے تھے کہ عبدالسلام نے اپنے وطن پاکستان کے سب سے زیادہ نمائندے بلائے ہیں۔ میریڈین ہوٹل کے کشادہ ہال میں سویڈن اور سوئٹزرلینڈ کے چٹے بھی تھے، گیمبیا اور تنزانیہ کے سیاہ فام بھی، امریکہ برطانیہ کے لمبے تڑنگے گورے بھی، چین جاپان کے پیلے زرد بھی، ہندوستان پاکستان کے سانولے بھی دنیا میں انسان کی جتنی بھی نسلیں اور جتنے بھی رنگ ہو سکتے ہیں ان سب کے لوگ یہاں موجود تھے۔ دنیا میں جتنے بھی مذہب اور عقیدے رائج ہیں، ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگ اس ایک چھت تلے جمع تھے۔ کرہ ارض پر موجود انسان جتنی بھی زبانیں بولتا ہے، ہر زبان کے بولنے والے یہاں دور دور سے آ کر حاضر و شریک تھے۔ ہزار ہا سال کی تحقیق و کاوش کے بعد انسان نے جتنے بھی سائنسی علوم ایجاد کئے ہیں، ہر شعبہ علم کے ماہرین خصوصی یہاں موجود تھے.....اور یہ بین الاقوامی انسانیت کا اجتماع ایک اور صرف ایک شخص ڈاکٹر عبدالسلام کا مرہون منت تھا۔

حسب پروگرام ٹھیک آٹھ بج کر تیس منٹ پر عقبی دروازہ کھلا اور دو مددگار ایک وھیل چیئر کو سہارا دیتے ہوئے آہستہ آہستہ ہال میں داخل ہوئے۔ تمام حاضرین خیر مقدمی تالیاں بجاتے ہوئے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یہ اظہار عقیدت پاکستان کے اس جلیل القدر سائنس دان کے لئے تھا جس نے پرائمری جماعت سے لے کر آج تک چودہ تا سولہ گھنٹے روزانہ لگن اور محنت سے یہ مقام حاصل کیا تھا۔

ڈاکٹر سلام کی بیمار بردار کرسی آہستہ آہستہ سرکتی ہوئی جب مرکزی میز کے کنارے پر آن لگی تو انہوں نے عقیدت کا جواب کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ دیا کیونکہ ہاتھ ہلا نہیں سکتے تھے اور گردن کی خفیف سی حرکت سے حاضرین سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ہال میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ اکیڈمی کے سیکرٹری جنرل نے افتتاحی اجلاس کا ایجنڈا اپنے دونوں

ہاتھوں سے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں کے قریب کر دیا۔ انہوں نے ایجنڈے پر نظر دوڑائی۔ ہال میں تمام مائکروفون گونج اٹھے۔''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ''میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے روسی نمائندے نے پوچھا ''سلام نے کیا کہا ہے''۔ میں نے کہا ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے'' اس نے پوچھا ''یہ اللہ کیا چیز ہے؟''۔ میں ''GOD.....WITH CAPITAL''۔ بولا ''حیرت ہے۔ اتنا بڑا آدمی بھی مائی تھولوجی پر BELIEVE کرتا ہے''۔

ایک عجب منظر میری آنکھوں کے سامنے کھلا تھا۔ اگر کوئی مسلمانوں کے سامنے پڑھے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' تو کافر اور اگر وہی شخص کافروں کے سامنے پڑھے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ''تب بھی کافر۔ شاعر نے ایسے ہی سنگ دل موقع کے لئے کہا تھا

''دست تہ سنگ آمدہ، پیمان وفا ہے''۔

جنرل کانفرنس کی آخری شام پاکستان کے سفارت خانے میں پاکستان سے آئے ہوئے پاکستانیوں کے اعزاز میں ایک تقریب ہوئی۔ سفیر محترم کرامت علی غوری نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر عبدالسلام اور دوسرے مشاہیر کا تعارف کرایا، ڈاکٹر پروفیسر عطاء الرحمٰن، پروفیسر سید ارتفاق علی، پروفیسر اے کیو انصاری، ڈاکٹر امیر محمد خان، ڈاکٹر سعید اے درانی، پروفیسر وقارالدین احمد، ڈاکٹر ظفر ایچ زیدی وغیرہ۔ پھر حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے جوشیلے انداز میں کہا ''چند ماہ پہلے جب یہاں عمران خان اپنے ہسپتال کے لئے چندہ لینے آیا تھا تو یہاں چندہ دینے والوں کی قطار لگ گئی تھی اور ایک گھنٹے کے اندر اندر تقریباً آٹھ لاکھ روپے جمع ہو گئے اور یہ تو ہمارے پاکستان کے لوگوں کی تعلیم اور سائنس کا معاملہ ہے اور یہ اس سے بھی بڑا نیک مقصد ہے۔ امید ہے کہ آپ لوگ بڑھ چڑھ کر چندہ دیں گے۔''

سفیر محترم کی تقریر کے بعد میری باری آئی۔ جب سے میں کویت آیا تھا، ڈاکٹر صاحب سے یہ میرا پہلا آمنا سامنا تھا۔ وہ میرے دائیں پہلو میں اپنی وھیل چیئر میں براجمان تھے اور زندہ دلان پاکستان کی محفل میں بیٹھ کر لندن اور ٹریسٹ اور میریڈین ہوٹل والے جناب ڈاکٹر عبدالسلام نہیں

رہے تھے بلکہ ان کے اندر سے جھنگ والا دیہاتی نکل کر اپنے یاروں پیاروں میں شریک ہو گیا تھا۔ جب میں کراچی سے چلا تھا تو میں نے چلتے وقت ہمشیرہ صاحبہ کو فون کیا تھا کہ میں کویت جا رہا ہوں۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو کچھ بھیجنا ہو تو، کوئی چیز یا کوئی پیغام وغیرہ ہو تو بتا دیں لیتا جاؤں گا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے کہا ہاں ایک کام ہے تو سہی لیکن آپ کر نہیں پائیں گے۔ میں نے کہا ضرور کروں گا۔ فرمایا ''بھائی صاحب اگر اس ہجوم عاشقان میں آپ کو کہیں میرا بھائی، سمجھے نا آپ نے کہا میرا بھائی نظر آ جائے تو اس کو اس بہن کا سلام پہنچا دینا''۔ مَیں نے اپنی گفتگو کا آغاز بہن کے اس جملے سے کیا۔ اچانک مجھے ڈاکٹر صاحب کی سسکی لینے کی آواز آئی۔ میرے پہلو میں بیٹھا ہوا، کرسی میں دھنسا ہوا ان کا بھاری بھرکم بدن ہل رہا تھا اور آنسو یکے بعد دیگرے ان کے چہرے پر پھیل رہے تھے۔ ماحول ایک دم اداس ہو گیا۔ رنگ محفل متغیر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ علالت کی وجہ سے حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ آنسوؤں نے اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیا اور خود داڑھی کے بالوں میں چھپ گئے۔

اپنے صدارتی کلمات میں انہوں نے تقریر کیا کی گویا بھیک مانگی۔ مَیں کیا عرض کروں میں تو آپ سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ اللہ نے آپ کو توفیق دی ہے۔ ہماری اکیڈمی کے لئے کوئی صدقہ خیرات دیجئے، جو غریب اور ترقی پذیر ملکوں میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی و ترویج کے لئے کام کر رہی ہے۔ آپ اکیڈمی کو چندہ نہیں دینا چاہتے نہ دیں لیکن مَیں یہ بات زور دے کر کہوں گا کہ آپ کا پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ اپنے مادری علمی کو ضرور بالضرور اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہا کیجئے۔ جس اسکول یا کالج میں آپ نے تعلیم حاصل کی ہے، جہاں سے تعلیم حاصل کر کے آپ اس لائق ہوئے ہیں کہ یہاں آ کر ملازمت کر سکیں، اس کا بھی آپ پر حق ہے اور بہت حق ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ پاکستان کے اسکولوں اور کالجوں میں لائبریریوں اور لیبارٹریوں کی کیا حالت ہے۔ کہیں ضروری ساز و سامان نہیں۔ کہیں کتابیں نہیں۔ کہیں فرنیچر نہیں۔ کہیں دیواریں ادھڑی ہوتی ہیں۔ کہیں کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ آپ کم از کم اپنے اسکول یا کالج کی یہ چھوٹی موٹی ضرورتیں تو پوری کر سکتے ہیں۔ آپ اس کو بھی چھوڑیئے۔ ہمارے ملک میں معاشی لحاظ سے سب سے کمزور

پیشہ استاد کا ہے حالانکہ استاد کا درجہ بڑی فضیلت رکھتا ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے اساتذہ کی وجہ سے ہیں۔ آپ کے اساتذہ ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کی معاشی حالت اور بھی دگرگوں ہو گئی ہو گی۔ ان کے بیٹے بیٹیاں شادی کے لائق ہو گئے ہوں گے۔ آپ کی نیک کمائی میں ان کا بھی حق ہے۔ اپنے اسکول، کالج اور استاد کی خدمت کرتے رہا کیجئے۔ اس معمولی خدمت سے بھی بہت کچھ حاصل ہو جائے گا۔'' ان نصیحتوں کا ''اثر'' یہ ہوا کہ اجلاس میں کسی نے ایک دھیلا بھی چندہ جمع نہیں کرایا۔ شاید کہ اس کے لئے شوبز یا کھیل تفریح کا آدمی ہونا ضروری ہے۔

اگلے روز دس بجے صبح میری روانگی تھی۔ مَیں ڈاکٹر صاحب سے الوداعی مصافحے کے لئے لفٹ سے نیچے اترا۔ ان کا کمرہ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ ہوٹل کی وسیع و کشادہ انتظار گاہ کے ختم ہونے پر عین صدر دروازے سے کوئی دو میٹر کے فاصلے پر ایک وھیل چیئر رکھی ہوئی تھی۔ وھیل چیئر کے اندر ایک انسان تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کرسی کی ہتھیوں پر پڑے ہوئے تھے۔ گرم لمبے کوٹ میں ملبوس، سر پر سیاہ بالوں والی ٹوپی، گلے میں براؤن مفلر، دنیا کے مختلف ملکوں کی تیس یونیورسٹیوں سے سب سے زیادہ ڈاکٹر آف سائنس کا اعلیٰ ترین اعزازی اکیڈمک ایوارڈ پانے والا شخص دنیا کا سب سے بڑا علمی انعام نوبل پرائز حاصل کرنے والا واحد پاکستانی فاضل، ہزار ہا سال سے رائج و قائم چار مادی قوتوں کو گھٹا کر تین ثابت کرنے والا، تاریخ سائنس کی پیشانی پر اپنا ابدی نام ثبت کرنے والا محقق، نظریاتی طبیعیات کی تحقیق کا دنیا کا سب سے بڑا ادارہ قائم کرنے والا جھنگ کا عام سا انسان، تیسری دنیا کی سب سے بڑی اور فعال ترین سائنس اکیڈمی کا بانی، سینکڑوں مقالات لکھنے والا مصنف آج کس قدر بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ، لیکن کیسی شائستگی اور عظیم اسلامی و انسانی اخلاقی روایات کے ساتھ اپنے تین سو مہمانان عزیز کو الوداع کہنے کے لئے سب سے پہلے صدر دروازے پر آن کھڑا ہوا تھا۔

مَیں شش و پنج میں پڑا ہوا تھا۔ مَیں ان کے پاس مصافحے کے لئے جاؤں یا نہ جاؤں۔ گذشتہ شام میں نے ان کو بڑی تکلیف پہنچائی تھی۔ بہتر ہے کہ مَیں ان سے ملے بغیر ہی چلا جاؤں۔ یہ برا

ماننے والا شخص نہیں ہے۔ ابھی میں مڑنے ہی والا تھا کہ ان کی گردن میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ ان کی دور بین نظروں نے مجھے دیکھ لیا۔ مَیں ان کے قریب گیا۔ ان کی خرخراہٹ والی خفیف آواز سننے کے لئے اپنا چہرہ ان کے چہرے کے بالکل قریب کر لیا۔ کہنے لگے ’’کل آپ نے ڈاکٹر عثمانی کا ذکر کر کے بہت اچھا کیا۔ مجھے سکون پہنچا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور وہ آپ کے حلق میں جو سرطان ہو گیا تھا اس کا کیا حال ہے؟‘۔ اور کہا ’’میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ جائیے پاکستان کی خدمت کیجئے۔ خط لکھا کریں اور اگر احباب میرا حال پوچھیں تو کہنا اب اچھا ہے۔ جو بھی ملے اسے میرا اسلام کہنا۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس عالم صاحب سے ایک انٹرویو

آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی فزکس اور درھم یونیورسٹی یو کے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کو امپیریل کالج لندن میں پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ آپ کا تدریسی اور تحقیقی تجربہ 30 سال پر محیط ہے۔ آپ کے 19 سے زائد ریسرچ آرٹیکلز مختلف ملکی وغیر ملکی جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ آپ نے اٹامک فزکس، نیوکلیئر اینڈ پارٹیکلز فزکس اور سالڈ سٹیٹ فزکس کے موضوعات پر کتب تحریر کیں اور کئی کتب کے تراجم بھی کئے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبد السلام کی کتاب یونیفیکشن آف فنڈامنٹل فورسز کا ترجمہ بھی مکمل کر چکے ہیں جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ 89-1988ء میں سترہ ماہ کیلئے آپ نے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس (اٹلی) میں وزٹنگ سائنٹسٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا آپ 20 سے زائد غیر ملکی کانفرنسز اور ورکشاپس میں پاکستان کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ رسالہ خالد کے قارئین کیلئے محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے بارے میں جو آپ نے انٹرویو دیا وہ پیش خدمت ہے۔

سوال: ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے آپ کا رابطہ کیسے ہوا؟

جواب: پہلی دفعہ میں نے راولپنڈی میں ایک سکول ہیڈ ماسٹر کے کہنے پر ڈاکٹر صاحب کی تصویر دیکھی تھی۔ پھر 1960ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں Ph.D کے دوران ڈاکٹر صاحب کے بعض لیکچرز سننے کا موقع ملا اور انہی لیکچرز سے پارٹیکلز اور فنڈامنٹلز کے بارے میں کچھ آئیڈیا ہوا اور میں سے مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں تھیوریٹکل فزکس میں مزید تعلیم حاصل کروں۔ 1964ء میں جب میں Ph.D کا مقالہ لکھ رہا ہے تو مجھے ایک سکالرشپ ملا اور میری فزکس میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خان نے لندن ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ ہمارا ایک طالب علم سکالرشپ پر یہاں آرہا ہے آپ اسے امپیریل کالج میں ایڈجسٹ کروادیں۔ چنانچہ سلام صاحب نے مجھے امپیریل کالج میں Ph.D کیلئے ایڈجسٹ کروا دیا۔لیکن اسی دوران ڈاکٹر صاحب ICTP کے ڈائریکٹر بن کر ٹریسٹ (اٹلی) چلے گئے اور ان سے رابطہ کم ہوتا ہے۔ ملاقاتوں کا موقع ملا۔ 1967ء میں Ph.D کے بعد میں واپس پاکستان آ گیا۔ اور 1970ء میں پہلی دفعہ میں نے گرمیوں کی چھٹیوں کے دو تین ماہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے پاس اٹلی میں گذارے۔ اس کے بعد تقریباً ہر سال میں سلام صاحب کے پاس حاضر ہوتا رہا ہوں۔ اس طرح میری ڈاکٹر سلام صاحب سے بہت ملاقاتیں ہوئیں اور مَیں نے ڈاکٹر صاحب سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور میرا جو سارا کیریئر ہے اس کے بنانے میں ڈاکٹر سلام صاحب کا ہی بنیادی کردار ہے۔

سوال:۔ اس وقت دنیا بھر میں بہت سے سائنسدان کام کر رہے ہیں۔لیکن سلام صاحب میں وہ کونسی خوبیاں تھیں جو انہیں دوسرے سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

جواب: ڈاکٹر سلام صاحب کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کام کیا وہ بنیادی نوعیت کا ہے اور اس کے اثرات ساری فزکس پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً میں کہ کائنات کی جو قوتیں ہیں ان پر کام کرنے والے بمشکل چند درجن لوگ ہوں گے اور ان میں سے چونکہ سلام صاحب کو نوبل پرائز ملا اس لئے وہ نمایاں ہیں اور اس طرح اس صدی کے جو دس پندرہ چوٹی کے سائنسدان تھے اکثر سلام

صاحب کا ان میں شمار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ باقی سائنسدانوں کو تو صرف اپنی فیلڈ میں ہی دلچسپی ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر سلام صاحب نے ''فزکس بطور سبجکٹ'' کے پھیلاؤ اور فروغ کیلئے بہت کام کیا ہے اور اس کام کیلئے بے شمار ادارے بنائے۔ اور بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کیلئے ڈاکٹر صاحب کی نمایاں خدمات ہیں۔ ٹریسٹے میں واقع ICTP اس کی زندہ مثال ہے۔

تیسری بات جو ڈاکٹر صاحب کو دوسرے تمام سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو عام انسانیت سے بھی بہت محبت تھی اور آپ ان کی فلاح و بہبود کیلئے بھی بہت کام کرتے رہے ہیں۔ یہ چیزیں ہمیں اس دور کے باقی سائنسدانوں میں اس طرح نظر نہیں آتیں۔

سوال: ڈاکٹر عبدالسلام کی کوششوں سے اٹلی میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کا جو ادارہ بنا اس سے ترقی پذیر ممالک اور بالخصوص پاکستانی سائنسدانوں کو کون سے فوائد حاصل ہوئے۔

جواب:۔ ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کے واسطے Treaste میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ICTP کا جو ادارہ بنا اس لحاظ سے وہ بہت اہم ہے کہ یہاں پر دنیا کے چوٹی کے سائنسدان آتے ہیں۔ اسی طرح ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کا اس سنٹر میں ان سے رابطہ ہو جاتا ہے اور اس وقت فزکس میں جو بھی نمایاں کام ہو رہا ہے وہ ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو فزکس میں نمایاں کام کرنے والے ان سائنسدانوں سے براہ راست پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان اس سے پہلے سائنسی میدان میں Isolation محسوس کرتے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی شدت سے اس Isolation کو محسوس کیا تھا۔ لیکن اس ادارہ کے قیام سے ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو بھی فزکس کے بڑے بڑے سائنسدانوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسر آ گئے اور جن مشکلات کا سامنا سلام صاحب کو کرنا پڑا اس ادارہ کے قیام سے سلام صاحب نے ان کا حل کر دیا۔ جہاں تک اس ادارے سے پاکستانی سائنسدانوں کو ملنے والے فوائد کا تعلق ہے تو اس وقت پاکستان میں فزکس کے جتنے بھی Active سائنس دان ہیں ان سب کو اس ادارے میں کام

کرنے کا موقع ملا اور اس سے انہیں ریسرچ کے میدان میں کافی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

سوال: پاکستان میں سائنس کے فروغ کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے جو کردار ادا کیا اس پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: اصل میں پروفیسر عبدالسلام اور پاکستانی سائنس کو علیحدہ کیا ہی نہیں جاسکتا چونکہ وہ پچاس کی دہائی سے ہی پاکستانی سائنس سے وابستہ رہے اور 1974ء تک صدر کے سائنسی مشیر بھی تھے۔ اس لئے پاکستان میں سائنس کے جتنے بھی ادارے بنے اور پاکستان کے جتنے بھی سائنس دان ٹرینڈ ہوئے ان سب میں سلام صاحب کا بنیادی کردار ہے۔ اور یہ بدقسمتی ہے کہ 1974ء میں جب ڈاکٹر صاحب یہاں سے چلے گئے تو ان کی جگہ لینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ یعنی ان کی مناسب Replacemnt نہیں ہوسکی۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کے بعد باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت سائنسدانوں کی ٹریننگ کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا اور اس وقت ہم شدید بحران سے دوچار ہیں کیونکہ اس وقت فزکس کے پاکستانی سائنس دانوں میں جو فعال ہیں وہ سب کے سب عمر کے لحاظ سے 50 کے لگ بھگ ہیں اور اس کے بعد 10، 15 سال کا گیپ نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہاں سے چلے گئے تھے۔ اور بعد میں ان کی Replacemnt نہیں ہوئی۔

سوال: ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو ناگزیر وجوہات کی بناء پر پاکستان سے جانا پڑا کیا اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب پاکستان میں سائنس کی ترقی کیلئے کام کرتے رہے۔

جواب: پاکستان سے جانے کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ پاکستان میں کسی طرح سائنس کی ترقی ہو۔ اس لحاظ سے میرے پر بھی ان کی خاص شفقت تھی۔ کیونکہ میں اپنی ریسرچ کے علاوہ پاکستان میں سائنسی ترقی کے بارے میں لکھتا رہتا ہوں۔ تو جب بھی ڈاکٹر صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے اس بارے میں نہایت مفید مشورے دیئے۔ پاکستان میں سائنسی ترقی کے بارے میں ان کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ اور وہ انفرادی، اجتماعی اور Institutional صلح پر ہر طرح سے کوشش کرتے رہے کہ پاکستان سائنسی میدان میں ترقی کرے۔

سوال: پاکستان اور پاکستانیوں سے ڈاکٹر صاحب کے جذبات کسی قسم کے تھے؟

جواب:۔ پاکستانیوں اور پاکستان سے ڈاکٹر صاحب کو بہت محبت تھی۔ مثلاً جب بھی ہم نے وہاں جانا انہوں نے فوراً پنجابی یا اردو میں بات کرنی شروع کر دینی۔ جب بھی ان سے پاکستان کے حالات پر بات ہوتی جذباتی ہو کر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ پاکستانیوں کیلئے سلام صاحب کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔

سوال:۔سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ایک انسانیت دوست شخص بھی تھے۔اس بارے میں آپ ہمارے قارئین کو کچھ بتائیں گے؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ آپ بہت انسانیت دوست تھے۔ میں 84ء سے 85ء کے درمیان تقریباً ڈیڑھ سال ڈاکٹر صاحب کے ساتھ رہا۔ ڈاکٹر صاحب کو جو خطوط آتے ان میں سے اردو خطوط کے جواب دینے کا کام میرے سپرد تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ لوگ کیسے کیسے مسائل ڈاکٹر صاحب کو لکھتے ہیں۔جن میں سائنسی اور عمومی مسائل کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔اور ڈاکٹر صاحب سب کو نہ صرف جواب دیتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ان کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتے اور یہ ڈاکٹر صاحب کا مستقل طریق تھا۔اور آپ کی اسی فراخدلانہ عنایات اور ہر ممکن اعانت اور تعاون کی بناء پر ہماری فزکس کی کمیونٹی میں مشہور تھا کہ ڈاکٹر سلام کو خط لکھنے میں ہمیشہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سلام صاحب کے گرد مختلف دائرے تھے پہلا دائرہ ان کی فیملی اور کمیونٹی کا تھا۔ دوسرا پاکستانی کا پھر اسلامی ممالک کا پھر ترقی پذیر ممالک کا اور پھر پوری دنیا کا دائرہ۔اس طرح انہوں نے ہر دائرے کے حوالے سے کام کیا اور پاکستان میں یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر سلام مختلف رسالوں خاص طور پر مہلک ہتھیاروں کے خاتمے کی تحریک چلانے والے رسالے بلیٹن آف اٹامک سائنسز،جس کے بانیوں میں آئن سٹائن بھی تھا اس کے بورڈ آف ایڈیٹرز کے بھی ممبر تھے۔اور ڈاکٹر سلام ہمیشہ Peaceful دنیا کیلئے کام کرتے رہے۔جس میں ہر طرف امن اور

خوشحالی ہو۔اس کی ایک اور مثال میرے سامنے ہے 80 کے دہائی میں جب ریگن امریکہ کا صدر بنا تو اس نے ہتھیاروں کی نئی دوڑ شروع کر دی۔ جسے Star War کہا جاتا ہے۔اس کا خیال تھا کہ ایک ایسا سلسلہ بنائیں جس میں امریکہ کے اوپر ایسے سیٹلائٹس ہوں جو روس وغیرہ کی طرف سے آنے والے میزائلوں کو روک لیں۔ امریکی سائنسدان اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ایک تو یہ سلسلہ تقریباً ناممکن تھا دوسرے اس پر اتنا خرچ آتا کہ اگر اس کو دوسری جگہ خرچ کیا جائے تو انسانیت کا بہت بھلا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سلام صاحب نے امریکی اور دیگر یورپی سائنسدانوں سے مل کر اسٹار وار پروگرام کے خلاف مہم چلائی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ He was a Universal Man ایسے عالمی آدمی تھے کہ ان کی بات سنی جاتی تھی۔ باہر کے ممالک میں ڈاکٹر صاحب کو بہت سے فورمز پر خطاب کا موقع ملا جن میں وہاں کے ممالک کے صدور اور وزراء اعظم بھی شامل ہوتے تھے۔لیکن پاکستان میں انہیں پبلک کو ایڈریس کرنے کے بہت کم مواقع ملے۔ 1986ء میں وہ کافی عرصہ کے بعد پاکستان آئے تو ہم نے ان کے ایک لیکچر کا اہتمام کیا تھا تو اس لیکچر میں اتنے لوگ آئے کہ سارا ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ پاکستانی عوام ان سے محبت کرتی تھی لیکن بدقسمتی سے ہم نے انہیں ایسے مواقع فراہم نہیں کئے جن میں پاکستانی عوام کے ساتھ ان کا براہ راست رابطہ ہو سکے۔(انٹرویو مکرم حافظ راشد جاوید صاحب)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کا دورۂ تنزانیہ (مشرقی افریقہ)

(مکرم عبدالوہاب احمد صاحب سابق امیرو مشنری انچارج تنزانیہ)

تیسری دنیا کا درد

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے دنیائے انسانیت اور بالخصوص

تیسری دنیا کی دکھی انسانیت کا درد اور سسکتی جانوں کا دکھ دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے غریب ملکوں کے سائنس میں ترقی کیلئے ہر قسم کی مالی قربانی کے ذریعہ ان کے فلاح و بہبود کے سامان کرتے۔ انہیں جو مختلف انعامات ملتے تھے وہ غریب ملکوں کے سائنسدانوں کی تربیت سے تعلق رکھنے والے اداروں کو دے دیتے تھے۔ دنیا میں انہوں نے عالمی سطح کے کئی سائنسی ادارے قائم کر کے دکھی انسانیت کی خدمت کی۔ ٹرسٹ اٹلی میں آپ کے قائم کردہ ادارہ سے ہی اب تک چالیس ہزار سائنس دان استفادہ کر چکے ہیں۔ پس غریب دنیا کیلئے آپ بے حد دکھی رہتے تھے اور ملک ملک میں پہنچ کر لوگوں کو غربت کے چنگل سے نجات کی راہیں بتاتے تھے۔ تنزانیہ ایسٹ افریقہ کا دورہ بھی ان کی اسی تڑپ اور جذبہ ہمدردی خلائق کی کڑی تھی۔

دارالسلام ائیر پورٹ پر ورود

مارچ 84ء کو اٹلی سے عازم تنزانیہ ہوئے اور دارالحکومت دارالسلام کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر ورود فرما ہوئے۔ خاکسار، میجر جنرل چوہدری نواز سفیر پاکستان مقیم تنزانیہ، صدر جمہوریہ تنزانیہ کے خصوصی نمائندہ اور وائس چانسلر یونیورسٹی تنزانیہ نے جہاز کے ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد دروازہ کھلتے ہی آگے بڑھ کر پروفیسر صاحب کو خوش آمدید کہا انہوں نے ہمیں مصالحہ اور معانقہ سے نوازا اور ہمارے ساتھ وی آئی پی لاؤنج میں تشریف لائے۔ جہاں دیگر اعلیٰ حکام نے آپ کا استقبال کیا۔

خوشی و غم کے آنسو

جہاز سے باہر آتے وقت ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وی آئی پی لاؤنج میں پہنچ کر ضبط نہ رہ سکا اور آنسو برس پڑے۔ سب حیران تھے اور سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آخر یہ آنسو کیسے ہیں۔ ایک اخباری نمائندہ یا کسی اور اعلیٰ شخصیت نے بالآخر پوچھ ہی لیا کہ جناب ڈاکٹر صاحب یہ آنسو کیسے ہیں۔ جواباً ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ۔ ''میرے یہ آنسو خوشی و غمی کے امتزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ خوشی اس بات سے ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیارے اور باوقار عاشق

صحابی سیدنا بلال ؓ ہاں وہی بلال ؓ جس نے اپنے خون سے بستان دین محمد ﷺ کو سینچا اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان واقرار کے پاداش میں تپتی ہوئی ریت اور گلیوں کے نوکیلے سنگریزوں پر گھسیٹا جاتا تھا جوان کے قطرات خون، ان کی محمد ﷺ اور رب محمد ﷺ سے عشق و وفا کی داستان رقم کرتے تھے کی سرزمین پر قدم رکھنے کی توفیق وسعادت پائی ہے اور رنج وغم اس وجہ سے ہے کہ اس عاشق رسول ﷺ کی قوم غربت اور بھوک وافلاس کی چکی میں کیوں پس رہی ہے۔'' آپ کے اس جواب سے عجیب سماں بندھ گیا اور سب اپنے سر جھکائے آپ کے آنسوؤں کو اپنے لئے قسمت نو بہار کے پھول کہتے ہوئے پکار اٹھے۔

O, our dear brother Most Welcome

افریقنوں سے محبت۔ انوکھے انسان

ایئر پورٹ سے گاڑیاں ایمبیسی ہوٹل جہاں ڈاکٹر صاحب کے قیام کا انتظام تھا روانہ ہوئیں۔ ایئر پورٹ سے باہر قطار در قطار کھڑے استقبال کرنے والوں کے ہاتھ جونہی ہوا میں لہرائے ڈاکٹر صاحب نے استفسار فرمایا کہ یہ بھائی میرے لئے آئے ہیں' میرے یہ بتانے پر کہ ہاں آپ کیلئے ہی چشم براہ ہیں اور ان میں اکثریت احمدیوں کی ہے جو خادم انسانیت اور اپنے روحانی بھائی کیلئے دیدہ ودل بچھانے آئے ہیں۔ میری بات مکمل ہوئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے گاڑی رکوائی اور نیچے اتر آئے جونہی ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کو بریک لگی آگے پیچھے رواں دواں سب گاڑیاں رک گئیں اور سب بھاگ کر ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کے پاس پہنچ گئے کہ خیر ہو گاڑی کیوں رکی ہے۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کو ہر ایک سے ملتے ،مصافحہ ومعانقہ کرتے دیکھ کر دنگ رہ گئے اور کہا کہ یہاں جو بھی غیر ملکی شخصیات آتی ہیں وہ استقبال کرنے والوں کو گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی ہاتھ ہلا کر کم ہی جواب دیتے ہیں مگر یہ ہیں کہ پیدل چل رہے ہیں اور ہر ایک سے مل رہے ہیں جیسے یہ ان کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔

O, how much he has love with Affrecans. We never forget him

اور مزید کہا کہ یہ ایک واحد مثال ہے ورنہ آج کے انسان ہم افریقنوں سے محبت نہیں نفرت کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب دوسروں سے الگ تھلگ ایک انوکھے انسان ہیں ۔ انہوں نے تو ہمارے جدامجد سیدنا بلال سے پیار کرنے والے محسن ومحب انسانیت حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کی یادتازہ وزندہ کردی ہے۔ڈاکٹر صاحب سب سے ملتے ہوئے آخری آدمی تک پہنچے اور سب اعلیٰ شخصیات آپ کے ساتھ ساتھ پیدل چلتی رہیں اور گاڑی خالی رواں دواں رہی ۔ بڑا عجیب نظارہ تھا جس کا الفاظ میں پورا نقشہ کھینچنا مشکل ہے۔

ہمدردانہ مشورے اور خوشی کی لہر

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے اپنے چند روزہ قیام تنزانیہ کے دوران میں صدر مملکت، وزراء، مختلف اداروں کے ہیڈز اور دیگر اعلیٰ شخصیات سے ملاقاتوں کے علاوہ Huts میں مکین غریبوں اور مسکینوں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے گھل مل گئے اور انہیں اپنی حالت غربت بدلنے کے راستے بتائے۔اس طرح تنزانیہ یونیورسٹی اور دیگر بڑے بڑے ہال اور کمیونٹی سنٹر میں دانشوروں، ملکی وغیر ملکی اعلیٰ شخصیات اور حکام سے خطاب فرمائے اور بتایا کہ ساڑھے تین لاکھ سے زائد مربع میل رقبہ پر پھیلا ہوا ملک جس کی آبادی بھی قریباً دو کروڑ ہو کیوں غربت کا شکار ہے۔اتنی وسیع زمین جو زرخیزی کے لحاظ سے سونا ہے جس ملک کی ہو وہ تو بہت آگے نکل سکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے ایگریکلچر کو ترقی دینے پر زور دیا اور سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کی روشنی میں مختلف ذرائع اور طریق بتائے اور ڈھنگ سکھائے اور ملک کو صف اوّل میں لانے کی تلقین کی۔ڈاکٹر صاحب کے ہمدردانہ اور قیمتی مشوروں اور اپنے سے بے پناہ محبت اور پیار کو پا کر بلالی قوم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہر کوئی خوشی سے اچھل اچھل پڑا کہ ہمارے بھائی کو ہم سے کتنا پیار اور ہمدردی ہے ہماری حالت زار پر کتنے آنسوں بہاتا اور ہمارے لئے درد سے ہلکان ہو رہا ہے اور ہماری ترقی کا کس قدر خواہاں اور دلی تڑپ رکھتا ہے۔

رچ ملک Rich Country

ایک موقعہ پر ڈاکٹر سلام صاحب نے بلالؓ کے تنزانین سپوتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ: ’’اے محسن انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے بلال کے پیارو اور میرے دل کے لالہ زارو اٹھو اور ایگریکلچر کے میدان میں آگے بڑھو اور اعلیٰ مقام پاؤ جو تمہارا مقدر ہے آپ ایک ایسے ملک کے باسی ہیں جو Rich Country ہے۔ اٹھو اور جدید ٹیکنالوجی کو بروئے کار لاؤ اس طریق پر نہ صرف آپ اپنی غربت دور کر سکیں گے بلکہ دس دوسرے ملکوں کو بھی کھلا سکیں گے۔‘‘

قوتوں کا سرچشمہ۔ایک خدا

پروفیسر سلام صاحب کے دورہ کے دوران ایک سوال یہ سامنے آیا کہ آپ قوتوں کو متحد کرنے کی اپنی تھیوری اور ریسرچ سے یہ تو نہیں ثابت کر رہے کہ خدا ایک ہے اور اس کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے جواباً فرمایا کہ:

’’خدا کا ایک ہونا ہماری ریسرچ کا محتاج نہیں وہ اپنی تمام قوتوں اور صفات جو اس کی اس وسیع و عظیم کائنات میں پھیلی ہوئی اور محیط ہیں کے باوجود ازل وابد سے ایک ہے۔ ہم تو اپنی ریسرچ سے اس کے شکر گزار بندے بننے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ اس کی قوتوں اور صفات گوناں گوں جو اس ایک کے وجود میں ایکا کا رنگ لئے ہوئے ہیں ایک نہایت چھوٹے سے چھوٹے حصے اور آئیٹم کی کنہہ تک بھی نہیں پہنچ سکتے **ولا یحیطون بشی من علمه الا بما شاء** اس (اللہ) کے علم میں سے جس قدر وہ چاہے اس سے زیادہ کسی بھی چیز کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہر چیز کی بلکہ ہر ذرہ کی بقا اس ایک ذات سے وابستہ ہے اس کے بغیر **لم یکن شیا مذ کورا** یعنی کوئی قابل ذکر چیز ہے ہی نہیں اور کل شئی یرجع الی اصلیہ ہر چیز اصل کی طرف راجع ہے جو ذات خداوندی ہے۔ اصل سے جدا کا نام عدم ہے۔ پس **کل یوم هو فی شان** کو پیش نظر رکھتے ہوئے سائنسدان کی ساعت کی کس شان کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کلیے یا ذرے کو اس کی کنہہ تک پہنچا سکے گا ناممکن ہے۔ زندگیوں کی زندگیاں ختم ہوتی جا رہی ہیں لیکن ہر مرحلہ پر **لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی و لو**

جئنا بمثله مددا کی صداقت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ہم سائنس دانوں کی زندگیاں ریسرچز اور کاوشیں ختم ہو جائیں گی مگر رب کے کلمات جو تمام قوتوں اور توانائیوں کا سرچشمہ ہے کبھی ختم نہ ہوں گے...'' ایک اور موقعہ پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:

''یہ ثبوت مل جائے گا کہ یہ چاروں قوتیں دراصل ایک ہیں اور توانائی کا سرچشمہ ایک اور صرف ایک ہے لیکن تجربے کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔'' (ہفت روزہ لاہور 7 دسمبر 1996ء)

سائنس اور مذہب

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے اپنے لیکچروں اور گفتگو میں آیات قرآنیہ کی تلاوت اور اس کی روشنی میں مضمون کے بیان کو ایک عجوبہ سمجھا گیا کیونکہ تنزانیہ میں بھی یہ خیال بڑی شدت سے پایا جاتا تھا کہ سائنس اور مذہب دو متضاد چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ مذہب اور سائنس ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مذہب خدا تعالیٰ جو خالق کائنات ہے کی طرف سے راہنمائی ہے اور سائنس اس کی عملی شکل ہے۔سائنسدان عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں مگر انہیں جاننا چاہئے کہ عقل دی کس نے ہے؟ جس نے عقل دی ہے وہی اس کی راہنمائی کرتا ہے اس کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہے اور اسے سائنس دانوں کے ذریعہ کام میں لا کر ان سے ایجادات کرواتا ہے۔ ورنہ ''یہ تو خود اندھی ہے گر نیر الہام نہ ہو''

سائنسدان چونکہ عرفان الٰہی سے محروم ہیں اس لئے اللہ کے نام سے بدکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میری سائنس کی بنیاد قرآن کریم ہے اور خدا کی راہنمائی اور اس کے کلام کی روشنی میں ہی میں قدم آگے بڑھاتا ہوں۔ میرے اس عمل نے سائنس کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ اور سائنس دانوں کی ایک خدا کی طرف توجہ ہوگئی ہے۔ کہ کوئی ہستی تو ہے جو سلام کی راہنمائی کر رہی ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبیل پرائز جیت چکا ہے۔ پس یہ قدرت خداوندی ہے جو انہیں گھیر کر اس طرف لے آئی ہے اور ان کی زبان سے یہ کہلوا دیا ہے کہ! ''ہم میں ایک ایسا سائنس دان بھی ہے جو حی و قیوم خدا پر ایمان رکھتا ہے۔'' (ہفت روزہ لاہور 7 دسمبر 1996ء)

ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ

جماعت احمدیہ تنزانیہ نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے اعزاز میں وسیع پیمانے پر ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اعلیٰ شخصیات، وزراء، ڈاکٹرز، وکلاء، اعلیٰ حکام، دانشوروں اور مختلف ملکوں کے سفراء نے شرکت کی۔اس اہم تقریب کا آغاز خاکسار کی صدارت میں تلاوت قرآن کریم نے ہوا۔نظم کے بعد جماعت احمدیہ کی طرف سے اپنے روحانی بھائی اور عظیم سائنس دان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کے ساتھ تنزانیہ کی بنی ہوئی ایک خاص طرز کی ٹوپی تحفہ پیار کے طور پر پیش کی گئی جسے ڈاکٹر صاحب نے قبول فرماتے ہوئے اسی وقت پہن کر پیار کا جواب پیار سے دیا اور سپاسنامے کے جوابی خطاب میں بھی اسے پہنے رکھا۔آپ نے اپنے خطاب میں نوجوانوں کو خاص طور پر علم وعمل کے میدان میں مثالی کردار پیش کرنے کی نصیحت فرمائی۔

امام وقت سے عشق ومحبت

تنزانیہ میں عرصہ قیام کے دوران ڈاکٹر سلام صاب کی امام وقت سے جو بے پناہ محبت وعشق تھا اس کی جھلکیاں بھی منصۂ شہود میں آئیں اور لوگوں کو ورطہ حیرت میں ڈالا۔

حکومت تنزانیہ اور ادارہ جات کی خواہش ہوتی تھی کہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے اعزاز میں منعقد ہونے والی سب تقاریب میں میں شامل ہوں اور پاکستان کے سفیر کا تو ازحد اصرار تھا کہ میں ضرور ہر تقریب میں شریک ہوں کیوں کہ اس ملک میں جماعت احمدیہ کے امیر ہونے کے لحاظ سے مجھے جو پروٹوکول ملتا ہے اس سے ہمیں ڈاکٹر صاحب سے ان کے شایان شان Dealing میں مدد ملتی اور تمام امور متعلقہ کی انجام دہی آسان ہو جاتی ہے۔لہٰذا خاکسار تقریباً سبھی تقاریب میں شریک ہوا اور بسا اوقات ایسا ہوا کہ جب بھی میں کسی تقریب میں پہنچا تو ڈاکٹر صاحب خواہ کتنی ہی اعلیٰ شخصیات سے محو گفتگو ہوتے انہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور لپک کر عاجز کو خوش آمدید کہتے اور پھر شرکاء محفل سے مخاطب ہو کر فرماتے کہ یہ اس ملک کے لئے میرے پیارے امام کے نمائندہ ہیں اسی لئے مجھے سب سے زیادہ پیارے اور قابل احترام شخصیت ہیں۔اللہ اللہ کتنا پیار اور عشق

ہے امام وقت ہے کہ ان کے ایک ادنی واحقر خادم سے اپنے ارفع مقام کو خیال میں نہ لاتے ہوئے اور بڑی بڑی اعلیٰ شخصیات کی پرواہ کئے بغیر نہایت ہی عزت واحترام سے پیش آتے ہیں۔

عالم اسلام اور ملک وقوم کا سچا ہمدرد۔ عاشق قرآن

عجب تھا عشق اس دل میں

شعبۂ فزکس پنجاب یونیورسٹی کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران صاحب کا خراج تحسین

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران نے 1971ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ایس۔سی اور 1979ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1985ء میں تحقیقی کاوشوں پر آپ کو عبد السلام پرائز ملا۔ آپ ICTP میں ایسوسی ایٹ اور سینئر ایسوسی ایٹ بھی رہے۔ 89-1988ء میں امریکہ کی جارجیا یونیورسٹی میں فل برائٹ سکالر کی حیثیت سے تحقیقی کام کیا۔ مختلف غیر ملکی جرائد میں آپ کے 60 سے زائد تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ آپ 25 کے قریب غیر ملکی کانفرنسوں میں ملک کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ 1970ء سے جامعہ پنجاب شعبہ فزکس سے وابستہ ہیں اور 1995ء سے شعبہ کے چیئرمین کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ فزکس سے متعلق کئی کتب کے مصنف بھی ہیں۔ رسالہ خالد کے ڈاکٹر عبدالسلام نمبر کیلئے جو انہوں نے انٹرویو دیا وہ پیش خدمت ہے۔ (انٹرویو مکرم حافظ راشد جاوید صاحب)

سوال: ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے آپ کا رابطہ کسی طرح ہوا؟

جواب:۔ ڈاکٹر صاحب کو پہلی دفعہ میں نے ایڈنبرا یونیورسٹی میں پروفیسر کیمر کی ریٹائرمنٹ کی

تقریب میں دیکھا تھا میں ان دنوں وہاں پر طالبعلم تھا۔ یہ ڈاکٹر کیمر وہی تھے جو ڈاکٹر سلام کے Ph.D کے سپر وائزر تھے۔ یہ 1954ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایڈنبرا آ گئے اور انہی کی جگہ ڈاکٹر عبدالسلام کو تعینات کیا گیا تھا۔لیکن میرا تفصیلی رابطہ ڈاکٹر صاحب سے 1982ء کے شروع میں ہوا جب میں اٹلی گیا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر سلام صاحب کو میں نے اپنے مضمون کی کاپی دی جو میں نے پاکستان میں سائنسی ترقی نہ ہونے کی وجوہات پر لکھا تھا۔ میں نے اس مضمون میں لکھا تھا کہ پاکستان میں سائنسی ترقی نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان سائنس کی اہمیت کو سمجھتے ہی نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر سیاستدان نااہل بھی ہیں تو بھی بیوروکریسی اگر ٹھیک ہوتی تب بھی سائنسی ترقی ہوسکتی تھے۔ پھر تیسری بات اگر بیوروکریسی میں بھی کرپشن ہے تو جامعات کے وائس چانسلرز ہی ٹھیک ہوتے تب بھی سائنسی ترقی ممکن تھی۔لیکن پاکستان میں بدقسمتی سے تینوں جگہوں پر نااہلی ہے۔ ڈاکٹر سلام صاحب نے جب یہ مضمون پڑھا تو مجھے کہنے لگے۔ آپ کو اس مضمون سے پاکستان میں نوکری سے نکال کیوں نہیں دیا گیا۔ نیز فرمانے لگے سیاستدانوں اور بیوروکریسی کی نااہلی کا تو مجھے علم تھا لیکن جامعات کے وائس چانسلرز کے پہلو کی طرف میری توجہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس مضمون کا بعض جگہوں پر حوالہ بھی دیا ہے۔ پھر اس کے بعد مجھے ڈاکٹر صاحب کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

سوال: دنیا بھر کے سائنسدانوں میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا سب سے نمایاں مقام تھا۔ وہ کونسی خصوصیات تھیں جو ڈاکٹر صاحب کو دوسرے سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

جواب: ڈاکٹر سلام صاحب میں سب سے نمایاں بات جو انہیں دوسرے سائنسدانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ تھی کہ آپ نے پسماندہ ممالک میں سائنسی ترقی کے فروغ کیلئے بہت کام کیا ہے۔ کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ پسماندہ ممالک اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوسکتے جب تک وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی نہ کریں اور ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ پسماندہ ممالک میں بھی بے پناہ صلاحیتوں والے لوگ موجود ہیں ۔لیکن ان کے پاس ایسے

مواقع نہیں کہ اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکیں ۔ کیونکہ سائنسی ترقی کیلئے ضروری ہے کہ آپ وہاں جائیں۔ جہاں اعلیٰ پائے کی سائنسی تحقیق ہو رہی ہے۔لیکن پسماندہ مما لک کے پاس وسائل اور مواقع نہیں کہ اعلیٰ پائے کے تحقیقی سینٹرز میں جاسکیں۔ان مشکلات کا چونکہ ڈاکٹر صاحب کو بھی سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے انہوں نے پسماندہ مما لک کے آئندہ آنے والے سائنسدانوں کیلئے ان مشکلات کو دور کرنے میں بڑی جدو جہد کی اور اپنی انتھک کوششوں سے ان کو ایسے ادارے مہیا کر دیئے جن میں وہ اعلیٰ درجے کے سائنس دانوں کے ساتھ بہترین ماحول میں تحقیق کر سکتے تھے۔ بہت سے اور بھی سائنسدان ہیں مگر انہوں نے سائنس کے فروغ کی پرواہ نہیں کی۔ نہ اپنے ملک کیلئے اور نہ ہی دوسرے مما لک کیلئے جب کہ ڈاکٹر سلام صاحب نے اپنے ملک اور دیگر پسماندہ مما لک میں سائنس کے فروغ کیلئے بہت کام کیا اور یہ وہ بات ہے جسے دوسرے لوگ رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ہندو سائنس دان مجھے کہا کرتا تھا کہ پروفیسر چندرا شیکھر بھی تو ہیں وہ بھی نوبل انعام یافتہ ہیں مگر انہوں نے ہمارے لئے کیا کیا دوسرے سائنسدانوں کی نسبت ڈاکٹر صاحب میں یہ سب سے بڑا فرق تھا۔اس کے علاوہ ڈاکٹر سلام صاحب کا قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں بڑا گہرا اور وسیع نقطۂ نظر تھا۔جس کا اظہار وہ اپنے مضامین میں جابجا کیا کرتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص وہ پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر سلام صاحب کا تحقیقی اور تخلیقی عرصہ بڑا وسیع ہے آپ کے تحقیقی کیرئیر کا آغاز 1949-50ء میں ہوا اور آپ 1993ء تک مستقل تحقیقی کاوشیں کرتے رہے۔ بہت کم لوگ ہیں جن کی تحقیق کا عرصہ اتنا طویل ہو۔عموماً سائنسدان 5 سے 15 برس تک منظر عام پر رہتے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں۔

سوال: کیا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر سب سے گہرا اثر مذہب کا تھا اس بارے میں آپ کا ذاتی مشاہدہ کیا ہے۔ جواب: مجھے مختلف اوقات میں ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت پر مذہب کا بہت گہرا اثر تھا۔ ڈاکٹر سلام صاحب کی تحریر میں ہمیں

قرآن کریم اور تاریخ اسلام کے بہت سے حوالے ملتے ہیں اور اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب نے بہت لکھا ہے۔ قرآن کریم سے بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت لگاؤ تھا اس سلسلہ میں میں ایک واقعہ آپ کو بتا تا ہوں ۔ ڈاکٹر صاحب جس وقت امپیریل کالج میں پروفیسر ہوئے تو ان کی عمر صرف 31 سال تھی۔ اس وقت وہاں پر ڈاکٹر صاحب نے ایک لیکچر دیا۔ جس کے آخر پر قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ کر آپ نے استدلال کیا اور وہ چیز لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ وہاں موجود ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ میں نے با قاعدہ گھڑی سے وقت نوٹ کیا تقریباً پانچ منٹ تک لوگ تالیاں بجاتے رہے۔ پھر ICTP میں بھی میں نے ان کو دیکھا ہے ان کے دفتر کے ساتھ آرام اور کھانے وغیرہ کیلئے ایک کمرہ ہوتا تھا۔ وہ دوپہر ایک بجے کے قریب وقفے میں وہاں چلے جاتے اور قرآن کریم پڑھتے رہتے مجھے انہوں نے خود بتایا ہے کہ میں وقفہ میں قرآن کریم کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔

سوال:۔ سائنس کے فروغ کے سلسلہ میں ترقی پذیر ممالک اور بالخصوص عالم اسلام کیلئے ڈاکٹر صاحب نے جو خصوصی طور پر کام کیا اس بارے میں آپ ہمیں کچھ بتائیں۔

جواب:۔ انہوں نے عالم اسلام کا کوئی لیڈر نہیں چھوڑا جس کو خطوط نہ لکھے ہوں اور اس کو اپروچ نہ کیا ہو کہ خدا کیلئے آپ علم اور سائنس کے فروغ کیلئے اقدامات کریں۔ پاکستان کو خط لکھے، کویت اور سعودی عرب کو خط لکھے۔ کبھی خود بھی گئے۔ انہوں نے کوئی اسلامی ملک نہیں چھوڑا جس کو نہ لکھا ہو۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے کہا کہ یار! یہ جو میں خطوط لکھتا رہتا ہوں اس کا کوئی فائدہ بھی ہے۔ تو مَیں نے ان سے کہا کہ آپ نے سائنسی ترقی کے متعلق بنیادی نکات واضح کر دیئے ہیں۔ اب جس نے بھی اقدامات کرنے ہیں اسکو آپ کی چیزیں ضرور سامنے رکھنی پڑیں گی۔ اور یہ جو انہوں نے ٹریسٹ میں ICTP قائم کیا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے یہاں دنیا بھر سے سائنسدان آتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ روس سے بھی آتے تھے اور امریکہ سے بھی۔ منگولیا، برازیل، لاطینی امریکہ، افریقہ، نیپال، بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان غرض ہر جگہ سے لوگ آتے تھے۔ ہماری وہاں پر دوسرے مسلمان ممالک کے سائنسدانوں سے ملاقات ہوتی تھی اور تب پتہ

چلتا تھا کہ ان ممالک میں سائنسی حوالے سے یہ یہ کام ہو رہا ہے۔ اس سنٹر کا بہت وسیع دائرہ اور وسیع اثر تھا۔ اور بین الاقوامی سائنسی تعاون جتنے وسیع پیمانے پر یہاں ہوا ہے پوری سائنسی تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔

سوال:۔ سائنس کی ترقی اور فروغ کے ساتھ ساتھ کیا ڈاکٹر صاحب عام انسانیت سے بھی محبت کرتے تھے اور عام لوگوں کی مدد کرتے تھے۔

جواب: ڈاکٹر سلام صاحب میں بہت بڑا وصف جو میں بہت عرصہ تک مشاہدہ کرتا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سلام لوگوں کی مدد کرنے میں ایک لمحہ تاخیر نہیں کرتے تھے۔ ان کو کسی نے اپنا مسئلہ بتا دیا۔ ڈاکٹر صاحب فوراً جو کر سکتے تھے کرتے تھے اور ایسے بے شمار واقعات ہیں۔ مجھے کسی نے واقعہ سنایا کہ 1968ء میں کسی پاکستانی لڑکے کو امریکہ میں مزید تعلیم کیلئے داخلہ اور ایوپسی ایشن شپ مل گئی مگر اس کے پاس امریکہ جانے کا کرایہ نہیں تھا۔ اس نے ڈاکٹر سلام صاحب کو لکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اس کو امریکہ کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا۔ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی ڈاکٹر سلام صاحب نے بہت سے لوگوں کے کیریئر بنائے ہیں۔ لوگوں کی زندگیاں سنواری ہیں۔ ان ممالک میں بہت سے لوگوں کی تقرریاں اور ترقیاں ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر ہوتی ہیں۔ یا اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ لوگ ڈاکٹر سلام صاحب کے ادارے ICTP سے وابستہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت لوگوں کی مدد کی ہے اور لوگوں کی مدد کرنے میں بالکل تاخیر نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی رنگ و نسل یا مذہب و ملت کا واہمہ تک بھی دل میں لاتے۔

سوال: ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو اپنے وطن پاکستان سے بھی شدید محبت تھی اس بارے میں آپ کے ذاتی مشاہدات کیا ہیں۔ جواب: مجھے جو ڈاکٹر سلام صاحب کو دیکھنے کا موقعہ ملا خصوصاً آخری دنوں میں تو ڈاکٹر سلام صاحب پاکستان کے نام پر وفور محبت سے اکثر رو پڑتے تھے۔ اور میں نے ذاتی طور پر بہت دفعہ پاکستان کے نام پر ڈاکٹر سلام صاحب کی آنکھوں سے آنسو گرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ جس کا مجھے بہت دکھ ہوتا تھا انہوں نے ایک دفعہ مجھے کہا کہ ٹھیک ہے یہ ہمیں اپنے

خیال میں بے شک کافر ہی سمجھیں لیکن پاکستانی تو سمجھیں اور پاکستان کا علمی پسماندگی کا بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت دکھ ہوتا تھا اور پاکستان میں مذہبی تعصّبات اور فرقہ وارانہ فسادات جو بہت بڑھ گئے ہیں اس پر بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ یہاں ہندو مجھے طنزاً کہتے ہیں کہ پاکستان میں شیعہ سنی ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں آپ ہمیں کیا کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں سے زیادتی کرتے ہیں۔

سوال: پاکستان میں سائنس کے فروغ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی نمایاں خدمات کیا تھیں۔ جواب: ڈاکٹر سلام صاحب نے پاکستان کی مختلف حکومتوں کو بار بار لکھا انہوں نے کوئی حکومت نہیں چھوڑی جسے نہ لکھا ہو کہ پاکستان میں سائنس کو فروغ دیں۔ پاکستان میں جتنے بھی سائنسی ادارے بنے ہیں ان میں ڈاکٹر صاحب کا نمایاں کردار ہے وہ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر بھی رہے۔

سوال: ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے پاکستان میں سائنس کے فروغ کیلئے نمایاں کام کیا۔ کیا پاکستان کی طرف سے ان کے ان اقدامات کی مناسب قدر کی گئی یا نہیں۔

جواب: ہاں ایک وقت تک جب تک وہ صدر کے سائنسی مشیر رہے اس وقت تک ان کی قدر کی گئی۔ بعد میں کسی رنگ میں قدر نہیں کی گئی۔ پریس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ عام لوگ ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں ان کے نام سے کوئی وظیفہ نہیں جاری کیا گیا فی الحال کوئی ادارہ نہیں کھولا گیا یہ بے قدری کی انتہاء ہے۔

سوال: آپ کیا سمجھتے ہیں اس ناقدری کے پیچھے صرف اور صرف مذہبی تعصب تھا یا ہمارے ارباب حل وعقد کی سائنس سے عدم دلچسپی۔ جواب: (اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر مجاہد کامران بے ساختہ بولے کہ سو فیصد مذہبی تعصب، مذہبی تعصب اگر آپ سو فیصد نہ بھی کہیں تو نوے فیصد مذہبی تعصب تھا اور دس فیصد سیاستدانوں ارباب اقتدار اور نوکر شاہی کی کمزوری ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جو صحیح بات ہے وہ کرنی چاہئے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ مسلمانوں میں تو مذہبی

تعصب ہونا ہی نہیں چاہئے۔سمجھ نہیں آتا مسلمانوں میں مذہبی تعصب آ کہاں سے گیا۔

آخر پر پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر عبدالسلام ایک بہت ہی عظیم سائنسدان تھے جن کے دل میں انسانیت اور وطن کی محبت اور پسماندہ ممالک میں سائنسی ترقی کے بارے میں بہت دور پایا جاتا تھا۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ میرا وطن پاکستان اور دیگر ترقی پذیر ممالک بھی سائنسی میدان میں ترقی کریں۔

اس کے بعد ہم The conecpt اپریل 94ء کے شمارے میں چھپنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران کے مضمون Abdus Salam The soldier of science میں سے چند باتیں جو انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے تحریر کیں وہ پیش کرتے ہیں۔

مجاہد کامران صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالسلام اپنے عمر کے لحاظ سے دنیا بھر میں سب سے بااثر سائنسدان تصور کئے جاتے تھے۔آپ کے شاگرد اور پرستار دنیا بھر میں موجود تھے۔جو آپ کو اپنے ممالک کے حالات سے باخبر رکھتے۔افریقہ،ایشیاء اور لاطینی امریکہ کے ممالک کی سیاست اور وہاں کے حالات پر انکی گہری نظر تھی۔کئی ممالک کے سربراہان اور وزراء سے ڈاکٹر عبد السلام کا براہ راست رابطہ تھا۔پروفیسر رزمی نے ایک بار کہا کہ" پاورفل عالمی شخصیت پر ڈاکٹر عبد السلام کے اتنے زیادہ اثر کو دیکھتے ہوئے مجھے حضرت سلیمان کا خیال آجاتا ہے جن کے قبضہ میں جن بھی تھے۔مجھے ICTP کی طرز پر ایک اور سینٹر بنانے کیلئے فنڈز دے دیں یہی میرا انعام ہے

مجاہد کامران اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ سائنس کے فروغ کا تو ڈاکٹر عبدالسلام کو جنون تھا۔انہوں نے اٹلی کی حکومت کے تعاون سے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹکل فزکس کا ادارہ تو قائم کیا ہی تھا اٹلی کی حکومت نے دو مزید سائنس سینٹرز کیلئے بھی ڈاکٹر صاحب کو فنڈز دیئے تھے جو احسن طریق پر کام کر رہے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کو سائنس کے فروغ میں اس قدر دلچسپی تھی کہ ایک بار کسی کو کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ایسے 20 ادارے بناؤں۔اٹلی کی حکومت نے سائنس کے فروغ میں آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ سے پوچھا کہ ہم آپ کو انعام دینا چاہتے ہیں آپ

بتائیں آپ کو کس چیز کی خواہش ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام نے جواب دیا کہ مجھے ICTP کی طرز پر ایک ادارہ اور بنانے کیلئے فنڈ ر دے دیں یہی میرا انعام ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ ڈاکٹر سلام ہر قسم کے کمپلیکس سے پاک تھے۔جب چاہیں آسانی سے ان کے ساتھ ملاقات ہو سکتی تھی۔آپ ان کے دفتر جائیں اگر وہ میٹنگ میں نہ ہوں تو سیدھے اندر چلے جائیں۔اکثر ان کے کمرے کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ایک روسی سائنسدان وی اے کوف نے ایک دفعہ انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

I found him very nice and very open. People who are not as big as he is, will be busy when You go to them. But Salam is different.

یعنی میں نے انہیں بہت ہی عمدہ اور فراخ دل والا انسان پایا۔وہ لوگ جو ڈاکٹر عبدالسلام کی طرح عظیم نہیں ہوتے جب آپ انہیں ملنے جائیں تو وہ اکثر مصروف دکھائی دیتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر سلام بالکل مختلف تھے۔'' ''اوہ! تمہارے پاس عبدالسلام ہے''

ڈاکٹر مجاہد کامران تحریر کرتے ہیں کہ بیرونی دنیا میں ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان کی پرجوش نمائندگی کرنے والے سمجھے جاتے تھے۔ایک مرتبہ کروشیا میں ایک عظیم سائنس دان پروفیسر میانی (Malani) سے میری ملاقات ہوئی میں نے انہیں اپنا ایک مضمون دیا جو میں نے ڈیراک (Dirac) کی زندگی پر لکھا تھا۔انہوں نے مضمون پسند کیا اور مجھے پوچھا کہ تمہیں یہ لکھنے کا خیال کیسے آیا میں نے کہا کہ میں اس لئے اس طرح کے مضمون لکھتا ہوں کہ نئی نسل کو سائنس میں دلچسپی پیدا ہو۔کیونکہ عملاً پاکستان سائنسی لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔اس پر پروفیسر میانی نے فوراً حیرت سے کہا Oh!but you have Abdus Salam اوہ تمہارے پاس عبدالسلام تو ہے۔

لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والا۔عبدالسلام

پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں کہ ٹریسٹ میں ڈاکٹر عبدالسلام کو ملنے والے ایک بات کا ہمیشہ اظہار کرتے کہ سلام لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔لوگ اس سے

محبت کرتے ہیں اور عقیدت بھی رکھتے ہیں اور اپنی مشکلات کے حل کیلئے ہمیشہ عبدالسلام کی راہنمائی اور مدد کے متمنی رہتے ہیں۔ ICTP میں آنے والا ہر سائنسدان ترکی میں ڈاکٹر عبدالسلام کی عظیم خدمات کا بھی معترف ہوتا اور اس بات پر بھی اس کو یقین ہوتا کہ یہی واحد وہ شخص ہے جو ہمارے مشکلات کو حقیقی طور پر سمجھتا ہے اور حل کرنے کیلئے سنجیدہ کوششیں بھی کرتا ہے اور باوجود بیماری کے اس ادارے کو چلانے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ جب کبھی تھک جاتا ہے تو اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں کچھ ستا لیتا ہے اور دن کے اختتام پر اپنے چھوٹے سے گھر میں چلا جاتا ہے جہاں وہ تنہا ہے ہاں کبھی کبھی چھٹیوں میں اس کے اہل خانہ بھی ساتھ ہوتے ہیں۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

پروفیسر عبدالسلام کو خراج عقیدت

(پروفیسر ڈاکٹر اختر حسین آفتاب صاحب

پٹنہ (بہار) انڈیا

انسان جسمانی موت مر جاتا ہے لیکن اس کی خوبیاں اسے زندہ رکھتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم انسان کو اس کے جسم خاکی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی نیکیوں کی وجہ سے یاد رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ علم، قلم، فکر، کردار، خلوص اور قربانی کا جذبہ موت کے بعد ہی زیادہ پرکشش، دل کش اور زندہ انسان کو جنم دیتے ہیں۔ ارسطو، بوعلی سینا، البیرونی، گیلیلو، نیوٹن اور آئن سٹائن مرنے کے بعد صحیح معنوں میں زندہ ہیں۔ کیونکہ ان کے مشاہدات اور ان کی تحقیقات سے آج کا انسان زیادہ مستفید ہو رہا ہے۔ جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں وہی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام جو 21 نومبر 1996ء کو انگلینڈ میں موت کی آغوش میں ہمیشہ کیلئے ہو گئے مگر ہم

ان کو معنوی طور پر اب اپنے درمیان زندہ پائیں گے۔ پروفیسر عبد السلام 1955ء سے 1981ء تک اقوام متحدہ کے سائنس سے تعلق رکھنے والے کئی عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ 1988ء میں وہ تھرڈ ورلڈنٹ ورک آف سائنٹیفک آرگنائزیشن کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

بہت کچھ دیا: پروفیسر عبد السلام نے فزکس کی دنیا کو بہت کچھ دیا جس کے اعزاز میں انہیں کیمبرج یونیورسٹی، فزیکل سوسائٹی لندن، کلکتہ یونیورسٹی، امریکن انسٹی ٹیوٹ آف فزکس، رائل سوسائٹی لندن اور یونیسکو پیرس سے مختلف ایوارڈ ملے۔ 1979ء میں انہیں آئن سٹائن میڈل اور دنیا کا سب سے بڑا انعام یعنی فزکس میں نوبیل پرائز (Nobel Prize) ملا۔ بنارس یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دے کر اپنا وقار بلند کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی اہم یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جس نے انہیں کوئی اعزازی ڈگری نہ دے کر اپنی اہمیت گھٹائی ہو۔

پروفیسر عبد السلام ایٹم کا استعمال برائے امن چاہتے تھے۔ امن عالم کی اس خدمت کے لئے انہیں چارلس یونیورسٹی (پراگ) سے پیس میڈل (Peace Medal) ملا۔ کئی بین الاقوامی اداروں نے بھی ان کی امن کی مہم کو کافی سراہا اور انہیں مختلف تنظیموں کی رکنیت بھی عطا کی گئی۔ پروفیسر عبد السلام نے سائنس کی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ 1975ء میں انہوں نے امپیریل کالج لندن میں تھیورٹیکل فزکس کا محکمہ قائم کیا۔ تھیورٹیکل فزکس میں انگلینڈ کے بہت سارے لوگوں نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، برازیل، گھانا، نائجیریا، لبنان، ایران، عراق، یونان وغیرہ تیسری دنیا کے تقریباً پچاس لوگوں کو پی ایچ ڈی کرایا وہ اقوام متحدہ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی مشاورتی کمیٹی کے 1994ء سے 1975ء تک ممبر رہے۔ وہ یواین او فاؤنڈنگ کمیٹی برائے یواین او یونیورسٹی کے ممبر بھی تھے۔

فاؤنڈر ڈائریکٹر

پروفیسر عبد السلام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس کے فاؤنڈر ڈائریکٹر تھے۔ یواین او کا یہ ادارہ تیسری دنیا کے سائنس دانوں کی ٹریننگ کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے سے اب تک

36000 فزکس کے پروفیسروں کو ریسرچ کی ٹریننگ ملی ہے۔اس ادارہ سے فزکس کی تازہ ترین ریسرچ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام نے تھرڈ ورلڈ اکاڈمی آف سائنس قائم کی اور اس کے فاؤنڈر پریذیڈنٹ تھے۔اس اکاڈمی کو چلانے کے لئے انہوں نے سالانہ تقریباً دوملین ڈالر کا انتظام کیا۔ پروفیسر عبدالسلام کی شخصیت کے دو پہلو بہت اہم تھے۔انہوں نے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ سائنس اور مذہب میں اختلاف ہے۔سائنس تو فطرت کے راز ہائے سربستہ کو سمجھنے کا دوسرا نام ہے۔وہ کافی مذہبی ہوتے ہوئے بھی سائنس کی دنیا کو آخری دم تک گلے لگائے رہے۔

پروفیسر عبدالسلام تیسری دنیا سے بہت گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ مغرب، مشرق پر اس لئے غالب ہے کہ مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا لیا ہے۔مشرق اس لئے پیچھے ہے کہ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنے دامن میں اب تک سمیٹ نہ سکا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایشیا اور افریقہ اپنے دامن کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھرے۔ پھر وہ ضرور خوشحالی کی طرف گامزن ہوگا اور اسے یورپ پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

پروفیسر عبدالسلام کے خطوط میرے پاس برابر آیا کرتے تھے۔وہ ہمیں تاکید کیا کرتے تھے کہ میں عوام کے ذہن کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے زیادہ سے زیادہ آمادہ کروں۔ 1991ء میں انہوں نے مجھے (Ideals & Realities) کا تیسرا ایڈیشن بھیجا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے بہت سے لیکچرز کی کاپیاں ابھی مجھے بھیجیں جو وہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں دیا کرتے تھے۔انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دسویں صدی سے لیکر گیارہویں صدی تک یورپ نے سائنس کے میدان میں مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ان کے خطوط میں اکثر عمر خیام کی رباعی اور علامہ اقبال کے اشعار ہوا کرتے جن سے ان کے ادبی ذوق کی نشان دہی ہوتی ہے۔ پروفیسر عبدالسلام برابر کہا کرتے تھے۔''انسانی برادری کی بنیاد دوستون پر قائم ہے ایک علم اور دوسرا رواداری علم کے بغیر رواداری بے اثر ہے اور رواداری کے بغیر علم بیکار ہے۔''

ایک عظیم تحقیقی پروفیسر عبدالسلام ایک عظیم انسان، ایک عظیم سائنس داں اور ایک عظیم محقق

تھے۔ ان کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ نوبل پرائز ملنے کے بعد وہ کلکتہ آئے اور اپنے استاد سے ملے جنہوں نے انہیں لاہور میں پڑھایا تھا۔ ان کے استاد جو مذہبی اعتبار سے براہمن تھے بہت خوش ہوئے اور انہیں دعائیں دیں۔ پروفیسر عبدالسلام کی خدمت میں سب سے بڑا اخراج عقیدت ہوگا کہ ہم اپنے دل اور دماغ کو علم اور عقل کی روشنی سے پوری طرح منور کریں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ٹھوس قدم آگے بڑھائیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق اور کردار پیدا کریں۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی دولت علم ہے اور علم کا صحیح مقصد بنی نوع انسان کی خدمت ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ مارچ 97ء صفحہ 78 بحوالہ لاہور ہے جون 1997ء صفحہ 11)

ایک نابغہ روزگار وجود
(محترم عطاء المجیب راشد صاحب، امام بیت الفضل لندن)

آسمان احمدیت اور دنیائے سائنس کے ایک روشن ستارے محترم پروفیسر عبدالسلام صاحب مرحوم و مغفور کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی خدمات اور کامیابیوں پر کوئی تبصرہ کرنا تو میرے بس کی بات نہیں لیکن قارئین کو اس لطف میں شریک کرنا چاہتا ہوں جو گذشتہ دنوں ایک مضمون پڑھتے ہوئے اس عاجز کے حصہ میں آیا۔ مشہور سائنسی رسالہ Current Science جلد 72 نمبر 11 مجریہ 10 جون 1997ء میں شعبہ طبیعیات، گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر (انڈیا) میں H.S.Virk کے قلم سے ایک جامع مضمون شائع ہوا جس میں سائنس دان مذکور نے پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی گرانقدر بے لوث

خدمات اور تحقیقات پر شاندار خراج تحسین پیش کرنے کے بعد آخر میں بطور خلاصہ یہ فقرہ لکھا اور اس پر اپنے مضمون کا اختتام کیا۔

If Trieste has become a Macca for Third World Scientiss over the years since its creation in 1964. Abdus Salam, Nobel Laureate and a genius fram Punjab was destined to play the role of a prophet of Third World scientist. May the mercy of Allah be on His servant!

اُمید ہے قارئین کرام نے بھی اس جامع تبصرہ سے خوب حظ اٹھایا ہوگا۔ سائنسی دنیا سے ہٹ کر پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ایک بہت ہی عاجز بے ریا اور دنیاوی وجاہتوں سے بے نیاز موحد انسان تھے۔ مجھے لندن میں ان سے کئی بار مسجد فضل لندن میں یا دیگر مقامات پر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار میرا یہ تاثر پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا گیا اور دل میں اس عظیم انسان کی عظمت بڑھتی چلی گئی۔ 1970-1973ء کے قیام لندن میں ان سے ابتدائی تعارف ہوا۔ کئی بار حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ساتھ اکٹھے بیٹھنے کا موقع ملا۔ ایسے مواقع پر ان بزرگوں کی علمی دینی گفتگو بہت پر لطف اور مفید ہوتی تھی۔

غالباً 1983ء کی بات ہے نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد جب کہ آپ کی شہرت عروج پر تھی آپ جاپان تشریف لائے۔ مَیں بطور مربی وہاں مقیم تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ نے پروفیسر عبد السلام صاحب کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ مجھے بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خواہش کا بھی بہت دخل تھا) بہرحال میں ناگویا سے ٹوکیو حاضر ہو کر اس تقریب میں شامل ہوا۔ پاکستانی کمیونٹی کے سرکردہ احباب سے ہال بھرا ہوا تھا۔ اکثر احمدیت کے حوالے سے مجھے جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو سفیر پاکستان نے ایک ایک کر کے سب لوگوں کا تعارف کروانا شروع کیا۔ میری باری آئی تو سفیر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ان کے تعارف کی تو ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے

اس عاجز کو معانقہ کا شرف بخشا اور پھر سارا وقت اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے اس انداز سے محبت و شفقت کے علاوہ ان کی جرأت اور عظمت کا بھی خوب پتہ چلتا ہے جو لوگ مجھ سے پہلے واقف نہ بھی تھے وہ بھی خوب واقف بن گئے اور یہ سب احمدیت کی برکت سے ہوا۔

باتیں تو اور بھی ہیں لیکن ایک آخری بات لکھ کر اس نوٹ کو ختم کرتا ہوں۔ یہ بات ایک تاریخی امانت بھی ہے جس کا غالباً ہمارے لٹریچر میں اس سے قبل ذکر نہیں آسکے 30 اپریل 1984ء کا دن تاریخ احمدیت کا ایک اہم دن ہے۔ اس روز حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز پاکستان سے ہجرت فرما کر لندن ورود فرما ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو حضور انور نے ''مسجد فضل'' لندن میں ملحقہ محمود ہال میں ایک تاریخی اور جلالی خطاب فرمایا تھا۔ سارا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر پروفیسر عبدالسلام صاحب حضور انور کے سامنے صف اوّل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور انور نے خطاب کے آخر میں فرمایا کہ چونکہ بہت زیادہ کام کرنے والے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ پوری یکسوئی سے ساری طاقتوں کو ان کاموں کے لئے وقف کر دوں اس لئے کوئی دوست مجھ سے ملاقات کی درخواست یا خواہش نہ کریں جس کی مجھے ضرورت ہوگی اس شخص کو میں خود ملاقات کے لئے بلالوں گا۔ پرسوز دعا پر تقریب کا اختتام ہوا۔ محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو یہ تاریخی اعزاز نصیب ہوا کہ جس شخص کو حضور انور نے از خود ملاقات کے لئے سب سے پہلے دعوت دی وہ یہی فرزند احمدیت تھا۔ حضور انور نے تقریر کے بعد اٹھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ ملاقات کے لئے میرے دفتر میں تشریف لے آئیں۔''

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے درجات بلند فرمائے اور علمی میدانوں میں برتری کا جو علم آپ نے بڑی شان سے اٹھائے رکھا اللہ تعالیٰ فرزندان احمدیت کو توفیق دیتا چلا جائے کہ وہ اسے ہمیشہ سربلند رکھیں۔ آمین

اے اہل زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں کمیاب ہیں ہم

ڈاکٹر عبدالسلام کی رحلت۔ایک قومی المیہ

(ڈاکٹر منیر احمد خان صاحب سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن)

''ڈاکٹر عبدالسلام کے اپنے ملک نے ان کے ساتھ بے انصافی اور تعصب کا برتاؤ کیا لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان سے شدید محبت کرتے تھے۔''

بہت کم پاکستانیوں نے پروفیسر عبدالسلام کی طرح پاکستان کا وقار بڑھایا ہے۔ وہ نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے سائنس دان تھے بلکہ شاید اس صدی کے دوران مسلم ممالک میں پیدا ہونے والے عظیم ترین سائنسدان بھی تھے۔ جب وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھے تو ان کی صحت جواب دے گئی اور وہ اپنی مسلسل محنت اور انہماک کے ثمرات سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وہ نئے سائنسی مفروضوں پر کام کر رہے تھے اور انہیں دوسری مرتبہ نوبل پرائز ملنے کے امکانات تھے۔

عالمی شہرت کے حامل سائنسدان ہونے کے علاوہ وہ ایک تخیل پرست، محب وطن اپنی سرزمین کے خادم اور سب سے بڑھ کر ایک منکسر المزاج انسان تھے۔ سائنس کی سرحدوں میں وسعت پیدا کرنے میں ان کی کامیابی نے ان کی منکسر المزاجی میں مزید اضافہ کیا اور ہم وطنوں کے ساتھ ان کا رشتہ مزید گہرا ہو گیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے تیسری دنیا اور خصوصاً پاکستان میں ہزاروں اعلیٰ تربیت یافتہ سائنس دان چھوڑے ہیں جو اکیسویں صدی میں ان کے مشن کو جاری رکھیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ہمارے لئے اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کے لئے بہت کچھ کیا لیکن ہمارے پاس ان کا قرض چکانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ عبدالسلام سے میری پہلی ملاقات 1942ء میں کالج میں ہوئی۔

ہم ایک ہی کالج کے طالب علم تھے۔ پھر ہم پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے لئے عمومی جدو جہد میں شامل ہو گئے اور دوست بن گئے۔ وہ یونیورسٹی امتحانات میں ہندوؤں کے قائم کردہ تمام ریکارڈ توڑ کر پہلے ہی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے نہ صرف امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی بلکہ انہیں یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ بیک وقت گورنمنٹ کالج یونین کے صدر اور کالج مجلہ ''راوی'' کے مدیر بھی تھے۔ وہ 1947ء میں کیمبرج چلے گئے اور ان کے واپس آنے سے پہلے میں 1951ء میں امریکہ چلا گیا لیکن ہمارا رابطہ بحال رہا خصوصی طور پر جب 1958ء میں میری انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمیشن میں شمولیت کے بعد ان سے رابطہ مضبوط ہو گیا۔

1960ء میں ایک دن وہ ویانا میں میرے دفتر میں آئے اور کہا کہ کیوں نہ ''آئی اے ای اے'' کے تحت تھیوریٹیکل فزکس کا ایک سنٹر قائم کیا جائے۔ اس کے اخراجات نہ ہونے کے برابر ہوں گے۔ صرف سٹیشنری کا خرچہ آئے گا اور فائدہ یہ ہوگا کہ مشرق ومغرب کے سائنس دان اپنی تنہائی چھوڑ کر ایک دوسرے سے مل بیٹھیں گے۔

خصوصی طور پر ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان جو سائنس کی دنیا کے ساتھ اپنے رابطے ختم کرتے جا رہے ہیں۔ جب میں نے ''آئی اے ای اے'' کے شعبہ تحقیق کے سربراہ سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے لئے وقت مانگا تو ان کا کہنا تھا ''یہ ڈاکٹر عبدالسلام کون ہیں؟'' جب انہیں بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب رائل سوسائٹی کے کم عمر ترین رکن ہیں تو ان کا لہجہ بدل گیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر سلیگ مان دوست بن گئے لیکن بدقسمتی سے ڈاکٹر سلیگ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔ انہوں نے ''آئی اے ای اے'' کے عام اجلاس میں ''انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس'' قائم کرنے کی تجویز پیش کی لیکن ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے اس کی بہت مخالفت کی گئی۔ ''آئی اے ای اے'' کی سائنسی مشاورت کمیٹی جس میں نوبل انعام یافتہ ربی اور ھومی بھابا شامل تھے، نے اس کی شدید مخالفت کی۔ نجی طور پر یہ بھابا سنٹر بمبئی میں بنانا چاہتے تھے اور انہوں نے عبد السلام سے مدد کی درخواست بھی کی۔ عبد السلام نے اس پیشکش کو رد کر دیا۔ انہوں نے تمام دنیا کے

سائنس دانوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جس میں نوبل انعام یافتہ ہانس بیتھ بھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ ڈاکٹر عبدالسلام کی بہت قدر کرتے تھے۔ آخر کار ''آئی اے ای اے'' نے اپنی مشاورتی کمیٹی کی مخالفت کو رد کرتے ہوئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دی۔ ڈاکٹر عبدالسلام چاہتے تھے کہ یہ منصوبہ پاکستان میں شروع ہو۔ اس کے لئے عمارت اور دوسری ضروری اشیاء کے لئے انہوں نے ایوب خان سے 10 لاکھ ڈالر کا مطالبہ کیا لیکن انہیں یہ منصوبہ پسند نہیں آیا اور پاکستانی حکومت نے اسے رد کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اٹلی کی پیشکش قبول کر لی لیکن انہوں نے اس کی ایک شاخ اسلام آباد میں کھولنے کی کوشش ترک نہ کی کیونکہ وہ پاکستان واپس آکر نوجوان پاکستانیوں کو تربیت دینا چاہتے تھے لیکن ان کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔

تیسری دنیا کی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے سائنس سے مدد لینے کا ان کا خواب مفروضوں کی سطح سے آگے تھا۔ انہوں نے اپنے ادارے میں محض نظریاتی تحقیق نہیں کی بلکہ کمپیوٹر، الیکٹرانک کیمسٹری، انرجی کے موضوعات پر اجلاس منعقد کئے بلکہ ان کے لئے متعلقہ ادارے بھی قائم کئے۔ انہوں نے ترقی پذیر ممالک کو اکیسویں صدی میں سائنس کے کردار کا احساس دلایا۔ انہوں نے لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرق وسطیٰ اور ایشیا کے کئی صدور اور وزرائے اعظم کو سائنس کو پہلی ترجیح دینے پر قائل کیا لیکن پاکستان کے ضمن میں وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ وہ اعلیٰ تکنیکی ادارے، ایم آئی ٹی قسم کی یونیورسٹیاں اور سائنس کے لئے دوسرے عمومی ڈھانچے تعمیر کرنے کے لئے پاکستان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ناکامی سے دوچار ہوتے رہے۔ یہ ایک عظیم المیہ اور ہمارے منصوبہ سازوں اور سیاست دانوں کی ناکامی ہے کہ ہم اپنی بقا اور مستقبل کے لئے سائنس کی اہمیت کا ادراک نہیں کر سکے۔ سائنس کی دنیا کے لئے عبدالسلام ہمارا دریچہ تھا کیونکہ تمام دنیا کے عظیم ترین سائنس دان ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے اعلیٰ ترین تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں میں تیسری دنیا کے سیاست دانوں کو مواقع مہیا کئے۔ تھیوریٹیکل فزکس میں ان کی نمایاں خدمات کے علاوہ جس کے لئے انہیں نوبل انعام ملا ان کا سب سے بڑا ورثہ یہ ہے کہ انہوں نے تیسری دنیا

کے لئے سائنس دانوں کی ایک کثیر تعداد کو تربیت دی۔

پروفیسر عبد السلام نے پاکستان میں سائنس کی ترقی کے لئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں اور 14 سال تک ''پی اے ای سی'' کے رکن رہے۔ وہ اس کے قیام ہی سے اس کی راہنمائی کرتے رہے۔ انہوں نے ہی اس کے لئے عمارت تعمیر کرنے کے مقام کا تعین کیا اور حکومت کو قائل کیا کہ وہ سائنس دانوں کو تربیت دے انہیں بیرون ملک بھیجے۔ انہوں نے نئے سائنس دانوں کو یونیورسٹیوں اور لیبارٹریوں میں جگہ دلوائی۔ انہوں نے پاکستان میں سیم وتھور کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے ایوب خان کو امریکہ سے مدد لینے کا مشورہ دیا جس کے بعد ریوے مشن قائم ہوا۔ 1990ء کی دہائی میں مجھے ڈاکٹر عبد السلام کے ساتھ نیوکلیئر فیول پروسیسنگ کے قیام کے لئے تجاویز تیار کرنے کا موقع ملا۔ ایوب خان نے معاشی بنیادوں پر اس منصوبے کو ترک کر دیا۔ اس طرح تیس برس قبل پاکستان نے اس اہم ترین ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا۔ جب وہ انتہائی سستی قیمت پر بلا روک وٹوک حاصل ہوسکتی تھی۔ جب 1979ء میں انہوں نے نوبل انعام وصول کیا تو اس کے فوراً بعد اندرا گاندھی نے انہیں بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سب سے پہلے پاکستان جانا چاہتے ہیں اور انہوں نے ریاست کے مہمان کی حیثیت سے پاکستان کا دورہ کیا۔ کئی ممالک کے سربراہان کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات تھے اور وہ سب ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چین کے دورہ کے دوران مجھے بتایا گیا کہ چینی اکیڈمی نے ان کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا ہے۔ جس میں وزیراعظم شریک ہوں گے لیکن تمام تر پروٹوکول کو توڑتے ہوئے چین کے صدر نے بھی اس ڈنر میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر عبد السلام سے میری آخری ملاقات محض تین ماہ پہلے ہوئی۔ ان کی بیماری اپنا کام دکھا چکی تھی اور وہ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ لیکن وہ میری باتوں کو سمجھتے تھے۔ میں نے ان کی سترویں سالگرہ کی پاکستان میں ہونے والی تقریبات کے متعلق انہیں بتایا۔ وہ مجھے دیکھتے رہے۔ وہ توصیف سے بالاتر ہو چکے تھے۔ جب میں جانے کے لئے اٹھا تو انہوں نے میرا ہاتھ نرمی سے دبا کر اپنی کیفیات کا اظہار کیا جیسے کہ وہ ان تمام

لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہوں جنہوں نے ان کے متعلق کلمات ادا کئے۔

ڈاکٹرعبدالسلام کے اپنے ملک نے ان کے ساتھ بے انصافی اور تعصب کا برتاؤ کیا لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان سے شدید محبت کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے پاکستان آنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ اب وہ پاکستان آ چکے ہیں اور اس مٹی میں دفن ہو چکے ہیں جس سے انہوں نے ہمیشہ انتہائی محبت کی۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم اس قابل ہو جائیں کہ تعصب سے بالاتر ہو کر انہیں تسلیم کریں اور ان کی موت کے بعد انہیں وہ کچھ دے سکیں جو ان کی زندگی میں ان کا حق تھا۔'' (روزنامہ ''آجکل'' لاہور 30 نومبر 1996ء)

ڈاکٹر سلام کی سائنسی خدمات اور اعلیٰ کردار

آپ محب وطن، سادہ مزاج، محنتی اور انسانیت کے ہمدرد تھے

جناب ڈاکٹر منیر احمد خان سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن

ترجمہ مکرم محمد زکریا ورک صاحب

یہ تقریر ٹریسٹ میں نومبر 1997ء کی سلام یادگاری میٹنگ کے موقعہ پر کی گئی تھی۔ ڈاکٹر خان 1972-1991ء تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین رہے تھے۔ وی آنا میں IAEA کے بورڈ آف گورنرز کے بارہ سال تک ممبر رہے۔ ڈاکٹر سلام سے ان کی دوستی کالج کے زمانہ سے تھی۔ دونوں نے آئی سی ٹی پی کے قیام میں ان تھک کوشش کی تھی۔ اٹامک انرجی کے پرامن استعمال پر ہونے والی 1964ء اور 1971ء کی کانفرنسوں کے وہ

سائنٹیفک سیکرٹری رہے تھے۔ متعدد بین الاقوامی کمیٹیوں کے ممبر رہے جن کا تعلق نیوکلیر پاور اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے تھا۔ 21 اپریل 1999ء کو یہ شمع سخن گل ہو کر مجلس سائنس کو سونی کر گئی۔

میرے لئے یہ بات باعث افتخار ہے کہ مجھے ایک پاکستانی اور سلام کے دوست کی حیثیت سے آج دو پہر بلایا گیا ہے تا ہم ڈاکٹر سلام کو خراج تحسین پیش کر سکیں۔ میں ذاتی طور پر آپ کا ممنون ہوں اور مجھے اس بات پر میں ذاتی طور پر آپ کا ممنون ہوں اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ سینٹر کا نام ان کی یاد کو زندہ رکھنے کیلئے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اگر چہ سینٹر کا آئیڈیا سلام کا تھا مگر اس کا قائم ہونا اطالوی حکومت کی مخیر مالی امداد اور آئی اے ای اے، یونیسکو فزکس کمیونٹی، اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اس کے دوستوں کی مسلسل سپورٹ کے بغیر ممکن نہ تھا۔ یہ تمام لوگ ہمارے مخلص شکریہ کے حقدار ہیں۔

سلام کے ہم عصر کے طور پر ان سے میری ملاقات 1942ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوئی تھی۔ ان سے میرا ملنا چار سال قبل سینٹر ماڈل سکول میں ممکن ہوسکتا تھا۔ لیکن جب ان کا داخلے کیلئے انتخاب ہو گیا تو ہیڈ ماسٹر نے ان کے والد محترم کو مشورہ دیا کہ وہ بچے کو واپس جھنگ لے جائیں کیونکہ وہ سر پر رومی ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور شاید دوسرے طالب علم اس کو نشانہ تضحیک بنائیں۔ یہ ایسا مشورہ تھا جس پر ہیڈ ماسٹر کو ساری زندگی تاسف رہا۔ میری ان کے ساتھ دوستی زندگی کے آخری لمحوں تک رہی۔ تعلیمی کامیابیوں کی بناء پر وہ لاہور آنے پر لیجنڈ بن چکے تھی۔ تھے۔ ہم دونوں نے 1945ء میں یونین الیکشن اکٹھے لڑا لیکن وہ بطور پریذیڈنٹ جیت گئے اور میں سیکرٹری کا الیکشن ہار گیا۔ وہ نہ صرف ایک فطری لیڈر بلکہ ان میں ادبی اور سائنسی ٹیلنٹ دونوں پائے جاتے تھے۔ کالج کے میگزین کے وہ چیف ایڈیٹر بھی رہے۔

ایسے لگتا ہے کہ ان کا کیریئر کئی مواقع پر الٹے رخ پر چلنے والا تھا مگر شاید تقدیر ان کی راہ نمائی کر رہی تھی۔ انگلش اور ریاضی کے مضامین اوّل پوزیشن حاصل کرنے کی وجہ سے ان کا استاد چاہتا تھا کہ وہ انگلش کے معلم بن جائیں لیکن مجھے شک ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ریاضی کی تعلیم سے وہ شطرنج

بہتر طریق سے کھیل سکیں گے۔ برطانوی راج کے اس دور میں ہر نوجوان کی یہی تمنا ہوتی تھی کہ وہ سول سرونٹ بن جائے۔ وہ قریب قریب انڈین ریلویز میں بھرتی ہو گئے مگر میڈیکل ٹیسٹ میں فیل ہو گئے کیونکہ انہوں نے چشمہ لگایا ہوا تھا۔ یوں وہ میری طرح انجینئر نہ بن سکے جس سے ریلوے کی لاج بھی رہ گئی کیونکہ وہ کوئی میکانیاتی عبقری نہیں تھے۔

ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ انڈین سول سروس میں بھرتی ہو جائیں لیکن 1946ء میں ان کی عمر ایک سال کم تھی کہ مقابلے میں حصہ لے سکتے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی ان کا داخلہ ایک خوشگوار حادثہ تھا۔ ان کے والد جھنگ کے محکمہ تعلیم میں ہیڈ کلرک تھے اور اس قابل نہیں تھے کہ ان کو تعلیم کی غرض سے غیر ملک بھجوائیں لیکن سلام نے زمینداروں کیلئے مختص سکالر شپ جیت لیا۔ کیمبرج میں ان کا داخلہ آخری منٹ پر ہوا جب سینٹ جانز کالج میں پروفیسر ڈائراک کے ماتحت ایک آسامی خالی ہوگئی تھی۔ ستمبر 1946ء میں انہوں نے بمبئی سے کیمبرج کیلئے سفر کیا اور قریب تھا کہ ان کو نیوی سے بھگوڑا سمجھ کر گرفتار کر لیا جاتا اگرچہ اس سے پہلے انہوں نے سمندر بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے بحری جہاز میں 1600 اطالوی جنگی قیدی بھی جو اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔

جب وہ لیور پول بندرگاہ پر اترے تو سردی سے کانپ رہے تھے۔ سر ظفر اللہ وہاں اس کے بچاؤ کیلئے غیب سے پہنچ گئے اور اپنا اوور کوٹ اس کو پہننے کیلئے دے دیا۔ اس زمانے میں کیمبرج میں سینٹرل ہیٹنگ نہیں ہوتی تھی اس لئے ہر موسم میں بھاری کپڑے پہنے رکھنے کی عادت اس کو پڑ گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں اس نے گرمیوں کے موسم میں بھی اوور کوٹ زیب تن کیا ہوتا تھا کیونکہ اس کو ہر وقت سردی لگتی رہتی تھی۔

جھنگ کا ایک لڑکا جس نے بجلی اس وقت تک نہیں دیکھی تھی جبکہ وہ بارہ سال سے اوپر کا نہیں ہو چکا تھا اس کیلئے کیمبرج میں خود کو نئی زندگی کے مطابق ڈھالنا کافی مشکل کام تھا۔ انہوں نے ایسا دن رات ریاضی کے مسائل کو حل کرنے میں کیا اور ٹرائی پوز کا امتحان بجائے تین سال کے دو سال میں

ختم کرلیا۔فریڈ ہوئیل نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ تجرباتی فزکس کیلئے کیونڈش لیبارٹری میں ایک سال کا عرصہ گزاریں۔لیکن سلام میں لیبارٹری کے کام کیلئے صبر کا مادہ نہیں تھا کیونکہ ان کے ہاتھ ان کی امیجنیشن کی برق رفتاری کے برابر نہیں چل سکتے تھے۔گریجوایشن کے بعد وہ کچھ عرصہ کیلئے پاکستان گئے اور اپنے کسانوں کے سکالرشپ کی مدت میعاد میں توسیع کروا کے واپس آ گئے لیکن انہوں نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ وہ دوبارہ کیونڈش میں قدم رنجہ نہیں ہوں گے۔

ان کے پی ایچ ڈی کرنے کے دوران ایک اور خوشگوار حادثہ رونما ہوا۔جب ان کو چیلنج کیا گیا کہ سائنس کا ایک مسئلہ جس کو ڈائراک اور فین مین جیسے اعلیٰ ذہین افراد بھی حل نہیں کر سکے تھے اس کا حل ایک سال میں تلاش کرے تو انہوں نے میسان تھیوری کو ری نارملائز کرنے کے مسئلہ کا حل چھ ماہ میں تلاش کرلیا۔اس کے بعد وہ اس وقت کے عظیم سائنسدانوں جیسے ڈائراک Dirac، بیتھے Betheاور آپن ہائیمر Oppenheimer کی نظروں میں آ گئے۔ایک عالمی شہرت والے سائنسدان کے طور پر ان کی پاکستان واپسی پر گورنمنٹ کالج کے ریاضی کے شعبہ کا ان کو صدر بنا دیا گیا اور اسکے ساتھ فٹ بال کلب کا صدر بھی۔جلد ہی ان کو پتہ چل گیا کہ دونوں کام آپس میں میل نہیں کھاتے اور ان کیلئے مشکل کا سامان پیدا ہو گیا۔انہوں نے خود کو مین سٹریم فزکس سے منقطع محسوس کیا اور اس علمی تنہائی کی فضا میں ان کیلئے سانس لینا مشکل ہو گیا۔اگرچہ ان کو پاکستان سے پیار تھا مگر وہ وہاں فزکس کی زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ان کے اندر برپا ہونیوالی اس کشمکش نے ان کی روح پر زبردست اثر مرتسم کیا۔زندگی میں بعد کے ایام میں وہ خود ان تھرڈ ورلڈ کے سائنسدانوں کی تنہائی کا احساس کر سکتے تھے جس کی وجہ سے کئی عبقری سائنسدان اس لئے پھل پھول نہیں سکتے کیونکہ وہ دنیا کے ریسرچ سینٹرز کیساتھ میل ملاپ نہیں کر سکتے۔1953ء میں ہونیوالے فرقہ وارانہ فسادات نے ان کو اور بھی پریشان کر دیا جب اس کی چھوٹی سی کمیونٹی کو نشانہ ستم بنایا گیا تھا۔ان حالات کے پیش نظر انہوں نے خود کو مجبور محسوس کیا کہ کیمبرج سے ملنے والی لیکچرار کی پیش کش کو قبول کر لیں۔اگرچہ انہوں نے

1954ء میں پاکستان کو ہمیشہ کیلئے الوداع کہہ دیا مگر ان کا دل پاکستان میں ہمیشہ اٹکا رہا۔

سلام کا ریاضی سے عشق

1951-58ء کے عرصہ کے دوران جب میں امریکہ میں تھا تو ہمارے درمیان تعلق منقطع رہا۔ لیکن جب 1958ء میں میں نے انٹرنیشنل اٹامک انرجی میں شمولیت کر لی تو ہمارے درمیان تعلق دوبارہ قائم ہو گیا۔ ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہمارے درمیان بہت سی چیزیں مشترک تھیں لیکن ان کے برعکس میرا پہلا پیار ریاضی یا فزکس سے نہیں تھا۔ ان کے نزدیک نیوکلیر فشن اور نیوکلیر پاور دقیانوسی ہو چکے تھے کیونکہ یہ پہلے ہی دریافت ہو چکے تھے۔ تاہم پاکستان اور تھرڈ ورلڈ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہمارے درمیان قدر مشترک تھی۔ اس کے علاوہ وہ پنجابی میں باتیں کرنے کیلئے ترستے تھے تاکہ کسی کے ساتھ اپنی امیدوں، ناامیدیوں اور مایوسیوں کو بیان کر سکیں کہ کسی طرح ان کو اپنے وطن میں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور وہ لوگ جن کو وہ پیار کرتے تھے وہ ان کو حقارت سے جھٹک دیتے تھے۔

1960ء میں وہ ایک روز وی آنا میں میرے دفتر میں آئے اور اس بات پر شدید غم کا اظہار کیا کہ ایجنسی ترقی پذیر ممالک کیلئے کافی کچھ نہیں کر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایجنسی کے زیر نگرانی ایک تھیوریٹیکل فزکس قائم کرنے کا ان کے پاس آئیڈیا ہے جس پر خرچ بہت کم آئیگا یعنی محض پنسل اور پیپر لیکن یہ سینٹر مشرق اور مغرب کے درمیان میٹنگ پوائنٹ بن سکے گا اور طبیعیات دانوں کی تنہائی کا بھی سد باب بن سکے گا۔ وہ ایجنسی میں کسی سے ملنا چاہتے تھے جو ان کے آئیڈیا کو آگے دھکیل سکے۔ میں نے پروفیسر سلگمان Sligman کو فون کیا جو ایجنسی کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کا صدر تھا۔ اس نے مجھے پوچھا پروفیسر سلام کون ہے؟ جب میں نے اس کو بتلایا کہ پروفیسر سلام رائیل سوسائٹی کا سب سے کم عمر میں بننے والا فیلو اور امپیریل کالج میں پروفیسر ہے تو اس کا رویہ بدل گیا۔ پھر سلام اور سلگمان اچھے دوست بن گئے مگر بچارہ سلگمان اگلے تیس سال تک زندہ نہ رہا کہ

اپنی فاش غلطی کو دیکھ سکتا۔ سلام نے آئی سی ٹی پی کے قیام کیلئے آئی اے ای اے کی جنرل کانفرنس کے سامنے تجویز پیش کی مگر سب سے زیادہ مزاحمت ترقی یافتہ ممالک سے ہوئی۔ ایجنسی کی سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی نے جن میں ایزوڈور ربائی Rabi جیسے نوبیل انعام یافتہ بھی شامل تھے اس تجویز کی مخالفت کی۔ انہوں نے اپنی حمایت میں دنیا کے ممتاز نظری طبیعیات دانوں کی حمایت حاصل کر لی۔ ڈاکٹر ایک لنڈ Eklund جو ایجنسی کا ڈائریکٹر جنرل تھا اس نے بھی سلام کی حمایت کی۔ آخر کار بورڈ آف گورنرز اور جنرل کانفرنس نے سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ اس طور سے آئی سی ٹی پی کی داغ بیل رکھی گئی تھی۔

دلچسپ واقعہ

مجھے وہ دن آج تک یاد ہے جب وہ وی آنا سینٹر کے قیام کیلئے بورڈ آف گورنرز کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ وہ ائر پورٹ پر اترے، ان کے جسم پر اوورکوٹ اور کینویس ہیٹ تھا جو کہ نہ صرف رنگ میں پھیکا پڑ چکا تھا بلکہ اس میں سلوٹیں پڑی ہوئیں تھیں۔ میں ان کو ایسی ہیئت میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میں نے ان کو منوالیا کہ اوورکوٹ اور ہیٹ اتار دیں جو میں نے کار کے ٹرنک (ڈگی) میں رکھ دیئے۔ ائر پورٹ اور برسٹل ہوٹل میں سفر کے دوران میں نے اس کا ہیٹ غائب کر دیا۔ جب ہم ہوٹل میں پہنچے تو انہوں نے ہیٹ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ بظاہر تلاش شروع کر دی مگر ساتھ ہی ان کو یاددہانی کرائی کہ انہوں نے بورڈ کی میٹنگ میں جانا ہے اسلئے ہیٹ کو بعد میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ میری بات کی منطق ان کے پلے پڑ گئی۔ بورڈ کے سامنے ان کی تقریر بہت ہی فصیح و بلیغ تھی۔ بحث کے آخر پر پرنسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر سمتھ Smith نے جو امریکہ کا گورنر تھا کہا: "ایجنسی کے بہت سارے ارکان ممالک آئی سی ٹی پی کو سپورٹ کرتے ہیں، پروفیسر سلام بھی اور وہ بہت سارے ممالک کے برابر ہے"۔ کمرے میں ہنسی کی لہر دوڑ گئی۔ سینٹر کی منظوری 1964ء میں دے دی گئی۔

سلام راسخ العقیدہ انسان تھے جو سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک علم کی تحصیل عبادت کی ایک قسم تھی اور خدا نے اپنے بندوں پر لازم قرار دیا ہے کہ وہ علم حاصل کریں، اور رموز کائنات سے آگاہ ہوں۔ تمام کائنات میں ہی صرف ایک قوت کارفرما ہے جو اس کو سنبھالے ہوئے ہے اور تمام دیگر قوتیں اسی منبع سے جاری ہوتی ہیں۔ یہ خیال ان کے عقیدہ کے پیچھے کارفرما تھا جس کے ذریعہ وہ فطرت کی چاروں قوتوں میں اتحاد ثابت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کا یقین تھا کہ سائنس کو محض سائنس کی خاطر ہی فروغ نہیں دینا چاہئے۔ اس کو انسان کی خدمت میں بروئے کار لایا جانا چاہئے جو کہ خدا کی سب سے اعلیٰ تخلیق کی آئینہ دار ہے۔ وہ سائنسی علم کو انسان کی ترقی کیلئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور تھرڈ ورلڈ کی اکنامک اور سوشل ڈیویلپمنٹ کیلئے یہ چیز اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ انہوں نے آئی سی ٹی پی کا سکوپ نظریاتی طبیعیات سے بڑھا کر کمپیوٹرز، الیکٹرانکس، کیمسٹری، انرجی، انوائرمنٹ، بائیوٹیکنالوجی تک پھیلا دیا۔ آج ٹریسٹ بڑی تیزی سے سائنس سٹی بن رہا ہے جہاں آئی سی ٹی پی کے اردگرد متعدد انسٹی ٹیوٹ قائم ہو چکے ہیں۔

سلام نہ صرف سائنس کا خادم بلکہ تھرڈ ورلڈ کا بھی خادم تھا۔ اس نے ترقی پذیر ممالک پر یہ حقیقت منکشف کی کہ سائنس ان کی ترقی اور ان کی موت وحیات میں کیا فیصلہ کن کردار ادا کرسکتی ہے۔ اس نے دنیا کے متعدد ممالک کے صدروں، سربراہوں اور پالیسی میکرز کو اکسایا کہ وہ سائنسی ادارے قائم کریں۔ مگر اس کا سب سے بڑا اورثہ وہ برین پاور ہے جو اس نے ڈیویلپ کی تھی۔ تیسری دنیا کے ہزاروں سائنسدان آئی سی ٹی پی میں آچکے ہیں تاکہ اس کے ویژن سے انسپائر ہوسکیں اور پھر اپنے ممالک کو واپس جا کر اسی شوق وذوق اور جوش وخروش سے اپنے اپنے ممالک میں علم کی شمع کو فروزاں کریں۔ سی پی سنوء Snow.C.P نے کہا تھا: ’’ہنرمند غریب افراد کیلئے اور تیسری دنیا کے غیر مراعات یافتہ لوگوں کیلئے کسی نے اتنا کچھ کیا نہیں ہے جتنا کہ سلام نے"۔ کولڈ وار کے مشکل

ترین سالوں میں اس نے مغرب اور مشرق کے طبیعیات دانوں کو ایک جگہ اکھٹا کیا اور سائنس کا ایسا پل تعمیر کیا جس نے دنیا کو کما حقہ فائدہ پہنچایا ہے۔

اگر چہ سلام پاکستان سے باہر رہتے تھے مگر انہوں نے پاکستان کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ڈویلپمنٹ میں صدر پاکستان کا سائنسی مشیر اعلیٰ اور پاکستان اٹامک انرجی کا 14 سال تک ممبر رہ کر بیش قیمت خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے ہمارے اٹامک انرجی پروگرام کی روز اول سے راہ نمائی کی اور پہلے نیوکلیری ایکٹر کے قیام میں مدد کی نیز کراچی میں نیوکلیر پاور پلانٹ کے حصول میں بھی مدد کی۔ انہوں نے حکومت پاکستان کو تجویز دی کہ سائنسدانوں کی تربیت غیر ممالک میں کی جائے جن میں سے کئی ایک اس وقت یہاں اس اجلاس میں موجود ہیں اور پاکستان میں سائنس کے لیڈرز ہیں۔ انہوں نے ہی ہمارا سپیس ریسرچ پروگرام شروع کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان میں سیم و تھور کے مسئلہ کے حل کیلئے غیر ممالک سے امداد طلب کی تھی۔ انہوں نے ہمیں نتھیا گلی سمر سکول Physics & Contemporary Needs پر شروع کرنے کا آئیڈیا دیا جو پچھلے 25 سال سے منعقد ہو رہا ہے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میں سینٹر فار فزکس قائم کیا جائے جو آئی سی ٹی پی کے قریبی تعاون کے ساتھ کام کرے۔ مجھے امید ہے کہ ہم ان کے خواب کو حقیقت کا روپ دے سکیں گے۔ ہمارے لئے سلام انسپریشن کا منبع اور دنیائے سائنس کی طرف کھلنے والے روشندان تھے جو ان کی رحلت کے بعد ہم پر بند ہو گیا ہے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ میں نے پندرہ سال تک ان کی پاکستان میں میزبانی کی تھی جب وہ ہمارے ملک کے صدروں، وزیر اعظموں سے ملنے آتے تھے جہاں وہ سائنس کے فروغ کیلئے وکالت کیا کرتے تھے۔ ان کی آخری خواہش یہ تھی کہ ریٹائر منٹ کی زندگی پاکستان میں گزاریں تا کہ یونیورسٹیوں میں نوجوان سائنسدانوں کی نئی نسل کی پرورش کر سکیں۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک سچے پاکستانی رہے۔ جب وہ سٹاک ہالم میں نوبیل انعام لینے گئے تو روایتی لباس یعنی زری

کھسے اور دیہاتی پگڑی میں ملبوس تھے۔ اتفاق سے وہ پگڑی باندھنا بھول چکے تھے۔ نوبیل تقریب کے موقعہ پر انہوں نے سر پر جو پگڑی پہنی ہوئی تھی وہ ہمارے پاکستانی سفیر کے خانسامے کا آرٹ ورک تھا۔ لیکن جو بات وہ لوگوں کو بتانا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ وہ اپنی نسلی وثقافتی جڑوں کو بھولے نہیں تھے اور یہ کہ وہ ایک ترقی پذیر ملک کے پسماندہ شہر سے وابستہ اپنی دیہاتی بیک گراؤنڈ پر فخر محسوس کرتے تھے۔

زندگی کی آخری ریسرچ:: سلام کے ساتھ میری آخری تفصیلی ملاقات ٹریسٹ میں 1992ء میں ہوئی تھی۔ ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ مجھے یاد ہے انہوں نے اپنی حویلی میں اوپر جانے کیلئے بغیر کسی سہارے کے سیڑھیاں چڑھنے پر اصرار کیا۔ اگلے روز انہوں نے میرے لئے ناشتہ تیار کیا جو ہم دونوں نے کچن میں کھایا اور مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بتلایا کہ وہ ریاضی اور فزکس کے اصولوں کو بائیولوجی پر لاگو کرنے کی کوشش میں ہیں تا کہ کائنات کے آغاز کے بارے میں مزید تفہیم پیدا کی جاسکے۔ انہوں نے چار ایلیمنٹری انٹرایکشنز میں سے دو کا جو اتحاد ثابت کیا تھا وہ اس پر مطمئن نہیں تھے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اگر زندگی نے کچھ اور دیر مہلت دی ہوتی تو وہ زندگی کے آغاز کے بارے میں ہمارے علم میں مزید اضافہ کر سکتے۔

ان کا آخری دیدار میں نے ان کی وفات سے تین ماہ قبل آکسفورڈ میں کیا تھا۔ میں نے ان کے گوش گزار کیا کہ کس طرح ہم نے پاکستان میں اس کی 70ویں سالگرہ جنوری 1996ء میں منائی تھی اور خراج تحسین جو پورے پاکستان میں ان کو ادا کیا گیا تھا۔ وہ میری باتیں غور سے سنتے رہے مگر جواب دینے سے محروم تھے۔ وہ مجھے ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہے گویا وہ اس قسم کی تعریف سے بالاتر ہو چکا تھا۔ جب میں رخصت لے رہا تھا تو انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ناتواں ہاتھ سے دبایا اور مجھے کہا کہ ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کردوں جنہوں نے ان کے بارے میں اچھی باتیں کہی تھیں۔

مجھ سے اکثر لوگ دریافت کرتے ہیں: کیا پاکستان ایک اور سلام پیدا کر سکے گا؟ مجھے معلوم

نہیں کہ آیا ایسا ہو سکے گا یا نہیں مگر ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔دنیا بھر کے ہزاروں ایسے نوجوان سائنسدان جنہوں نے ٹریسٹ کو وزٹ کیا اور انہوں نے ان کو اپنی نصائح سے انسپائر کیا، ان میں سے کئی ایک ایسے ہوں گے جو اس کے طے کردہ راستہ پر قدم رنجہ ہوں گے۔میرا یقین ہے کہ اگلی صدی میں کچھ نوبیل انعام یافتہ تیسری دنیا سے ایسے ہوں گے جو سلام کے چیلے ہوں گے۔سلام پیچیدہ انسان تھے جس میں کئی شخصیتیں ایک ذات میں مدغم ہو چکی تھیں۔ان کی گونا گوں دلچسپیاں، مشغلے اور جنون تھے۔وہ ایک معمار اور ژرف نگاہ انسان تھے۔انہوں نے اپنی ہی دنیا بسائی جو سائنس کے شہروں، اور علم کے بلند قلعوں سے بھری ہوئی تھی جہاں پیروکار ہر سال کے بعد اگلے سال رموز فطرت کو دریافت کرنے آتے ہیں۔عبدالسلام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس اس نئی دنیا کا محض ایک مظہر ہے جو سلام نے بسائی تھی۔

(Tribute to Abdus Salam, edited by A. Hamende, ICTP, Italy 1999pp 101-107)

(روزنامہ الفضل 25 جون 2009ء)

تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے۔میرا دوست۔میرا حبیب

(سابق چیف آف ائیر سٹاف ائیر مارشل

(ر) مکرم ظفر چوہدری صاحب۔لاہور)

اعلیٰ سائنس کی سنگلاخ زمین میں ڈاکٹر سلام کے کارہائے نمایاں کے متعلق کچھ کہنا میرے بس کی بات نہیں۔البتہ میں چند مختصر باتیں ان کی شخصیت متعلق عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

میری ان سے شناسائی 1942ء میں ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر میں داخل ہوئے۔اس سے قبل وہ پنجاب یونیورسٹی کے میٹرک اور ایف اے کے امتحانوں میں نئے ریکارڈ

قائم کر چکے تھے۔اس وقت کا عبدالسلام ایک شرمیلا سالڑکا تھا جو اپنے کام سے کام رکھتا۔کبھی کبھی وہ یہ انتظام کر لیتا کہ جب وہ پڑھائی میں مصروف ہو تو ہاسٹل کے کمرے کو باہر سے تالا یا کنڈی لگا دی جائے تا کہ یار دوست بلا وجہ اس کا وقت ضائع نہ کریں۔اس کی تفریح فقط شطرنج کی دو ایک بازیاں ہوتیں جو وہ کامن روم کے مار کر خوشیا سے کھیلتا۔اس زمانے میں نیو ہاسٹل میں باورچی محمد دین دونوں وقت نہایت لذیذ آلو گوشت پکایا کرتے تھے جو کہ عبدالسلام کو بہت مرغوب تھا اور وہ خوب سیر ہو کر کھاتے۔ان کے بے تکلف دوست ان کی پر خوری پر انہیں مذاق بھی کرتے لیکن وہ کبھی برا نہ مانتے۔

1946ء میں عبدالسلام ریاضی میں Tripos حاصل کرنے کیلئے کیمبرج چلے گئے۔کبھی کبھار وہ لندن آئے تو میری ان سے ملاقات ہوتی۔ان کا لباس حد درجہ سادہ ہوتا اور وہ اکثر ایک بڑی سی روسی ٹوپی اور rain coat پہنے رہتے۔فارغ وقت کھیل تماشے کی بجائے لندن میں مختلف Museums میں گزارتے اور ہم کھلنڈروں کو بھی ساتھ گھسیٹ لیتے۔ان کی طبیعت بہت سادہ اور ہر قسم کے تکلفات سے مبرا تھی۔ایک مرتبہ ہم بس میں سفر کر رہے تھے اور انہوں نے کچھ لکھنے کیلئے قلم جیب سے نکالا جس کی سیاہی کچھ Leak کر گئی تھی۔انہوں نے فالتو سیاہی بلا تکلف اپنے سر کے بالوں سے پونچھ دی۔میں نے جب کچھ حیرانی کا اظہار کیا تو کہا ''بھئی اس میں کیا حرج ہے۔سیاہی بھی کالی ہے اور سر کے بال بھی کالے ہیں۔کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

کیمبرج سے واپسی پر وہ گورنمنٹ کالج میں استاد مقرر ہوئے۔میں ایک مرتبہ کالج آیا تو ان سے سٹاف روم میں ملاقات ہوئی۔کہنے لگے کہ میرا بہت سا وقت محکمہ تعلیم کے فضول اعتراضات کا جواب دینے میں گزر جاتا ہے اور ساتھ ہی مجھ نابلد کو زبردستی کالج کی فٹ بال ٹیم کا نگران مقرر کر دیا گیا ہے۔ان حالات میں میں کوئی ٹھوس کام نہیں کر سکتا۔سوچتا ہوں کہ دوبارہ کیمبرج جا کر کچھ تحقیق کا کام کروں۔چنانچہ وہ کیمبرج چلے گئے اور وہ کام صرف چند ماہ میں مکمل کر لیا جو دوسرے برسوں میں کر پاتے ہیں۔1955ء میں مجھے Mr.Ian Stephens نے کیمبرج مدعو کیا جہاں وہ Kings

College میں Dean تھے۔ وہ ہندوستان میں Statesman اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اور ایک کتاب پاکستان کے متعلق بھی لکھ چکے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ پاکستان سے ایک شخص یہاں آیا ہوا ہے جس کے متعلق کیمبرج کے اساتذہ سمجھتے ہیں کہ وہ سائنس کی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل کرے گا۔ اس کا نام عبدالسلام ہے اور وہ تمام وقت اپنی دھن میں مگن رہتا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کیمبرج کے اساتذہ کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو 1957ء میں Imperial College of Science and Technology میں فزکس کے شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر 31 برس تھی اور اتنی کم عمر میں آج تک کسی اور کو یہ اعزاز حاصل نہ ہوا تھا۔ اس طرح انہوں نے لندن کے Putney نامی علاقے میں ایک مکان میں رہائش اختیار کر لی اور آخر دم تک اس گھر میں مقیم رہے۔ 1958 میں میری بیوی کو چھوٹے بچے کے علاج کے سلسلہ میں چند ہفتے لندن میں رہنا پڑا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے ہاں قیام کر سکتے ہیں۔ ان کا جواب تھا۔ یارا ے وی کوئی پچھن والی گل اے۔

"They would be most welcome"

ایک مرتبہ میرا چھوٹا بھائی اور میں صبح کے وقت ڈاکٹر صاحب کے گھر گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی قدر پریشانی میں جتایا کہ انہیں کالج پہنچنا ہے اور ان کی کار بیٹری کمزور ہونے کی وجہ سے سٹارٹ نہیں ہو رہی میرے بھائی نے کہا کہ اگر صرف یہ بات ہے تو غالباً دھکا لگانے سے کار شارٹ ہو جائے گی۔ ڈاکٹر عبدالسلام بہت حیران ہوئے اور پوچھا کہ کیا واقعی اس طرح کار سٹارٹ کی جا سکتی ہے۔ میرا بھائی کار میں بیٹھا اور ڈاکٹر سلام اور میں نے کار کو دھکا دیا اور یوں کار سٹارٹ ہو گئی اور یہ مشکل حل ہو گئی۔ اس طرح ہم پر یہ کھلا کہ ضروری نہیں کہ ایک عظیم سائنسدان روزمرہ کے معمولی ٹوٹکوں سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

ڈاکٹر سلام کا رہن سہن بہت سادہ ہوتا اور گھر میں بیوی بچوں سے ٹھیٹھ پنجابی بولتے۔ ان کے کمرے میں ایک سادہ سا بستر بچھا ہوتا اور ہر طرف کتابیں بکھری ہوتیں۔ سائنس کے علاوہ انہیں

انگریزی، فارسی، اردو اور پنجابی ادب سے بھی گہری واقفیت تھی۔ ہزاروں اشعار یاد تھے اور موسیقی کے رموز سے بھی آشنا تھے۔ مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کا گہرا مطالعہ تھا اور وہ یہ بات کہتے ہوئے کبھی نہ تھکتے تھے کہ قرآن حکیم قوانین اور عبادات کی نسبت تحصیل علم، تفکر اور تحقیق پر کہیں زیادہ زور دیتا ہے۔ گویا کہ کہا جا سکتا ہے کہ اس انتہائی ذہین و فطین شخص کا مزاج فلسفی درویشوں جیسا، دل حساس ادیبوں اور شاعروں جیسا اور دماغ ایک بلند نگاہ اور مہم جو سائنسدان کا سا تھا۔

وہ ہر قسم کے تعصب سے آزاد تھے اور تنگ نظری کی ہر شکل کو غلط قرار دیتے۔ ہر معاملہ میں بنی نوع انسان کی بہتری ان کے پیش نظر ہوتی۔ بایں ہمہ ان کے دل میں اسلامی دنیا اور خاص طور پر اپنے وطن پاکستان کے لئے سچی تڑپ تھی اور یہی وجہ تھی کہ باوجود کثیر العیال ہونے اور محدود وسائل رکھنے کے انہوں نے لاکھوں ڈالر کے ملنے والے انعامات میں سے کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھا اور ان تمام رقوم سے ایسے ٹرسٹ بنا دیے جن سے خاص طور پر پاکستانی طلباء اور سائنسدان استفادہ کر سکیں۔ ایسی قربانی اور بے لوث حب الوطنی کی مثالیں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ مختلف ترقی یافتہ ممالک نے انہیں اپنی شہریت پیش کی اور امداد کا وعدہ کیا جب کہ ان کے اپنے بدنصیب ملک نے ان سے اکثر و بیشتر سرد مہری اور سوتیلے پن کا سلوک کیا۔ اس جاہلانہ تنگ نظری کی ایک مثال یہ ہے کہ نوبیل پرائز ملنے کے موقع پر جو تقریر انہوں نے کی پاکستانی ٹیلی ویژن اور اخبارات نے اسے رپورٹ کرتے ہوئے وہ حصے کاٹ دیئے جن میں کہ قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا تھا۔ لیکن اس خدا کے بندے نے تمام غیر ملکی پیشکشوں کو ٹھکراتے ہوئے آخر دم تک پاکستان کے سبز رنگے پاسپورٹ کو سینے سے لگائے رکھا۔ سچ ہے۔ وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے۔

ڈاکٹر سلام تیسری دنیا کی اور خاص طور پر اسلامی دنیا کی پسماندگی پر بہت رنجیدہ ہوتے تھے حتی کہ وہ پسماندگی اور غربت کو کفر کی ایک قسم قرار دیتے اور اس کا ذمہ دار کسی دوسرے کو ٹھہرانے کی بجائے یہ سمجھتے تھے کہ اس کی اصل وجہ ہمارا علم اور سائنس کو نظر انداز کرنا ہے۔ وہ اس بات پر زور

دیتے تھے کہ سائنس اور تحقیق سے نہ صرف ذہن آزاد ہوتا ہے اور علم و دانش ترقی کرتے ہیں بلکہ ان کا صنعت و حرفت اور رہن سہن پر فوری خوشگوار اثر پڑتا ہے اور غربت اور پسماندگی کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی تمام عمر اس کوشش میں صرف ہوئی کہ ہم سائنس کی اہمیت کو سمجھیں اور اسے قومی ترجیحات میں صحیح درجہ دیں۔ وہ چاہتے تھے کہ سائنس کے لئے زیادہ وسائل مہیا کیے جائیں اور سائنسدانوں کو معاشرے میں مناسب مقام حاصل ہو۔ یہ ایک مرتبہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام اسلامی ممالک، جن میں کچھ بہت امیر بھی ہیں اپنی پیداوار کا ایک فیصد سائنس اور تحقیق کیلئے مختص کر دیں تا کہ اعلیٰ تحقیقی ادارے قائم ہو سکیں اور کچھ علمی کام ہو۔ انہوں نے یقین دلایا کہ اس طرح اسلامی دنیا کا نقشہ بدل جائے گا اور ایک دفعہ پھر وہ علم وفن کا گہوارہ بن جائے گی اور دوسرے اس سے استفادہ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ تمام ممالک نے اتفاق کیا اور مقررہ شرح کے مطابق وسائل مہیا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ لیکن الا ماشاء اللہ کسی نے بھی وعدہ پورا کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ افسوس کہ ڈاکٹر سلام کی دردمندانہ اور حق آشنا اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی اور مسلمان ملکوں کی حالت میں کوئی قابل قدر بہتری نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ ان کا وجود اور ان کی بقا بھی دوسروں کے رحم و کرم پر موقوف چلے آتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سلام چاہتے تھے کہ وہ بین الاقوامی ادارہ جو بالآخر اٹلی میں قائم ہوا پاکستان میں قائم کیا جائے۔ لیکن ان کی یہ خواہش بھی ہماری حکومتوں کے بے اعتنائی کی نظر ہو گئی اور آج جو ناگفتہ بہ حالت سائنس اور علم کی ہمارے ملک میں نظر آتی ہے وہ یقیناً ہم سب کے لئے دکھ اور شرمندگی کا باعث ہے۔ چند برس ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام گرمیوں کے موسم میں دہلی جاتے ہوئے لاہور ٹھہرے۔ روانگی کے لئے تیار ہو کر آئے تو کوٹ پتلون کے اوپر raincoat پہنا ہوا تھا۔ میں نے از راہ تفنن پوچھا کہ کیا دہلی میں برف باری ہو رہی ہے جو اس کی تیاری کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا اور کہا ''بھئی بات یہ ہے کہ اس کوٹ نے ایک طویل عرصہ میرے ساتھ وفا کی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ سفر میں یہ کہیں کھو جائے۔ اس لئے میں اسکی حفاظت کے لئے اسے گرمی

سردی میں پہن ہی لیتا ہوں۔‘‘

یہ انتہائی سادہ سوچ اس شخص کی تھی کہ جب اس نے کیمبرج میں اپنے استاد سے اپنے کام کے متعلق سرٹیفکیٹ مانگا تو استاد نے کہا کہ بہتر ہوگا کہ تم مجھے سند دو کہ تم نے میرے ساتھ کام کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام سے میری آخری ملاقات کوئی تین سال قبل ان کے بیٹے کے نکاح کے موقع پر ہوئی۔ وہ اپنی Wheel Chair میں بیٹھے کھوئے کھوئے نظر آرہے تھے۔ میں قریب آکر بیٹھا تو میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کالج کا زمانہ یاد کرنے لگے۔ ان کی بات بڑی مشکل سے سمجھ آتی اور میں اندازے سے جواب دیتا رہا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ وہ شخص جو اپنے لطیف نکات اور زور خطابت سے دنیا کے ممتاز دانشوروں کو مسحور کر لیتا تھا۔ اب **کل من علیہا فان** کی منزل کی طرف محو سفر تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی اس نے حکومت پاکستان کے علاج کیلئے پیش کش کا یہ جواب دیا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ اپنے ملک کے غریب لوگوں کی کمائی سے جمع شدہ پیسے کو اپنی ذات پر خرچ کروں اور اب وہ نابغہ روزگار شخص اسی چٹیل اور شور زمین میں ابدی نیند سو رہا ہے جس نے کہ اسے جو جنم دیا تھا۔ سچ ہے باقی رہے نام اللہ کا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے!
کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بھری بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر خدا سے دعا

انور سدید

جمعرات 21 نومبر 1996ء کو سائنس کی دنیا سے وہ شخص رحلت کر گیا

جس نے نظریہ اضافیت کے خالق آئن سٹائن کی فزکس کی دریافتوں میں توسیع کی اور ''یونی فیکیشن آف فورسز'' کا نظریہ پیش کر کے 1979ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ یہ ڈاکٹر عبدالسلام تھے جو پاکستان کے معروف لیکن دورافتادہ شہر جھنگ میں ایک اقلیتی فرقے میں پیدا ہوئے لیکن سائنس کی دنیا میں اتنے معروف ہوئے کہ اب ان کا نام نیوٹن، آئن سٹائن، سٹیون وائن برگ، سڈنی گلوسگو جیسے مغربی سائنس دانوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انہیں تیسری دنیا کے ان معدودے چند طبقات کے ماہرین میں بلند مقام دیا گیا جن کی دریافتوں سے نہ صرف انسانی زندگی کو ارتقاء کا اگلا قدم اٹھانے کا موقع ملا بلکہ کائنات کی تشکیل اور زندگی کو برقرار رکھنے والی قوتوں کی .... کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔

ڈاکٹر عبدالسلام 29 جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد جھنگ میں ایک معمولی کلرک تھے۔ اس دور میں بجلی کے قمقمے صرف لاہور جیسے بڑے شہروں کو منور کرتے تھے۔ عبدالسلام مٹی کے تیل کے چراغ پر اپنی نصابی کتب پڑھتے۔ لیکن اس غریب طالب علم کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے میٹرک سے لے کر ایم اے تک تو امتحان بھی دیا اس میں نہ صرف کامیابی حاصل کی بلکہ سابقہ ریکارڈ توڑ کر نئے ریکارڈ قائم کئے۔ ان کی کامیابیوں کا گوشوارہ کچھ یوں ہے۔ ایف اے 600 نمبروں میں سے 555 نمبر حاصل کئے۔ بی اے 500 میں سے 451 نمبر حاصل کئے۔ ایم اے (ریاضی) 600 میں سے 573 نمبر پائے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی فنون میں گئے تو ریاضی کی ڈگری تین سال کے بجائے دو سال میں اور فزکس کی ڈگری تین سال کے بجائے ایک سال میں حاصل کی۔ فزکس کی گتھی جس پر انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی، صرف 5 ماہ میں سلجھائی۔ اس کے لئے بالعموم پانچ برس صرف کئے جاتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام فزکس میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پاکستان آ گئے۔ پاکستان کے تحفہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالبعلموں کو فزکس کی تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ ان کی

تدریسی خدمات سے استفادہ کرنے کے بجائے کالج حکام نے انہیں ضابطے کی کارروائیوں میں الجھا دیا۔ ایک فرض انہیں یہ بھی تفویض کیا گیا کہ شام کو کھیلوں کی نگرانی کریں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب طلبہ کو ''نظریہ اضافیت'' (Theory of Relativity) پڑھانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے شام کی ''مفت کلاسوں'' کا اجراء کیا۔ ابتداء میں خاصی بڑی تعداد میں طالبعلم آئے لیکن آخر میں جب صرف دو رہ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اس حقیقت کو پا لیا کہ اس ملک کی فضا جدید علوم کیلئے ساز گار نہیں، چنانچہ وہ کیمبرج واپس چلے گے۔ 10 نومبر 1979ء کو جب انہیں نوبل انعام دیا گیا تو انہیں ایک عالمی شہرت کے پاکستانی سائنس دان کی حیثیت مل چکی تھی لیکن ان کے اندر کا انسان مطمئن نہیں تھا۔ انہیں یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ ان کا ملک تیسری دنیا کا ایک پسماندہ ملک تھا۔ چنانچہ جب صدر ایوب نے 1960ء میں انہیں اپنا سائنسی مشیر مقرر کیا تو انہوں نے اس سے انکار نہ کیا اور پاکستان کے اٹامک انرجی کمیشن، کراچی نیوکلیئر پلانٹ اور اپلائیڈ فزکس کے متعدد اداروں کی تعمیر و تشکیل میں معاونت کی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا سب سے بڑا کارنامہ ٹریسٹی کے مقام پر انٹرنیشنل سنٹر آف تھیوریٹیکل فزکس کا قیام تھا۔ یہ سائنسی مرکز تیسری دنیا کے سائنس دانوں اور طلبہ کو عالمی سطح کے سائنس دانوں سے تعلیم حاصل کرنے اور ان سے تبادلہ خیالات کا موقع فراہم کرتا ہے۔ 1964ء سے لے کر اب تک چالیس ہزار سے زیادہ سائنس دان اس سنٹر سے استفادہ کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد بھی جاری رہے گا۔ بلاشبہ ٹریسٹی سنٹر نے اور خود ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان میں سائنسی فروغ کے لئے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی دریافتوں سے سائنسی دنیا کے نقشے میں پاکستان کا نام منور ہوا ہے، اسے سربلندی ملی ہے۔ میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ایک طرف پاکستان کرپشن کی افراط کی وجہ سے پوری دنیا میں ذلت اور بدنامی کا شکار ہے اور اب ہمارے سیاستدان اور بیوروکریٹ احتساب کا سامنا کرنے والے ہیں، لیکن دوسری طرف ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان کو اپنی سائنسی دریافتوں سے باعزت

اور باوقار بنا دیا۔ جب یہاں لوگ مال بنانے میں مصروف تھے تو ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے عالمی ایوارڈوں سے حاصل ہونے والی ساری دولت عوام کے لئے وقف کر دی اور عالمی سطح کے سائنسی ادارے قائم کئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام سادہ مزاج انسان تھے۔ علم و ادب سے انہیں گہری وابستگی تھی۔ حافظ اور اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ تنہائی کے لمحوں میں وہ اقبال پڑھتے تو ان کے فلسفۂ حرکت و حرارت کو فزکس کے مطالعے سے اثبات فراہم کرتے اور ان سے مزید جستجوئے علم کا جذبہ حاصل کرتے۔ خُدا انہیں اس تجربے سے گزارے جو قلب پر وارد ہوتا ہے تو کسی اور کائنات کی خبر رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک کتاب ''آئیڈیل اور ریئلٹی'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ پاکستان میں اس کتاب کا ترجمہ شہزاد احمد نے کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب میں یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو مجھے علامہ اقبال کے فلسفہ کے استاد .... یاد آئے۔ اقبال اس عیسائی فلسفہ دان کو ایسا صوفی قرار دیتے تھے جسے بشارت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا تعلق قادیانی فرقے سے تھا۔ جس سے پاکستان کے عامۃ الناس کو اختلاف ہے۔ وہ اپنے عقیدے پر سانحہ ارتحال تک قائم رہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق وہ اللہ کے ایک بڑے انعام سے محروم رہے۔ حکومت نے انہیں حسن کارکردگی کا تمغۂ نشان امتیاز اور ستارۂ پاکستان کے اعزازات پیش کئے۔ ایک عالم نے ان کو تحسین سے نوازا۔ خدا نے ان پر سائنس کی بشارتیں اتاریں۔ ان بشارتوں کی صداقت تجربے سے ثابت ہوئی۔ سائنسی صداقتوں کو عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر میرے دل سے دعا نکل رہی ہے کہ ''اے خدا، سائنسی علوم کے چند زاویے ہم جیسے گنہگار مسلمانوں پر بھی منکشف فرما۔'' اے خدا، ہمیں معصیت کے سمندر سے نکال۔

''اے خدا، اپنا ابرِ کرم ہم پر بھی برسا، اس شوریدہ زمین سے کوئی ابنِ سینا، کوئی ابن رُشد پیدا کر .... اے خدا، اے خدا!!'' (گُفت نی۔ انور سدید) (بشکریہ روزنامہ ''خبریں'' 27 نومبر 1996ء)

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ہیرو کی موت

''ہم انسانی تاریخ کے اس تاریک دور سے ابھی باہر نہیں نکل سکے''

(روزنامہ ''پاکستان'' لاہور کی ایک تحریر)

ڈاکٹر عبدالسلام سے زیادہ کسی اور ایشیائی شخصیت کو جدید سائنس کی دنیا میں اتنا احترام حاصل نہیں ہوا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ 1979ء میں ملنے والے طبیعیات کے نوبل پرائز سے زیادہ اس امر سے لگانا چاہئے کہ پارٹیکل فزکس میں گزشتہ نصف صدی کے دوران جتنی بھی ترقی ہوئی ہے وہ کسی نہ کسی طور ڈاکٹر صاحب کی مرہون منت ہے۔ یوں ستر برس کی عمر میں لندن میں ڈاکٹر صاحب کی وفات سے ان کے ہم وطنوں کو نہ سہی، سائنس کے عالمی حلقوں کو ضرور نقصان پہنچا ہے اور وہ اپنی ممتاز ترین غیر سفید فام شخصیت سے محروم ہوگئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یوں کہنا چاہئے کہ ترقی پذیر قوموں کے مفاد کو ضعف پہنچا ہے۔

نظری طبیعیات بلاشبہ ڈاکٹر عبدالسلام کی پہلی محبت تھی لیکن گزشتہ میں پینتیس برسوں سے وہ سائنس دان کے ساتھ عالمی مدبر کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ ان کی زیادہ تر دلچسپی سائنس کو مغربی حدود سے نکال کر ترقی پذیر ملکوں تک لانے میں تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے دن رات کام کیا ہے اور وہ اس طویل جدوجہد کی یادگار اٹلی میں ٹریسٹ کے مقام پر نظری طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز کی صورت میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ مرکز 1964ء میں یونیسکو اور اطالوی حکومت کی امداد سے بنایا گیا تھا۔ تب سے یہ مرکز ترقی پذیر ملکوں کے سائنس دانوں کو بڑی تعداد میں تربیت اور تحقیق کی سہولتیں باقاعدگی سے بہم پہنچا رہا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہے اور غریب ملکوں کا شاید ہی کوئی قابل ذکر سائنس دان ہوگا کہ جس نے اس مرکز سے فائدہ نہ اٹھایا ہو چنانچہ اعداد و شمار یہ ہیں کہ اب تک اس

مرکز سے چالیس ہزار سے زیادہ سائنس دان مستفید ہو چکے ہیں۔

ٹریسٹی کا یہ مرکز ترقی پذیر ملکوں میں سائنس کے فروغ کے معاملے میں ڈاکٹر عبدالسلام کی کومٹمنٹ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی خاص خواہش اور کوشش تھی کہ پاکستان اور اسلامی دنیا میں سائنس کی تحقیق و ترقی کا وہ سلسلہ پھر سے شروع ہو جائے جو ان کے خیال میں چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں ٹوٹ گیا تھا اور جس کے سبب مسلم دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاملے میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اپنی اس دلچسپی کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے اقوام متحدہ کے ایک یونیورسٹی سمپوزیم میں یوں کیا تھا کہ ''میں آپ سے پرزور طریقے پر یہ استدعا کرنے آیا ہوں کہ عرب اور اسلامی دنیا کی ایک سائنسی دولت مشترکہ بنائی جائے۔ جس میں تخلیقی علم کو اعلیٰ ترین فوقیت حاصل ہو۔ میں یہ عرض کروں گا کہ ایسا کرنے کے لئے کن اقدام کی ضرورت ہے۔ اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمیں قوموں کی برادری میں ایسا مقام ملے جو ہمارے لئے مناسب بھی ہو اور ہماری عزت نفس کے بھی مطابق ہو''۔

ایک اور موقعہ پر پاکستان پلاننگ کمیشن کے ایک اجلاس میں ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت یوں کی تھی ''کہ جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے، مسلم امت سائنس کے شاندار ماضی کی حامل ہے۔ بدقسمتی سے زمانہ حال سائنس کے سلسلے میں اس قدر شاندار نہیں ہے۔ اس کرہ ارض پر جس قدر بھی تمدن ہیں ان میں سے اسلامی ممالک میں یہ سائنس کمزور ترین ہے۔ اس حوالے سے کسی کو بھی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں علم قومیت تاریخ کے کسی بھی عہد میں سائنس کے معاملے میں مضبوط نہیں تھی چنانچہ اس سلسلے میں ایک بھی نام ایسا نہیں ہے جو ہم ساری افغان اور مغل تاریخ میں بطور عالمی سطح کے سائنس دان کے لے سکتے ہوں۔ صرف البیرونی ہی ایک استثناء ہے جو 1000ء کے قریب ہندوستان آیا تھا۔ ہمارے حکمران اور ان کی فوجی حکومتیں اس معاملے میں دلچسپی رکھتی ہی نہیں ہیں کہ علوم اور سائنس کے کوئی ادارے قائم کئے جائیں۔ ان کی دلچسپی محض

اس قدر تھی کہ وہ اپنے لئے شاندار مقبرے بنائیں تا کہ وہ ان کی عظیم مملکتوں کی یادگار بن جائیں۔ یہ مقام افسوس ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

میں یہاں ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی کامیابیوں کا ذکر نہیں کروں گا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ مجھے ان کے (UNIFYING THEORY) کے فلسفیانہ پہلوؤں سے دلچسپی رہی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے قائم سائنسی حاصلات کی وضاحت کا حق تو ڈاکٹر پرویز ہود بھائی ہی ادا کر سکتے ہیں یا پھر ڈاکٹر انیس عالم، البتہ میں یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں کون کون سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مندرجہ ذیل تین عوامل کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔

(1) ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ سائنسی علم کو ترقی دیں گے۔ ہمیں یہ اندازہ بھی نہیں ہے کہ سائنس کا اطلاق قومی اقتصادی اور دوسرے مسائل پر ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر 1870ء میں جاپان کے شہنشاہ نے نئے منشور کے تحت پانچ حلف اٹھائے تھے۔ تو ان میں سے ایک حلف یہ تھا کہ علم جہاں سے بھی ملے گا اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے لئے سب ذرائع جو ہمارے پاس استعمال کئے جائیں گے تا کہ جاپان کو عظمت حاصل ہو سکے'' ہم نے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں سائنس دانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور یہی حال ان مصارف کا ہے جو سائنس پر کئے جا رہے ہیں۔ (2) ہمارے ملک میں نوجوان سائنس دانوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی مناسب انتظام نہیں۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ دوسرے ادارے بھی اس معاملے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ پاکستان اصل میں کاغذی تحقیقی اداروں کی جنت ہے۔ کوئی ٹھوس کام کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی۔ (3) کسی پاکستانی حکومت نے قومی سطح پر ٹیکنالوجی کے معاملے میں خودکفیل بننے کی کوشش نہیں کی حتی کہ دفاعی ٹیکنالوجی کو بھی ہم نے نظرانداز کر رکھا ہے۔''

خیر چھوڑیں اس قصے کو کہ یہ بہت طویل ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام کے ذکر کو آگے بڑھاتے ہوئے میں آپ کی خدمت میں ڈاکٹر صاحب کی وہ تقریر پیش کرتا ہوں جو انہوں نے 10 ستمبر 1979ء کو نوبل انعام ملنے کی تقریب میں کی تھی۔سویڈن کے بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''اپنے رفقاء پروفیسر گلاشو اور وائن برگ کی طرف سے میں نوبل فاؤنڈیشن اور رائل اکیڈمی آف سائنسز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ہماری عزت افزائی کی اور ہم پر بعض نوازشات کیں جن میں یہ نوازش بھی شامل ہے کہ مجھے میری قومی زبان میں مخاطب ہونے کی اجازت دی اس کیلئے پاکستان ممنون ہے۔'' ''طبیعیات کی تحقیق تمام انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہے۔مشرق اور مغرب،شمال اور جنوب سب نے اس میں مساوی حصہ لیا ہے۔اسلام کی مقدس کتاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہیں پاؤ گے۔پھر پلٹ کر دیکھو کہ تمہیں کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔''

فی الحقیقت تمام ماہرین طبیعیات کا یہی ایمان ہے۔جتنی گہرائی تک ہم تلاش کریں اتنی ہی ہماری حیرت بڑھتی جاتی ہے اور اس تناسب سے ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔میں یہ بات صرف اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں آج شام آپ کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ بات میں خاص طور پر تیسری دنیا کو مخاطب کر کے بھی کہہ رہا ہوں۔تیسری دنیا والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ سائنسی علم کی جستجو کی بازی ہار چکے ہیں کیونکہ ان کے پاس مواقع اور ذرائع موجود نہیں ہیں۔ (نوبل انعام کا اجراء کرنے والے) الفرڈ نوبل نے یہ پیمان باندھا تھا کہ رنگ و نسل کا کوئی بھی امتیاز اس کی فیاضی کے حصول کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔اس موقع پر میں ان سے مخاطب ہو کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن کو خدا نے یہ عطیہ عطا کیا ہے۔آیئے ہم سب کو ایک جیسے مواقع فراہم کرنے کے لئے جدوجہد کریں تا کہ وہ طبیعیات اور سائنسی تخلیق میں شامل ہو کر ساری انسانیت کے لئے نئے فوائد حاصل کریں۔یہ سب کچھ الفرڈ نوبل کی آرزو اور ان خیالات کے مطابق ہوگا جو اس کی زندگی

میں نفوذ کر گئے تھے............اللہ آپ کو نوازے۔''

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام جب نوبل انعام وصول کرنے گئے تھے تو انہوں نے مکمل پنجابی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شلوار کرتا، شیروانی، پاؤں میں کھسہ اور سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ نوبل انعام کے ساتھ ان کو ساٹھ ہزار ڈالر نقد بھی ملے تھے جو انہوں نے فوراً ہی غریب ملکوں کے سائنس دانوں کی تربیت کے ادارے کو عطیہ کے طور پر دے دیئے تھے۔ اس موقع پر انہوں نے اپیل بھی جاری کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''میں پورے انکسار کے ساتھ اسلامی ملکوں سے اپیل کرتا ہوں کہ تم میں سے بعض کو اللہ نے بڑی فیاضی سے نوازا ہے۔ آپ کی آمدن تقریباً 60 ارب ڈالر کے قریب ہے۔ بین الاقوامی رواج کے مطابق ان ملکوں کو لگ بھگ ایک ارب ڈالر ہر سال سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر خرچ کرنے چاہئیں۔ یہ ان کے آباء واجداد ہی تھے جنہوں نے آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارھویں صدیوں میں بین الاقوامی سائنسی تحقیق کی شمع روشن رکھی تھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیت الحکمت قائم کئے تھے جو سائنس کے اعلیٰ ادارے تھے۔ ان کے ہاں عرب، ایران، ہندوستان، ترکی، بازنطینی عالموں کا ہجوم تھا۔ ایک بار پھر فیاضانہ رویہ اختیار کیجئے۔ آپ سائنس پر سالانہ ایک ارب ڈالر خرچ کیجئے خواہ دوسرے نہ کریں۔ ایک باصلاحیت فنڈ قائم کیجئے جو سب مسلمان ملکوں کے لئے ہو۔ عرب اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ملکوں کے لئے تاکہ کوئی اعلیٰ صلاحیت والا سائنس دان ضائع نہ ہو جائے۔''

یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے ملک سے جو گہری محبت تھی وہ زندگی کے آخری سانس تک قائم رہی حالانکہ ان کے ملک نے نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی قدر نہ کی تھی بلکہ ان کے ساتھ اچھوتوں سے بھی برا سلوک کیا تھا۔ 1979ء میں دنیا بھر کی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹر صاحب کی سائنسی کامیابیوں کے اعتراف میں ان کو اعلیٰ ترین ڈگریوں سے نوازا تھا لیکن پنجاب یونیورسٹی نے ان کی کوئی پذیرائی نہ کی۔ 23 مختلف ملکوں کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹر آف سائنس کی 36 اعزازی ڈگریاں

حاصل کرنے والے ڈاکٹر عبد السلام نے اسی قدر ناشناس یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور اس میں استاد بھی رہے تھے۔ پاکستان کی کسی اور یونیورسٹی کو بھی ڈاکٹر صاحب کو بلانے اور ان کی تشریف آوری سے اپنا اعزاز بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ قرون وسطیٰ میں مذہبی اختلاف کے باعث کبھی کبھار کسی جینئس کے ساتھ اس قسم کی بدسلوکی کی مثالیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر عبد السلام کے ساتھ ہمارے اس سلوک سے پتہ چلتا ہے کہ ہم انسانی تاریخ کے اس تاریک دور سے ابھی باہر نہیں نکل سکے۔
(روزنامہ ''پاکستان'' یکم دسمبر 1996ء)

پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام کی یاد میں

ملے تھے اعزاز دنیا بھر سے سلام مجھ کو نگر نگر سے
امام رابع کی شفقتوں کا بڑا تھا اعزاز اپنے گھر سے
رہا سدا تجھ پہ رب کا سایہ، کبھی نہ کبر و غرور آیا
ملے جو تجھ کو مقام عالی نہ چھپ سکیں گے کسی نظر سے
زمانے بھر کی حدوں سے آگے گیا تھا فکر و خیال تیرا
کہ برق و جوہر کی طاقتوں کا ہے ایک کرنا کمال تیرا
یہ ایک نوبل کی بات کیا ہے ابھی تو اور اعتراف ہوں گے
بھلا سکے گی نہ تجھ کو دنیا کبھی نہ ہوگا زوال تیرا

(مکرم ظہور الدین بابر صاحب ایم۔اے)

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ...........

مکرمہ ڈاکٹر فہمیدہ منیر صاحبہ۔ ربوہ

دورِ حاضر میں ڈاکٹر عبدالسلام کے بارہ میں معلوماتی مواد ڈھیروں کی صورت میں موجود ہے۔ان کے بارہ میں وہی باتیں بار بار لکھنا وہی معلومات فراہم کرنا جو سب کی لکھی ہوئی ہوں۔ بعض جدت پسند طبائع پر بار بن جاتا ہے اور وہ پڑھنے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ میں ان کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے بھی قاصر ہوں کہ میری اس عظیم شخصیت سے ملاقات ہی نہ ہوسکی!!!! میں اپنے خیالات کا اظہار کرسکتی ہوں۔مگر یہاں میں کیا اور میرے خیالات کیا۔اس لئے میں نے سوچا ہے ایک حقیقت ایک واقعہ آپ کی نذر کروں کہ کسی طرح عظیم شخصیات تعصب کی نذر ہو جاتی ہیں۔لیکن یہی لوگ وقت پڑنے پر کیسی کیسی دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔جنہوں نے پہلے کسی ہستی کی حیثیت کو پامال کیا ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام کو ایوارڈ ملنے کے بعد کی بات ہے۔ نہ اخبارات میں اس کا خاطر خواہ چرچا کیا گیا نہ پذیرائی دی گئی نہ پاکستان ٹی وی پر اس بارہ میں کوئی تفصیلی خبر آئی۔ نہ پروگرام ہوا۔میرے ایک عزیز کزن پی ٹی وی میں اچھے عہدہ پر ہیں۔ ان سے اور ان کی اہلیہ سے اس بارہ میں میں نے گلہ شکوہ کیا۔ وہاں کیا اثر ہوا نہیں جانتی۔ کچھ عرصہ خاموشی سے گذر گیا۔ پھر ایک دن ان کا فون آیا کہ ’’ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے آپ سے۔ضرور کر دیجئے۔ ہماری عزت کا سوال ہے۔مشکل آن پڑی ہے۔‘‘میں نے کہا’’ فرمائیے‘‘بولیں:’’ڈاکٹر عبدالسلام کی ایک تصویر چاہئے۔ہم نے کل پروگرام کرنا ہے اور ہمیں ان کی کوئی تصویر مہیا نہیں ہو رہی‘‘ اف رہی بے سروسامانی۔ مجھے یہ سوال کرنے والے مجھے بولنے لگے۔اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا قد میری نظر میں اور بلند ہو گیا۔خیر میں نے وعدہ کر لیا۔ پھر میں تھی اور میری کوشش۔ مَیں نے رات تک یہ تصویر انہیں مہیا کر دی۔’’یہ ایک نایاب تصویر تھی بندہ بھیج کر انہوں نے منگوائی۔ پروگرام دیکھا اچھا تھا اب تاریخ مجھے یاد نہیں۔

انسانوں کی بے حسی پر رونا آ گیا۔ کہ انسانوں کی قدر کرنا بھول گئے ہیں۔

جب مر گئے تو آئے ہمارے مزار پر
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر

لوگوں کا اس طرح انہیں نظر انداز کرنا ان کی قیمت کو کم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان کی توقیر کو بڑھاتا ہے۔اے خدا ہمیں ایسے ہزاروں ہزار عبدالسلام عطا فرما۔ہم میں سے بہت سے ایسے ہوں جو ان کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہوئے کامیابی کی اعلیٰ ترین منازل طے کر جائیں۔مَیں ان کی عظمت کی دل کی باریک ترین گہرائیوں سے قائل ہوں۔خدا کرے ان کے لئے کی گئی دعاؤں کے خزانہ میں ہر آن اضافہ ہوتا رہے۔کبھی کبھی مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میں نے ان کی خاطر ایک چھوٹا سا کام سرانجام دیا اور یہ سارے احساس احمدیت کے رشتہ تلے جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں۔شجر سے جور ہے وابستہ وہ پھل دار ہو جائے۔

ڈاکٹر عبدالسلام: عالم سائنس میں پاکستان کی شناخت

سید سجاد نقوی، سیالکوٹ

دنیائے سائنس میں بے شمار ایسے سائنس دان گزرے ہیں جن کے محیر العقول نظریات، ایجادات اور دریافتوں سے اہل عالم انگشت بہ دنداں ہے۔انھوں نے اپنی زیرک اور دقیق النظر صلاحیتوں کو ایسے روپ اور عمل میں ڈھالا کہ تیسری دنیا کے لیے رفاہ عام ثابت ہوئیں۔انیسویں صدی سے تاحال سائنس کا زمانہ ہے۔روز بہ روز سائنس بڑھ چڑھ کر ترقی کر رہی ہے۔آج ہم اپنے جوانب و اطراف میں جدید سائنسی اشیا اور جدید ٹیکنالوجیز کے کمالات و احسانات دیکھ سکتے

ہیں۔اسی تناظر میں ڈاکٹر اقبال نے آفاقی شعر کہا تھا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

عملی اور نظری میدان جہاں اہل مغرب (نیوٹن، گلیلیو، آئن سٹائن اور نیکولا ٹیکسلا وغیرہ) نے سائنس میں ان گنت خدمات سرانجام دیں وہیں اہل مشرق نے اپنی زرخیز مٹی سے ذہین وفطین وفہیم وعلیم لوگوں (ستیندر ناتھ بوس، سی وی رامن، میگھناد ساہا) کو جنم دیا۔مغرب نا صرف ان کی سائنسی کاوشوں اور خداداد صلاحیتوں کا معترف ہے۔ بلکہ انھیں عالمی شہرت یافتہ انعامات سے بھی نوازا۔ اسی ضمن میں برعظیم پاک و ہند میں ڈاکٹر عبدالسلام بلاشبہ ایسی نمائندہ شخصیت ہیں جو عالم سائنس میں پاکستان کی آواز ہیں۔آپ نے ایوان سائنس میں عملی اور نظریاتی طور پر ایسی مشعل جلائی کہ جس کی روشنی سے تیسری دنیا سمیت کئی قلوب واذہان منور ہو رہے ہیں۔ڈاکٹر سلام دنیا کے بہترین سائنسی نظریات رکھنے والے سائنسدانوں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام غیر معمولی ذہانت ولیاقت کے مالک اور نابغہ شخصیت تھے۔آپ نے 29 جنوری 1926 کو شہر جھنگ کے ایک عام گھرانے میں آنکھ کھولی۔آپ کے والد کا نام چودھری محمد حسین تھا جو پیشے کے لحاظ سے محکمہ تعلیم میں ہیڈ کلرک تھے۔ڈاکٹر سلام نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی سے حاصل کی۔آپ بھر پور دلجمعی سے اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز کرتے رہے۔آپ کو بچپن ہی سے علم و ادب کے حصول کا فطری ذوق تھا۔ جھنگ کالج سے میٹرک اور انٹر کا امتحان اول حیثیت سے پاس کیا۔اس کے بعد تاریخی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ یہ ادارہ آپ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ڈاکٹر سلام کو گورنمنٹ کالج سے بے پناہ عقیدت تھی۔آپ گورنمنٹ کالج میں راوی رسالے کے مدیر اعلا اور کالج یونین کے صدر بھی رہے۔

ڈاکٹر سلام ایک تو بچپن ہی سے ادبی ذوق رکھتے تھے اور دوسرا گورنمنٹ کالج کی ادبی فضا نے

ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ آپ انگریزی اور اردو ادب سے نہایت شغف رکھتے تھے۔ مرزا غالب اور اقبال آپ کے پسندیدہ شاعر تھے۔ آپ نے دونوں شخصیات پر مضامین بھی قلم بند کیے۔ گورنمنٹ کالج ہی سے آپ اول درجے میں بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے ریاضی کے امتحانات میں کامیاب ہوئے۔ انعام کے طور پر آپ کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کیمبرج یونی ورسٹی پڑھائی جاری رکھنے کا وظیفہ جاری ہوا۔

آپ کا رجحان پارٹیکل فزکس میں تھا۔ جو مادے کے بنیادی ذرات سے متعلق ہے۔ یوں کیمبرج یونی ورسٹی سے آپ نے ڈاکٹریٹ (رینورملائزیشن آف میسن تھیوری) کی ڈگری وصول کی۔ بعد ازاں وطن واپسی پر آپ اپنے ہی مادرِ علمی گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی میں شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کا تعلیمی سلسلہ نہایت روشن اور ذمہ دارانہ تھا۔ آپ پاکستان میں مشیر سائنس کے عہدے پر بھی فائز رہے اور اٹامک انرجی کمیشن میں پاکستان نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ادارے کی بنیاد رکھی۔ پاکستان میں سائنسی تعلیم اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے ہمہ دم کوشاں رہے۔ آپ کا دماغ سائنسی افکار کی موزوں آماجگاہ تھا۔ آپ پاکستان کو دنیا کے روبہ رو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ پاکستان میں تمام سائنسی تناظرات میں آپ بالواسطہ و بلاواسطہ طور پر منسلک رہے۔ مگر مقام افسوس ہے کہ بعد میں آپ کی ہمہ جہت شخصیت سے استفادہ نہ کیا گیا بلکہ اکثر کام مسترد کر دیے گئے۔

ڈاکٹر سلام کو اپنے سائنسی افکار پر بہت ناز تھا اور وہ انھیں منصۂ شہود پر لانے کے لیے بے تاب تھے۔ پاکستان میں چوں کہ سائنسی اور دوسرے تحقیقی اور معیاری ادارے نہیں تھے لہٰذا ڈاکٹر سلام کو اس سلسلے میں دوبارہ کیمبرج یونی ورسٹی جانے کی سوجھی۔ بقول آپ کے، آپ اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ فزکس یا پاکستان، کس کو ترجیح دوں؟ آخر کار آپ نے سائنس کے میدان میں تحقیقی تشنگی کو دور کرنے کے لیے پاکستان کو خیرباد کہہ دیا۔ کیمبرج میں آپ نے کئی حیران کن تحقیقی مقالے لکھے۔

یہیں سے آپ کو مقبول سائنس دان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس اعتراف میں آپ کو دنیا کے بہترین شہرت کے حامل 25 ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر سلام دنیا کے بہترین تعلیمی ادارے کیمبرج اور امپیریل کالج، لندن میں پروفیسر بھی رہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام سائنس کے فروغ اور اس کی ترویج کے لیے بہت متحرک انسان ثابت ہوئے۔ جس طرح مصلح قوم سرسید نے مسلمانان ہند کو نئے علوم سے روشناس کروانے اور ان کے حصول کے لیے تعلیمی ادارے (علی گڑھ یونیورسٹی) قائم کیے۔ اسی طرح عبد السلام کی روح بھی کسی ایسے ہی ادارے کی منتظر تھی۔ پرہیز ہود بھائی کے بقول ڈاکٹر سلام کا سب سے عظیم کارنامہ، جس پر وہ نوبل انعام کے مستحق تھے، اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (ICTP) جیسے تحقیقی ادارے کا قائم کرنا تھا۔ اس ادارے نے سائنس کے تحقیقی میدان میں انقلاب بپا کر دیا۔ اس ادارے سے آج ہزاروں سائنسدان مستفید ہو چکے ہیں جبکہ سینکڑوں ایسے ہیں جنھوں نے نوبل انعام حاصل کیے۔ یہ شاہکار ادارہ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے محققین کے لیے پارس پتھر ثابت ہوا۔ ڈاکٹر سلام جیسی ضوریز شخصیت نے اپنے وطن میں اس تحقیقی ادارے کی عدم موجودگی کے درد کو محسوس کیا اور اس احساس کو دوسروں پر حاوی ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے لہذا یہ ادارہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بعد میں آپ کی پہلی برسی پر اس ادارے کے نام میں آپ کے نام کا اضافہ کر کے عبدالسلام انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس رکھ دیا گیا۔

ڈاکٹر سلام نے فزکس کے میدان میں نظریاتی سطح پر بلندترین اور بالکل اچھوتے افکار پیش کر کے سائنسی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ آپ نے رینورملائزیشن، سپرسمٹری، پروٹون ڈیکے، پتی سلام ماڈل، کوانٹم پلانکس اور سلام سٹینڈرڈ ماڈل/گرینڈ یونائیٹڈ جیسی کئی تھیوریاں پیش کیں۔ ڈاکٹر صاحب کو 1979 میں فزکس میں "یونیفیکیشن آف الیکٹرومیگنیٹک اینڈ ویک فورسز" جیسی

تحقیق پر نوبل انعام ملا۔ اس تھیوری کی وضاحت کچھ ایسے ہے کہ کائنات ذرات سے مل کر بنی ہے۔ جنھیں جوہری ذرات یا ایٹمز کہتے ہیں ان ذرات کو کون سی قوتیں جوڑ کر رکھتی ہیں اور ان میں وزن کہاں سے اور کیسے آتا ہے؟ کائنات میں بنیادی طور پر چار قوتیں کارفرما ہیں۔ کشش ثقل، مقناطیسیت، مضبوط قوت اور نیوکلیائی کمزور قوت۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے بقول تمام قوتوں کا ماخذ ایک ہی قوت ہے۔ یوں آپ نے ان قوتوں کے اتحاد پر مختلف نظریات دیے جن پر تجربات بھی ہوئے۔ آخرکار ڈاکٹر سلام نے الیکٹرومیگنٹک اور ویک فورسز کے اتحاد کو یقینی بنا ڈالا اور کہا کہ یہ دونوں فورسز ایک ہی فورس کی دو شکلیں ہیں اور اسے الیکٹرو ویک فورس کا نام دیا۔ یہ پارٹیکل فزکس سے متعلقہ موضوع ہے اور پارٹیکل یا ذرات کائنات کے آغاز میں اہم نظریات کا احاطہ کرتے ہیں۔

1979 میں اس ناقابل فراموش کارنامے پر عبدالسلام کے ساتھ ان کے معاونین ماہر طبعیات اسٹیون وین برگ اور شیلڈن لی گلاشو کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ آپ کی اس تھیوری کو معروف سائنسدان سٹیفن ہاکنگ نے بھی اپنی مشہور کتاب ”اے بریف ہسٹری آف ٹائم“ میں سراہا ہے۔ آپ کو مختلف ممالک سے چالیس سے زائد ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں اور آپ تیس سے زائد ممالک میں سائنسی تحقیق اور فروغ سے متعلق اکیڈمیز کے رکن رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام ایک سچے محب وطن تھے آپ کو کئی ممالک کی طرف سے نیشنلیٹی کی پیشکش بھی ہوئی، مگر آپ نے اس خیال سے مسترد کر دی کہ ان کا اعزاز ”نوبل انعام“ پاکستان کے بجائے کسی اور ملک سے منسوب نہ ہو۔ ڈاکٹر سلام نہایت منکسر المزاج اور اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ حلقہ احباب میں سب کے ساتھ محبت بھرا رشتہ تھا۔ آپ پاکستان سمیت غریب اور ترقی پذیر ممالک سے غربت اور جہالت کے خاتمے کے خواہش مند تھے اور محنت شاقہ سے اس کے سدباب کے لیے ہر ممکن معاونت فرمائی۔ آخری وقت میں بیماری نے آگھیر لیا اور یہ عظیم اور برق رفتار دماغ رکھنے والا

عظیم انسان اور ممتاز سائنس دان بالآخر 21 نومبر 1996 کو لندن میں وفات پا گیا۔

آپ کو آپ کی خواہش کے مطابق اپنے وطن کی مٹی (ربوہ) میں والدین کے قدموں میں سپرد خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر سلام اصل معنوں میں پاکستان کا جید ہیرو ہے مگر مقام حیف ہے کہ اس جلیل القدر ذہن کو اپنے وطن میں وہ درجہ عالی میسر نہ آسکا جس کے وہ حق دار تھے۔ اس کی وجوہات ہمارے سماج میں سائنسی شعور کا فقدان اور تعصب پسندی ہے۔ یوں ہر سال آپ کا یوم پیدائش اور یوم وفات خاموشی سے گزر جاتا ہے۔ مگر جب تک آپ کے مداح موجود ہیں، آپ کے کام اور نام کی عظمت کا ڈنکا دنیا بھر میں بجتا رہے گا۔ (بحوالہ ہم سب ویب سائٹ)

ڈاکٹر عبدالسلام کی جلاوطنی آخر ختم ہوئی

ایک کڑوا سچ

ڈاکٹر عبدالسلام کون ہے؟ یا تھا؟ پنجاب کے بچوں کیلئے مشکل سوال ہے مگر جواب بڑا ضروری ہے۔ ایک سوال اور بھی ہے، نوبل انعام یافتہ کون ہوتا ہے؟ اشارہ .....نوبل پرائز ...اب تم اشارے کی مدد سے بوجھ سکتے ہو۔ نوبل پرائز جیتنے والے کو نوبل انعام یافتہ کہتے ہیں۔ اگلا سوال بھی اسی سلسلے کا ہے، لیکن جواب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ کبھی کسی پنجابی نے نوبل پرائز جیتا؟ یہ دنیا کا اعلیٰ ترین ایوارڈ ہے۔ اور صرف دنیا کے اعلیٰ ترین دماغ والوں کو ہی مل سکتا ہے۔ اس انعام کا جیتنے والا اپنے ملک علاقے اور اپنے عوام کیلئے بڑی عزت حاصل کرتا ہے کیونکہ یہ انعام تخلیق اور تحقیق کے کاموں میں ارفع ترین مقابلے میں ہی جیتا جاتا ہے اور انعام دیتے وقت اس ملک کا نام بھی پکارا جاتا ہے جس نے اس عالیشان ذہن کو پیدا کیا۔ سوال سمجھ میں نہیں آیا؟ چلو لفظ بدل دیتے ہیں کیا پنجاب نے کبھی کوئی بڑا سائنسدان پیدا کیا؟ یہ بھی آسان نہیں ہوگا کیونکہ تمہاری کتابوں میں تو سائنس کا ذکر بہت ہی کم ملتا ہے اور پنجاب نے سائنس میں ترقی بالکل نہیں کی ....پھر؟ فزکس کا

نوبل انعام یافتہ؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ پنجابی گھرانے کا ایک سیدھا سادھا آدمی دنیائے فزکس کا اعلیٰ ترین ذہن 1979ء کا نوبل لارئیٹ مانا گیا تھا۔ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی انتہائی ترقی یافتہ سائنس فزکس ہی ہے۔ یہی سائنس انسان کو سپیس ایج (Spaceage) میں لے گئی۔ اس کی مدد سے آدمی چاند پر اتر کر چاندنی کی چادر پر اپنے پیروں کے نشان چھوڑ آیا۔

یہی وہ علم ہے جس نے انسان کو تسخیر کائنات کا سب سے اونچا پرچم تھمایا۔ یہی سائنس کائنات کی اصل ابتدا اور ایٹم کی بے پناہ طاقت کا کھوج لگا سکی۔ اس عالیشان کھوج کا ایک ہاتھ بہت سارے ہاتھوں میں سے ایک پنجابی ہاتھ بھی ہے۔ بہت سارے جرمن، امریکی، برطانوی، اطالوی، روسی اور سویڈش ہاتھوں کے درمیان ایک گندمی رنگ کا ہاتھ۔

اب بتاؤ تم اس پنجابی کا نام جاننا چاہو گے؟ ڈاکٹر عبدالسلام۔ یہی نام ہے اس یکتائے روزگار کا، لیکن پنجاب کے بچے اس نام سے کیوں واقف نہیں؟ پھر ایک سوال، فکر کی بات نہیں۔ ہماری تاریخ سوالوں سے بھری پڑی ہے۔ پنجاب کی تاریخ اور ہے کیا، سوال ہی سوال۔ پنجاب تقسیم کیوں ہوا؟ پنجاب میں قتل عام کیوں ہوتے رہے؟ پنجاب کی عورت بے عزت کیوں کی گئی؟ پنجاب سے امرتا پریتم کیوں چلی گئی؟ کرشن چندر کو وہاں سے کیوں نکالا گیا؟ پنجابی زبان ترقی میں کیوں پیچھے رہ گئی؟ پنجاب اپنے شاعروں کی زبان کیوں نہیں گاتا؟ پنجاب میں سائنس کا مستقبل اندھیر کیوں ہے؟ ڈاکٹر عبدالسلام اپنے دیس واپس کیوں نہ آ سکے؟ ان کا عظیم خواب .... سائنس کی ترقی کا خواب پنجاب کی زمین پر کیوں نہ اتر سکا؟ وہ عالیشان ادارہ جو فزکس جیسی سائنس کی ترقی کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام نے اٹلی میں قائم کیا، پنجاب میں کیوں نہ بن سکا؟ یہ سوال نہیں ایک بدصورت حقیقت ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کو قادیانی ہونیکی وجہ سے فزکس کی ترقی کیلئے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ نوبل پرائز جیتنے والا یہ سائنسدان اپنے انعام اور اعزاز لاکر اسی زمین پر سجا دینا چاہتا تھا۔ پوری دنیا سے اسے جو عزت اپنے علم کیلئے ملی تھی وہ اپنے وطن لے کر آنا چاہتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اس حیثیت میں ہے کہ دنیائے سائنس کے خزانوں سے جتنی امداد اپنے وطن کیلئے مانگے گا وہ اسے ملے گی۔ اس کا خواب تھا کہ یہاں دنیا کی بڑی سائنس کی بنیاد استوار ہو جائے مگر افسوس! یہ سب کچھ ہونے نہیں دیا گیا۔ کس نے نہیں ہونے دیا؟ یہ سوچ جس نے پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ کو سائنسی علم کی برکت اور شہرہ آفاق شہرت لیکر وطن لوٹنے نہیں دیا، اس رویے سے کس قدر نقصان ہوا؟ علم کی دولت کو ٹھکرا کر اپنے وطن کو محروم کیا۔ ایک ایسی ہستی کا دل توڑا جس پر انسانیت کو فخر ہے۔ اس پر بھی ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے انعام کی رقم سے پاکستانی طالبعلموں کی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔

آج ان کا انتقال پردیس میں ہوا ہے۔ دیس آکر رہنے اور کام کرنے کی تمنا کا انت ہوگیا آخر۔ وہ ہستی آج دنیا سے اٹھ گئی، جس کے لئے علم کی دنیا آنکھیں بچھاتی رہی۔ مگر اس نے یورپ کی شہریت نہیں لی اور تن تنہا فزکس کی منڈی کا بہت شاندار مرکز اٹلی میں قائم کیا۔ یہ سنٹر انٹرنیشنل سنٹر فار تھوریٹیکل فزکس کہلاتا ہے۔ یہاں دنیا بھر سے فزکس میں اعلیٰ ریسرچ کیلئے سکالرز آتے ہیں اور سائنسی علم کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ ڈاکٹر سلام کی زندگی کے دو بڑے مقاصد تھے۔ اوّل کائنات کی فزیکل اہمیت کو Mathematical آلات کی مدد سے سمجھ لینا۔ دوسرے سائنس کی مدد سے پاکستان کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنا۔ ان کی پہلی خواہش پوری ہوئی لیکن دوسری تشنہ کام رہ گئی۔ آخر کیوں؟ دنیائے فزکس کا یہ عظیم ریسرچ سنٹر پاکستان میں کیوں نہ بننے دیا گیا؟ آج یہ سرچشمہ پچاس سے زیادہ پس ماندہ ممالک کو فیضان دے سکتا تھا۔

کئی سال پہلے کی بات ہے ایک وزیراعظم نے گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک فنکشن میں وہاں (تحصیل علم کے بعد) نکلنے والے بڑے آدمیوں کے نام گنوائے اس فہرست میں سب سے بڑے آدمی کا نام نہیں تھا۔ وزیراعظم کو فزکس کے نوبل انعام یافتہ کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔ مگر اس طرح کے رویے سے ڈاکٹر عبدالسلام کے علم کی اہمیت کو فرق نہیں پڑتا۔ تاہم ان کے دل کو ضرور

فرق پڑ گیا تھا۔ اپنی چالیس سالہ شاندار علمی کاوش کے نتیجے میں اس سائنسدان نے 20 (سے زائد) عالمی ایوارڈز حاصل کئے۔ ان میں کیمبرج کا وہ ایوارڈ بھی شامل ہے جو فزکس میں سب سے زیادہ کام کرنے والے کی حیثیت سے انہیں 1957ء میں ملا تھا۔ پاکستان سے تعلق اور تعلق خاطر رکھنے والے ڈاکٹر عبدالسلام کا کام دنیائے فزکس میں ایک انقلاب ہے کہ جو ہر آن آگے بڑھ رہا ہے۔ ان کی تحقیق نے حقیقت کائنات کے فرق روشن کئے ہیں اس لئے مہذب دنیا میں ان کی بے پناہ عزت وتوقیر ہے، مگر خود ان کا دل آخر تک ایک جلاوطن کا دل تھا جو اہل وطن کی توجہ کیلئے بھڑکتا رہا۔ (اور دھڑکتا رہا)

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے جب ان کی ریٹائرمنٹ کے اعزاز میں ایک جشن ہوا۔ اس سلسلے میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کا اعلیٰ درجے کا اجلاس بھی ہوا یہ کوئی معمولی اجلاس نہیں تھا۔ دنیا کے عظیم سائنسدانوں اور دانشوروں کا اجتماع تھا کہ جس میں فزکس کے تین اور نوبل انعام یافتہ بھی شریک تھے۔ اس اعلیٰ سطحی اجتماع میں کائنات وحیات کے آغاز بگ بینگ کے وقت مادے کی حالت اور زمین کی گہرائیوں کے بعید اور سپر کنڈکیٹویٹی کے متعلق حیرت انگیز انکشافات پر غور کیا گیا۔ یہ جشن سائنسی فتوحات کا جشن تھا۔ اصل میں ڈاکٹر سلام کی دریافتوں کا جشن تھا۔ عجب بات ہے کہ عین اس وقت جب فزکس کی دنیا کے چمکدار ستارے ایک کے بعد ایک ڈاکٹر سلام کو تعظیم پیش کر رہے تھے وہ اپنے اندر ایک افسردہ دل لئے بیٹھے تھے۔ کس طرح سے؟ ذرا سنئے ''نیوز لائن'' نے کسی طرح اس منظر کو بیان کیا؟

''اس شاندار جشن کی تقریبات کے اختتام پر ایک ناقابل فراموش منظر اس طرح سے بنا کہ وہ سب یعنی بین الاقوامی سائنس برادری کے معتبر انسان سینکڑوں کی تعداد میں منظم قطاریں باندھ کر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو مبارکباد پیش کرنے کیلئے آگے بڑھے اور اپنی باری کیلئے صبر سے کھڑے ہوگئے۔ تب ایک پریشان حال سا نوجوان اپنی باری آنے پر عظیم سائنسدان کے آگے جھکا اور کہنے

لگا ''جناب! میں ایک پاکستانی طالبعلم ہوں... ہمیں آپ پر بڑا فخر ہے'' ....ڈاکٹر عبدالسلام کے کندھے ہلے اور آنسوؤں کے دو دھارے ان کے چہرے پر بہنے لگے۔ ایک عام سے طالبعلم کی مبارکباد میں کیا بات تھی؟ مگر وہ خاص مبارکباد تھی۔ ساری دنیا کے ممتاز سائنسدانوں کے درمیان ایک ہم وطن کی آواز تھی۔ اس عظیم ہستی کے لئے وہی آواز اپنی آواز تھی۔ لیکن ہم وطنوں نے کیا کیا؟ اپنے سپوت کو جو پردیس جا کر یکتائے روزگار بنا تھا اسی کو نہ اپنایا اور ایک نا قابل تلافی نقصان اپنے مستقبل کا کیا۔ یہ کوئی ایک مثال نہیں۔ پاکستان میں نا قابل تلافی نقصان کا عمل مسلسل چل رہا ہے۔ فیض کے ساتھ کیا نہ کیا جو نام اس دھرتی کا مان ہو سکتے تھے انہی کو بیگانہ کیا۔ جو نام اس کی تاریخ کو سجانے والے تھے انہی کو مٹاتے رہے۔ ایک بری سیاست اور بے بس سوسائٹی نے بزدلی و بے ضمیری کے ساتھ جھوٹ کی پیروی کی۔ غلط اور نا اہل لوگوں کو اوپر اٹھایا۔ کرپشن میں لتھڑے ہوئے کرداروں کی پرورش کی اور بدمعاشی کو ترقی دی۔ اس کا نتیجہ ایک بگڑا ہوا بد اخلاق معاشرہ، ایک ولگیریٹی سے بھرا ہوا کلچر، جہالت کا دور دورہ، ذہانت اور ہنرمندی کا زیاں۔ پہلے سے زیادہ شعور اور علم کا نور پیدا کرنے والے کتنے تھوڑے ہیں اور کس قدر بے مقام!

سوچنے کی بات یہ ہے ڈاکٹر عبدالسلام نے علم کا جو خزانہ کمایا وہ کس کے کام آیا؟ ساری دنیا کو اس سے فیض ملا مگر پاکستان کے مقدر میں محرومی کیوں؟ کون لکھتا ہے ان محرومیوں کو؟ کون مجبور کرتا ہے ایک سائنسدان کو سقراط بن جانے پر؟ وہ بھی اس دور میں۔ آج بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ملک سائنس کی ترقی سے بری طرح بچھڑا ہوا ہے، مگر فزکس کا نوبل انعام حاصل کرنیوالا ''جلاوطن'' کر دیا گیا۔ سوچنے کی بات ہے، غور کا مقام ہے!''

(بشکریہ روزنامہ ''خبریں'' لاہور 29 نومبر 1997ء: مرسلہ: داؤد احمد صاحب بھلسیرا نوالہ ضلع گجرات)

عالم پہ اپنی دھاک بٹھا کر چلا گیا
پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی عظیم سائنسی خدمات

(مکرم پروفیسر راجا نصر اللہ خاں صاحب۔ ربوہ)

اللہ کے کچھ ایسے بندے ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خاص صلاحیتیں اور قوتیں عطا فرماتا ہے جن کو بروئے کار لا کر وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں اور ان کی کامیابیوں اور خدمتوں سے ایک عالم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی ایک ایسے عبد منیب تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قابلیت اور علم وفضل سے نوازا تھا۔

آپ کی ذہانت، قابلیت، آپ کی انسان دوست شخصیت اور آپ کی دنیا کی خدمت اور ہمدردی کے جذبہ کا دنیا نے برملا اظہار کیا۔ چنانچہ بطور نمونہ بعض اخبارات کے اس اعتراف کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

1۔ انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کراچی مورخہ 12 اکتوبر 1979ء کے صفحہ اوّل کی ایک نمایاں خبر کی سرخی۔ پروفیسر سلام اور دو امریکنوں نے نوبیل پرائز حاصل کیا۔ سٹاک ہوم۔ 15 اکتوبر۔ پاکستان کے پروفیسر عبدالسلام اور دو امریکیوں نے آج 1979ء کا طبیعیات کا نوبیل پرائز اپنے اس کارنامے کے نتیجہ میں جیت لیا جس کا تعلق ایسے میدان سے تھا جو آئن سٹائن کیلئے پریشان کن بنا رہا۔ یعنی ایک مشترکہ قوت کی تلاش جس کے متعلق اسے گمان تھا کہ وہ ساری کائنات کو یکجا باندھے ہوئے ہے۔ ڈان کراچی 18 اکتوبر 1979ء کا اداریہ بعنوان ''پاکستان کیلئے ایک اعزاز'' لکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی اتفاق نہیں کہ البرٹ آئن سٹائن کی سوویں سالگرہ کے برس طبیعیات کے تین سائنس دانوں کو تمام عالمی انعامات میں سے سب سے زیادہ قابل رشک نوبیل پرائز دیا گیا ہے جو

ان کی ایسے میدان میں تحقیق کا نتیجہ ہے جس نے ان کے شہرہ آفاق پیشرو (آئن سٹائن۔ناقل) کو پریشان کئے رکھا اور یہ بات کہ انعام جیتنے والوں میں سے ایک پروفیسر عبد السلام ہیں۔اس ملک پاکستان کیلئے زبردست افتخار اور عزت کا باعث ہے۔

روزنامہ مشرق مورخہ 19 اکتوبر 1979ء صفحہ 3 م ش کا کالم ''نوبیل پرائز یافتہ عبد السلام کا گھریلو ماحول'' ''نظریاتی طبیعیات میں ریسرچ پر نوبیل پرائز حاصل کرنے والے پاکستانی سپوت ڈاکٹر عبد السلام کا تعلق جھنگ کے ایک متوسط درجے کے خاندان سے ہے ان کے والد ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ ورنیکلر کلرک'' تھے۔دنیاوی لحاظ سے یہ ایک معمولی منصب تھا۔لیکن وہ ایک بلند اخلاق انسان تھے۔جنہوں نے اپنی پاکیزگی اخلاق سے اپنے ماحول کو عموماً اور اپنے اہل خاندان اور اہل وعیال کو خصوصاً متاثر کیا۔پروفیسر عبد السلام اپنے مرحوم والد کے عملی درس اخلاق کے بہترین متعلم اور یادگار متصور ہوتے ہیں۔پروفیسر عبد السلام کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ گھر اور دفتر میں ایک مثالی کردار کے انسان تھے۔ان پر یہ قول لفظ بلفظ صادق آتا تھا کہ ایک ٹن وعظ پر ایک اونس کا حسن عمل بھاری ہوتا ہے۔انہوں نے رزق حلال کو اپنا ماٹو قرار دیا تھا۔ان کے حسن کردار نے ننھے عبد السلام کے دل و دماغ کو بچپن سے ہی متاثر کیا اور انہوں نے شروع دن ہی سے اپنی زندگی کو منظم کرنا شروع کیا۔اگر عبد السلام صاحب کے والد کی طرح پاکستان میں لوگوں نے اپنی اولاد کی طرف توجہ دی ہوتی تو پاکستان میں آج ایک ایسی نسل معرض وجود میں آچکی ہوتی جو حقیقی معنوں میں اقبال کے شاہین کہلانے کی سزاوار ہوتی۔''

روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی مورخہ 17 اکتوبر 1979ء کا اداریہ ''پاکستانی سائنس دان کا اعزاز''

''ہر پاکستانی کیلئے یہ باعث صد فخر اعزاز ہے کہ ان کے ایک ہم وطن ڈاکٹر عبد السلام نے علم طبیعیات میں اس سال نوبیل پرائز حاصل کیا ہے۔ڈاکٹر عبد السلام کو جو ان دنوں لندن میں ہیں جب اس اعزاز کی خبر ملی تو وہ سجدہ شکر میں گر گئے اور کرنا بھی چاہئے تھا کیونکہ وہ ایک سائنسدان ہیں اور اس حقیقت سے واقف ہیں کہ انسان کو قدرت کے رازوں تک رسائی............

کی توفیق بخشنے والی اس کی ذات پاک ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ ڈاکٹر عبدالسلام کی قوت فکر و ذہانت میں مزید اضافہ کرے اور انہیں ملک وقوم کی خدمت کرنے کا طویل موقع بھی عطا کرے۔ ہم انہیں اور اپنے تمام ہم وطنوں کو اس موقع پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔'' اپنی نوجوان نسل اور لکھے پڑھے طبقے کی معلومات میں مزید دلچسپ اضافہ کرنے کی غرض سے ہم پاکستان کے اس عظیم وفطین فرزند پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب ''ڈاکٹر عبدالسلام'' کے مستند حوالوں سے کچھ مزید تفصیلات درج کرتے ہیں جن سے یہ بھی واضح ہوگا کہ اس محب وطن سائنسدان نے اپنے وطن عزیز کیلئے کیا کیا خدمات انجام دیں اور سائنس کے عالمی افق پر اس کا کیا مرتبہ ہے۔

یہاں ڈاکٹر عبدالغنی کے متعلق یہ عرض کردینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ وہ خود بھی طبیعیات کے پی ایچ ڈی ہیں وہ برصغیر پاک وہند کے پہلے سائنسدان ہیں جو 1971ء میں سرن (جینوا) میں بطور مہمان سائنسدان مامور ہوئے۔وہ 1966ء میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی'' کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ پھر 1976ء سے 1980ء تک پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے چیئرمین رہے۔''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' سلام پر پوری طرح صادق آتا ہے ان کی غیر معمولی اٹھان اور تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی ان کے تابندہ مستقبل کی ضمانت بن گئی تھی۔ڈاکٹر عبدالغنی انکے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

''جس معیار پر بھی پرکھا جائے۔سلام نے اپنے آپ کو میٹرک سے لے کر ایم اے تک یونیورسٹی کے تمام امتحانات میں اوّل رہ کر ایک انتہائی غیر معمولی اوصاف اور قابلیت کے حامل طالبعلم کی حیثیت سے منوایا۔میٹرک اور بی۔اے کے امتخابات میں تو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں جو اعلیٰ ترین نمبر حاصل کئے وہ ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔بی۔اے میں انہوں نے ہر مضمون میں الگ الگ ٹاپ کیا۔ یہ مضامین تھے انگلش، انگلش لٹریچر (برائے آنرز) اور عملی ریاضی۔'' (ڈاکٹر عبدالسلام صفحہ 29)

کیمبرج میں داخلہ:۔کیمبرج جو کہ دنیا بھر کی اعلیٰ ترین درس گاہوں میں سے ایک ہے صرف

انہی طلبہ پر اپنے دروازے کھولتی ہے جو غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کا ثبوت دے چکے ہوں۔ سلام 1946ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے کیمبرج روانہ ہو گئے ڈاکٹر عبد الغنی تحریر فرماتے ہیں۔

''سلام کیمبرج میں روزانہ چودہ تا سولہ گھنٹے لگا تار کام کیا کرتے تھے ان کا مطالعہ بہت وسیع و عمیق تھا۔ وہ نہ صرف علوم ریاضی وطبیعیات کا مطالعہ کرتے تھے بلکہ تاریخی کتب بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ خصوصاً تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت تاریخ ہند اور تاریخ اقوام عالم یہاں انہوں نے دنیا کے تمام مذہب کی الہامی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ انہوں نے اپنا تین سالہ Tripos (کیمبرج میں آنرز ڈگری کا امتحان) دو ہی سالوں میں مکمل کر لیا اور بغیر کسی مشکل کے Wrangler (کیمبرج کا فرسٹ ڈویژن میں کامیاب آنرز گریجویٹ بن گئے۔'' (صفحہ 38-39)

شاگرد سے استاد بننا:: کیمبرج سے ہی محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری نہایت ہی ممتاز اور شاندار کامیابی سے حاصل کی اور اس دوران ہی طبیعیات میں اعلیٰ تحقیقی کام کے نتیجہ میں کیمبرج کے زمانہ تعلیم میں ہی انہیں سمتھ پرائز (Smith Frze) دیا گیا۔ 1954ء میں اٹھائیس سال کی عمر میں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے لیکچرر شپ کی پیشکش قبول کر کے ایک اور منفرد کامیابی حاصل کی۔ اس کے صرف تین سال بعد جب کہ ان کی عمر صرف اکتیس سال تھی انہیں لندن کے شہرہ آفاق امپیریل کالج کی فل پروفیسر شپ کی پیشکش ہوئی اور اس طرح وہ 1957ء میں امپیریل کالج لندن کے فل پروفیسر بن گئے۔

وطن عزیز کی بے مثال خدمات

ڈاکٹر عبد السلام کا اتنی کم عمری میں طبیعیات کے میدان میں ایک عبقری کی حیثیت سے ابھرنا اتنی شاندار کامیابی تھی کہ وطن عزیز کی نظریں بھی ان کی طرف اٹھنے لگیں اور صدر پاکستان محمد ایوب خان نے ان کی بہت قدر دانی کی جس کے نتیجہ میں ڈاکٹر عبد السلام کو اپنے ملک وقوم کی بے لوث اور بے مثال خدمات کا موقع میسر آیا۔ چنانچہ 1959ء میں حکومت پاکستان نے ڈاکٹر عبد السلام کو ''ایجوکیشن کمیشن'' کا مشیر اور پاکستان سائنٹفک کمیشن کا ممبر مقرر کیا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر انیس عالم کے ایک

مضمون ''ڈاکٹر عبد السلام کی یاد میں'' مطبوعہ دی نیشن لاہور مورخہ 29 نومبر 1996ء سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

1959ء میں آپ کو تعلیمی کمیشن کا ایڈوائزر مقرر کیا گیا یہ کمیشن اس وقت کی پاکستان حکومت نے قائم کیا تھا۔ اس کمیشن کا کام یہ تھا کہ وہ ایک آزاد ملک کی ضروریات کے مطابق تعلیمی سسٹم کو اوورہال کرنے کے متعلق مشورے دے جو کہ ملک کو کامیاب جدید صنعتی ملک بنانے کیلئے اشد ضروری تھا۔ اس کمیشن نے بڑے زور سے یہ سفارش کی کہ سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم کو مضبوط کیا جائے۔ اس کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن میں کم ازکم سات ہزار ہنرمند ہرسال تیار کئے جاسکیں۔ ایجوکیشن کمیشن کی ان سفارشات کے نتیجہ میں کئی ٹیکنیکل تعلیم اور انجینئرنگ کی تعلیم کے ادارے کھول دیئے گئے۔ اسی طرح پوسٹ سکول لیول کے طلباء کے لئے سپیشل کالج کھولے گئے جن میں سائنس کی بہتر تعلیم دی جاتی تھی۔ اسی سال ان کو نئے قائم شدہ سائنس کمیشن کا بھی ممبر مقرر کردیا گیا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ کئی نئے ادارے کھولے جائیں جن میں پاکستان میں سائنس کی ریسرچ کے کام کو منظم کیا جائے۔ 1961ء میں ڈاکٹر عبد السلام کو پاکستان کے صدر کا سائنٹیفک ایڈوائزر (سائنسی مشیر) مقرر کیا گیا۔ اس عہدے کی وجہ سے وہ اس قابل ہوسکے کہ پاکستان میں سائنسی اداروں کا ایک جال بچھا سکیں۔ وہ اس بات میں کامیاب ہوگئے کہ سائنس اور سائنسی ریسرچ کے لئے بنیادی انفراسٹرکچر پاکستان میں قائم کرسکیں۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن

ڈاکٹر منیر احمد خان سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اپنے مضمون مطبوعہ روزنامہ ''آجکل'' مورخہ 30 اکتوبر 1996ء میں تحریر کرتے ہیں۔ ''پروفیسر عبد السلام نے پاکستان میں سائنس کی ترقی کیلئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں اور چودہ سال تک PAEC کے رکن

رہے۔ 1960ء کی دہائی میں مجھے ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ نیوکلیئر فول پروسیسنگ کے قیام کیلئے تجاویز تیار کرنے کا موقعہ ملا۔ ایوب خان نے معاشی بنیاد پر اس منصوبے کو ترک کر دیا۔ اس طرح تیس برس قبل پاکستان نے اس اہم ترین ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کا موقع گنوا دیا جب وہ انتہائی سستی قیمت پر بلا روک ٹوک حاصل ہو سکتی تھی۔''

سائنسی مشیر اعلیٰ کا منصب

صدر محمد ایوب خان پاکستان کے عظیم سپوت اور نامور سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کی قابلیت اور خلوص کے جذبہ سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے 1971ء میں ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنا سائنسی مشیر اعلیٰ مقرر کیا۔ صدر پاکستان کے سائنسی مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالسلام کو وطن عزیز کی خدمات کا بھرپور موقع ملا۔ آپ 1961ء سے 1974ء تک تیرہ برس اعزازی طور پر اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ آیئے ڈاکٹر عبدالغنی کی کتاب ''ڈاکٹر عبدالسلام'' کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام کی کچھ بے لوث اور نمایاں خدمات کا تذکرہ کریں۔ سائنسدانوں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم:۔ ڈاکٹر عبدالغنی کا کہنا ہے کہ ''پروفیسر سلام نے پاکستان میں جس کام کو اولیت دی وہ سائنس دانوں کی تربیت تھی۔ وہ اس وقت کی وزارت تعلیم کے فیڈرل سیکرٹری ایس ایم شریف کو اس امر پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ طبیعیات میں پوسٹ گریجویٹ سٹڈیز کیلئے چھ سالہ وظائف دینے کیلئے فنڈز قائم کئے جائیں اس سکیم پر تین سال تک عملدر آمد ہوتا رہا اور اس کی بدولت ہونہار طالبوں نے برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔''

میزائل ریسرچ

''میزائل ریسرچ اور اس کے ملحقہ میدانوں میں ترقی کیلئے سلام نے خلاء اور بالائی فضا کی تحقیقی کمیٹی ''سپارکو'' کی بنیاد رکھی اور کچھ عرصہ تک اس کے چیئرمین بھی رہے۔''

سوشل سائنسز کا میدان:: پروفیسر سلام پاکستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو کتنا فروغ دینا

چاہتے تھےاوراپنے ملک کی معاشرتی اورمعاشی مسائل کےحل کے لئے اپنے دل میں کیا جذبہ اور کیا تڑپ پاتے تھےاس کی عکاسی ان کےاس خطبے سے ہوتی ہے جوانہوں نے جنوری 1961ء میں ڈھاکہ''انجمن ترقی سائنس پاکستان'' کےموقع پر دیا تھاان کی تقریر کا موضوع تھا۔''ٹیکنالوجی اور پاکستان کی غربت کےخلاف جنگ'' ڈاکٹرعبدالغنی کی کتاب''ڈاکٹرعبدالسلام'' کےصفحات 109 تا 112 سےڈاکٹرسلام کی متذکرہ تقریر کےکچھ اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

''ہم پاکستانی غریب قوم ہیں۔نسل انسانی کی غالب اکثریت کی مانند غربت ہمارا سب سے بڑا اور گھمبیر مسئلہ ہے۔'' ''پہلے تو ایک معاشرہ کومطلوبہ ٹیکنالوجیکل مہارت ولیاقت حاصل کرنی چاہئے دوسرے اسے قومی آمدنی کا پانچ فی صد حصہ بچانا چاہئے اور اسے پیداواری منصوبوں میں انویسٹ کرنا چاہئے'' ہماراافلاس صرف مادی نقطہ ونظر سے ہی نہیں بلکہ روحانی نقطہ نظر سے بھی ایک اہم مسئلہ ہے ہمارے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے۔''یہ ناممکن نہیں کہ غربت اور کفر ہم معنی بن جائیں'' مجھے اجازت دیجئے کہ اپنے پورے زور کے ساتھ کہوں کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان پاکستان کی ہر مذہبی درس گاہ کے دروازہ پر روشن حروف سے لکھ دیا جائے۔کفرکو پرکھنے کے اور بھی بہت سے پیمانے ہوں گے۔لیکن اس صدی میں میرے ناچیز خیال میں کفر کا معیاری پیمانہ،غربت کو بغیر قومی سطح پر جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کے خاموشی سے سہتے چلے جانا ہے۔

Pinstech کا قیام

سلام نے صدر پاکستان (ایوب خان) کومجبور کیا کہ وہ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی منظوری اور ہدایت دے دیں۔ جو ایک تخلیقی سائنسی یادگار ہوگا جس کی بدولت پاکستان میں سائنسی تعلیمات کا احیاء ہوگا۔سلام کی باتیں ایوب خان کے دل لگیں۔ چنانچہ جلد ہی اسلام آباد میں نیلور کےمقام پر Pinstech کا قیام عمل میں آ گیا۔

سیدوشریف کی سوات کانفرنس: یہ کانفرنس ڈاکٹرعبدالسلام کے مشورہ پر اگست 1965ء

میں سیدو شریف کے مقام پر منعقد ہوئی۔اس میں ملک کے چوٹی کے سائنسدان شامل ہوئے۔خود صدر ایوب خان بھی اس موقع پر موجود تھے۔ڈاکٹر عبدالسلام نے کانفرنس سے خطاب کیا۔ڈاکٹر عبد الغنی نے اس کانفرنس کیلئے ''خاص الخاص سائنس کانفرنس'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔''اپنے اس خطاب میں سلام نے ریسرچ کیلئے مجموعی قومی پیداوار کے ایک فیصد کیلئے درخواست کی تھی اور یہ کہ ریسرچ کے معاملات روائتی بیوروکریسی کے کنٹرول میں نہ ہوں۔سائنسی کاموں کے سلسلہ میں سلام نے اپنی طرف سے کچھ تجاویز پیش کیں۔''سیم اور تھور: ڈاکٹر عبدالغنی صاحب رقمطراز ہیں۔سلام نے سیم اور تھور (شور) پر بھی چند مضامین لکھے ہیں انہیں اس پریشان کن مسئلہ کے حل کی اتنی فکر تھی کہ انہوں نے حکومت کو مجبور کیا تھا کہ اس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے امریکی ماہرین کی ٹیم پاکستان بلوائی جائے۔چنانچہ صدر کینڈی کے سائنسی مشیر جیروم ویز کی درخواست اور صدر کینڈی کی ہدایت پر ایک اعلیٰ سطح کا سائنسی مشن 1961ء میں بھیجا گیا۔''

اسلامک سائنس فاؤنڈیشن

جیسا کہ آپ جانتے ہیں مسلم ممالک اپنی نفری اور دولت کے باوجود وقت کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے مغربی ممالک سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں مسلم اقوام کی عظمت اور شوکت کا راز اس بات میں پنہاں ہے کہ اپنا دینی تشخص قائم رکھتے ہوئے وہ سائنسی اور تکنیکی میدان میں ہی آگے بڑھنے کی بھر پور کوشش کریں۔تا کہ مسلم معاشرے سے جہالت، افلاس، بے انصافی اور کاہلی کا خاتمہ کرنے میں مدد ملے گی۔لاہور میں منعقدہ اسلامی کانفرنس 1974ء کے موقع پر ڈاکٹر عبدالسلام نے ''اسلامک سائنس فاؤنڈیشن'' کے قیام کی تجویز پیش کی۔ڈاکٹر عبدالغنی رقمطراز ہیں۔

''سلام نے یہ تجویز پیش کی کہ اس فاؤنڈیشن کا قیام اعلیٰ سطح پر ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی کو اپنا ہدف بناتے ہوئے اسلامی ملکوں کی مدد سے عمل میں لایا جائے فاؤنڈیشن کی سرپرستی اسلامی ممالک کریں۔فاؤنڈیشن قطعی طور پر غیر سیاسی ہو اور خالصتاً سائنسی ہو۔اسے مسلم ممالک کے چوٹی

کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین چلائیں۔"

دنیا بھر کی خدمت

ڈاکٹر عبدالسلام کامیابیوں کے زینے متواتر طے کرتے چلے گئے یہاں تک کہ 1964ء میں جب کہ وہ سائنس کی دنیا میں ایک عبقری کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔انہوں ٹریسٹ (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔اس طرح کے سنٹر کی تجویز دراصل ڈاکٹر سلام کے ذہن میں بہت پہلے سے موجود تھی۔اور ان کی شدید خواہش تھی کہ یہ سنٹر پاکستان میں کھولا جائے ڈاکٹر عبدالغنی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

1963ء میں سلام نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ حکومت پاکستان میں اس سنٹر کے قیام کی منظوری دیدے۔سلام کی موجودگی میں صدر ایوب نے ٹیلیفون پر اپنے وزیر خزانہ سے اس سلسلہ میں مشورہ مانگا تو انہوں نے جواب دیا کہ "جناب پروفیسر دنیا بھر کی سائنسی کمیونٹی کیلئے ایک بین الاقوامی ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں نہ کہ پاکستان میں کوئی نظریاتی طبیعیات کا سکول۔

درست ہی فرمایا تھا مرزا اسداللہ غالب نے کہ

ہم دعا لکھتے رہے اور وہ دغا پڑھتے رہے

ایک نقطے نے محرم سے مجرم کر دیا

لیکن پروفیسر عبدالسلام کا یہ جذبہ صادق ضائع نہ گیا اور اطالوی حکومت نے یہ فراخدلانہ پیش کش کر دی کہ پروفیسر سلام کا مجوزہ سنٹر ٹریسٹ شہر میں کھولا جائے اس طرح اس مرکز نے 1964ء میں اپنا کام شروع کر دیا۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالسلام کی انتظامی صلاحیتوں اور کوششوں کو ڈاکٹر عبدالغنی یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔"سلام نے بے حد محنت،جذبہ صادق اور سچی لگن کے ساتھ اس مرکز کو چلایا ہے۔انہوں نے اپنی منفرد شخصیت وسیع اور گہری سائنسی دلچسپی،تجرعلمی ہر موضوع کو گرفت میں لینے کی بے پناہ صلاحیتوں،علمی اقتصادی،سیاسی اور مذہبی امور پر گرفت (جن پر انہوں نے بڑی آسانی اور اتھارٹی سے لکھا ہے) اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں دنیاؤں کے

لوگوں کے بارے میں گہری اور صحیح واقفیت کی بدولت اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا ہر طرح سے اہل ثابت کر دیا ہے۔ اور وہ آج دنیائے سائنس کے متفقہ لیڈر ہیں۔'' یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کے اس عظیم کارنامے کی وجہ سے آپ کو 1968ء میں ''ایٹم برائے امن'' انعام دیا گیا اور اس موقع پر پڑھے جانے والے مضمون میں اعتراف کیا گیا کہ

''آپ نے ایک بڑی انتظامی ذمہ داری سنبھال کر اقوام عالم کی کوششوں اور خیالات کی راہنمائی کرنے اور انہیں ایک خاص نصب العین پر مرتکز کرنے میں مدد دی ہے۔''

صدی کی سب سے بڑی سائنسی کامیابی

اٹلی کا بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعیات ICTP کا قیام ڈاکٹر عبدالسلام کی کتنی بڑی کاوش اور کامیابی ہے اس کے متعلق معروف علمی اور سائنسی شخصیت ڈاکٹر انیس عالم کے مضمون ''ڈاکٹر سلام کی یادیں'' مطبوعہ دی نیشن 29 نومبر 1996ء کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ ''سلام نے سائنس کی دنیا میں جو کام کیا اس کو بے شمار لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ پچھلی جنوری میں جب ان کی 70 ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ اس موقع پر یورپین فزیکل سوسائٹی کے صدر پروفیسر ہروگ شو پر نے ڈاکٹر سلام کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ ''فزکس کیلئے آپ کی عظیم خدمات کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جا چکا ہے اور انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یقیناً آپ کی سائنسی کامیابیوں کے علاوہ انٹرنیشنل سنٹر برائے تھیوریٹیکل فزکس ICTP کا قیام اس صدی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

''قائد اعظم یونیورسٹی میں طبیعیات کے معروف اور علم دوست پروفیسر ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق ایک مضمون لکھا جو انگریزی اخبار نیوز کے 29 جنوری 1997ء کے شمارہ میں صفحہ 6 پر شائع ہوا۔ اس میں پروفیسر ہود بھائی لکھتے ہیں۔ ''سلام اٹلی کے شہر Trieste میں بین الاقوامی مرکز برائے نظریاتی طبیعیات ICTP قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اٹلی کی بجائے پاکستان میں کیوں نہیں؟ وجہ صاف ظاہر ہے۔ پاکستان نے کوئی دلچسپی نہ ظاہر کی۔ لیکن اٹلی اس مرکز کا خواہشمند تھا اور اس کے لئے خطیر رقم خرچ کرنے پر تیار تھا۔ آج آئی سی ٹی پی عمارتوں کا ایک پھیلتا

ہوا سلسلہ ہے جہاں پر پچاس سے زائد ترقی پذیر ممالک کے سائنسدان تحقیقی کام کیلئے باقاعدگی سے حاضر ہوتے ہیں۔ پاکستانی سائنسدان ایک ہزار سے زائد مرتبہ قیام کر چکے ہیں۔''

اعداد و شمار کا ذکر۔ دنیا بھر کی خدمت

انگریزی روزنامہ ڈان نے اپنی 22 نومبر 1996ء کی اشاعت میں ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر جو اداریہ لکھا اس میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے علم و فضل اور ٹریسٹ مرکز کے ذکر میں یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں۔ ''درحقیقت ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ 1950ء سے ذراتی طبیعیات کے میدان میں ہونے والی تقریباً ہر پیش رفت میں ان کا حصہ ہے ان کو دنیا بھر سے ایوارڈ اور اعزازی ڈگریاں ملیں لیکن غالباً ڈاکٹر عبدالسلام کو سب سے زیادہ تکمیل خواہش ٹریسٹ میں تھیوریٹیکل فزکس کے بین الاقوامی مرکز کی تخلیق میں حاصل ہوئی جو انہوں نے ایک ادارہ کی شکل میں قائم کیا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنسدان ترقی یافتہ ممالک کے سائنسدانوں کے ساتھ ملکر کام کر سکیں۔ 1964ء میں اس کے آغاز سے لے کر گزشتہ برس تک اس مرکز نے یہاں پر آنے والے چالیس ہزار سے زائد سائنسدانوں کو تحقیق کے میدان میں تربیت دی ہے۔ جو چیز انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کا انسانیت کیلئے گہرا احساس تھا۔''

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے۔

انگریزی اخبار ''دی نیوز'' مورخہ 22 نومبر 1996ء میں ایک مضمون بعنوان ''ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان کا ایک عبقری اور سرمایہ افتخار'' شائع ہوا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے کام کے معمول اور جذبہ کا یوں ذکر ہے۔ ''ٹریسٹ (اٹلی) میں وہ اپنے کام کا آغاز صبح ساڑھے آٹھ بجے کرتے اور دوپہر کے کھانے کیلئے معمولی سے وقفہ کو چھوڑ کر گیارہ بارہ گھنٹے کے بعد اپنے کام کو اختتام کرتے۔ ان کے دوست کہا کرتے تھے کہ ان کے باتھ روم میں بھی ایک میز کتابوں سے لدی پڑی رہتی ہے۔ انہیں کام کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔''

تیسری دنیا کی خصوصی خدمت

نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز واقع (ٹریسٹ اٹلی) کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام کا ایک اور زبردست کارنامہ سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا ہے۔ڈاکٹر عبدالغنی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تیسری دنیا کی بڑھتی ہوئی درماندگی پر عبدالسلام کے کرب اوران کی تڑپ کا اظہار صرف ان کی سربراہی میں قائم نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز۔اس کی روز افزوں ترقی اوراس کے تیسری دنیا میں سائنس کے مختلف النوع منصوبوں کی شکل میں ہی نہیں ہوا۔ان کا دردمند دل انہیں یہ مستقل باور کراتا رہا کہ دنیا کی دوتہائی آبادی کیلئے یہ مرکز اپنے کارکنوں کے بے مثال جانفشانی اور خلوص کے باوجود بھی ناکافی ہے۔سلام کو اپنی منزل مقصود 1983ء میں ''سائنس اکیڈیمی برائے تیسری دنیا'' کی شکل میں ملی۔''

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں۔''سائنس اکیڈیمی برائے تیسری دنیا'' نظریاتی طبیعیات کے مرکز کے بعد تیسری دنیا پر سلام کی دوسری بڑی عنایت ہے اس اکیڈمی نے تیسری دنیا میں سائنسی انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی ہے اور سلام کی اس سے جذباتی وابستگی اس بات کی ضامن ہے کہ یہ لہر ہرآن بڑھتی ہی چلی جائے گی۔روزنامہ دی نیشن کا اداریہ مورخہ 24 نومبر 1996ء متذکرہ اداریہ کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے۔''نہ صرف پاکستان بلکہ تیسری دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی سائنسی ترقی سے متعلق ان کی فکرمندی اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ 1983ء میں انہوں نے ''سائنس اکیڈیمی برائے تیسری دنیا'' کی بنیاد رکھی۔اس مقصد کیلئے انہوں نے کئی بار پاکستان آکر یہاں پر لمبا قیام کیا اور مختلف حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ سائنس کی اہمیت کا ادراک کریں اور ملک میں سائنسی تحقیق کے ادارے قائم کرنے کیلئے زیادہ رقم مختص کریں۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معروضات پر کان نہیں دھرا گیا اور زبانی یقین دہانیوں کے باوجود کبھی بھی کوئی ٹھوس پروگرام نہیں کیا گیا۔''

برطانوی اخبار گارڈین کا خراج تحسین

بحوالہ جنگ مورخہ 27 نومبر 1996ء پاکستان نوبیل انعام یافتہ سائنسدان پروفیسر عبد السلام شمال اور جنوب کے درمیان پل بنے ہوئے تھے۔ برطانوی اخبار گارڈین نے ڈاکٹر عبد السلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کیلئے کام کیا۔''

ہم سخن فہم ہیں.......

خاکسار کو حال ہی میں میرے ایک نہایت ہی محترم اور مہربان دوست نے لندن سے گورو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر کے جناب ایچ ایس ورک کے ایک نہایت ہی قیمتی اور مفصل مضمون کی فوٹو کاپی ارسال کی ہے جس کا عنوان ہے ''عبد السلام نامی عبقری'' یہ مضمون ایک وسیع انگریزی میگزین ''کرنٹ سائنس'' میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کا ایک حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ترجمہ: تھرڈ ورلڈ اکیڈمی (سائنس اکیڈمی برائے تیسری دنیا) کی بنیاد چالیس عالمی شہرت یافتہ سائنسدانوں کے ایک گروپ نے جس میں تیسری دنیا کے نو نوبیل لاریٹ شامل تھے۔ 1983ء میں ٹریسٹ کے مقام پر رکھی۔ 1987ء اور 1988ء کے دوران ڈاکٹر عبد السلام خود تیسری دنیا کے بہت سے ممالک میں گئے اور مختلف سربراہان سے ملاقات کی جنہوں نے مدد کا وعدہ کیا۔

جناب ایچ ایس ورک متذکرہ بلند پایہ مضمون کو ان عقیدت بھرے الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

اگر ٹریسٹ اپنے سن آغاز 1964ء سے لے کر سال ہا سال سے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کی امید و آرزو کی آماجگاہ بن گیا ہے تو پنجاب کے ذہین و فطین فرزند اور نوبیل لاریٹ عبد السلام کیلئے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کیلئے ''اوتار'' کا کردار ادا کرنا مقدر ہو چکا تھا۔ اللہ اپنے بندے پر رحمت نازل فرمائے۔)

ہم نے ہر حال میں تیرا افسانہ کہا: : ڈاکٹر عبد السلام وطن عزیز پاکستان اور پاکستان کے مسلم برادر ممالک کی ترقی اور وقار کیلئے کتنے کوشاں اور آرزومند رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں کچھ

حوالے مختصراً پیش کئے جاتے ہیں۔

سابق چیئر مین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن ڈاکٹر منیر احمد خان کا ڈاکٹر سلام کے متعلق ایک مضمون روزنامہ آج کل مورخہ 30 نومبر 1996ء میں شائع ہوا ہے۔اس کے آغاز میں آپ لکھتے ہیں۔ بہت کم پاکستانیوں نے پروفیسر عبدالسلام کی طرح پاکستان کا وقار بڑھایا ہے۔وہ نہ صرف پاکستان کے سب سے بڑے سائنسدان تھے بلکہ شائد اس صدی کے دوران مسلم ممالک میں پیدا ہونے والے عظیم ترین سائنس دان بھی تھے۔''

روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ (انگریزی) نے ڈاکٹر عبدالسلام کے متعلق اپنی 23 نومبر 1996ء کی اشاعت میں ایک اداریہ لکھا۔جس میں ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ اخبار لکھتا ہے۔

ان کی وفات سے پاکستانی سائنس بلکہ درحقیقت مسلم دنیا کی سائنس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے کیونکہ وہ واحد سائنسدان ہے جن کی طبیعیات میں خدمات کیلئے ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔

وطن عزیز کے معروف ماہر تعلیم اور ادیب پروفیسر خواجہ مسعود کا ایک مضمون ڈاکٹر عبدالسلام کے بارہ میں دی نیوز مورخہ 23 دسمبر 1996ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر موصوف رقمطراز ہیں۔

''اسلامی ممالک کیلئے انہوں نے ایک کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کا خیال پیش کیا۔انہوں نے مسلم ممالک کے بڑے بڑے حکمرانوں سے اپیل کی کہ یہ کوئی بے فائدہ خواب نہیں ہے۔لیکن ان کی یہ اپیل صدا بصحراء ثابت ہوئی۔جب سلام کا دماغ ریاضی کی مساوات حل کرنے میں مشغول ہوتا تھا تو اس وقت ان کا دل تیسری دنیا کے لوگوں کی غربت کا سوچ کر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔''

روزنامہ پاکستان مورخہ 5 دسمبر 1996ء میں جناب عبدالعزیز خالد کے مطبوعہ مضمون ''وطن میں اجنبی'' کا کچھ حصہ پڑھتے ہیں۔

''علامہ مشرقی کے بعد یہ غالباً دوسرے نابغہ روزگار سائنس دان ہیں جن کا قرآن سے شغف عشق کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔پچھلے دنوں ان کے مضامین کا مجموعہ ارمان اور حقیقت دیکھنے کا اتفاق ہوا۔اپنے مضامین میں بار بار یہ صاحب دل شخص عالم اسلام اور خصوصاً ارض پاکستان کی سائنسی علوم

و معارف سے بے اعتنائی و محرومی پر رنجیدہ و دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ وہ بار بار مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی پر آنسو بہاتا ہے۔ انہیں ان کے اسلاف کے عملی کارناموں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے یورپ کو اس کی گہری نیند سے جگایا اور احیائے علوم کے دور کا آغاز کیا مگر تاسف سے کہتا ہے کہ بیداد بخت دوسروں کو جگا کر خود خواب غفلت میں کھو گئے اور ایسے کھوئے کہ ابھی تک غنودگی کے عالم میں ہیں۔'' شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

الفت الفت، بیر بیر، کعبہ کعبہ، دیر دیر ہم سے نفرت ہوش کر، اپنا اپنا غیر غیر
اور لعل و جواہر کیا ہیں!!!

ڈاکٹر عبد السلام نے اپنی خداداد ذہانت قابلیت اور محنت کی بدولت بے شمار گرانقدر اور عالمی نوعیت کے انعامات حاصل کئے لیکن ان کا استعمال کس طرح کیا اس کے لئے ممتاز علمی و ادبی شخصیت پروفیسر خواجہ مسعود کے مضمون ''سلام۔ دو دنیاؤں کا انسان'' مطبوعہ دی نیوز 23 دسمبر 1996ء سے یہ اقتباس پڑھئے۔ ''بیسویں صدی نے جو عظیم ترین سائنسدان پیدا کئے وہ ان میں سے ایک تھے لیکن وہ ایک بہت عظیم انسان بھی تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ ''نوبیل پرائز'' جیسے انعامات صرف اللہ تعالیٰ کی عنائت ہیں اور خدا کے نام پر ہی ان کو صرف کیا جانا چاہئے۔ وہ جس بات پر ایمان رکھتے تھے۔ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے اس فلسفہ پر تمام عمر عمل کیا اور اپنے تمام بڑے بڑے انعامات کو اسی طرح خرچ کیا۔ ان انعامات میں ایٹم برائے امن ایوارڈ مالیتی تیس ہزار ڈالر، نوبیل پرائز مالیتی چھیاسٹھ ہزار ڈالر، بارسلونا پرائز مالیتی ایک لاکھ ڈالر اور ایڈنبرا پرائز مالیتی پانچ ہزار ڈالر شامل تھے اور ان تمام رقومات کو اسی طرح خدمت کے طور پر دے دیا گیا۔ اقبال کا یہ مجسم استغناء یقیناً ایک خدا رسیدہ انسان تھا۔''

تیری گلیوں کے نثار میرے وطن

ڈاکٹر عبد السلام کے سارے عالم کی غم خواری اور خدمت کے سچے جذبہ کا اعتراف مشرق و مغرب میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ روزنامہ ''ڈان'' نے اپنے 22 نومبر 1996ء کے اداریے میں واضح

طور پر تحریر کیا۔ ''جو چیز انہیں اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتی تھی وہ ان کا انسانیت کے لئے گہرا احساس تھا .... وہ ایک بہتر نئی دنیا کی تخلیق میں دلچسپی رکھتے تھے۔'' یا جیسا کہ پروفیسر خواجہ مسعود صاحب اپنے مضمون مطبوعہ ''دی نیوز'' (23-12-97) کے آخر پر لکھتے ہیں:۔ ''سلام کے کئی خواب تھے اور وہ سب کے سب مظلوم انسانیت کی بھلائی کے لئے تھے۔'' لیکن پاکستان سے تو جیسے ڈاکٹر عبد السلام کو عشق تھا۔ جنون تھا۔ وہ وطن عزیز پر نثار ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس حقیقت کی جھلک زیر نظر مضمون میں درج مستند اور وقیع حوالوں میں صاف موجود ہے جو ہمارے معزز قارئین گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ اب دو تین مزید بین حوالے درج کئے جاتے ہیں:۔

(الف) قائد اعظم یونیورسٹی (اسلام آباد) کے معروف پروفیسر ڈاکٹر پرویز ھود بھائی اپنے مضمون ''عبد السلام۔ ماضی اور حال'' مطبوعہ ''دی نیوز'' (29-1-96) صفحہ 6 پر تحریر کرتے ہیں:۔ ''سلام نے برطانیہ اور اٹلی کی پیشکش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی پاکستانی شہریت قائم رکھی۔ ان کے ٹریسٹ کے مرکز میں تمام پاکستانی جن میں کٹر مخالفین احمدیت شامل تھے ترجیحی سلوک کا مورد بنتے اور ڈائریکٹر (عبد السلام) تک نسبتاً آسانی سے رسائی حاصل کر لیتے۔ بعض دفعہ دوسرے ممالک کے زائرین کو یہ بات ناگوار گزرتی پھر بھی اصولی لحاظ سے سلام کی اس طرفداری کو غلط سمجھا جاتا تھا لیکن یہ ان کی اپنے پیدائشی ملک (جنم بھومی) سے گہری وابستگی کی واضح علامت ہے''۔

پروفیسر خواجہ مسعود ڈاکٹر سلام کے متعلق اپنے مضمون مطبوعہ دی نیوز مورخہ 23 دسمبر 1996ء میں تحریر کرتے ہیں۔ ''نوبیل پرائز دیئے جانے کی تقریب میں ڈاکٹر سلام نے اس بات کو یقینی بنایا کہ وہ ایک پاکستانی کے طور پر جانے اور پہچانے جائیں۔ اس موقع پر ان کا لباس اچکن، پگڑی جس پر سیدھا طرہ بھی اٹھا ہوا تھا اور سنہرے کام والے کھسے پر مشتمل تھا۔''

متذکرہ مضمون کے پہلے کالم میں پروفیسر خواجہ مسعود صاحب لکھتے ہیں۔ ''وہ پاکستانیوں سے اپنے دل و جان سے پیار کرتے تھے جب کوئی انہیں بتاتا کہ وہ پاکستان سے آیا ہے تو ان کی آنکھیں

آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔''

ڈاکٹر منیر احمد خان اپنے مضمون مطبوعہ روز نامہ ''آج کل'' مورخہ 30 نومبر 1996ء میں رقمطراز ہیں۔''عالمی شہرت کے حامل سائنس دان ہونے کے علاوہ وہ ایک تخیل پرست، محب وطن اپنی سرزمین کے خادم اور سب سے بڑھ کر ایک منکسر المزاج انسان تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے تیسری دنیا اور خصوصاً پاکستان میں ہزاروں اعلیٰ تربیت یافتہ سائنسدان چھوڑے ہیں جو اکیسویں صدی میں انکے مشن کو جاری رکھیں گے۔ اگرچہ انہوں نے ہمارے لئے اور دوسرے ترقی پذیر ممالک کیلئے بہت کچھ کیا لیکن ہمارے پاس ان کا قرض چکانے کیلئے کچھ بھی نہیں ہے۔''

علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی	ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

وطن کی مٹی گواہ رہنا!!

ڈاکٹر عبدالسلام کی وطن عزیز پاکستان سے محبت ان کی موت کے بعد بھی قائم رہی وہ یوں کہ انہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ انہیں پاکستان میں ہی دفن کیا جائے۔

مر کے بھی شمع سے رہ نہ سکا دور	خاک بن بن کے اڑا پروانہ

اس سلسلہ میں پروفیسر خواجہ مسعود صاحب روز نامہ دی نیوز مورخہ 23 دسمبر 1996ء کی اشاعت میں اپنے مضمون ''سلام۔ دو پروانہ دنیاؤں کا انسان'' میں لکھتے ہیں۔

اٹلی کی حکومت نے اس عہدے (ڈائریکٹر جنرل یونیسکو۔ ناقل) کیلئے ڈاکٹر سلام کو اپنی طرف سے نامزد کرنے کی پیشکش کی لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا کہ انہیں اپنی پاکستانی شہریت تبدیل کرنا پڑتی۔ انہوں نے اس سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ایک پاکستانی کے طور پر ہی زندہ رہنا اور مرنا چاہتے تھے۔'' روز نامہ پاکستان مورخہ 5 دسمبر 1996ء میں ملک کی مشہور ادبی شخصیت جناب عبدالعزیز خالد کا ایک رقت انگیز مضمون بعنوان ''وطن میں اجنبی'' شائع ہوا ہے۔ جس کا آغاز ان سطور سے ہوتا

ہے۔'' پاکستان کے مایہ ناز فرزند، شہرآفاق سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام نے آخر جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ یہ ان کی سرزمین وطن سے گہری، بے غبار اور اٹوٹ محبت کا ثبوت ہے۔ کہ ان کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو اسی خاک پاک نے اپنی آغوش میں لیا۔'' روزنامہ جنگ مورخہ 23 نومبر 1996ء نے صفحہ اوّل پر یہ خبر دی۔ ''لندن سے موصولہ اطلاعات کے مطابق نوبیل انعام یافتہ پاکستانی سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی میت پروگرام کے مطابق کل 24 نومبر کو صبح سات بجے لاہور لائی جارہی ہے اور وہاں سے اسے ربوہ لایا جائے گا۔ عبدالسلام کی وصیت کے مطابق انہیں ربوہ کے قبرستان میں ان کے والد چوہدری محمد حسین کے پہلو میں دفن کیا جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالسلام ایک لمبے عرصہ تک بیرونی ممالک میں رہائش پذیر رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی پاکستانی شہریت کو قائم رکھا۔ ان کی تجہیز وتکفین میں شرکت کرنے کیلئے پاکستان اور بیرون پاکستان سے ہزاروں افراد شرکت کریں گے۔ جماعت کی طرف سے تمام مہمانوں کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کیا جارہا ہے اور ہزاروں رضا کاروں کی ڈیوٹیاں لگائی جارہی ہیں۔''

ہم زندہ قوم ہیں!!! اب جماعت کے موقر اخبار ''الفضل'' مورخہ 26 نومبر 1996ء صفحہ 1، 7 سے کچھ بیان حسب انتخاب ملاحظہ فرمائے۔

استقبال:: ''جنازہ کا جلوس شام سوا سات بجے ربوہ پہنچا۔ جہاں لجنہ اماء اللہ کے دفتر کے قریب چوک سے اہل ربوہ کی بڑی بھاری تعداد دونوں اطراف کھڑی اپنے ہیرو کے استقبال کیلئے چشم براہ تھی۔ ان میں سے کئی لوگ شام پانچ بجے سے کھڑے تھے۔''

نماز جنازہ:: محترم ڈاکٹر صاحب کا جنازہ جب احاطہ لجنہ سے روانہ ہوا تو خدمت خلق کے رضا کاروں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک وسیع دائرہ بنا لیا جس کے اندر محترم ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے افراد اور جماعت احمدیہ کے چیدہ چیدہ افراد موجود تھے۔ بہشتی مقبرہ کے اندر قبر کے گرد ایسا ہی ایک وسیع دائرہ بنایا گیا تھا۔''

سپرد خاک

پونے گیارہ بجے جنازہ بہشتی مقبرہ پہنچا جہاں پر قطعہ نمبر 12 میں جہاں محترم پروفیسر عبدالسلام صاحب کے والد محترم حضرت چوہدری محمد حسین صاحب اور والدہ محترمہ ہاجرہ بیگم صاحبہ کی قبریں ہیں وہاں تدفین عمل میں آئی۔ تدلین مکمل ہونے پر محترم صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب نے ساڑھے گیارہ بجے دعا کرائی۔'' خوب طے تو نے کیا اپنا سفر سوئے معاد

زندہ باد و زندہ باد، زندہ باد و زندہ باد

پاکستانی سیاست کی سنگدلی یا سرد مہری

قارئین! یہ ڈاکٹر عبدالسلام جس کی قابلیت، حسن اخلاق، ہمدردی خلق اور پاکستان سے وفاداری کا ساری دنیا نے کھل کر اظہار کیا۔ اس دنیا کے مایہ ناز ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ ان کی زندگی میں پاکستانی سیاست نے جو سلوک کیا اس کا ذکر آپ اس رسالہ میں دوسری جگہ ملاحظہ کر چکے ہوں گے۔ یہاں پر میں ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد پاکستانی سیاست اور میڈیا کا ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کے انداز کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستانی میڈیا جو فلمی ہیرو یا ہیروئن اور کرکٹر ہیروز کا تذکرہ کئی کئی دن اور پورے پورے صفحات کے ساتھ کرتا ہے اس نے اپنے اس علمی ہیرو کو اپنے اخبارات کے چند کالموں میں جگہ دی اور دوسرے تیسرے دن یہ کالم اندر کے صفحات میں منتقل ہو گئے۔ آپ کے جنازہ اور تدفین کو نہ اخبارات نے اور نہ ہی ملکی ٹی وی نے کوریج دی۔ اور ملکی سیاست کا یہ حال تھا کہ ہمارے ملک کے سیاستدانوں میں سے کسی نے بھی یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ اپنے اس ہیرو جو ساری زندگی اس ملک پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور اس کے نام کی بلندی کیلئے کوشاں رہا۔ اس کے آخری دیدار اور اس کی آخری رسومات میں شرکت کیلئے آئے۔ پاکستانی سیاست اور میڈیا کے اس سلوک سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ ہماری ذہنیت اور سوچ کیا ہے اور علم اور علمی ہیروز کا ہماری نظر میں کیا مقام ہے۔ اور وہ وفات کے بعد بھی وطن میں اجنبی ہی رہا۔

وحدت حقیقت اور عبدالسلام

پروفیسر عبدالسلام کی خدمات کا اعتراف

(پروفیسر جان زیمان۔ برسٹل یونیورسٹی)

عبدالسلام کی زندگی اور کارہائے نمایاں دونوں میں ایک ہی تصور کار فرما ہے اور وہ ہے ارتباط و اتحاد۔ عبدالسلام دین پر ایمان رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی کو نظریہ وحدت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ وحدت جو کہ فطرت میں رچی بسی ہوتی ہے اور بنی آدم کو اتحاد کے رشتوں میں منسلک کیے ہوئے۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے عبدالسلام اس نکتے تک پہنچے کہ بنیادی مادی ذرات کے مابین کارفرما مختلف النوع قوتوں کو اصل میں صرف ایک بنیادی مادی قوت کی مختلف شکلوں کے علاوہ کچھ اور نہ ہونا چاہئے۔ ایک سیاسی اور اخلاقی رہنما کی حیثیت سے انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ قوموں اور تہذیبوں کا اختلاف ایک عالمی سائنسی برادری کے قیام کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

آج اس عظیم ہستی کا استقبال ہم اپنی فیکلٹی میں اس لئے کر رہے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت تمام دنیا میں نظریاتی طبیعیات کے ممتاز ترین ماہرین میں سے ایک ہیں۔ کیمبرج میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہی انہوں نے ایسا نمایاں تحقیقی کام کیا تھا کہ اس پر 1950ء میں ان کو اسمتھ پرائز (Smith Prize) سے نوازا گیا۔ اس دن سے آج تک عبدالسلام لگاتار تحقیق کی مہم پر مہم سر کر رہے ہیں۔ ان کے اس تحقیقی مشن کی نوعیت جواہر حقیقت کی مشکل کان کنی کی مانند ہے۔ جس میں عبدالسلام ڈھیرے ڈھیرے پتھروں کو ہٹا کر علمی گتھیوں کو سلجھا کر حقیقت (کے جواہر و الماس) کو عیاں کرنے کی جدوجہد میں مستقل لگے ہوئے ہیں۔ کوانٹم طبیعیات کے پیرہن میں پنہاں مادے کے بنیادی اجزا کی کھوج اور اس کی تفہیم کے ڈرامے کے ہر سین میں عبدالسلام نے ایک اہم رول ادا

کیا ہے۔ایک حیرت انگیز باوجود بات یہ ہے کہ وہ عوامی امور میں بھی کافی عمل دخل رکھنے کے باوجود بنیادی ذرات کی فزکس میں اب تک دو سو سے زائد نمایاں تحقیقی مقالات پیش کر چکے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اب بھی شدید مقابلوں اور ذہنی کاوشوں کی ہل چل کے درمیان لگا تار اپنے لیے راہ بناتے چلے جا رہے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ آج بھی عبد السلام تحقیق کے میدان میں اتنی مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے مصروف کارزار ہیں کہ میں نے ان کے کارناموں کی مکمل فہرست کندہ کرانے کی ہمت ابھی تک نہیں کی ہے۔کیا معلوم کہ آنے والی صبح میں کہیں کوئی مشاہدہ ہو جس کے نتیجے میں عبد السلام کی کارگزاریوں کی فہرست میں ایک نئی تھیوری کا اضافہ ہو جائے۔عبد السلام غیر معمولی سائنسی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔مثال کے طور پر وہ مادی حقائق پر مبنی ایسے نظریاتی رشتے باسانی تجویز کر دیتے ہیں جن کی صداقت کو پرکھنے کی کاوش رائیگاں جانے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔عبد السلام کے تشکیل کردہ الیکٹرو ویک قوت کے تصور نے ان کو 1979ء کے طبیعیات کے نوبل پرائز میں حصے دار بنایا۔اس تصور کو انہوں نے 13 سال قبل پیش کیا تھا۔اس کے بعد تین چار سال تک کسی نے اس پر وقت صرف نہ کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظریے کو سمجھنے کی راہ میں تقریباً ناقابل عبور ریاضیاتی مسائل درپیش تھے۔جب یہ مسائل بھی حل ہو گئے تب ان ریاضیاتی پیشین گوئیوں کو احتیاط طلب اور نازک و نفیس تجربات کے ذریعے سچ ثابت کرنے کا نمبر آیا۔مجھے یاد ہے کہ میں اس ولولہ انگیز دور میں (Trieste) ہی میں تھا جب عبد السلام کے الیکٹرو ویک قوت کے نظریے کی روشنی میں کی گئی پیشین گوئیوں کی صداقت پرکھنے کے لیے دنیا میں کئے گئے تجربوں کے نتائج آنے شروع ہوئے تھے۔مختلف براعظموں میں بکھری ہوئی تجربہ گاہوں سے بذریعہ ٹیلیفون اعداد و شمار حاصل کیے جا رہے تھے اور ان کو چیک کیا جا رہا تھا۔اولین نتائج سے ایسا لگتا تھا کہ شاید حقیقت عبد السلام کے نظریے کے برعکس ہے،لیکن عبد السلام کے اطمینان میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور وہ اپنے نظریے پر اٹل رہے اور آخر کار کامیابی نے ان کو لبیک کہا۔اس دن (Trieste) میں ہم سب کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔یہ کہنا درست ہی ہوگا کہ عبد السلام میں فزکس کیلئے ایک ایسا ولولہ ہے جو دوسرے لوگوں میں بھی اس

علم کیلئے جذبہ کشش کے خوشگوار وسبک احساسات کو خوش اسلوبی سے ابھار دیتا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کو الیکٹرو ویک قوت کے نظریے کے بارے میں کچھ بتاؤں۔سب جانتے ہیں کہ نیوٹران جس قوت کے تحت پروٹان اور الیکٹران میں تبدیل ہوتا ہے، اس کو کمزور یا ''ویک'' قوت (Weak Force) کہتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک اور قوت جس کی واقفیت عام ہے وہ ہے برقی ذرات کے درمیان کام کرنے والی برقی مقناطیسی قوت (Electromagnetic Force) عبدالسلام نے اپنے الیکٹرو ویک قوت کے نظریے میں یہ تجویز کیا کہ ذرات کے زوال میں کارفرما قوت کو الگ حیثیت دینے کی بجائے اس کو برقی مقناطیسی قوت کا جز ماننا چاہئے۔اس وقت اس نظریے کو سمجھنا ہنسی کھیل نہ تھا۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ عبدالسلام کا طریقہ فکر و کار دوسروں سے الگ ہے۔آج کل کے نظریاتی طبیعیات کے ماہرین کے مقابلے میں عبدالسلام ریاضیاتی مسائل ذرا پرانے ڈھنگ سے حل کرتے ہیں لیکن بلاشبہ ان کو اس کام میں مہارت حاصل ہے۔ فیراڈے (Faraday) اور میکسویل (Maxwell) اگر آج اوپر بیان کیے گئے کارنامے کو دیکھ سکتے تو بہت خوش ہوتے۔کیوں کہ عبدالسلام کا یہ کام ان جید سائنس دانوں کے اس معرکہ الاراء کام سے مشابہت رکھتا ہے جس میں انہوں نے سو سے زائد برس پہلے مقناطیس اور برقی قوت کو یک جا کر کے ایک رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔

رسمی انداز میں سائنس کی سمٹی ہوئی تہوں کو پھیلا کر عیاں کرنے کا منظر پرلطف ہوتا ہے۔قدرے قدامتی طرز میں کام کرنے کی وجہ سے عبدالسلام کو جدوجہد تو خاصی سخت کرنی پڑی لیکن ان کو ایسی کامیابی ملی جس نے کوانٹم طبیعیات میں ایک بڑے انقلاب کی آمد کیلئے راہ ہموار کر دی۔اس نئے انقلاب کا رخ جس منزل کی جانب ہے وہ ہے ارض وسماوات میں کارفرما سب طرح کی قدرتی قوتوں کا اتحاد یعنی ایک اعلیٰ وحدت (Grand Unification) کے تصور کی تشکیل ہوسکتا ہے کہ یہ صرف ایک سراب ہو یا پھر دوسری بات سچ ہو۔یعنی مادے اور توانائی کی حتمی ساخت کی اصلیت کے بارے میں عبدالسلام کی نظریاتی اسکیم ہی درست ہونی چاہئے۔ایسی صورت حال میں ظاہر ہے کہ

اس اسکیم کی روشنی میں عبدالسلام نے جن مشاہدات کی پیشین گوئیاں کی ہیں وہ کہیں نہ کہیں کھوج لیے جائیں گے اور عبدالسلام کے نظریے کے علاوہ کسی دوسری طرح ان کو نہ سمجھا جا سکے۔

عبدالسلام کے اعلیٰ وحدت کے تصور کے مطابق ایک پیشین گوئی جس کی بڑی شہرت ہوتی ہے وہ پروٹان کے زوال کے سلسلے میں ہے۔ پروٹان جو کہ تمام کائنات کا بنیادی جزو ہے، عبدالسلام کے کہنے کے مطابق اس کی عمر کی بھی ایک حد ہونا چاہئے۔یعنی نیوٹران کی طرح پروٹان کا بھی زوال ہونا چاہئے۔ یہ اور بات ہے کہ خوش قسمتی سے نیوٹران کے برعکس پروٹان کے زوال کا امکان بہت کم ہے۔یعنی پروٹان کی زندگی بہت طویل ہے۔ ہمارے دور حاضر کے پروٹان کو جینے کے لئے کائنات کے شروع ہونے سے لے کر اب تک کے وقت کا ارب ارب گنا وقت ابھی باقی ہے۔ یہ وقت یقیناً اس وقت سے تھوڑا زیادہ ہے جو مجھے عبدالسلام کے نظریات کو پہلے اچھی طرح سمجھنے اور بعد ازاں اس مجلس کے حاضرین کرام کو قاعدے سے سمجھانے کیلئے درکار ہوگا۔اس صورت حال کے پیش نظر محترم وائس چانسلر مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس خوش گوار محنت سے بچالیں گے اور عبدالسلام کی عالمی سائنسی شہرت کو ان کو اس فیکلٹی میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کے لئے ثبوت کے طور پر قبول فرمالیں گے۔لیکن اس سے پہلے میں آپ کے سامنے عبدالسلام کی شخصیت کا ایک اور پہلو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان کا شمار دنیا کے اولین شہریوں میں کیا جاتا ہے ان کو صف اوّل کا انگلستانی سائنس دان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پچھلے بیس سال سے لندن یونیورسٹی کے امپیریل کالج میں پروفیسر ہیں۔اس کے علاوہ ان کا کافی وقت ٹریسٹے میں صرف ہوتا ہے اور اقوام متحدہ (نیویارک) میں بھی ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہ کہنا بہت مناسب ہوگا کہ عبد السلام کی ذات فرد واحد پر مشتمل مختلف اقوام کی اس کارپوریشن کی مانند ہے جو کہ دنیا کے پچھڑے ہوئے ممالک کو ذہنی ٹیکنالوجی بہم پہنچانے کے کام میں ہر دم مصروف ہے۔

عبدالسلام کا وطن پاکستان ہے اور ان کو اپنے ملک سے گہرا لگاؤ ہے۔ان کی .... پرورش ایک چھوٹے سے شہر جھنگ میں ہوئی۔ یہ شہر مغلوں کے محلوں اور باغات کی قدیم جنت یعنی لاہور سے

زیادہ دور نہیں ہے۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ایک وظیفے نے سلام کو کیمبرج میں پہنچا دیا۔ یہاں انڈر گریجویٹ سطح کی تمام فزکس و ریاضیات پر عبدالسلام نے آناً فاناً عبور حاصل کرنے کے بعد بتدریج بلند ہوتی ہوئی تحقیق کے منازل کو تیزی سے طے کرنا شروع کر دیا۔ صرف 25 سال کی تھوڑی سی عمر میں وہ پروفیسر ہو کر لاہور لوٹ آئے۔ ان دنوں عام معیار کے لحاظ سے عبدالسلام کی علمی کامیابی اتنی کافی تھی کہ اس کے سہارے وہ بہت آرام دہ زندگی گزار سکتے تھے۔

لاہور میں انہوں نے تین سال گزارے۔ عبدالسلام کا وقت یہاں شدید کرب اور کشمکش میں گزرا۔ انگریزوں کے زمانے میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کا شمار اچھے علمی اداروں میں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود تحقیق کے میدان میں یہاں کسی کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ لاہور میں گزرے ان سالوں میں عبدالسلام کا سب سے بڑا نقصان جدید سائنسی مسائل پر مشغول کار ہم عصر سائنس دانوں سے رابطے کا منقطع ہو جاتا تھا۔ بعد میں عبدالسلام نے اپنے اس ناقابل تلافی نقصان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں تحقیق کے کام پر پژمردگی چھائے رہنے کا سبب وہاں پر باہر کی دنیا سے روابط کا برائے نام وجود ہے۔ خود عبدالسلام ہی کے الفاظ میں :۔

”تیسری دنیا کے ممالک جیسے کوریا، لبنان، برازیل اور پاکستان کے باصلاحیت اور ذہین افراد تدریس و تحقیق میں مہارت حاصل کرنے کے لئے اپنے وطن سے دور مغرب یا روس جاتے ہیں اور بعد میں اپنے وطن کے اداروں کی تعمیر نو کی غرض سے واپس آجاتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عام طور پر ماہرین اپنے وطن کی یونیورسٹیوں میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ان کے گرد اگر کوئی چھوٹا سا گروپ بن بھی جاتا ہے تو وہ اتنا حقیر ہوتا ہے کہ علم کی بھٹی کی آگ کو دہکانے اور بھڑکانے کیلئے بالکل ہی ناکافی ہوتا ہے۔ ان اداروں میں اچھی لائبریریوں اور باہر کی سائنس برادری سے علمی لین دین کا فقدان ہوتا ہے۔ نتیجے میں یہ لوگ جو کام کرتے ہیں اس کو کون سمجھے اور اس کی کون تصحیح کرے۔ اس کے علاوہ اس دنیا سے الگ سائنس دانوں کو دنیائے سائنس میں نت

نئے ابھرتے ہوئے تصورات کی خبریں بہت دیر سے ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ جن بلندیوں سے یورپ یا روس کے اداروں کے ولولہ انگیز ماحول میں روشناس ہوتے تھے۔ ان کے نئے تحقیقی کام بھی ان بلندیوں کی حدود کے اندر پھڑ پھڑا کر رہ جاتے ہیں۔ یہ بے چارے سائنس داں اپنے وطن واپس پہنچ کر علیحدگی کی ایک ایسی زندگی گزارتے ہیں جو علمی قید کے مترادف ہوتی ہے۔ علمی دنیا سے اس طرح ناطہ ٹوٹ جانا نظریاتی طبیعیات میں خاص طور سے اور دوسرے علمی شعبوں میں بھی ان ہونہار افراد کی علمی موت کے برابر ہے۔ جب میں نے لاہور میں یونیورسٹی جوائن کی تھی تو مجھے بالکل اسی طرح کے حالات وحادثات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔''

نوجوان عبدالسلام جیسا کوئی بھی غیر معمولی ذہین شخص دھیرے دھیرے زندہ درگور ہونے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ عبدالسلام 1954ء میں انگلستان واپس آ گئے اور فوراً ہی لندن میں علمی منصب پر فائز ہو گئے۔ یہاں رہ کر بھی اپنے وطن سے ذاتی اور علمی سطح پر قربت کے رشتوں کو عبد السلام نے کبھی کمزور نہ پڑنے دیا۔ اگرچہ عبدالسلام بعد میں اپنے وطن میں کسی باقاعدہ عہدے پر فائز نہیں ہوئے، پھر بھی ان کو اس بات پر فخر ہے کہ نوبل پرائز پانے والے وہ پہلے پاکستانی ہیں۔

عبدالسلام جتنے اعلیٰ درجے کا ذہن رکھتے ہیں ساتھ ہی اتنا ہی وسیع دل بھی ان کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ پاکستان میں گزرے ہوئے چند ناخوشگوار سالوں کی یاد نے ان کا دل کھٹا نہیں کیا بلکہ یہ یاد ایک ایسے تخلیقی نقطے میں ڈھل گئی جس کے گردان کی عظیم علمی کامیابیوں کے وسیع حلقے کی تحقیق وجود پذیر ہوئی۔ عبدالسلام نے یہ تہیہ کیا کہ کم ترقی یافتہ ممالک کے ہونہار نوجوان سائنس دانوں کے لئے اس طرح کی سہولیات میسر کریں گے کہ جس سے وہ سائنس کی دنیا سے کٹ کر نہ رہ جائیں اور علمی موت سے ہم کنار نہ ہونے پائیں اور ان کو اپنے وطن کو بھی خیر باد نہ کہنا پڑے۔ عبدالسلام کا یہ عزم آج ٹھوس حقیقت بن کر دنیا کے سامنے درخشاں ہے۔

صرف ایک سطر جوان کے کارہائے نمایاں کی طویل فہرست میں جلی حروف میں درج ہے، بتاتی

ہے کہ عبدالسلام 1974ء سے لے کر آج تک ٹریسٹے کے نظریاتی طبیعیات کے بین الاقوامی مرکز
(Internation Centre for Theoretical Physics at Trieste)
کے ڈائریکٹر کے فرائض لگا تار انجام دے رہے ہیں۔ یہ واحد سطر ان پچاس سے زائد انعامات پر بھاری ہے جو کہ نمایاں تحقیقی کارناموں کے عوض دنیا بھر میں بکھری ہوئی یونیورسٹیوں اور مشہور علمی اداروں کی طرف سے عبدالسلام کو عطا کیے گئے ہیں۔ ان کا معرکۃ الآراء کارنامہ یہ مرکز ہے جس کی تخلیق انہوں نے صفر سے کی۔ آج یہ مرکز سب سے زیادہ کامیاب اور قابل احترام بین الاقوامی اداروں میں سے ایک ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان جدید ترین سائنس سے باخبر ہونے کی غرض سے Trieste کے اس مرکز میں آکر مستفید ہوتے ہیں۔ تحقیق کے نئے طریقے سمجھنا اور سیکھنا ہوں تو یہ مرکز ان کی مرادوں کی منزل ہوتا ہے۔ یہاں پر ان کو ترقی یافتہ ممالک کے ترقی پذیر ممالک کے بلکہ دنیا بھر کے سائنس دانوں سے ملاقات کے مواقع ملتے ہیں۔ یہاں اگر وہ خصوصی مضامین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں یا صرف چپ چاپ مطالعہ مقصود ہو تو مرکز کی بہترین لائبریری میں غرق ہو جاتے ہیں یا ہونہار نوجوان سائنس دانوں سے بحث ومباحثہ کرتے ہیں یا پھر سوئیڈن کے بہت سمجھ دار معمر سائنس دان سے مضمون کے باریک نکات کو سمجھتے ہیں۔ ٹریسٹے کا یہ مرکز اس مصروف ترین ریلوے جنکشن کی مانند ہے جہاں علم و دانشوری کی ریلوں کی ہمہ وقت آمد و رفت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صرف چند سالوں کے وقفے میں یہ مرکز شاندار عمارتوں سے پٹ گیا ہے۔ خوش قسمت ہے یہ ادارہ کہ یہاں کا تمام عملہ اپنے کو مرکز کے مقاصد کیلئے وقف کیے ہوئے ہے۔ بس ایک کمی ہے اور وہ ہے سرمائے کی قلت جو یہاں کبھی ختم نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود یہ مرکز پوری طرح زندہ ہے۔ اچھی طرح کام کر رہا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور سائنس کی پوری دنیا کی خدمت میں لگا تار مشغول ہے۔

اس مرکز کے قیام کا معرکہ کس طرح سر ہو سکا؟ ان دنوں نوجوان پروفیسران میں عبدالسلام کو

سب سے زیادہ مشکل اور ناقابل فہم پروفیسر تصور کیا جاتا تھا۔ایسے شخص نے کس طرح جامد و ساکت بین الاقوامی اداروں جیسے یونیسکو (UNESCO) اور بین الاقوامی اٹامک انرجی ایجنسی (IAEA) کے جذبات سے عاری اور ہوشیار نمائندوں کو عام روش سے ہٹ کر اس مرکز کے منصوبے پر سرمایہ لگانے کیلئے راضی کیا ہوگا۔کس طرح عبدالسلام نے اٹلی کی حکومت کو اپنا ایسا دوست بنالیا جس نے دامے، درمے اور سخنے ان کی مدد کی؟ گزرے ہوئے چند سالوں میں عام مالی بدحالی اور بڑھتی ہوئی کرسی شاہی کے نظام نے بڑے بڑے شاندار منصوبوں کو ناکامی کی نذر کر دیا تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس نظام میں رہ کر یہ مرکز نہ صرف زندہ رہ سکا بلکہ پھلتا اور پھولتا بھی رہا؟

وہ تنہا قوت جس کی وجہ سے ٹریسٹے کا یہ مرکز نہ صرف قائم ہوا بلکہ شہرآفاق بنتا جا رہا ہے وہ ہے اس مرکز کے ڈائریکٹر عبدالسلام کی ذاتی قوت ارادی۔محترم وائس چانسلر صاحب میں آپ کو ہوشیار کرنا چاہتا ہوں کہ میکانیات میں ایک ایسی غیر مرئی قوت کا خیالی تصور ملتا ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔عبدالسلام کی ذات اس قوت کا حقیقی مظہر ہے۔عبدالسلام اپنے ملاقاتیوں پر بلاتفریق اسی طرح چھا جاتے ہیں۔چاہے یہ ملاقاتی سیاست دان ہوں یا سرکاری افسران یا بین الاقوامی اداروں کے افسران یا رفقائے کار سائنس دان،عبدالسلام کی دیانت داری، خلوص اور مقصد کی یک سوئی سب کو متاثر کرتی ہے اور بہت موثر انداز سے اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ اقوام کی بے لوث خدمت میں مشغول ہیں۔

ابتدا میں ٹریسٹے کا یہ مرکز اوّل درجے کی نظریاتی سائنس کیلئے وقف تھا اور یہاں تیسری دنیا کے افراد فزکس میں اعلیٰ ترین سطح پر کارہائے نمایاں انجام دے کر اونچے مقام پیدا کرتے تھے۔اس مرکز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اور اس کے علاوہ 1960ء سے لیکر 1974ء تک پاکستانی حکومت کی سائنسی پالیسی کے معمار اور صلاح کار کی حیثیت سے عبدالسلام جن تجربات سے دوچار ہوئے اس سے ان کو نیا درس ملا۔انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ممالک جو اقتصادی اور سماجی بہتری کی جدوجہد میں

نبرد آزما ہیں ان کے یہاں پہنچنے والی سائنس کے مقاصد میں وسیع النظری ہونا ضروری ہے، عبد السلام کی طرز فکر میں اس تبدیلی کا اثر مرکز کی کارکردگیوں پر فوراً ہی شروع ہو گیا اور وقت کے ساتھ یہاں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اب جو ورکشاپس اور کانفرنسز یہاں منعقد ہوتی ہیں جو سیمینارز یہاں کیے جاتے ہیں۔ جن خصوصی کورسز کی تعلیم یہاں دی جاتی ہے یا وظائف کا جو پروگرام یہاں جاری ہے، سب میں ایک ایسا پھیلاؤ آ چکا ہے جس کے تحت کارآمد سائنس کے ہر میدان میں مجموعی تحقیق تسلی بخش طریقے سے پرورش پا رہی ہے۔ یہاں پر تربیت حاصل کرنے والے سائنسدانوں کے خصوصی رول کے بارے میں عبد السلام کہتے ہیں کہ بین الاقوامی اور قومی سائنسی اداروں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر ان سائنسدانوں کا رول بہت پر کشش اور مفید ثابت ہوگا۔ عبد السلام کی ایک اور قابل ستائش عظیم کاوش کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے حال ہی میں عبد السلام نے چھوٹی اور غریب اقوام جو اپنی بہبودی کی کوشش میں لگی ہوئیں ہیں ان کی ہمت افزائی مدد اور اصلاح دینے کی غرض سے ایک مزید نئے ادارے کے بنیادی ڈھانچے کو قائم کرنے کیلئے عالمی سطح پر جدوجہد شروع کی ہے اور اس اعلیٰ مقصد جہاد میں وہ اپنے ذاتی اثر ورسوخ اپنی دولت اور نوبل انعام کی شہرت کے ساتھ مصروف ہیں۔ فلسفے کے فطری اور سماجی دونوں وسیع حلقوں میں عبد السلام لگاتار رابطہ پیدا کرنے، جوڑنے یا متحد کرنے کی جستجو میں جانفشانی سے مصروف ہیں۔ اس راہ پر چلتے ہوئے فطرت میں پنہاں وحدت اور مثالی انسانی برادری کے حقیقی روپ کو عبد السلام پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اس لئے عالی جناب وائس چانسلر صاحب یہ بہت ہی مناسب ہوگا کہ ہم بھی ان کو عزت واحترام سے نوازیں۔ اسی غرض سے آپ کے روبرو عبد السلام کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کے لئے پیش کرتا ہوں کیونکہ وہ سب سے بڑھ کر اس اعزاز کے مستحق بن چکے۔

Ideals and Realities Edited by: Z.Hassan & C.H. Lai:

Published by: World Scientific Publishing Co Ple. Ltd.

گمنام تھا وطن میں

(ڈاکٹر صاحب نے سرکاری علاج کی پیش قبول کرنے سے معذرت کر لی کہ وہ غریب پاکستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اپنی ذات پر خرچ نہیں کر سکتے)

(جناب اصغر علی گھرال صاحب)

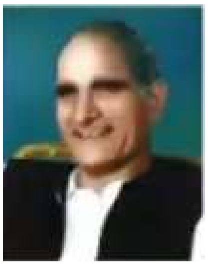

بی بی سی کے ایک پروگرام میں اس ٹریجڈی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دنیا نوبل انعام یافتہ عظیم سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان کا سپوت کہتی ہے۔ لیکن خود پاکستان نے انہیں کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور وہ یہ حسرت لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ کاش ان کا وطن بھی نہیں فرزند پاکستان کے نام سے پکارے۔ 1950ء کی دہائی میں پاکستان چھوڑ کر لندن چلے گئے تھے اور اس کے بعد پاکستان واپس آ کر آباد ہونے کی تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ مستقلاً پاکستان میں آباد ہو جائیں۔ لیکن یہاں نہ تو ریسرچ کی عمدہ سہولتیں تھیں اور نہ حکومت کے پاس سائنس کے شعبے کیلئے وافر فنڈ تھے۔ تیسرے ان کی شخصیت کا ایک پہلو بہت ''متنازعہ'' تھا۔ پروفیسر عبدالسلام ایک ایسے فرقے سے تعلق رکھتے تھے جسے پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا تھا۔ بی بی سی کے مطابق بعض انتہا پسندوں نے یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر پروفیسر عبدالسلام لوٹ کر پاکستان آئے تو انہیں قتل کر دیا جائے۔

اب اس بات سے پونے چار سو سال پہلے کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کوپرنیکس اور کیپلر کی طرح گلیلیو نے بھی ثابت کر دیا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گھومتی ہے جب کہ کلیسا کا دعویٰ تھا کہ زمین فرش کی مانند پانی پر بچھی ہوتی ہے۔ کلیسا اپنے عقائد کی یوں کھلی توہین برداشت نہ کر سکا۔ 1616ء میں گلیلیو کو ایکوئزیشن کے سامنے پیش کیا گیا کہ وہ اعلان کرے کہ کوپرنیکس کے نظریات باطل ہیں۔ اس نے توبہ کر لی مگر چپکے سے بولا'' میں مانوں یا نہ مانوں

زمین تو بہر حال گھومتی رہے گی۔‘‘

1623ء میں گلیلیو کا ایک روشن خیال درست پوپ بن گیا۔ گلیلیو نے چاہا کہ 16ء والی پابندی ختم کر دے مگر وہ ناکام رہا۔ البتہ یہ اجازت لینے میں کامیاب رہا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھے گا کہ جس میں ارسطو کے قدیم اور کوپرنیکس کے جدید نظریات پر بحث ہوگی۔ دو شرائط عائد کی گئیں ایک یہ کہ وہ کسی کی طرفداری نہیں کرے گا، دوسرے اس بحث کے بعد وہ اس ’’مثبت‘‘ نتیجے پر پہنچے گا کہ انسان یہ تعین کر ہی نہیں سکتا کہ دنیا کیسے چل رہی ہے۔

یہ کتاب ’’ڈائیلاگ‘‘ یا ’’مکالمہ‘‘ کے نام سے 32ء میں چھپ گئی۔ یہ دونوں عظیم نظاموں اور نظریات پر بحث کرتی ہے۔ کتاب کی سارے یورپ میں زبردست پذیرائی ہوئی، پوپ ڈر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کتاب کی اجازت دے کر غلطی کی ہے کیونکہ لوگ کوپرنیکس کے جدید نظریات کے حامی ہو گئے۔ پوپ خود ضرور روشن خیال تھا مگر نہ ہی ماحول سے بڑا پریشان ہوا۔ اس نے گلیلو پر 16ء کی پابندی کی خلاف ورزی کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا دیا۔ عظیم سائنسدان گلیلو پھر ایکویزیشن کے سامنے لایا گیا۔ اس نے دوسری دفعہ سر تسلیم خم کر دیا لیکن اس دفعہ اسے معاف نہیں کیا گیا اور سزا کے طور پر ہمیشہ کے لئے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں فی الواقعہ اس کی نظر بند ہوگئی یعنی اس کی آنکھیں ضائع ہوگئیں۔ اب چند سال قبل کلیسا نے عظیم سائنسدان گلیلو کے ساتھ اس ’’حسن سلوک‘‘ پر معافی مانگ لی ہے۔ معذرت کر لی ہے۔ اپنے ’’مقدس فتاویٰ‘‘ کو واپس لے لیا ہے۔ اب کلیسا خاص روشن خیال ہو گیا ہے!

پاکستان کے عظیم سائنسدان کے ساتھ سائنسی نظریات کے حوالے سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں تھا مگر نہ ہی عقائد کے اختلاف کی بناء پر ایک عظیم انسان کو اپنے ہی وطن میں جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن حسرتوں کو وہ دل میں لے کر چل بسا یہ ایک المیہ ہے۔ نہ جانے ہمارے علماء کب اتنے فراخ دل ہوں گے کہ لا اکراہ فی الدین کے فلسفے پر خود بھی عمل کر سکیں اور انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ قوم کو اس عظیم سائنسدان کے ساتھ اس بے اعتنائی کے لئے

یقیناً احساس جرم ہوگا............!!

پارکنسن سے ملتی جلتی خطرناک بیماری میں ایک عرصے تک مبتلا رہنے کے بعد وہ عظیم انسان جسے دنیا ڈاکٹر عبدالسلام کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ سائنسدان تھے 20 نومبر کو صبح 8 بجے لندن میں انتقال کر گئے۔ 24 نومبر کو ان کا جسد خاکی پاکستان میں لاکر سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی عمر 70 سال 9 ماہ اور 22 دن تھی۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اور یونیورسٹیوں میں ان کی وفات پر بڑا سوگ منایا گیا ہے۔

گجرات میں تھنکرز فورم کے زیر اہتمام بھی ایک تعزیتی تقریب ہوئی۔ معروف سکالر اکبر علی ایم اے نے صدارت کی۔ مقررین نے اس امر پر شدید افسوس کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر صاحب کو پاکستان میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے اور جو مقام ساری دنیا انہیں دے رہی تھی۔ ان کی عظمت کا کما حقہ اعتراف کیا گیا اور نہ ہی ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ چوہدری اکبر علی نے اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایک ٹریجڈی سے کم نہیں کہ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ہم پاکستان میں سائنسی کلچر کو فروغ نہیں دے سکے............!

انہوں نے کہا کہ برطانیہ میں رائل سوسائٹی آف سائنس کے تحت سائنسی علوم کو ترقی ملی............ نیوٹن اس کے سربراہ تھے۔ نیوٹن نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے قوانین بنا دئے ہیں جن کی وہ خود بھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس پر مذہبی حلقوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ خود اپنے ہی قوانین کے سامنے بے بس ہے۔ نیوٹن کا جواب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی رضا سے ہی فطرت کے قوانین کی مخالفت نہیں کرتا۔ ڈارون نے ارتقاء کا نظریہ پیش کیا تو کلیسا نے اس کی بھی زبردست مخالفت کی، بحث چل نکلی بلکہ بحث و مباحثے کا طوفان آ گیا۔ بحث وتمحیص سے ہی بات آگے بڑھتی ہے تاہم ''آرتھوڈکس'' خیالات کی شکست مقدر تھی۔ وہ ہو کر رہی۔ قدامت پسندی اور توہم پرستی کہاں تک مقابلے میں ٹھہر سکتی تھی۔

ہمارے ہاں بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی ''ڈی بیٹ'' نہیں ہے۔ الیکٹرانک میڈیا سے بھی توہم پرستی کا

پرچار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام ایسے عظیم سائنسدان کے لئے برطانیہ، بھارت اور اٹلی ہی نہیں دنیا کا ہر ملک فخر سے شہریت اور زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات نچھاور کرنے پر تیار تھا مگر انہیں اپنے وطن سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ انہوں نے سائنس کی دنیا میں اپنے ملک کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگائے مگر یہاں تو وہ اپنی مادر علمی میں لیکچر تک نہیں دے سکتے تھے۔ یہ ہماری جہالت اور تعصب کا بیرومیٹر ہے۔

شبیر احمد ڈار ایڈووکیٹ نے ڈاکٹر عبدالسلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ 21 ویں صدی کے دھانے پر کھڑے آج ہم محض عقیدے کے اختلاف کی بناء پر ایک عظیم سائنس دان اور ایک عظیم انسان کو اس کا جائز مقام دینے کو تیار نہیں۔ انہوں نے کہا ڈاکٹر عبد السلام کی آخری وقت یہ خواہش رہی کہ وہ پاکستان کو ایک سائنسی انسٹیٹیوٹ دے سکیں۔ انہوں نے کہا یہاں سائنس کی سرکاری طور پر سرپرستی کی بجائے توہم پرستی کی سرکاری سرپرستی ہوتی ہے۔ وہ ملک کو پرانی فزکس کی بجائے جدید فزکس سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ساتھ جو زمین مستقبل کی توسیع کے لئے موجود تھی اسے نام نہاد عوامی نمائندوں نے اونے پونے اپنے ناموں پر الاٹ کروالیا البتہ حال ہی میں یہ اراضی ان کے پنجوں سے آزاد کرالی گئی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے زبردست کردار ادا کیا ہے۔ اتفاق سے ڈاکٹر پرویز ہود بھائی پاکستان میں ڈاکٹر عبدالسلام کے سب سے بڑے شیدائی اور قدر دان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ''مذہبی'' حلقے ان کے خلاف بھی منفی پروپیگنڈا کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کے مطابق ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی کی دو بڑی آرزوئیں تھیں۔ ایک تو فزکس کی تحقیقات، جن میں کھو کر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔ دوسرے وہ اپنے وطن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی چاہتے تھے............!

معروف قانون دان چوہدری مسعود اختر نے ڈاکٹر عبدالسلام کی عظمت خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے چودہری اکبر علی سے سوال کیا کہ سائنسی کلچر لانے کی ذمہ داری تو سیاست دانوں پر عائد ہوتی

ہے۔سائنس دان تو سائنسی تھیوریوں پر کام کر سکتے ہیں۔علم کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

اکبر علی ایم۔اے نے کہا کہ ہر نئی سائنسی ایجاد کلچر پر اثر انداز ہوتی ہے۔سٹیفن نے انجن ایجاد کیا تو یورپ کا کلچر بدل کر رہ گیا۔کالم نگار عبداللہ خالد خان نے کہا کہ سائنس کی ترویج کے بغیر سیکولر خیالات کے پنپنے کا امکان نہیں ہوتا۔حیرت ہے کہ ہم کرسچین دنیا کے سائنس دانوں کو تو بسر و چشم قبول کر لیتے ہیں مگر مادر وطن کے ایک عظیم فرزند کو محض عقیدے کی بناء پر مسترد کر دیتے ہیں۔ہم دوسروں کو متعصب کہتے ہیں۔انڈیا میں مسلمان اظہر الدین کرکٹ کی دنیا کا ہیرو ہے اور 90 کروڑ اہل بھارت اس پر فخر کرتے ہیں۔چوہدری بشیر احمد ایڈووکیٹ نے کہا کہ نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان کی ناقدری سے خود پاکستان کو نقصان ہوا ہے اور ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا۔انہوں نے کہا ڈاکٹر عبدالسلام، نیوٹن یا آئن سٹائن مذہب کے خلاف نہیں تھے گویا مذہب اور سائنس اکٹھے رہ سکتے ہیں!

معروف دانشور سید آفتاب احمد نے ڈاکٹر عبدالسلام کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ہاں سائنسی تعلیم پر کوئی توجہ ہی نہیں دی جاتی۔سائنسی تحقیقات پر کم سے کم رقم خرچ کی جاتی ہے۔ماڈرن دنیا میں سائنسی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو حل کرنے کے لئے ''پرابلم'' دی جاتی ہیں۔وہ اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور محنت کر کے اچھے نتائج حاصل کرتے ہیں۔ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں۔سرکاری الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ آزاد پرنٹ میڈیا میں بھی سائنسی موضوعات پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔انہوں نے کہا دنیا کے کوئز پروگراموں کا تقابل کریں، ان سے سائنسی معلومات میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔سارک کے کوئز مقابلوں میں انڈیا تو خیر ہمیشہ ہی اوّل آتا ہے، ہم اکثر سری لنکا سے بھی نیچے رہتے ہیں۔سائنس کے فروغ کے لئے ذرائع ابلاغ کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔اسے یہ رول ادا کرنا چاہئے۔

سید آفتاب شاہ نے کئی واقعات بنائے اور بتایا کہ فزکس کے نئے نصاب کے سلسلے میں ذوالفقار علی بھٹو نے ڈاکٹر عبدالسلام کو بلوایا۔

مگر پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار بالخصوص ایک سیاسی مذہبی جماعت کی طلبہ تنظیم نے انہیں بڑا پریشان کیا حتیٰ کہ ذوالفقار علی بھٹو بھی بے بس ہو گئے اور ان کا مرتب کردہ نصاب رائج نہ کر سکے۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا گورنمنٹ کالج لاہور میں کالج کی جوبلی کے حوالے سے تقریبات منعقد ہوئیں۔ ملک کے وزیر اعظم صدارت فرما رہے تھے۔ انہوں نے اس ادارے کے قابل فخر فرزندوں کے نام گنوائے لیکن وہ پاکستان کے واحد نوبل انعام سائنس دان کا نام گول کر گئے۔ جانے ڈاکٹر عبدالسلام ادارے کے لئے قابل فخر فرزند نہیں تھے یا وہ ساتھی مولویوں کے ڈر سے ان کا نام زبان پر نہ لا سکے۔ اس سے ملک میں جہالت پسندی کا اندازہ کر لیں۔ آخر میں خود کالم نگار نے عظیم سائنسدان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسلام تو لا اکراہ فی الدین اور لکم دینکم ولی دین کے فلسفے کی تبلیغ میں مذہبی رواداری کا سبق دیتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مورخین نے اسلام کو سیکولرازم سے بڑھ کر وسیع المشرب دین قرار دیا ہے۔ جس میں کوئی چھوت چھات نہیں۔ جمہوریت میں بھی عقائد کی بناء پر کسی تفریق اور شہریوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی گنجائش نہیں لیکن کتنے ظلم کی بات ہے کہ ملک کا ایک غریب دیہاتی بچہ جو دنیا میں آسمان عظمت پر ایک تارا بن کر چمکا اور اپنے وطن کا نام چار دانگ عالم میں روشن کیا۔ وہ اپنے وطن میں اجنبی رہا بلکہ اسے یوں احساس دلایا جاتا رہا کہ جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہے! ڈاکٹر عبدالسلام کی عظمت کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ لندن میں زیر علاج تھے کہ حکومت پاکستان کو بھی کسی نے توجہ دلائی تو انہیں سرکاری علاج کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی کہ وہ غریب پاکستانی عوام کے خون پسینے کی کمائی اور قومی وسائل کو اپنے ذات پر خرچ نہیں کر سکتے۔

یہ یاد رہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام نے نوبل انعام سمیت گراں قدر سارے انعامات کی رقوم پاکستان میں سائنس کی ترقی اور ترویج کے لئے وقف رکھیں۔ دنیا میں سائنسی اداروں کو قائم کیا۔ انہوں نے کوئی محل نہیں بنایا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مرتے نہیں بلکہ زندہ رہتے ہیں۔ (بشکریہ روزنامہ ''پاکستان'' لاہور یکم دسمبر 1996ء)

او بہشتی اے۔۔او جنتی اے

گورنمنٹ کالج کے مالی مکرم بابا سید صاحب کے حوالے سے گفتگو

(تحریر مکرم حافظ راشد جاوید صاحب)

کہتے ہیں کہ اکثر سائنسدان جذبات سے عاری، دنیا و مافیہا سے بے خبر، کائنات کے سربستہ رازوں کا سراغ لگانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ دنیا میں بھوک اور افلاس کا شکار تڑپتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ شاید یہ بات دوسرے سائنسدانوں کے بارے میں تو سچ ہو لیکن فزکس کا شہزادہ ڈاکٹر عبدالسلام ایک ایسی شخصیت تھے جن کے سینے میں انسانی ہمدردی سے لبریز ایک دل دھڑکتا تھا۔ ایک سلام وہ تھا جو دن رات لیبارٹریوں میں پارٹیکلز اور مادہ کی دنیا میں گم رہتا تھا۔ دوسرا سلام وہ تھا جو ترقی پذیر ممالک میں مصائب و الام کا شکار تڑپتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ ممالک بھی ترقی کریں تا کہ یہاں کے لوگ بھی سکھ کا سانس لے سکیں۔ ان کا خواب تھا صلح صفائی اور امن آشتی کا معاشرہ جہاں ہر طرف خوشحالی ہو۔ امن ہو۔ غریب بھی سکھ کا سانس لے سکے۔

جب بھی انہیں کوئی انسان دکھ میں مبتلا نظر آتا آپ مقدور بھر اس کی مدد کرتے۔ ان میں سے ایک گورنمنٹ کالج لاہور کا مالی بابا سید بھی تھا۔ بابا سید تو ڈاکٹر سلام صاحب کے نزدیک بہت ہی محترم تھا کیونکہ جب ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو بابا سید نے بھی ڈاکٹر سلام کا بہت خیال رکھا اور ڈاکٹر سلام صاحب بھی آخری عمر تک بابا سید کی مدد کرتے رہے۔ بابا سید تو اس وقت اس دار فانی سے کوچ کر چکا ہے لیکن جب ہم اس کی بیوہ اور بیٹے رونق علی سے ملے تو اس نے

ہمیں بتایا کہ میرے والد صاحب بتاتے ہوتے تھے کہ جب ڈاکٹر صاحب تعلیم کے حصول کے لئے گورنمنٹ کالج کے ہاسٹل میں مخدوم قیام پذیر تھے تو میرے والد صاحب وہاں مالی تھے اور ڈاکٹر صاحب کو ہاسٹل کا کھانا موافق نہیں آیا۔ اس لئے کچھ عرصہ میرے والد صاحب گھر سے کھانا پکوا کر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں دے آتے اور باقاعدگی سے ڈاکٹر صاحب کو دودھ اور مکھن وغیرہ بھی پہنچاتے رہتے۔

بابا سید کے ذمہ یہ بھی ڈیوٹی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر ڈاکٹر صاحب کا کمرہ باہر سے لاک کر دیتے تا کہ ڈاکٹر صاحب کو پڑھائی کے دوران کوئی ڈسٹرب نہ کرے اور پھر مقررہ وقت پر جا کر باہر سے کمرہ کھول دیتے۔ مہینہ کے آخر پر جب ڈاکٹر صاحب کے والد محترم تشریف لاتے وہ کھانے وغیرہ کے اخراجات کی ادائیگی فرما دیتے تھے۔ بعد میں جب میرے والد صاحب ریٹائرڈ ہوئے تو انہیں کوئی پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ نہیں ملا اور کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوا اور مزید یہ کہ ہمیں گورنمنٹ کالج کا مکان بھی خالی کرنے کا حکم مل گیا۔ والدہ نے پریشانی میں ڈاکٹر سلام صاحب کو خط لکھا۔ آپ نے فوراً جواب دیا کہ میرے جھنگ والے مکان میں شفٹ ہو جاؤ۔ اس پر میرے والد صاحب نے لکھا کہ میرے لئے لاہور چھوڑنا ممکن نہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اچھی خاصی رقم بھجوا دی اور اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا معمول رہا کہ وہ ہر مہینہ باقاعدگی سے کچھ رقم بھجواتے رہے اور یہ سلسلہ والد صاحب کی وفات تک جاری رہا اور بعد میں بھی گاہے بگاہے ہماری بھی مدد کرتے رہے۔

جب اس بارے میں بابا سید کی بوڑھی بیوہ سے پوچھا گیا تو اس کے منہ سے تو یہی چند فقرے بار بار سننے کو ملے پتر ''او بہشتی اے۔ او جنتی اے۔ او بہت نیک سی۔ اداں کوئی کسی دا خیال نئیں کر دا جناں انہیں ساڈا خیال کیتا۔''

یعنی وہ بہشتی تھا اور بہت نیک تھا۔ اس طرح کوئی کسی کا خیال نہیں کرتا جس طرح اس نے ہمارا خیال رکھا۔ میرے خاوند نے بہت لوگوں کی مدد کی لیکن کسی نے نیکی یاد نہیں رکھی سوائے ڈاکٹر صاحب کے۔ انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔

روحانی اقدار کے علمبردار ایک صوفی سائنسدان

محترم ڈاکٹر محمد عبدالسلام صاحب

تحریر: زینب محمود صاحبہ

انگریزی سے ترجمہ: محمد زکریا ورک صاحب

جھنگ کی کسان فیملی سے تعلق رکھنے والے اس شخص سے تو ہر کوئی واقفیت رکھتا ہے جو دنیا کے نامور سائنسدان کے طور پر مشہور ہوا۔ 1925ء میں جھنگ کے ایک معتبر شخص کو اس کی دعاؤں کے عوض خواب میں اس کی گود میں ایک بچہ رکھ دیا گیا۔ اس نے بچے کا نام پوچھا تو بتلایا گیا کہ اس کا نام عبدالسلام ہے۔ جمعہ 29 جنوری 1926ء کے روز اس کے ہاں ایک لڑکا تولد ہوا اور اس نے اس کا نام عبدالسلام ہی رکھا۔ کچھ سالوں بعد اس بزرگ شخص نے ایک اور خواب میں سلام کو درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ جب اس نے بچے کو خطرے سے آگاہ کیا تو سلام نے جواب دیا: ابا جان آپ متفکر ہرگز نہ ہوں مجھے خوب معلوم ہے میں کیا کر رہا ہوں یہ کہہ کر سلام درخت پر مزید چڑھتا گیا حتی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ کشف شائد اس غیر معمولی زندگی کے بارہ میں اشارے تھے جو اس بچہ کی قسمت میں مقدر تھی۔

سن بلوغت میں ہی سلام کی قوت ادراک نے اس کے والدین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سلام نے ابھی چلنا بھی نہیں شروع کیا تھا کہ اس کی والدہ نے اسے اخلاقی کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ اس نے ان کہانیوں کا ایک ایک لفظ حفظ کر لیا اور جب کبھی اس کی والدہ ان کہانیوں میں سے کوئی کہانی دوبارہ سنانا چاہتی تو سلام فوراً کہہ دیتا مجھے یہ کہانی خوب یاد ہے۔ سلام نے جب زندگی

کے چھٹے زینہ پر قدم رکھا تو اس کو سکول میں چوتھی جماعت میں داخل کیا گیا۔ جب وہ بارہ سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے میٹرک کا امتحان دیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن حاصل کر کے تمام پرانے ریکارڈ توڑ دیئے۔

سلام نے گورنمنٹ کالج لاہور میں گریجوائیٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے داخلہ لیا جہاں اسے راوی میگزین کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ جلد ہی وہ سٹوڈنٹ یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ چوتھے سال میں سلام نے (ہندوستان کے ممتاز ریاضی دان) سری نواس رامانوجن کے ریاضی کے ایک دقیق مسئلہ کا نہایت

بیرونی مخلوق سے رابطہ

اور اس کے نشانات میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش ہے اور جو اس نے ان دونوں میں چلنے پھرنے والے جاندار پھیلا دیئے ہیں اور وہ انہیں اکٹھا کرنے پر خوب قادر ہے جب وہ چاہے گا۔ (سورۃ الشوریٰ:30)

خوبصورت اور مختصر حل پیش کیا جسے اس سے قبل بڑے بڑے پروفیسر حل نہ کر سکے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں اس نے بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں پرانے تعلیمی ریکارڈ توڑ کر نئے ریکارڈ قائم کئے جن میں سے بعض ابھی تک قائم ہیں۔ اس کے بعد سلام نے کیمبرج میں ریاضی میں انڈر گریجوائیٹ پروگرام میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے درخواست دائر کر دی۔ اس کے والد ماجد غیر ملک میں اس کی تعلیم کے لئے مالی طور پر متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے اس دور کے حکومت پنجاب کے ریونیو منسٹر سر چھوٹو رام جو خود ایک کسان فیملی سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ فنڈز جو جنگ عظیم میں استعمال کے لئے اکٹھے کئے گئے تھے وہ اب کسان فیملیوں کے ہونہار طلباء کے کالرشپ کے لئے استعمال کئے جائیں۔

کیمبرج میں سلام کو احساس ہوا کہ اس کا علم دوسرے علوم کے بارہ میں قدرے محدود تھا، جس

کے بارہ میں رومی نے ایک نظم میں اشارہ کیا تھا یعنی کنویں کا مینڈک۔ چنانچہ اس نے یہاں بھوکے انسان کی طرح کتابوں کا مطالعہ مختلف موضوعات پر شروع کر دیا جیسے صوفی ازم، فلاسفی، سیاسی و مذہبی تاریخ، سوشل سائنس، مسلمان سائنسدانوں کے کارنامے، صوفیاء اور دوسرے سائنسدانوں کے حالات زندگی۔ اس چیز نے اس کو اپنی پسندیدہ فیلڈ میں کامیابی حاصل کرنے میں بہت مدد کی۔ نیز اس چیز نے اس کے اندر تاریخ اور روحانی زندگی کے بارہ میں زبردست احساس کو جنم دیا۔ ریاضی میں ٹرائی پوز کی ڈگری (جس میں اسے Wrangler کے ٹائٹل سے نوازا گیا تھا) جلد حاصل کرنے کے ساتھ اس نے فزکس کی تین سال کی ڈگری ایک سال میں حاصل کر لی۔ چونکہ اس کے تھیورٹیکل پیپرز اعلیٰ قابلیت کے تھے اس لئے اس کے پروفیسر نے اس سے عملی تجربات کے بارہ میں استفسار کرنا ضروری نہ جانا اور اسے فرسٹ کلاس کی ڈگری دے دی۔

سلام کے ایک پروفیسر سر فریڈرک ہوئیل (Hoyle) نے اس کے بارہ میں کہا تھا: "برے اوقات میں میرے لئے یہ کام زیادہ بوجھل نہ ہوتا تھا جب میں عبدالسلام جیسے طالب علم کے ساتھ (ریاضی کے) گھمبیر مسائل میں گم ہو جاتا تھا۔ بہ نسبت ایسے طلباء کے جو (کلاس) میں یوں ہی بیٹھے رہتے اور کھڑکی سے ہر دور فضا میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہوتے مؤخر الذکر طلباء کے ساتھ گویا انسان کو دو بھاری پتھر اونچائی کی طرف لے جانے ہوتے تھے ایک بھاری پتھر تو وہ ریاضی کا اصل مسئلہ ہوتا تھا اور دوسرا کند ذہن طالب علم کو وہ مسئلہ سمجھانا ہوتا تھا۔ عبدالسلام کے ساتھ انسان کو صرف ایک پتھر اونچائی کی طرف لے جانا ہوتا تھا کیونکہ وہ خود اس پتھر کو پوری قوت و استعداد کے ساتھ دھکیلتا تھا۔

سلام نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تھیوریٹیکل فزکس میں 1952ء میں حاصل کر لی۔ باوجود اس کے کہ اسے (کیمبرج میں) وظیفہ کی پیش کش کی گئی تھی اس نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے کام کو ترجیح دی۔ پروفیسر کیمر جو سلام کا ریسرچ سپروائزر تھا نے بالآخر سلام کو قائل کر لیا کہ وہ واپس

کیمبرج لوٹ آئے۔ پروفیسر موصوف کے مطابق: ”مجھے خوب احساس ہے کہ جب اسے لیکچرار کی ملازمت کی پیش کش کی گئی تو اپنے وطن کی خدمت کی ذمہ داری کے پیش نظر اس کے لئے اس کا قبول کرنا کافی مشکل تھا۔ میرے خیال میں چند ہی سالوں میں وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ایڈوانس سٹوڈنٹس دنیا بھر سے اس سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں گے اور وہ جلد ہی اپنا سکول آف تھیوریٹیکل فزکس قائم کر لے گا۔'' یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

1957ء میں سلام امپیریئل کالج میں سب سے چھوٹی عمر کا پروفیسر مقرر ہوا۔ سلام جس نے اپنی زندگی ایک دیہاتی بچے کے رنگ میں شروع کی تھی اور جس نے بجلی اس وقت دیکھی تھی جب وہ سولہ سال کا تھا کیمبرج آنے پر اس کا تعلق اس دور کے چند عظیم انسانوں سے قائم ہوا جیسے برٹنڈ ریسل۔ آئن سٹائین۔ آپن ہائمیر۔ وولف گانگ پالی۔ سے ایک ملاقات کے دوران سلام نے جب دیکھا کہ وہ کسی قدر خدا کی ہستی کے خلاف ہے تو سلام نے جواب دیا۔ خدا تعالیٰ پر ایمان کے بغیر انسان میں بعض بنیادی نقص پائے جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ وہ لوگ جو خدا پر یقین رکھتے ہیں ان میں قربانی دینے اور انسانیت کے لئے فائدہ مند کام کرنے کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو دہریہ ہوتے ہیں۔

آئین سٹائن کے ساتھ پہلی ملاقات میں دونوں نے مذہب پر تبادلہ خیال کیا، ڈاکٹر سلام نے اس کے سامنے اسلام کے نظریہ توحید کی وضاحت کی پھر اس کے بعد دونوں میں گہرے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ ڈاکٹر سلام کی روحانی اقدار اور صوفی ازم میں گہری دلچسپی ان کو دوسرے بڑے سائنسدانوں سے ممیز کرتی ہے۔ امپیریئل کالج میں جب انہوں نے سب سے پہلا لیکچر دیا تو اس کا آغاز قرآن پاک کی آیت کی تلاوت سے کیا تھا۔ آپ کے ایک شاگرد پروفیسر ایم جے ڈف (یونیورسٹی آف مشی گن) نے بیان کیا کہ ''ان کے لیکچر مسحور کن ہوتے تھے، ان کے خیالات میں مشرقی صوفی ازم کی چاشنی ہوتی تھی جو انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی کہ ان کی عبقریت

کی تہ تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر سلام کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے سائنسی آئیڈیاز کے لئے بطلیموس، برونو، گیلی لیو کے نظریات سے انسپریشن لیتے ہیں جنہوں نے کائنات کی ساخت اور ترتیب پر سوال اٹھائے اور پھر اس میں پوشیدہ کارفرما عوام کو دریافت کیا۔ انہوں نے بیان کیا کہ سائنسدان کے کئی روپ ہوتے ہیں جیسے صوفی، آرٹسٹ یا دریافت کرنے والا، یہی وہ علمی وفنی روایتیں ہیں جنہیں بنیاد بنا کر (سائنسدان) اپنے سائنسی علم کو ایڈوانس کرتا ہے۔

پاکستان کے لئے خدمات

جنرل محمد ایوب خاں (سابق صدر پاکستان) کے سائنسی ایڈوائزر کے طور پر انہوں نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر اشفاق (ڈائریکٹر پی اے ای سی 1998ء) پرانے ایام کی یاد تازہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: ''اس بات کا سہرا ڈاکٹر سلام کے سر پر ہے کہ انہوں نے پانچ صد فزے سسٹ، ریاضی دانوں اور سائنسدانوں کے لئے ڈاکٹریٹ کرنے کا انتظام برطانیہ اور امریکہ کے بہترین تعلیمی اداروں میں کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان میں سائنٹیفک پلیٹ فارم بنانے کے لئے دن رات پوری دل لگی سے کام کیا۔ انہوں نے پاکستان کو پیش نظر مسائل پر اظہار خیال کیا اور ان مسائل کا عملی حل بھی پیش کیا۔ 1961ء میں ڈھاکہ میں ہونے والی آل پاکستان سائنس کانفرنس میں انہوں نے غربت اور ناخواندگی تھرڈ ورلڈ میں ختم کرنے کے بارہ میں ٹھوس تجاویز پیش کیں۔ انہوں نے شہریوں اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ سائنٹیفک سیکٹر کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان سے غربت ایک نسل کی مدت کے اندر اندر ختم کی جا سکتی ہے اگر حکومت اس ضمن میں ٹھوس کمٹ مینٹ کرے۔ انہوں نے قرآن پاک کا حوالہ دیا کہ خدا کی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس کو اپنی حال کو بدلنے کی فکر دامنگیر نہ ہو۔

پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ((Pinstech سینٹر فار نیوکلیئر ریسرچ (اسلام

آباد)اور سپارکو(Suparco) کے قیام کے پیچھے بھی آپ کا ہاتھ کارفرما تھا۔انہوں نے پنجاب میں سیم اورتھور کاحل محنت شاقہ کے ساتھ تلاش کیا جو پاکستان میں زراعت کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔سلام نے اس سنگین مسئلہ پر بہت سارے مضامین لکھے جو امریکہ کی کانگریس میں پیش کئے گئے تھے۔سلام کی درخواست پر امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے امریکی ماہرین زراعت کی ایک ٹیم پاکستان بھیجی جن کی محنت شاقہ اور حکمت عملی سے (پنجاب میں) لاکھوں ایکٹر زرعی زمین ضائع ہونے سے بچ گئی۔

ڈاکٹرسلام نے دن رات نہایت جاں فشانی سے پوری لگن سے کام کیا کہ کسی طرح فزکس کاانسٹی ٹیوٹ کسی ملک میں قائم کرسکیں۔جیسا کہ لوگ جانتے ہیں پاکستان نے اس ضمن میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا بلکہ اس دور کے فنانس منسٹر مسٹرمحمدشعیب نے صدرایوب خان کومشورہ دیا کہ پروفیسر موصوف سائنسدانوں کے لئے فائیوسٹار ہوٹل کھولنا چاہتے ہیں۔ڈاکٹرسلام نے دل برداشتہ ہوکرکئی ایک یورپی ممالک سے رابطہ قائم کیا۔بالآخرایسا سینٹر(انٹرنیشل سینٹرفارتھیوریٹیکل فزکس) 1964ء میں اٹلی میں قائم ہوگیا۔سلام اس سینٹر کے تیس سال تک ڈائریکٹر رہے جس سے ترقی پذیر ممالک اورترقی یافتہ ممالک کے درمیان سائنس کا ایک پل قائم ہوگیا۔سائنس رائیٹررابرٹ وال گیٹ نے ڈاکٹرسلام کے بارہ میں کہا تھا’’وہ ایک ایسا انسان ہے جس پر وقت لاگونہیں ہوتا،وہ دودنیاؤں اوردو سائنسی پرابلم میں بٹا ہواہے،یہ دنیاکے لئےنقصان ہے کہ وہ دوزندگیاں نہیں پاسکتا۔‘‘

1979ءمیں ڈاکٹرسلام نے گرینڈ یونفیکیشن تھیوری میں عالی شان ریسرچ کرکےفزکس کانوبیل انعام جیت لیا۔اس تھیوری کے لئے ان کوانسپریشن ان کے مذہبی عقیدہ سے ملی کہ(فطرت کی تمام) قوتیں ایک ہی منبع سے نمود پذیر ہوتی ہیں۔(لندن میں)اپنے گھر میں جب وہ گھنٹوں سائنسی ریسرچ میں مصروف ہوتے تھےتو ساتھ میں مطالعہ کے کمرے کے اندر نعت یاقرآن پاک کی تلاوت ٹیپ پر لگی ہوئی تھی۔نوبیل انعام وصول کرنے کی شاہی رسم کے موقعہ پرسلام نے اپنا

قومی لباس زیب تن کیا ہوا تھا یعنی شیروانی، پگڑی اور کھسہ (پنجابی جوتا)۔اس موقعہ پر سلام نے اپنی تقریر کا آغاز تلاوت قرآن پاک کی آیات سے کیا:

نوبیل انعام جیتنے کے بعد سلام نے وطن عزیز کا دورہ کیا۔ایک موقعہ پر وہ ڈاکٹر عثمانی کے ہمراہ (کار) میں سفر کر رہے تھے تو سلام نے کہا کہ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور جانا ہے۔ڈاکٹر عثمانی نے جواب دیا کہ اس وقت کالج میں تعطیلات ہیں اس لئے وہاں کوئی بھی نہ ہوگا۔ڈاکٹر سلام نے کہا: جس شخص سے مجھے ملنا ہے وہ شرطیہ طور پر وہاں ہوگا۔جب ان کی کار کالج کے قریب چند ورکرز کے پاس پہنچی تو ڈاکٹر سلام کار سے نکلے،ایک ملازم سے مصافحہ کر کے اسے سینے سے لگایا۔ڈاکٹر عثمانی نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ کون ہے؟ ڈاکٹر سلام کے کہ اس محترم کا نام سیداں ہے جو نیو ہوسٹل کی کھانے کی میس میں سرونٹ ہے۔جب میں یہاں طالب علم تھا وہ میرے کہنے پر میرے ہوسٹل کے کمرہ کو باہر سے تالا لگا دیا کرتا تھا اور میرا کھانا مجھے کھڑکی کے راستہ دیا کرتا تھا۔

اساتذہ کا احترام

جن لوگوں نے ڈاکٹر سلام کو ان کی زندگی میں کسی بھی رنگ میں مدد کی تھی انہوں نے ان کو کبھی فراموش نہ کیا۔جب وہ کیمبرج میں لیکچرار تھے تو وہ مفلس یا ریٹائرڈ ہونے والے اپنے اساتذہ کو امدادی رقم بھجوایا کرتے تھے۔وہ تمام اساتذہ کو عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔جب وہ بھارت کے سرکاری دورہ پر گئے تو انہوں نے تاکید کی کہ ان کے تمام ہندو اور سکھ اساتذہ جو ہجرت کر کے وہاں آباد ہو گئے تھے ان کو ایسے تمام فنکشن میں مدعو کیا جائے جو ان کی عزت افزائی کے لئے ترتیب دئے گئے تھے۔ڈاکٹر سلام کو 274 ایوارڈ، ڈگریاں اور انعامات دیئے گئے تھے جن میں اکثر کے ہمراہ خطیر رقم کے کیش ایوارڈ بھی ہوتے تھے۔انہوں نے انعامات میں ملنے والی تمام رقوم سے مستحق طلباء کے لئے سکالرشپ شروع کیا تا اس سے نادار افراد کی مدد کی جا سکے۔

بھارت کے دورہ کے دوران ان کا استقبال ہیرو کے طور پر کیا گیا۔(وزیر اعظم) اندرا گاندھی

پر آپ کے رعب وجلال کا اس قدر اثر تھا کہ اس نے آپ کے برابر بیٹھنے سے انکار کر دیا بلکہ آپ کے قدموں میں فرش پر بیٹھی رہی۔ انڈیا میں جب طلباء نے آپ سے سوال کیا کہ نوبیل انعام ملنے کے بعد آپ میں کیا تبدیلی آئی ہے تو آپ نے جواب دیا: ”سب سے بڑی تبدیلی تو یہ آئی ہے کہ اب میں ان (ذی اثر) لوگوں سے مل سکتا ہوں جن سے میں ملنا چاہتا تھا، اور اب ان کی مدد سے اور خدائے تعالیٰ کی مہربانی سے میں اب تھرڈ ورلڈ کے بہت سارے ابھرتے ہوئے سائنسدانوں کی مدد کر سکتا ہوں۔ اس کے ماسوا میرے لئے نوبیل انعام کوئی وقعت نہیں رکھتا۔“

1988ء میں آپ کو لاہور میں فیض میموریل لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا۔ اس تقریر کے متن سے آپ کی منکسر المزاجی اور فطری حجاب کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ آپ نے تسلیم کیا کہ فیض احمد فیض جو عشق اور حسن کی دنیا میں رہتا تھا اور جو اس کے ماحول میں چھایا ہوا تھا، اس کے مقابلہ میں میں جو خشک ہے رنگین ایٹم کی دنیا کا مکین ہوں بہت کم تر انسان ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید کا آٹھواں حصہ مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ تفکر و تدبر کو اوڑھنا بچھونا بنائیں، سوال اٹھائیں اور فطرت کی قوتوں کو انسانیت کے فائدہ کے لئے مسخر کریں۔ آپ نے فرمایا کہ فیض ایک ایسا جلیل القدر انسان تھا جس نے اس چیلنج کو قبول کیا ہے۔ جیسا کہ ہر مومن کو کرنا چاہئے۔ آپ نے روحانی شاعری اور سائنس میں مطابقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ کس طرح دونوں ایک ہی نصب العین کی طرف لے جاتے ہیں تا خدائے کریم کی پیدا کردہ فطرت کے رازوں سے پردے اٹھائے جا سکیں۔ نیز شاعر اور سائنسدان دونوں کسی طرح اسی منبع سے وجدان پاتے ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ فیض اور مجھ میں ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ ہم دونوں اپنے ہی وطن میں نا قابل قبول انسان مانے جاتے ہیں۔

زندگی کا آخری حصہ جو آپ نے زیادہ تر برطانیہ میں گزارا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ پاکستان آنے سے کیوں کتراتے ہیں؟ آپ نے اس کا نہایت سیدھا سادا، ایمان دارانہ جواب یہ

دیا کہ یہ پاکستان ہے جو مجھے واپس لینے میں کنی کتراتا ہے۔ڈاکٹر سلام کو کئی ممالک کی طرف سے شہریت کی پیش کش کی گئی ،بشمول کویت اور اردن کے،ان ممالک نے بلکہ ان کو یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل کے لئے نامزد کرنے کا بھی کہا۔(وزیراعظم) جواہر لال نہرو نے آپ کو دعوت دی کہ آپ بے شک اپنی طے شدہ شرائط پر ہمارے ملک میں ہجرت کر آئیں ہمیں تمام شرائط منظور ہوں گی۔جب برطانیہ کی حکومت نے آپ کو مطلع کیا کہ کوئین ایلزبتھ آپ کو سر کا خطاب دینا چاہتی ہے تو آپ نے اس خطاب یعنی KBE (Knight Commander of British Empire) کو لینے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ صرف برطانوی شہریت رکھنے والوں کو دیا جاتا ہے۔(تاہم آپ کو اعزازی سر کا خطاب دیا گیا تھا،مترجم)۔ڈاکٹر سلام تمام زندگی پاکستان کے معزز شہری رہے اور تن تنہا وطن عزیز کے لئے (علمی) جنگوں میں برسر پیکار رہے۔

پاکستان کے ایٹمی ادارہ PAEC کے سابق چیئرمین ڈاکٹر منیر احمد خاں نے نومبر 1997ء میں ڈاکٹر سلام کی وفات کے ایک سال بعد مندرجہ ذیل مدحیہ الفاظ کہے:''ہم پاکستانی چاہیں تو ڈاکٹر سلام کو فراموش کر دیں مگر دنیا ہمیشہ ڈاکٹر سلام کو یاد رکھے گی۔'' مشہور زمانہ صحافی جمیل الدین عالی نے ایک دفعہ اخبار میں مضمون لکھا جس کا عنوان کچھ یوں تھا مشرق کے دو نا کام ہیرو پوری دنیا میں امام مانے جاتے ہیں ۔ یہاں اس کا اشارہ ڈاکٹر سلام اور مدر ٹریسا کی طرف تھا۔ مدر ٹریسا کو عنقریب سینٹ ہوڈ کا لقب دے دیا جائے گا۔اگر چہ پوری دنیا میں ڈاکٹر سلام کی یاد میں تزک و احتشام سے جلسے منعقد کئے جاتے ہیں،ان کے اپنے ملک میں ان کی عزت وعصمت تعصب اور بے پرواہی کے دبیز پردوں کے نیچے مدفون ہے۔ان کا نام سکول کی ٹیکسٹ بکس ، اہم کتابوں اور معروف رسالوں سے خارج کیا جا چکا ہے۔یہ بلاشبہ ہمارا اپنا ہی نقصان ہے۔ (دی فرائیڈے ٹائمز لاہور 19 نومبر 2004ء)(روزنامہ الفضل 3 اگست 2005ء)

ڈاکٹر عبدالسلام کی ادبی خدمات

عمران اختر

بعض لوگ اپنے انفرادی تجربات، مشاہدات، فکر اور حکمت عملی سے تہذیب انسانی اور تاریخ کا رخ موڑ دینے کی خداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ عقل و وجدان کی فطری استعداد کو نئے نئے زاویوں سے استعمال کر کے نئے جہان پیدا کرتے ہیں اور ایسے ہی افراد مہذب دنیا کو نئے معنی و مفہوم عطا کرتے ہیں۔ وقت کا مزاج ضروریات کے بدل جانے سے تشکیل پاتا ہے۔ مہذب دنیا کے یہ انفرادیت پسند لوگ دنیا کی بے ثباتی اور محرکات کو مثبت انداز میں اپنی فکر کے سانچے میں ڈھال کر جہد مسلسل اور تعمیر نو کا عزم کرتے ہوئے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ آج کا انسان شاید تقسیم در تقسیم ہوتا ہوا اپنی ہی ذات اور صفات کے خانوں میں بٹ سا گیا ہے۔ جیسے سائنسدان، ادیب، دانشور اور فلسفی وغیرہ۔ تاہم اس قسم کے خیالات کے باوجود بھی ہر شخص اس کائنات میں اپنا ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ تقسیم کی اس دنیا میں ایک سائنسدان ادیب کی شخصیت کو ناکارہ سمجھتا ہے جبکہ ادیب سائنسدان کو خشک اور سنگلاخ چٹان......نازک احساسات و خیالات سے قطعاً عاری۔

بیسویں صدی میں بالخصوص سائنس کے شعبے نے محیر العقول ترقی کی اور تمام تر روایات و اقدار کے انداز ہی بدل کر رکھ دیئے۔ سائنسی ایجادات، ٹیکنالوجی، خلا کی تسخیر اور کمپیوٹر کی دنیا میں تیز رفتار ترقی نے پوری دنیا کو محو حیرت کر دیا۔ اس مشینی دنیا نے نہ صرف ہماری فکر کے سبھی زاویوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے پر اصرار کیا بلکہ اس حیرت انگیز اور ہمہ جہت ترقی کے سبب ہماری تخلیقی صلاحیت اور ادب کی ترویج و اشاعت بھی بری طرح سے متاثر ہوئی۔ ادب اور سائنس زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ادب کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے اور فکر و خیال سائنس اور ادب

دونوں کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں ہمارے ذاتی میلانات، معاشرتی وسماجی زندگی کے ارتعاش، زندگی میں درآنے والے نشیب وفراز ہماری انفرادی بلکہ اجتماعی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں وہیں ہماری سوچ اور سائنس اور ادب سے متعلق شعوری کوششیں بھی ہماری قومی زندگی کا مزاج بدلنے پر مجبور دکھائی دیتی ہیں۔

سائنس کا ادب سے گہرا تعلق بنیادی طور پر انسانی زندگی کو درپیش چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے شعور عطا کرتا ہے جبکہ یہی شعور اور احساس آگہی دراصل انسانیت کی معراج بھی ہے۔ سائنس کا تعلق بنیادی طور پر سچائی کو پرکھنے اور حقائق کو جانچنے سے ہمارے سامنے آتا ہے جبکہ ادب مواد اور ہیئت کے امتزاج اور اس کو شعور سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتا ہے۔ ادبی اقدار وروایات کا براہ راست تعلق مواد کی نوعیت اور ہیت کے خاص معائر سے ہماری زندگی میں آگہی کی نئی دنیا کو جنم دیتا ہے جبکہ اس کے برعکس سائنسی تجربات ومشاہدات کی دنیا میں فرد کی انفرادی ذہنی تربیت اور عہد بہ عہد ہونیوالی تبدیلیوں میں مثبت پیش رفت کا امکان بھی سائنس ہی کے مرہون منت ہے۔ یہی امکانات ہمارے عہد کے ادیبوں اور تخلیق کاروں کو فکر وخیال کی نئی جہت سے آشنا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ یہ کائنات ہر لمحہ اور ہر لحظہ تغیر پذیر ہے جبکہ نئے نئے خیالات وتصورات کا نمو پانا بھی ایک فطری عمل ہے اور یہی فطری عمل اس کے تہذیبی ارتقا اور بقا کا ضامن بھی ہے۔ زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ سائنسی طرز فکر اور مربوط وہم آہنگ تخلیقی شعور کو از سر نو دریافت کیا جائے تاکہ ادب اور سائنس میں اشتراک عمل کا جو فقدان کئی صدیوں سے چلا آرہا ہے اس کو مثبت اور منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ سائنسی حقائق کا ادراک ہماری ادبی تخلیقات میں بھی زندگی کی حقیقی معنویت اجاگر کررہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ادب میں سائنسی رجحانات کا نمو پانا بھی یقیناً ہماری تخلیقات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور منطقی انداز فکر اپنانے میں معاون وحلیف کا کردار ادا کر رہا ہے۔ سائنس اور ادب کا ادراک ہر ذی شعور کی فکر میں شامل ہے جبکہ شکر وخیال اور جذبات واحساسات کی ہم آہنگی

ادبی رجحانات کو سائنسی فکر میں اس طرح مدغم کر دیتی ہے کہ سائنس اور ادب یا ہم یکجا ہو کر رہ جاتے ہیں جبکہ اس کا سبب وہ چند غیر معمولی شخصیات ہی ہوتی ہیں جنہوں نے اس دنیا کی نئے سرے سے تشکیل کرنے میں اپنا بنیادی کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ایسی ہی بلند پایہ شخصیات میں سے ایک منفرد نام پروفیسر عبد السلام کا ہے جو نہ صرف تیسری دنیا کے انسانوں کے واحد نمائندے کے طور پر پہچانے جاتے ہیں بلکہ وہ نوع انسانی کو دائمی زندگی بہم پہنچانے میں علم ،فکر، کردار قربانی اور خلوص انسانیت جیسے اوصاف سے بھی متصف ہیں۔ڈاکٹر عبد السلام نہ صرف ایک صرف ایک طبیعیات دان تھے بلکہ وہ ایک ایسے ادارے کی حیثیت رکھتے تھے جس نے مشرقی اقوام کو مغرب کی سائنسی دنیا میں سائنسی تحقیق ، تجربے اور سائنسی منظر نامے میں متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔انہوں نے برصغیر اور خصوصاً ترقی پذیر مما لک کے سائنسدانوں اور مفکروں کو ایک نئے سائنسی ماحول میں سانس لینے کا جواز فراہم کیا۔

احوال وآثار

’’پاکستان کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنسدان ڈاکٹر عبد السلام 29 جنوری 1926ء کو اپنے ننھیال موضع سنتوک داس ضلع ساہیوال میں پیدا ہوئے۔‘‘

آپ کی پیدائش بمطابق ہجری کیلنڈر 1344 ہجری بمقام جھنگ عمل میں آئی۔ جھنگ (2) پانچ دریاؤں کی سرزمین (پنجاب) میں شامل ایک تاریخی ضلع ہے۔اس ضلع کو پنجاب کی تاریخ، ثقافت، زبان، تہذیبی اور ادبی پس منظر میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ڈاکٹر عبد السلام کا بچپن لڑکپن اور شباب اسی شہر میں گزرا۔ان کو نوبل انعام ملنے کے بعد 'جھنگ' شہر کی شہرت میں قابل قدر اضافہ ہوا اور پوری دنیا میں اس شہر کے چرچے ہونے لگے۔اسی شہر سے آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ڈاکٹر عبد السلام کی پیدائش بھی اسی شہر میں آبائی گھر ’’فاروقیہ‘‘ جھنگ میں ہوئی۔

ڈاکٹر عبد السلام کے جد امجد ایک ہندو راجپوت خاندان کے شہزادے تھے اور ’’بڈھن‘‘ نام

سے پہچانے جاتے تھے۔آپ کے دادا کا نام میاں ''گل محمد'' تھا، جو پیشہ کے لحاظ سے طبیب تھے جبکہ دادی کا نام ''بھاگ بھری'' تھا جو بہت نیک سیرت اور گھریلو خاتون تھیں۔آپ کے نانا کا نام ''نبی بخش'' تھا جو پیشہ کے لحاظ سے پٹواری تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران وہ ضلع امرتسر اور ساہیوال میں بھی تعینات رہے تھے۔ بعدازاں ساہیوال ضلع میں ''سنتوک داس'' اور ''بصیر پور'' میں بھی کچھ عرصہ تعینات رہے۔آپ کے والد ماجد چوہدری محمد حسین (3) 2 ستمبر 1891ء کو پیدا ہوئے۔ چوہدری محمد حسین نے جھنگ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈیرہ غازی خان کا رخ کیا، جبکہ ان کے بڑے بھائی چوہدری غلام حسین اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کی حیثیت سے وہاں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ چوہدری محمد حسین نے 1913ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز 1920ء میں بطور انگلش ٹیچر ایک عارضی آسامی سے کیا۔ یہ سکول جھنگ کے نواح میں واقع تھا۔ وہاں آپ نویں جماعت کے طلبا کے لیے بطور سائنس اور انگلش ٹیچر کے تعینات رہے۔ چوہدری محمد حسین نے پہلی ملازمت گورنمنٹ ہائی سکول جھنگ میں بطور ٹیچر کی، پھر کچھ عرصہ بعد انہیں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز جھنگ میں مستقل ملازمت مل گئی۔ چند سال کے بعد آپ کو بحیثیت ہیڈ کلرک انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن تعینات کر دیا گیا۔آپ نے 2 جنوری 1941ء کو ضلع ملتان میں اپنا چارج سنبھالا۔ چوہدری محمد حسین نے پہلی شادی ''سعیدہ بیگم'' نامی خاتون سے کی۔ان کی وفات کے بعد دوسری شادی 12 مئی 1925ء کو ہاجرہ بیگم (والدہ ڈاکٹر عبدالسلام) سے انجام پائی۔ ہاجرہ بیگم ایک مذہبی اور دین دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ ایک قناعت پسند اور صوم وصلوٰۃ کی پابند خاتون تھیں۔آپ کے خاندانی پس منظر کا جگجیت سنگھ نے اپنی کتاب میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس ضمن میں وہ کہتا ہے:

''سلام کی فیملی کا دعویٰ ہے کہ انکا کوئی جد امجد بادشاہ یعنی سادہ بڈھن جو راجپوتانہ سے تھا۔ اس نے 1160ء کے قریب اسلام قبول کر کے جھنگ میں رہائش اختیار کر لی۔ تاہم بیسویں صدی

کے پہلے نصف تک سلام کی فیملی جو اس کے والدین، چھ بھائیوں اور ایک بہن پر مشتمل تھی، ایک دو کمروں والے مکان میں عاجزانہ رنگ میں سکونت پذیر تھی۔ یہاں بجلی یا پینے کے پانی کی سہولیات میسر نہ تھیں۔ موسم گرما کے ایام میں وہ رات کو مکان کی چھت پر سوتے تھے۔ اس کی بہن حمیدہ کو تیرہ برس کی عمر میں سکول چھوڑنا پڑا تا کہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی نگہداشت کر سکے۔[2]

ڈاکٹر عبدالسلام کی بیٹی ڈاکٹر عزیزہ رحمٰن کے خط سے اقتباس ملاحظہ ہو، جوان کی زندگی کی تمام کامیابیوں کا امین ہے۔ ان کی کہانی اس روز سے شروع ہوئی جب ہمارے دادا نے اپنے بیٹے کی پیدائش سے پہلے ایک کشف دیکھا تھا۔ 2 جون 1925ء کے دن مسجد احمدیہ جھنگ شہر میں مغرب کی نماز ادا کرتے ہوئے وہ قرآن مجید کی یہ دعا پڑھ رہے تھے: ''............ اے ہمارے رب العزت ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کو ہمارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور ہمیں متقیوں کے لیے راہنما بنا۔'' .... (75:25) تو عین عالم بیدار میں انہیں ایک لڑکا پکڑا یا گیا۔ دریافت کرنے پر انہیں اس کا نام عبدالسلام بتایا گیا۔ چنانچہ عبدالسلام 29 جنوری 1926ء کو سنتو کھ داس ضلع منٹگمری (ساہیوال) میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے[3]

عبدالحمید چوہدری (1) (برادر اصغر ڈاکٹر عبدالسلام) کے مطابق:

''بھائی جان ضلع منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے ایک گاؤں سنتوک داس میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے نانا حضرت حافظ نبی بخش صاحب وہاں محکمہ مال میں پٹواری تھے۔ منٹگمری (ساہیوال) سے پاکپتن جاتے ہوئے ملکہ ہانس سے ایک سڑک ہیڈ سلیمانکی کو جاتی ہے۔ سنتوک داس اسی سڑک پر حویلی لکھا سے قریباً آٹھ، نومیل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وارث شاہ نے مشہور رومانی داستان ہیر وارث شاہ ملکہ ہانس کی ایک مسجد کے حجرہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہیر کا تعلق بھی جھنگ سے تھا۔ بھائی جان کی پیدائش کے چالیس روز بعد والدہ جھنگ واپس آئیں۔ بھائی جان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی جھنگ شہر جو ہمارا آبائی وطن ہے میں گزری

[4]۔

رسمی وغیر رسمی تعلیم میں والدین کی دلچسپی

آپ کی والدہ آپ سے بے حد محبت کرتی تھیں، وہ ایک پرہیز گار اور متقی خاتون تھیں۔ انہوں نے بھی عبدالسلام کی پرورش میں اپنے شوہر کی طرح انتہائی سنجیدگی سے کام لیا۔ جگجیت سنگھ لکھتے ہیں کہ:

"His mother begain teaching him the three R's and soon discovered that her son was a Hafiz in making--able to recite from memory, fairy tales, adventure stories, episodes of Islamic history, and even verses of the Holy Quran. He was an infant prodigy "[5]

ڈاکٹر عبدالسلام نے قناعت پسندی، صلہ رحمی اور عفو درگزر کے اوصاف حمیدہ اپنی والدہ سے ہی سیکھے۔ عبدالسلام کو چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا، ان کا حافظہ بہت زیادہ تیز تھا۔ اس کم عمری میں بھی ان کو چالیس تک پہاڑے زبانی یاد تھے۔ اس کے علاوہ مضامین، تاریخی اقوال اور دیگر تاریخ سے متعلق سوالات بھی از بر یاد ہوتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی بچپن میں تعلیم کی جانب بے پناہ رغبت اور انتہائی دلچسپی سے متعلق ان کے بھائی کا کہنا ہے کہ:

''عزیز کی والدہ نے خدا تعالیٰ کا نام لے کر 'ا۔ب' شروع کرائی۔ اللہ کریم کا فضل تھا عزیز شوق سے پڑھتا تھا اور وہ بھی اسے باقاعدگی کے ساتھ پڑھاتی تھیں۔ بچپن میں میں نے آسان کہانیوں کی اردو کتابیں اس کے سامنے رکھیں۔ رسالے اردو میرے پاس آتے تھے جو عزیز کو پڑھنے کے لیے دیے جاتے۔ روزانہ دلچسپ کہانیاں عزیز کو سنائی جاتیں۔ عزیز جب روزانہ نئی سے نئی کہانیاں سنتا تو آخر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ کہانی تو مجھے آتی ہے اس پر اور نئی کہانیاں تلاش کی جاتیں اور عزیز کے علم کو بڑھایا جاتا۔[4]

ایم بی مڈل سکول (جھنگ) ان کے گھر سے قریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے جہاں سے آپ کی

تدریسی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔آپ کو ساڑھے چھ برس کی عمر میں ایم بی ایس مڈل اسکول جھنگ میں داخل کرایا گیا۔ان کی ابتدائی تعلیم کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایم بی ایس مڈل سکول جھنگ کے ہیڈ ماسٹر ایک نفیس انسان تھے مگر سکول میں داخلہ لینے کے لیے کچھ اصول طے تھے۔اس لیے ہیڈ ماسٹر عبدالسلام کو دیکھتے ہی کہنے لگے بیٹے ابھی تمہاری عمر کھیلنے کی ہے جب تم چھ سال کے ہو جاؤ گے تو تم سکول آ جانا............دو سال بعد عبدالسلام کو اس کے والد MBS مڈل سکول دوبارہ لے گئے۔ہیڈ ماسٹر نے عبدالسلام کا انٹرویو کیا اور چوہدری صاحب سے کہا کہ ماشااللہ ان کا لڑکا ذہین ہے میں اس لڑکے کو چوتھی کلاس میں داخلہ دونگا، وہاں پر لڑکوں کی عمر نو سال ہے۔عبدالسلام کو اس رویے پر بہت حوصلہ ملا۔[7]

ڈاکٹر عبدالسلام نے عام لڑکوں کی طرح ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ان کی ان کامیابیوں کا تسلسل زندگی بھر جاری رہا۔آپ کی ابتدائی زندگی کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"He decided to name him 'Abdus Salam' (Servent of Peace) before he was born. Due to the fulfilment of his vision, Mohammad Hussain became inordinately fond of the new born baby. He tended him with such care and solicitude that Salam won his first prize at the age of two, as the healthiest and most beautiful baby in Jhang town. By the time he was four, he began to show a real penchant for reading, writing, counting and even calculating.[A]

چوہدری محمد حسین اپنے بیٹے ڈاکٹر عبدالسلام کے لیے ان کی پیدائش کے بعد ہی سے بہت زیادہ فکر مند رہتے تھے۔جیسے جیسے عبدالسلام کی عمر بڑھتی گئی، بیٹے کی تعلیم وتربیت کا مسئلہ ان کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرتا چلا گیا۔جب بھی وہ کسی امتحان میں کامیاب ہوتے تو ان کے والد اپنے دوستوں سے ان کے مستقبل کے بارے میں تفصیلی مشورہ کرتے تاکہ وہ زندگی میں درپیش ہر

قسم کی مشکل گھڑی سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت حاصل کر سکیں۔ اب چند خطوط سے اقتباسات جو چوہدری محمد حسین نے اپنے دوستوں کو لکھے اور ان کے جوابات کے آئینے میں ڈاکٹر عبدالسلام کے آئندہ تعلیمی کیئر یر کا تفصیلی حال بھی ان خطوط میں موجود ہے۔ 13 اگست 1942ء کو لکھا گیا جوابی خط بہ طرف حافظ عبدالمجید بہ جانب چوہدری محمد حسین اس خط میں عبدالمجید لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کے صاحبزادے عبدالسلام نے انٹرنس اور انٹرمیڈیٹ میں اس قدر شاندار کامیابی حاصل کی ہے .... ایف اے میں میرے مضامین عربی، سائنس، بی۔ اے، ریاضی کے دونوں کورس اور انگریزی آنرز تھے۔ ایم۔ اے میں ریاضی کا طالب علم تھا۔ میرے خیال میں آپ کے صاحبزادے کو بھی یہی مضامین لینے چاہیں ....اگر آپ اپنے لڑکے کو لاہور کے گورنمنٹ کالج میں بھیج سکیں تو اس کے لیے بہتر ہوگا۔ مگر ملتان کے کالج میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے کسی مزید بات پر مشورہ لینا ہو تو میں حاضر ہوں۔ میرے لیے یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ مجھے ایسے ہونہار لڑکے کا علم ہو گیا ہے۔[9]

تعلیم و تربیت اور انعامات

ڈاکٹر عبدالسلام نے مارچ 1934ء میں ایم بی مڈل سکول (جھنگ) میں چوتھی کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ 1938ء میں پورے جھنگ ڈسٹرکٹ میں 700 میں سے 591 حاصل کر کے اوّل پوزیشن پر رہے۔ 1938ء میں ہی ایک نمائش میں تصویری البم پر دو روپے کا انعام بھی جیتا جبکہ آٹھویں کلاس میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کرنے پر ان کا ماہانہ وظیفہ 6 روپے مقرر ہوا۔ ڈاکٹر عبد السلام نے آٹھویں جماعت تک تعلیم گورنمنٹ مڈل سکول جھنگ سے حاصل کی (جو آج کل گورنمنٹ ہائی سکول کا درجہ حاصل کر چکا ہے)۔ 1938ء میں ہائی کلاسز میں داخلہ کے لیے گورنمنٹ کالج جھنگ کا رخ کیا۔ (یہ وہ وقت تھا جب کالج کی سطح پر نویں دسویں اور انٹرمیڈیٹ تک کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں)۔ آپ نے 1940ء میں میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پہلی

پوزیشن میں پاس کیا اور اسی کالج سے آپ نے 1942ء انٹرمیڈیٹ بھی اعلیٰ اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کے والدین نے آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور بھیج دیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آپ نے انتہائی محنت اور لگن سے پڑھائی کی اور 1944ء میں ریاضی کے ساتھ B.Sc کیا اور اس مرتبہ بھی آپ نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 1946ء میں M.Sc ریاضی کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں 95٪ نمبر لے کر اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی جبکہ 1945ء میں آپ نے M.Sc فزکس بھی کیا اور پنجاب بھر میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر صرف 20 برس تھی گویا آپ ابتدائی عمر سے ہی انتہائی ذہین اور اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ پہلی جماعت سے لے کر M.Sc تک تمام سابقہ ریکارڈ توڑ ڈالے۔ آپ کی اس ذہانت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے گورنمنٹ آف پنجاب کی جانب سے آپ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے (کیمبرج یونیورسٹی) سکالرشپ عطا کیا گیا۔ بی اے میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام اعلیٰ ترین نمبر حاصل کر کے نئے ریکارڈ بنائے اور بی اے کے ہر مضمون میں انہوں نے انفرادی طور پر بھی سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے۔ پھر 1946ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ریاضی اعلیٰ ترین اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور 600 میں سے 573 نمبر لے کر پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا بعد ازاں حکومت پنجاب کے وظیفہ ملنے پر مزید تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی چلے گئے وہاں پر آپ نے چھ سال پر مشتمل کورس کو صرف تین سال کی مدت میں مکمل کیا اور ریاضی اور طبیعیات کے میدان میں نیا ریکارڈ قائم کیا۔

آپ نے چوتھی کلاس سے لے کر ایم اے تک ہر امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ میٹرک کے امتحان میں صوبہ پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو دو سال کی عمر میں قصبہ جھنگ میں سب سے زیادہ صحت مند اور توانا بچہ ہونے کا اوّل انعام ملا۔ مارچ 1934ء میں انہوں نے ڈی سی جھنگ سے خوشخطی میں اوّل انعام حاصل کیا جبکہ 1937ء میں ایک نمائش میں نقشہ نویسی

اور خوشخطی میں بھی پہلا انعام جیتا۔ 1938ء مڈل میں اوّل آنے پر چھ روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 12 سال تھی۔ 1940ء میں میٹرک میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے پر سلام کو 20 روپے ماہانہ وظیفہ اور خالص سونے کا میڈل دیا گیا۔ جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے تھا۔ ڈپٹی کمشنر جھنگ سے اعلیٰ صحت پر بچپن میں چاندی کا پیالہ بطور انعام حاصل کیا۔ 1942ء میں ایف اے میں 85 فی صد نمبر لینے پر اور صوبہ بھر میں اوّل آنے پر 30 روپے ماہوار وظیفہ اور خالص سونے کا میڈل ملا۔ 1944ء میں سلام نے بی۔اے آنرز کیا اور 95.5 فی صد نمبر لے کر اوّل آئے اور سونے اور چاندی کے میڈل حاصل کیے۔ 1946ء میں ریاضی میں ایم۔اے کیا اور 95.5 فی صد نمبر لے کر پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے اور اس تمام عرصہ میں انہوں نے کل 7 میڈل حاصل کیے۔ گورنمنٹ کالج جھنگ اور گورنمنٹ کالج لاہور (4) میں گورنمنٹ کالج لاہور 1938 تا 1946ء رہے۔

کیمبرج میں داخلہ اور سائنسی مصروفیات و اعزازات

ڈاکٹر عبدالسلام نے تین اتفاقات کو اپنی زندگی کے لیے سنگ میل قرار دیا:

1۔ 1942ء کے بعد انڈین سول سروس امتحان کو ختم کر دیا گیا۔

2۔ حکومت ہند نے اتحادیوں کے لیے رقوم جمع کی تھیں۔

3۔ جنگ عظیم دوم کے بعد حکومت نے چھوٹے کسانوں کے لیے سکالرشپ کا پروگرام بنایا۔

ڈاکٹر عبدالسلام کے والد چوہدری محمد حسین کا خواب تھا کہ ان کا بیٹا سول سروس کا امتحان پاس کرے۔ اس ذیل میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک دن عبدس کو والد گرامی کا خط ملا جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو لکھا۔ عبدس تم محنت کر رہے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابی تمہارے قدم چوم رہی ہے تمہیں پتہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو اس قدر کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ انہیں بالآخر سول سروس کا امتحان دینا ہوتا ہے تمہارا بھی یہی

نقطہ نظر ہونا چاہیے۔مگر شاید خدا نے عبدس سے کوئی اور امتحان لینا تھا۔عبدس آئی سی ایس (یاد رہے کہ 1947ء سے پہلے متحدہ ہندوستان میں مقابلے کے امتحان کا نام انڈین سول سروس یعنی آئی سی ایس تھا) کا امتحان نہ دے سکا۔ ہوا یوں کہ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اس جنگ کے چھڑنے کے بعد آئی سی ایس کے امتحانات پر پابندی لگا دی گئی۔اس دوران برٹش سرکار نے ایک نئی پالیسی کا اعلان کیا۔اس پالیسی کے مطابق کسانوں کے بچوں کو ملک سے باہر پڑھائی کے لیے سکالرشپ دینے کا اعلان ہوا۔عباس نے بھی درخواست دی اور اس طرح عبدس کو ملک سے باہر جا کر پڑھنے کا موقع مل گیا۔اسے سینٹ جان کالج (St. John's College) کیمبرج،انگلینڈ میں داخلہ مل گیا۔[10]

آپ نے 3 ستمبر 1946ء کیمبرج میں داخلہ لیا اور 500 روپے ماہوار وظیفہ کے حقدار قرار پائے۔کیمبرج میں آپ نے بی۔اے (آنرز)، ریاضی کا تین سالہ کورس دو سال میں اور بی اے (آنرز) فزکس کا دو سالہ کورس ایک سال میں مکمل کر کے نیا ریکارڈ قائم کیا۔ 1951ء میں آپ پاکستان واپس آ گئے اور صرف 25 سال کی عمر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔اس کے بعد 1952ء سے 1954ء تک آپ شعبہ ریاضی کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہے۔اس کے بعد آپ کو دوبارہ حکومت پاکستان کی طرف سے Ph.D. کا سکالرشپ عطا ہوا چنانچہ آپ پھر دوبارہ اس اعلیٰ ترین ڈگری کے حصول کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔آپ نے یہاں تھیوریٹیکل فزکس میں کام شروع کیا اور پھر جون 1952ء میں آپ کو کیمبرج یونیورسٹی کی جانب سے Ph.D. کی ڈگری پیش کی گئی۔آپ کا مقالہ ''کوانٹم فلیڈ تھیوری'' میں Rromition کے موضوع پر تھا۔ بعدازاں آپ 1954ء میں لندن چلے گئے اور وہاں امپریل کالج (6) میں بطور پروفیسر تعینات ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ رائل سوسائٹی کے سب سے کم عمر فیلو بھی۔23 اگست 1942ء کو میاں فضل حسین کے عبدالسلام کے نام خط سے اقتباس جو انہیں ملتان میں

اس پتہ پر موصول ہوا۔ موجودہ صورت حال کا اندازہ اس خط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

"Abdus Salam, Esquire

C/o Supdt., Office of the Inspector of Schools,

Multan city.

"I have just received your letter of 18th August and by this very post. I also received a letter from Mr.Sharif. I have no doubt in mind that Mr. Sharif will do his very best for you. If you get a stipend $600/- to continue at Cambridge for another two years, you should consider yourself very fortunate.I have no doubt that they could offer you an appointment today and permit you to join after the completion of the course of your training at Cambridge ." [11]

ڈاکٹر عبدالسلام بحری جہاز P.O.Franconia پر بمبئی سے سوار ہو کر لیور پول پہنچے اور یہاں سے سر ظفر اللہ کے ساتھ لندن پہنچے اور پھر 18 اکتوبر 1946ء کو وہ سینٹ جانز کالج کیمبرج پہنچے۔ یہاں ان کا پہلا قدم نیوکورٹ کمرہ نمبر C-5 میں تھا۔ 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور سر ظفر اللہ جو بطور سپریم کورٹ جج کام کر رہے تھے پاکستان کے سب سے پہلے وزیر خارجہ مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام گورنمنٹ کی جانب سے فاؤنڈیشن سکالر منتخب ہوئے۔ سینٹ جان کالج کیمبرج میں (1946ء-1949ء) تک کا عرصہ زمانہ طالب علمی میں ہی گزرا۔ کیمبرج میں آپ ریاضی کے رینگلر Wrangler (5) کہلائے اور طبیعیات میں بھی اوّل پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں 1952ء میں کیونڈش لیبارٹری میں کچھ عرصہ تجرباتی کام کرنے کے بعد کیمبرج سے نظری طبیعیات میں Ph.D. کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو ڈاکٹریٹ کی تعلیم کے دوران تحقیقی کام حیرت انگیز طور پر مکمل کرنے پر ٹرینٹی

کالج کیمبرج سے فیلوشپ کی پیش کش ہوئی مگر انہوں نے اس آفر کو مسترد کر دیا۔ انوں نے ایک انٹرویو میں اس بات پر کہا کہ اس کالج کی تاریخ میں میں پہلا آدمی تھا جسے ایسی پیش کش کو رد کرنے کا اعزاز حاصل ہوا بعد ازاں انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ بھی کہا کہ آخر وفاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے کیونکہ کیمبرج (7) سے ان کی دیرینہ رغبت اور محبت تھی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے مضمون میں بہت مہارت حاصل تھی۔ کیمبرج میں ان کی مقبولیت کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''کیمبرج میں ایک رواج یہ بھی ہے کہ طلبا کو اپنے اساتذہ منتخب کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ ستر فیصد طلبا عبد السلام کی کلاسوں میں جانا چاہتے تھے۔ عبدالسلام کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کا راز اس کی آزاد طبیعت تھی۔ عبدالسلام نے اپنے ایک لیکچر کے دوران یہ جملہ بولا میری کلاس میں سب سے کم عمر طالب علم کو بھی اتنا ہی اعتماد آ جاتا ہے کہ وہ مجھے پر سوال کر سکے اور یہ عین ممکن ہے کہ وہ درست بات ہی کر رہا ہو۔[12]''

عبدالسلام کو 1968ء میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (ICTP) کی جانب سے "Atoms for Peace" کا ایوارڈ دیا گیا تو اس پر آپ کے والد نے ایک خط میں لکھا کہ: ''تم نے دیکھا کہ تمہیں آج امن کا ایوارڈ ملا ہے مگر جب تم پیدا ہوئے تھے تو وہ کونسی طاقت تھی۔ جس نے مجھ سے تمہارا نام 'امن کا بندہ' رکھوایا تھا۔''[13] اس دوران سائنس پر مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی آپ نے جاری رکھا۔ پہلا سائنسی مضمون 1943ء جبکہ آخری سائنسی مضمون 1993ء میں لکھا۔ آپ کے تمام سائنسی مضامین مشہور سائنس جرنلز میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کا آخری سائنسی مضمون سائنس جرنل ''فزکس لیٹرز'' میں شائع ہوا۔ آپ کے سائنسی مضامین کے تراجم، یونانی زبان میں کیمبرج سے 1991ء میں اور جاپانی زبان میں بھی ٹوکیو سے 1991ء میں ہی شائع ہوئے۔ آپ نے مختلف فورمز پر جو خطبات دیے ان کی تعداد 110 کے قریب ہے۔ ان میں سے بعض کے اردو تراجم بھی لاہور (پاکستان) سے سائنس کا جہانِ نو میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی سائنسی تحریروں کو 2 حصوں میں

تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی وہ تحریریں جو تھیوریٹیکل فزکس کے حوالے سے ہیں جبکہ دوسری وہ جن کا تعلق پاکستان میں سائنس کی ترقی وفروغ اور تیسری دنیا میں سائنس کے احیاء اور قیام سے متعلق ہیں۔ آپ نے تیرہ سال صدر پاکستان کے سائنسی مشیر کے طور پر بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ عبد السلام سائنسی طرز فکر کی بنا پر ہمیشہ نئی دنیا تلاش کرنے کے خواہاں رہتے کیونکہ وہ خالصتاً سائنسی تربیت مخصوص اور ذہنی رجحان سے ہم آہنگ ہو کر اپنا راستے کا خود تعین کرتے تھے۔ ان کو ہمیشہ کام کی لگن رہتی، وہ روزانہ سولہ سولہ گھنٹے کام کرنے کے عادی تھے۔ تقسیم ہند کے المناک حادثے نے ان کو واپسی کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، لہذا انہوں نے 1948ء میں ٹرائی پوز کے بعد اپنے ملک پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت انہیں دو مختلف شخصیتوں کے ذریعے واپسی کے اقدام سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔ ان میں سے ایک ان کے استاد فریڈ ہائیل تھے، جنھوں نے عبد السلام کو مشورہ دیا کہ وہ واپس جانے کی بجائے کیونڈش لیب سے 'ایڈوانسڈ فزکس' میں ایک سالہ کورس مکمل کرنے سے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔ ہائیل نے انہیں کہا کہ 'تمہیں نظریاتی محقق بننے سے پہلے تجرباتی کام بھی مکمل کر لینا چاہیے ورنہ تم کسی تجرباتی ماہر طبعیات کا کبھی سامنا نہ کر سکو گے۔'

پاکستان واپسی

جذبہ حب الوطنی کے پیش نظر ڈاکٹر عبد السلام 1949ء میں اپنے ملک واپس آ گئے۔ وہ کیمبرج سے حصول علم کے بعد واپس گورنمنٹ کالج لاہور آئے تو ان کے بقول کالج کے منتظم اعلیٰ نے ان کے سامنے کالج کے کاموں کے سلسلے میں تین پیشکشیں رکھیں تھی۔ خالی اوقات کے لیے وہ کالج ہوسٹل کے نگران بن سکتے ہیں یا اس کے حسابات کے خازن اعلیٰ یا اس کے فٹ بال کلب کے صدر بن سکتے ہیں ایک نظری طبعیات دان کے لیے یہ پیشکش کسی المیہ سے کم ہرگز نہ تھیں جو ان کے مزاج اور کام کسی سے بھی لگاؤ نہیں کھاتی تھی کیونکہ ایسے ماحول میں وہ کسی بھی طرح اپنا خیال یا نکتہ نظر دنیا کے بیشتر سائنسدانوں سے Share نہیں کر سکتے تھے۔ الغرض آپ نے تدریس کا آغاز گورنمنٹ

کالج لاہور میں بطور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف میتھی میٹکس کے شروع کیا۔ آپ کو یہاں کی علمی فضا نے بری طرح تنہا کر دیا جبکہ کسی بھی سائنسدان کے لیے سائنسی تنہائی اس کے کیریئر کے لیے موت کے مترادف ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام 54۔ 1951 ء تک پاکستان میں رہے۔ وہ بطور مدرس گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی پڑھاتے تھے مگر سائنسی زرخیزی اور تحقیق کے لیے غیر صحت مندانہ ماحول ہونے کی وجہ سے عبد السلام جلد ہی اکتاہٹ کا شکار ہو گئے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کس طرح اس سائنسی تنہائی کو دور کیا جائے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل نے عبد السلام کی تقرری کے دو اڑھائی سال کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص کالج کے مزاج کے مطابق نہیں ہے اس لیے اسے یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا جانا چاہیے۔ آپ کو کالج کی فٹ بال ٹیم کا صدر بنا دیا گیا لہٰذا آپ ہر شام چوبرجی کے میدان میں کھلاڑیوں کو فٹ بال کھلاتے اور ان کے لیے ریفریشمنٹ کا بندوبست بھی کرتے جبکہ آپ پاکستان کے پہلے نظری طبیعیات دان تھے۔ اس تقرری کے دوران ہی آپ ایک مرتبہ سائنسی سیمینار میں شرکت کے لیے گرمیوں کی چھٹیوں میں انڈیا گئے تو کالج انتظامیہ کی جانب سے آپ کی تنخواہ کاٹ لی گئی۔

ڈاکٹر عبد السلام تھیوریٹیکل فزکس میں عالمی پہچان حاصل کر چکے تھے۔ یہ دوران کی زندگی میں شدید ترین محرومی کا دور تھا جب انہوں نے خود کو پھر سے مغربی دنیا کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس دوران ان کے Ph.D. کے استاد پروفیسر Kemmer نے تعاون کا سفارشی خط محکمہ تعلیم پنجاب کے کسی نامعلوم شخص کو بھجوایا۔ اس خط سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ڈاکٹر عبد السلام اس وقت عمر کے اس حصے میں ہے جہاں وہ بڑھ چڑھ کر سائنسی کام کی قابلیت رکھتا ہے ......اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سال بہ سال اپنی شہرت میں اضافہ کرے گا اور وقت معینہ پر ان چند لوگوں میں سے ہو جائے گا جس کے پاس ایڈوانس طالب علم ساری دنیا سے تعلیم کے لیے آئیں گے خواہ وہ کہیں بھی مقیم ہو اور ذرا سی مالی پشت پناہی

سے اپنا تھیوریٹیکل فزکس کا سکول قائم کر سکے گا جو اعلیٰ ترین شہرت کا حامل ہوگا۔'' [14]

جذبہ حب الوطنی سے سرشار ڈاکٹر عبد السلام کو وطن پاکستان کی غیر سائنسی فضا نے شدید تنہا کر دیا تھا۔ اس ذیل میں یہ اقتباس ان کے پاکستان میں قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات کی ایک تلخ حقیقت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے:

''پی ایچ ڈی (Ph.D) کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر عبد السلام واپس پاکستان آ گئے اور دوبارہ گورنمنٹ کالج لاہور میں درس وتدریس میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر عبد السلام طلبا کو آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت پڑھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے شام کے وقت مفت کلاسز کا اجرا کیا۔ آغاز میں اچھی خاصی تعداد میں طلباء پڑھنے کے لیے آئے مگر دن بدن ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ جب صرف دو طالبعلم رہ گئے تو وہ از حد مایوس ہو گئے۔ ملک کی فضا کو جدید تعلیم اور تحقیق کے لیے ساز گار نہ پاتے ہوئے انہوں نے واپس کیمبرج یونیورسٹی جانے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ 1954ء میں وہ واپس انگلینڈ چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں بطور لیکچرار مصروف تدریس وتحقیق ہو گئے۔'' [15]

شادی:: درحقیقت عبد السلام اپنی زندگی میں سخت ترین محنت کرنے کے عادی تھے۔ جب وراثتی عوامل، تعلیم اور ماحول آپس میں یکجا ہو جاتے ہیں تو تب ہی کوئی شخصیت مکمل ہو پاتی ہے۔ 1949ء میں ڈاکٹر عبد السلام کی شادی چوہدری غلام حسین کی صاحبزادی 'امت الحفیظ بیگم' سے انجام پائی۔ پہلی بیوی سے آپ کے ہاں 3 بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ یہ شادی ان کی آئندہ آنے زندگی کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر عبد السلام کی دوسری شادی پروفیسر لوئس سے انجام پائی۔ ان کا پورا نام Professor Dame D.R.Louise.J.Salam ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام سے ان کے ہاں دو بچے بیٹا عمر سلام اور بیٹی سعدیہ کی پیدائش ہوئی۔ وہ ایک لمبے عرصے تک آکسفورڈ یونیورسٹی میں مالیکیولر بیالوجی کی پروفیسر رہیں۔ انہوں نے آکسفورڈ سے ہی ریٹائرمنٹ لی اور آج کل ریٹائرڈ لائف گزار رہی ہیں۔

نوبل انعام کا حصول اور اظہار تشکر

''آپ کو ایٹمی ذرات کے برقی مقناطیسی اور کمزور تعاملات کی وحدت' پر 1979ء میں نوبل انعام دیا گیا۔ عبد السلام نے 10 دسمبر 1979ء کو نوبل انعام کے سیشن میں تقریر کی۔'' [16]

آپ کو دو امریکی سائنسدانوں Sheldon Glashow اور Steven Weinberg کے ہمراہ نوبل انعام کے اس اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبد السلام نے نظری طبیعیات کے میدان میں بنیادی ذرات پر تحقیقی نوعیت کے کام کر کے تھیوریٹیکل فزکس میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان کو برقی مقناطیسی اور کمزور نیوکلیائی فورسز کو متحد کرنے پر وائین برگ (Weinberg) اور گلیشاؤ (Glashow) کے ساتھ مشترکہ طور پر اس عظیم ترین ایوارڈ نوازا گیا۔ یہ نوبل انعام ان کی نہ صرف فزکس میں عملی اور تحقیقی خدمات کے عوض بلکہ تحقیقی دماغ رکھنے کے اعتراف میں بھی دیا گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنس انسانیت کی مشترکہ میراث ہے انہوں نے بنیادی پارٹیکلز پر 250 کے قریب مقالات لکھے۔

ڈاکٹر عبد السلام جھنگ کے ایسے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں بہت مشکل سے گزر بسر ہوتا تھا۔ سلام کا بچپن ایسے علاقے اور وقت میں گزرا جہاں نہ تو پانی تھا اور نہ بجلی۔ وہ اپنے ثقافتی رویوں کا بہترین ترجمان تھے۔ عبد السلام ہمیشہ اپنی روایات کو بہت پسند کرتے تھے۔ درج ذیل اقتباس میں ان کے سچا پاکستانی ہونے کا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے:

''عبد السلام کی آخری خواہش یہ تھی کہ ریٹائرمنٹ کی زندگی پاکستان میں گزارے تاکہ یونیورسٹیوں میں نوجوان سائنسدانوں کی نئی نسل کی پرورش کر سکیں۔ وہ زندگی کی آخری سانس تک سچا پاکستانی رہا۔ جب وہ سٹاک ہوم میں نوبل انعام لینے کے لیے گیا تو وہ روایتی لباس یعنی زری کھسے اور دیہاتی پگڑی میں ملبوس تھا۔ اتفاق سے وہ پگڑی باندھنا بھول چکا تھا۔ نوبل تقریب کے موقع پر اس نے جو پگڑی پہنی ہوئی تھی وہ ہمارے پاکستانی سفیر کے خانسامے کا

آرٹ ورک تھا۔ لیکن جو بات میں لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ تھی کہ وہ اپنی نسل اور ثقافتی جڑوں کو بھولا نہیں تھا اور یہ کہ وہ ایک ترقی پذیر ملک کے پسماندہ شہر سے وابستہ اپنی دہقانی بیک گراؤنڈ پر فخر محسوس کرتا تھا۔'' [17]

ڈاکٹر عبد السلام پاکستان اور خصوصاً طلبا سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ان کے پیار کے عملی اظہار کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''5 اکتوبر 1979ء کو اسٹاک ہوم میں آپ کو دنیا کا سب سے بڑا علمی ایوارڈ نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ تو آپ نے نوبل پرائز کی انعامی رقم اپنے آبائی شہر جھنگ کے طلباء کی فلاح و بہبود اور پاکستان میں سائنس کے سینئر طلباء کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں کے لیے وقف کر دی۔ تیس ہزار ڈالر کی رقم سے پاکستان میں ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا اور جھنگ کالج میں دو بلاک بھی تعمیر کروائے گئے۔'' [18]

نوبل پرائز ملنے کے بعد سکول کے سائنس بلاک کو ''محمد حسین بلاک'' کا نام دیا گیا اور ڈاکٹر عبد السلام نے اس کی تعمیر کا تمام خرچ خود برداشت کیا تھا۔ ان کے نزدیک سائنس مسلمانوں کی متاع گم گشتہ ہے جسے پھر سے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''جھنگ شہر میں ڈاکٹر عبد السلام کے دو مکانات تھے۔ آبائی مکان ڈاکٹر عبد السلام نے حکومت پاکستان کو (In House Museum) بنانے کے لیے 1979ء میں نوبل انعام ملنے کے بعد Donate کر دیا تھا۔'' [19]

ڈاکٹر عبد السلام نے ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کو سائنسی تنہائی اور محرومی سے نکالنے کے لیے عزت نفس کا درس دیا۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"I think that the heritage of Abdus Salam, the heritage of giving dignity to the people, Should be kept up and I am glad that the new director Professor Virasoro mentioned it in his speech. After the nobel prize was conferred upon him, Abdus salam told me once" I don't need this prize for

myself, I need it for the people of the developing countries.I need it for doing something for them." [20]

ڈاکٹر عبدالسلام مختلف زبانوں پر عبور رکھتے تھے ان میں پنجابی، اردو، انگلش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔نوبل انعام ملنے کے بعد دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں بھی عطا کیں اوراس مقصد کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام نے بہت سی ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے دورے بھی کیے اور وہاں تیسری دنیا کے سائنسدانوں کے مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے بارے اپنے بہترین خیالات کا بھی اظہار کیا۔اس ذیل میں گرونانک یونیورسٹی (امرتسر) نے بھی اپنے سالانہ جلسے میں آپ کو مدعو کیا وہاں پر آپ نے ان کی اپنی زبان پنجابی میں تقریر کر کے بھارت کے سکھ نانکوں کے دل جیت لیے۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے اپنے اساتذہ کے احترام میں جواعزاز یہ کلمات کہے وہ علم ودوستی کی بہترین مثال ہیں۔کوئی بھی طالب علم اس وقت تک ادیب نہیں کہلا سکتا جب تا کہ وہ ادب سیکھ نہ لے اورڈاکٹر عبدالسلام نے کبھی بھی اور کسی بھی فورم پر اپنے اساتذہ کو فراموش نہ کیا کہتے ہیں کہ:

''میں جیہڑی دوسری چیز داوی شکر یہ ادا کرنا چاہنداواں اوہ ایہہ کہ تساں میری درخواست نوں قبول کر دیاں ہویاں میرے استاد لالہ ہنس راج بھاٹلا جو بیٹھے نے آخیر وچ سٹیج تے (تاڑیاں) انہاں نوں بلایا۔لالہ ہنس راج بھاٹلا نے جھنگ کالج وچ مینوں پہلے فزکس پڑھائی آہی اورفزکس کے بارے جو کچھ اونہاں کولوں سکھیا اوہدے بعد فیر کچھ نہیں رہیا۔ایسے طرحاں آر ڈی انس ورچ لالہ ایش کمار جی میرے استاد انگریزی دے نیں۔اہوناں نوں میں مل نہیں سکھیا ہن تیک (تاڑیاں)، میں اپناں ساریاں نوں دعوت دین واسطے تہاڈا بہت مشکور آں۔ساڈے کلچر اور ساڈے مذہب وچ استاددی عزت والدین دی عزت توں بعد سب توں زیادہ کیتی جاندی اے۔'' [214]

ڈاکٹر سلام نے روزنامہ 'نوائے وقت' کو 3 دسمبر 1979ء کو دیے جانیوالے ایک انٹرویو میں کہا کہ:''سائنسی تحقیق میری زندگی بن چکی ہے اور میرے لیے رموز فطرت کی تلاش دراصل خدا کی حکمتوں کی تلاش ہے۔۔۔۔کاروبار فطرت چلانے والی چار قوتوں کا تین قوتوں میں تبدیل ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات تو ہے نہیں کہ دنیا اسے نظر انداز کر سکتی۔آخری تجربات کے بعد یہ تھیوری سو فیصد Establish ہو جائے گی۔پھر سوال اٹھے گا کہ تین قوتیں دو میں تبدیل ہو جائیں اور دو بھی ایک ہو جائے اور تب یہ ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا نظام دراصل ایک ہی قدرت کا کرشمہ ہے۔''[22]

نوبل انعام ملنے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بھی ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے ملی اور قومی تشخص کو برقرار رکھا اور اردو زبان میں تقریر کی اجازت دینے پر پروفیسر گلاشو اور رائل اکیڈمی آف سائنس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس عزم کو دہرایا کہ اگر تیسری دنیا کے سائنسدان خود کو احساس قومیت اور اخوت کے جذبے سے سرشار کرلیں اور اپنی سائنسی تنہائی دور کرنے کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لائیں تو وہ وقت دور نہیں جب پاکستان اور تمام تیسری دنیا کے ممالک سائنس کی دنیا میں انفرادی مقام حاصل کر سکتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ:

''دراصل تمام ماہرین طبیعیات کا یہ ایمان ہے کہ جتنا گہرائی تک ہم سوچیں گے اتنی ہی ہماری حیرانی بڑھتی جائے گی،اتنی ہی ہماری نگاہ میں خیرگی ہوگی۔میں یہ بات صرف ان کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں جو آج رات یہاں موجود ہیں بلکہ ان کو بھی یاد دلا رہا ہوں جو تیسری دنیا کے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وسائل اور مواقع کی کمی کے خاطر وہ سائنسی علوم کی جستجو میں کھو چکے ہیں۔[23]

سائنسی تحقیقات اور انسانی خدمات

سائنس کی تاریخ اپنے دامن میں بہت سے سائنسدان اور ٹیکنالوجسٹ کو سموئے ہوئے ہے۔اس تاریخ کو اس وقت تک بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک یہ دنیا جاری و ساری ہے اور اس میں ڈاکٹر عبدالسلام جیسے سائنسدان موجود ہیں۔جب کبھی بھی طبیعیات کی تاریخ لکھی جائے گی تو وہ

ڈاکٹر عبدالسلام کے ذکر کے بنا مکمل نہیں ہو سکے گی کیونکہ آپ طبعیات کے میدان میں ایسے درخشندہ ستارے کے طور پر جانے جاتے ہیں جسے تاریخ ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام تیسری دنیا کے سنجیدہ ترین انسان ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بے حد اعتماد اور یقین کامل سے بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ایسے لوگ صنعتی دنیا کی پیداوار نہیں ہوتے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان کو اپنی دنیا کی بقا نظر آتی ہے۔ان کے نزدیک اگر کوئی شے اہم ہے تو وہ بس سائنسی ترقی اور علمی جہتوں کا ادراک ہے۔ایسے ہی چند افراد جو کسی بھی قوم کی تقدیر بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان ہی میں سے ایک نام ڈاکٹر عبدالسلام کا بھی ہے۔آپ پارٹیکل فزکس میں اعلیٰ درجہ کے طالب علم، آرکٹیٹ ماڈل پیش کرنے والے پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ کے بہترین فیلو ہیں۔جب ڈاکٹر عبدالسلام نے رائل سوسائٹی کو جوائن کیا تو آپ اس کے سب سے کم عمر فیلو کہلائے۔آپ لندن میں واقع امپریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں تھیوریٹیکل سائنس کے اہم ترین سائنسدان کا درجہ حاصل کرنے والے سائنسدانوں کی صف میں سب سے نمایاں مقام رکھتے تھے۔ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے تاہم ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

1۔ری نارملائزیشن (Renormalization)

2۔دو اجزائی نیوٹرانز نظریہ

(Two Component Theory of Neutrino or chiral symmetry)

3۔ بنیادی ذرات کی یکسانی صفات۔Symmetric Properties

4۔یونیٹری سمیٹری (Unitary Symmetry)، برقی مقناطیسی اور کمزور نیوکلیائی فورسز کا اتحاد۔

5۔ کمزور نیوٹرل کرنٹ، ڈبلیو پلس اور زیڈ مائنس ذرات سے متعلق پیشن گوئی۔

6۔ وحدت اولیٰ۔ Grand Unification7۔ پروٹان کے زوال پذیر ہونے کی پیشین گوئی8۔ یکسانیت اعلیٰ۔Super Symmetry

9۔ بنیادیت کی تلاش اور Big Bang جیسے نظریات کا احیاء

تیسری دنیا کے مسلم ممالک کے لیے خدمات

ڈاکٹر عبدالسلام تیسری دنیا کے سائنسدانوں میں احساس محرومی کے خاتمے اور ان کی علمی تنہائی دور کرنے اور سائنسی زرخیزی پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ترقی یافتہ ممالک کو' بگ سائنس (8) میں بے جا سرمایہ کاری کرنے سے دور رہنا چاہیے، کیونکہ غیر شعوری طور پر بھی ایسا کرنے سے ترقی پذیر ممالک میں بلند بانگ امید میں پیدا ہونے کا خدشہ ہے جو ان کے زمینی حقائق سے کسی بھی طرح Match نہیں کرتا۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس کے میدان میں باہمی اشتراک عمل کے لیے بین الاقوامی سطح پر کسی غیر جانبدار ملک میں سائنسی سنٹر قائم کیا جائے تاکہ مشرق ومغرب کے مشترکہ تصورات اور انفرادی سطح پر امتیازات کے خاتمے کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

C.P.Snow نے اپنی کتاب "The Two Cultures" میں لکھا ہے کہ:

''ہنر مند غریب افراد کے لیے اور تیسری دنیا کے غیر مراعات یافتہ لوگوں کے لیے کسی نے اتنا کچھ نہیں کیا جتنا کہ سلام نے۔'' [24]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (انڈیا) کے پروفیسر اسرار احمد نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا:

''انسان کی عظمت کا معیاری پیمانہ وسیع القلبی ہے۔ کوئی کتنا ہی قدآور کیوں نہ ہو اگر اس کا دل تنگ اور درد سے خالی ہو تو وہ ہونا ہے۔ بڑا وہ ہے جس کا دل بے در و دیوار ہو۔ تنہا آگے بڑھنا آسان ہے مگر اپنے ساتھ مفلوجوں کی فوج لے کر آگے بڑھنا مشکل۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو 'عبد السلام' عظیم ترین ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کے دل میں اپنوں میں سائنس کو فروغ دینے کی تڑپ ہو، جو عبدالسلام کے دل میں ہے۔۔۔۔ یہ مرکز جو آئی سی ٹی پی (اب اس سینٹر کا نام 'عبدالسلام آئی سی ٹی' رکھ دیا گیا ہے) کے نام سے مشہور ہے۔ 1964ء میں اطالیہ

کے شہر ٹریسٹ میں قائم ہوا۔ یہ عبدالسلام کا تیسری دنیا کی سائنس پر وہ عظیم احسان ہے جسے نسل در نسل یاد کیا جاتا رہے گا۔'' [25]

ڈاکٹر عبدالسلام نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ''میں طبعیات کو اسی لیے پسند کرتا ہوں کیونکہ اس کے ذریعے میں خدائے برتر کے بنائے ہوئے خاکوں کو طشت از بام کرتا ہوں'۔ ڈاکٹر عبد السلام تھیوریٹیکل فزکس میں اپنی انفرادی پہچان رکھتے تھے۔ان کا نام نیوٹن، آئن سٹائن، سڈنی گلاشو اور سٹیون وائن برگ جیسے عظیم سائنسدانوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔انہوں نے آئن سٹائن کی دریافتوں میں توسیع کی اور نئے نئے خیالات کے ساتھ نظری طبعیات میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔آپ کو الیکٹرو ویک (Electroweak) تھیوری کی وجہ سے ہائی انرجی فزکس High Energy Physics کی دنیا میں منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ تھیوری بعدازاں Z W عناصر کی لیبارٹری میں دریافت کے ضمن میں خاصی مددگار ثابت ہوئی۔ڈاکٹر عبدالسلام تھیوریٹیکل فزکس میں اپنا ایک منفرد مقام و مرتبہ رکھتے ہیں ان کے نظریات آئن سٹائن کی طرح تحقیق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ وہ اپنی تحقیق میں ارتقاء انسانیت کے بارے میں نظری بنیادوں پر ایک جداگانہ تصور رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان دنوں ڈاکٹر عبدالسلام کے ایک اور نظریے پر'میری لینڈ یونیورسٹی میں بڑے مہنگے تجربات ہو رہے ہیں۔ وہ نظریہ کچھ یوں ہے کہ'ارتقا اپنی جگہ مگر کرۂ ارض پر ایسے حالات کبھی نہ تھے جو حیات پیدا کرتے، یعنی حیات کرہ ارض کے باہر سے آئی ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام کے ایک مخالف ہندستانی سائنسدان اور امریکی شہری ڈاکٹر میرا کے بقول'اگر تجربات سے یہ نظریہ ثابت ہو گیا تو پورے 400 برس کی یورپین سائنس میں انقلاب آ جائے گا اور ڈاکٹر عبدالسلام کو نیوٹن اور آئن سٹائن کی صف میں تیسرے سائنسدان کی حیثیت دینی پڑے گی۔'' [26]

ڈاکٹر عبدالسلام تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو ایک ایسے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے جہاں سے

انہیں مغرب کی جانب دیکھنا نہ پڑے۔انہوں نے اس مقصد کے لیے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس قائم کی۔ڈاکٹر عبدالسلام کو سائنسی زندگی میں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔اس ذیل میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"He received the 'Atoms for Peace Medal and award in 1968, and many other awards for his contributions to Physics, towards peace and the promotion of International Scientific Collaboration. He is a member of 25 academies and societies and doctor honoris cause of 30 universities. He has published around 250 Scientific papers on physics of elementry particals as well as many others on scientific and educational policies for developing countries." [27]

ڈاکٹر عبدالسلام تھیوریٹیکل فزکس میں خاصی دلچسپی لیتے تھے کیونکہ عملی فزکس سے ذراہٹ کر اس میں فلسفہ اور نظریہ کو زیادہ اہم خیال کیا جاتا تھا۔اس میں ایٹم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔تاہم تھیوریٹیکل فزکس کے ثبوت کے لیے پریکٹیکل فزکس کا استعمال لازمی تھا اس مقصد کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام نے سب سے پہلے (Cavendish) کیونڈش لیبارٹری کا انتخاب کیا (جبکہ یہ لیبارٹری جدید آلات سے لیس نہ تھی۔) ڈاکٹر عبدالسلام نے سائنس کو امن اور ترقی کے لیے بنیادی قرار دیا اور ان کے نزدیک ٹیکنالوجی ٹرانسفر کرنے کی بجائے سائنس کو ٹرانسفر کرنا زیادہ اہم تھا۔انور دل (9) نے ان کی زندگی اور کام کے حوالے سے سائنس میں ان کی خدمات کو مرتب کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ICTP کی تشکیل کے بعد:

"Salam was a model director and took great pains to know and welcoming any one who worked in the centre..... any-how, those first two or there years, untill the success of the centre was assured, placed a

considerable toll on salam's health and nerves. But in all that time his research activity remained feverish ." [28]

ڈاکٹر عبد السلام ہمہ وقت سائنسی دنیا میں اپنا وقت صرف کرتے اور ان کا زیادہ تر وقت نظری طبیعیات دانوں کے ساتھ بسر ہوتا تھا۔ جب 1950ء میں انہیں کیمبرج یونیورسٹی سے 'سمتھ پرائز' سے نوازا گیا تو ان کے سائنسی انداز فکر میں نیا تخلیقی رجحان دیکھنے میں آیا۔ یہ پرائز پری ڈاکٹریٹ ایوارڈ کے ضمن میں ان کے لیے نہایت اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ یوں انہوں نے Quantum فزکس میں اپنے لیے نیا جہان تلاش کر لیا۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''1950ء میں اسے کیمبرج یونیورسٹی نے سمتھ پرائز (Smith's prize) دیا۔ یہ انعام ڈاکٹریٹ سے پہلے طبیعیات میں تحقیقی کام پر دیا جاتا ہے۔اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے نظری طبیعیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس نے اپنے مقالے میں اہم الیکٹروڈائنامکس پر بنیادی نوعیت کا کام کیا۔ یہ مقالہ 1951ء میں چھپا۔ عبد السلام نے ایٹم برائے امن میڈل اور نوبل انعام سے ملنے والی رقم سے ایک فنڈ قائم کیا تا کہ نو جوان پاکستانی طبیعیات دان بیرون ملک تعلیم کی سہولت حاصل کر سکیں۔'' [29]

ڈاکٹر عبد السلام انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس میں بڑی مستعدی اور جانفشانی سے کام کرتے تھے۔انہوں نے بہت سی بین الاقوامی کانفرنسز کا انعقاد کرایا اور ان کانفرنسز میں تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو سائنسی زرخیزی مہیا کرنے کے لیے چوٹی کے نامور سائنسدانوں کو مدعو کرنے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے تا کہ ان کے نومولود ذہنوں کی آبیاری کی جا سکے۔اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھیے: ''انہوں نے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کروائی، جس کا موضوع تھا "Contemporary Physics" یہ کانفرنس فزکس کے پورے سپیکٹرم پر محیط تھی۔اس مہینہ بھر کی کانفرنس میں تین سو سے زائد سائنسدانوں نے شرکت کی۔جس میں سے بہت سارے تیسری دنیا سے تھے۔۔۔اس کانفرنس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ دن کے معمول والے اجلاسات کے علاوہ

شام کو خاص لیکچرز ہوتے تھے اور اس کے لیے موجودہ صدی کے چوٹی کے چھ سائنسدانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ جن کے نام یہ ہیں" Heisenberg, Dirac, Hans Bethe, E.winger, ,, Oscar مسٹر لانڈاؤ علالت کی وجہ سے اس میں بہ نفس نفیس تشریف نہ لا سکے لہذا ان کی Landau,Kelim طرف سے ان کے ساتھی سائنسدان لف شٹز Lifshitz نے شرکت کی۔'' [30]

ڈاکٹر عبد السلام نے پال دیراک (Dirac)، وولف گانگ پالی اور پروفیسر Bethe کے ساتھ زیادہ وقت گزرا۔ انہوں نے نظری طبیعیات میں آنے سے متعلق اپنے عمومی فلسفہ کو یوں بیان کیا تھا:

''دل چاہتا ہے کہ ایک لمحہ میں بھی بیان کرتا چلوں کہ نظری طبیعیات میں کام کیسے کرنا چاہیے۔۔۔ میرا نسخہ یہ تھا کہ خود کو بھی صرف ایک قسم کے تجربات تک محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ تمام متعلقہ تجربات کے سلسلہ میں ہونے والی ترقیوں سے باخبر رہا جائے۔ تاکہ کسی نظریے کو ریاضیاتی یا کسی اور زبان کا لبادہ پہنانے کی کوشش کرتے وقت ذہن میں مکمل تصویر موجود ہو۔۔۔۔ دیراک اکثر یہ کہنا پسند کرتے تھے اور میں نے ہمیشہ ہی یہ محسوس کیا کہ وہ ہلکی تنقید کر رہے ہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ٹھیک ہو لیکن میں مسئلوں کو اس طرح نہیں دیکھتا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ''نیلز بوہر'' اس ضمن میں اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر آپ کے پاس کوئی درست بیان ہے تو اس درست بیان کے الٹ ایک غلط بیان ہوگا۔'' [31]

سائنسی دنیا میں خیالات اور نتائج کسی ٹھوس اور منطقی بنیادوں پر ہی استوار کیے جاتے ہیں مگر یہ خیالات اور نتائج کبھی بھی حتمی نہیں ہوتے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ کائنات اور اس سے متعلق حقائق میں بڑی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں لہذا ان تبدیلیوں کو ہی بنیاد بنا کر نئے نئے تجربات کیے جاتے ہیں تاکہ نظریاتی تصدیق کو تجرباتی عوامل سے گزار کر منطقی نتائج کو اخذ کیا جائے۔ ڈاکٹر عبد السلام کہتے ہیں کہ: ''اگر آپ سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تھیوریٹیکل فزکس میں ایسا ہی وجدانی ماحول موجود ہے۔ جہاں انسان کو دیگر قسم کی

ذہانتیں درکار ہوتی ہیں۔انسان کو اعلیٰ تخیل،عمدہ وجدان،اچھے ادراک اور حقائق کے درمیان قدر مشترک جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔انسان کو وسیع مطالعہ والے علم کی لمبی روایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' [32] بعض اوقات ایسی صورتحال میں سائنسدان کو اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بھی علم ہو جاتا ہے۔سائنس کی دنیا حقائق سے تولبریز ہے لہٰذا اس کی طرف رغبت بڑی جلدی ہو جاتی ہے لیکن اس سے نکلنا اتنا ہی زیادہ پیچیدہ کام ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں کہ:

''سائنسی خیالات اور ان کی تخلیق انسانیت کی مشترکہ میراث ہے۔اس سلسلے میں تمام تہذیبوں کی طرح سائنس کی تاریخ بھی دہرائی جاتی رہی ہے۔۔۔۔۔ میں نے طبعیات میں تحقیق کا کام ایک تجرباتی طبیعیات کے طالب علم کی حیثیت سے تمہیں سال قبل کیونڈش لیبارٹری میں ٹریٹیم اور ڈیوٹریم کے بکھراؤ (Scattering) سے کیا لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا کہ تجرباتی طبعیات میرے بس کی بات نہ تھی۔اس کے لیے صبر کی عظیم دولت درکار تھی۔۔۔۔ بادل ناخواستہ میں نے اپنے کاغذات سمیٹے اور پی اے ایم ڈیراک (P.A.M.Dirac) کے شعبہ میں نیکولس کیمر کے ساتھ کوانٹم فیلڈ تھیوری پر کام شروع کیا۔'' [33]

ڈاکٹر عبدالسلام نے (ٹریسٹے) اٹلی میں ایڈریاٹک ساحل پر نظریاتی طبیعیات کا بین الاقوامی ادارہ (10ICTP)) قائم کرنے کے لیے بے پناہ کوششیں کیں۔یہ مرکز سائنسدانوں کو اکیلا پن دور کرنے اور ایک زرخیز سائنسی فضا مہیا کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔ ڈان بحرمین (Behrman) اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:''اس سائینٹیفک مرکز سے جہاں تجربے کے واحد آلات کے طور پر صرف چاک،بلیک بورڈ اور ڈیسک ہی موجود ہیں ہر سال 130 سے زائد مقالے شائع ہوتے ہیں۔ان میں بنیادی ذرات،اعلیٰ توانائی طبیعیات،فیلڈ تھیوری،نیوکلیاتی طبیعیات ٹھوس حالت کی طبیعیات اور پلازما طبیعیات کے موضوعات شامل ہیں .... مرکز کے تمام کل وقتی عملے کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ڈائریکٹر پروفیسر عبدالسلام،ڈپٹی ڈائریکٹر اٹلی کے پروفیسر

پاؤلو بودینی .... باقیات میں بیل جنیم کے ڈاکٹر اینڈرے سمیندے سب کچھ تھے............
لیکن سائنسدانوں کی تعداد بہر حال 5 گنا سے زیادہ بڑھی ہے۔" [34]

ڈاکٹر عبدالسلام نے نظری طبیعیات کے میدان میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیے۔ انہوں نے اپنی سائنسی تنہائی کو دور کرنے کے لیے ICTP اور TWAS جیسے ادارے قائم کیے اور وہاں دور جدید کے چوٹی کے سائنسدانوں کو مدعو کر کے ان کے خیالات سے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو عملی کام کرنے کے لیے ایک نئی منزل کا راستہ دکھایا۔ 2008ء میں Gordon Fraser نے "Cosmic Anger" کے نام سے ان کے سائنسی کارناموں اور زندگی کی تمام تر سرگرمیوں کے بارے میں ایک کتاب شائع کی۔ وہ اپنے "Authors Note" میں لکھتے ہیں کہ:

"Archives are the raw material that a biographer should mine and refine. After Salam's death in 1996 and at the suggestion of his family, his papers and correspondence10,000 items in 350 boxes were carefully collected and painstakingly catalogued by Lizzie Richmond, Paul Newman and Peter Harper of the British National Cataloguing Unit for the Archives of contemporary scientists at the university of Bath, Uk Salma's Papers at 'Trieste' had been carefully divided into categories, one dealings specifically with the founding and administration of the International Centre for Theoretical Physics." [35]

پروفیسر ریاض الدین نے "Abdus Salam" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلاشبہ ڈاکٹر عبدالسلام پوری دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص سائنسی فہم وفکر کو منظم صورت میں پھیلانے کے لیے سب سے زیادہ سرگرم رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"During the thirty years of his active life in Physics, he has maintained

a constant and fertile flow of brilliant ideas in Physics of ultimate consuituents of matter. His contribution to the development of scientific institutions in Pakistan, which has hardly any scientific tradition, is tremendous]"36[

بعدازاں عبدالسلام نے کیمبرج پہنچ کر Cavendish میں سام ڈیویز کی زیرنگرانی Deutron کے تجرباتی کام میں مصروف کرلیا۔ بعدازاں .Ph.D کے مقالہ کے لیے ان کے نگران پروفیسر Kemmer (11) بن گئے جو بذات خود ایک نظری طبیعیات دان تھے اور یوں ڈاکٹر عبدالسلام ایک مرتبہ پھر فیلڈ تھیوری میں انہماک سے مشغول ہو گئے۔ جان زیمان نے اپنے مضمون 'عبدالسلام' میں یوں لکھا ہے کہ:

''یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ایک شخص امور عامہ میں اس درجہ مصروف ہونے کے باوجود بھی بنیادی ذرات سے متعلق طبیعیات میں 200 مقالات کی اشاعت کردے اور اسی ناقابل عقلی اور متحرک مہم جوئی کے ساتھ آج بھی اس راہ پر گامزن ہو۔ واقعی وہ آج بھی اتنے شدید کارکن ہیں کہ میں علم طبیعیات میں ان کا عشرعشیر بھی نہیں حاصل کرسکا۔ کل صبح کہیں کوئی نیا تجرباتی مشاہدہ ان کی فہرست میں کسی مزید نئے نظریے کا اضافہ کرسکتا ہے۔ [37]

ڈاکٹر عبدالغنی (12) نے اپنی کتاب ڈاکٹر عبدالسلام میں لکھا ہے کہ:

''سلام کو اپنے سائنسی کاموں سے عشق تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے اس وقت طبیعیات کے اتنے بڑے مسئلے کو کیونکر سلجھا لیا تھا تو انہوں نے جواب دیا، ہوا یہ کہ ڈائی سن، میسان تھیوری کے علاوہ الیکٹروڈ ئنامکس (Electrodynamics) کے ہر درجہ کے لیے ریاضیاتی نظریہ میں موجود بھونڈی لامتناہیوں (Infinities) کو جذب کر لینے کا ایک طریقہ کار Renormalization Programme کا اعلان کر چکے تھے۔ حسن اتفاق سے وہ برمنگھم میں تھے، بس میں نے ان سے فون پر پوچھا، کیا آپ میسان کے مسئلے کو سلجھانے میں میری مدد کر سکتے ہیں جو ہم سب کو پریشان کیے

ہوئے ہے؟ کیا میں آپ سے ملنے آجاؤں؟ اس پر ڈائی سن نے جواب دیا کہ چونکہ وہ اگلے ہی روز امریکہ روانہ ہونے والے ہیں اس لیے میں فوراً ہی ان سے ملنے کے لیے روانہ ہو جاؤں۔‘‘[38]

ڈاکٹر عبدالسلام جنھوں نے اپنے تعلیمی کیرئیر کا آغاز تیسری دنیا کے ایک ترقی پذیر ملک پاکستان کے چھوٹے سے شہر جھنگ سے کیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں عظیم ’رینگلر‘ بن جائیں گے۔ ریاضی کے ساتھ ساتھ انہوں نے طبیعیات میں بھی دلچسپی لینا شروع کی اور ان کی پسندیدہ فیلڈ کوانٹم فزکس تھی۔ اس فیلڈ میں ان کی ملاقات چوٹی کے نامور طبیعیات دانوں سے ہوئی جو ان کے خیالات سے حیران کن حد تک متاثر ہوئے اور یوں آپ نے اپنی Ph.D کی ڈگری تھیوریٹیکل فزکس میں حاصل کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے Meson Decay پر بھی اپنی تحقیق کے چند برس صرف کیے۔ اس Meson Theory پر ’یوکاوا‘ (Yukawa)(13) کو نوبل پرائز بھی عطا کیا گیا۔ اس تھیوری کے مطابق نیوکلیس میں پروٹانز اور نیوٹرانز میں انٹرایکشن ایک غیر دریافت شدہ پارٹیکل کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے، جس کو میسان (Meson) (14) کا نام دیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پایہ کے فلسفیانہ ذہن رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی باتوں سے فلسفیانہ افکار و روایات کی خوشبو آتی تھی۔ ایک مرتبہ بنگال کے وزیر تعلیم اے ٹی ایم مصطفیٰ، ڈاکٹر عبدالسلام اور برٹرینڈ رسل کے درمیان خدا کے وجود پر گرما گرم بحث جاری تھی اور اے ٹی ایم مصطفیٰ نے بہت سی عقلی دلیلیں خدا کے وجود کے حوالے سے دیں مگر بات نہ بن سکی۔ اس سارے منظر نامے کو اس اقتباس کی روشنی میں دیکھئے: ’’اتفاق سے ایوب خان کے برطانوی دورے کے دنوں میں برٹرینڈ رسل سے میری ملاقات طے ہو چکی تھی۔ اے ٹی ایم مصطفیٰ نے بھی برٹرینڈ رسل سے ملنے کی خواہش کی، چنانچہ وہ میرے ساتھ چل دیے۔ اے ٹی ایم مصطفیٰ نے خدا کے وجود کے مسئلے پر برٹرینڈ رسل سے بڑی زوردار بحث کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے اور

میں برٹرینڈ رسل کے پاس رہ گیا۔ بوڑھے برٹرنیڈ رسل نے کہا لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ 95 سال کے برٹرینڈ رسل کو آدھ گھنٹہ کی گفتگو سے خدا کے وجود کا قائل بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ یہ بحث بھی میرے ساتھ شروع ہوگئی میں نے کہا خدا کو مانے بغیر انسان کے کردار میں بہت ہی بنیادی خرابیاں رہ جاتی ہیں اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ خدا کو ماننے والوں نے انسانیت کی خاطر زیادہ قربانیاں دیں اور خدا کو نہ ماننے والوں کے مقابلے میں بہتر انسان ثابت ہوئے۔ برٹرینڈ رسل نے کہا کوئی مثال دو میں نے کہا کہ گاندھی کی شخصیت کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ برٹرینڈ رسل نے بڑی حیرانگی سے میری طرف دیکھا اور کہا کس کا نام لیتے ہو گاندھی کا وہ تو نہایت ظالم اور سنگدل انسان تھا میں نے کہا وہ کیسے؟ برٹرنیڈ رسل نے کہا اس ظالم نے 40 سال کی عمر میں اپنی بیوی کو تمام ازدواجی مسرتوں سے محروم کر دیا، اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔" [39]

پاکستان کے لیے سائنسی وملی خدمات

ڈاکٹر عبدالسلام ایک سائنسی ڈپلومیٹ بن کر اپنا سائنسی کیرئر پاکستان کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ وہ بطور سائنسدان ایک ایسا ادارہ تھے جو تھرڈ ورلڈ کا نمائندہ بن کر ان کے سائنسی مسائل کو مغربی اقوام کے سامنے بہترین انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ بین الاقوامی سائنس کمیونٹی میں تیسری دنیا کے واحد نمائندے کے طور پر سامنے آئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے شائع شدہ ریسرچ پیپرز کی تعداد کچھ یوں ہے:

"Around 285 S cientific papers on Physics of elementary particles. Papers on scientific and educational policies for developing countries and Pakistan." [40]

تیسری دنیا کے مسلمانوں کے لیے عملی اقدامات کے ضمن میں آپ نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں اسلامی ملکوں کی سربراہی کانفرنس میں اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کا میمورنڈم پیش کیا

اور تجویز دی کہ اس فاؤنڈیشن کا صدر دفتر جدہ میں ہونا چاہیے اور اس کے قیام کے لیے اسلامی ممالک آپس میں مل کر 2 بلین ڈالر کا ایک فنڈ قائم کریں تا کہ اس کے معاملات کو احسن طریقے سے چلایا جا سکے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے صدر پاکستان ایوب خان کو اپنی تجاویز منوانے کے لیے انتہائی مجبور کیا کہ وہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں انسٹیٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے قیام کے لیے منظوری کے ہدایات جاری کریں جو کہ پاکستان اور تیسری دنیا کے مسلمانوں کے لیے انتہائی ناگریز ہے۔ چنانچہ ان کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے صدر پاکستان نے نیلور (اسلام آباد) میں Pinstech کے قیام کا اعلان کیا اور جلدی ہی یہ ادارہ قائم بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی کے تین بڑے مقاصد تھے۔

1۔ سائنس میں بنیادی دریافتیں کرنا اور خدا تعالیٰ کی تخلیق کو بہتر انداز میں سمجھنا۔

2۔ تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو جدید سائنسدانوں سے مشاورت کا موقع فراہم کرنا تا کہ وہ اپنے ملکوں سے ہجرت کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

3۔ تمام تر اسلامی ممالک میں ماڈرن سائنس کے فروغ اور اس کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنا۔

ڈاکٹر عبدالسلام حساس اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے ان کا دل تیسری دنیا کی لو دیکھ کر پریشان رہتا تھا۔ حالانکہ دنیا کے سائنسدانوں کے حالات و کارناموں پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اکثر سائنسدان خود کو کسی ایک خاص فیلڈ تک محدود کر لیتے ہیں اور یوں ان کی تمام تر تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز محض ایک مخصوص میدان ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالسلام ایسی شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے نہ صرف سیاسی طور پر بلکہ سائنسی طور پر بھی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے ساتھ اپنی وابستگی کو ہمیشہ برقرار رکھا اور ساتھ ہی ساتھ تحقیقی کاموں پر بھی نگاہ رکھی۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ کسی طرح تیسری دنیا کے سائنسدانوں کی سائنسی تنہائی اور غربت و افلاس جیسے

مسائل کی تنہائی کو دور کیا جائے اور اس دنیا کو اسباب تلاش کیے جائیں اور وہ اس کام میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس سائنسی محرومی اور عمومی پسماندگی کی بنیادی وجہ ان کے نزدیک ٹیکنالوجی سے لاعلمی اور سائنس سے لاپرواہی ہے۔ ان کی بھرپور کوشش رہی کہ تیسری دنیا کے تمام ممالک آپس میں مل بیٹھ کر سائنس وٹیکنالوجی کی ٹرانسفر کی بجائے خود سائنسی فکر کو اپنے ملکوں میں روشناس کرائیں تاکہ یہ تاثر دور کیا جاسکے کہ تیسری دنیا کے ممالک اور سائنسدان سائنسی علوم سے نا آشنا ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ مشرق ومغرب کے درمیان سالوں کی نہیں بلکہ صدیوں کی سائنسی خلیج حائل ہے۔ انہوں نے پاکستان کے سائنسدانوں پرزور دیا کہ وہ اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے تحقیقی سرگرمیوں کو جاری رکھیں اور ہر ممکن کوشش کریں کہ دستیاب وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں۔ دراصل تحقیقی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ضروری وسائل کے نہ ہونے سے اکثر سائنسدان ناامیدی کا شکار ہوکر اپنی تحقیقی سرگرمیاں یا تو معطل کردیتے ہیں یا پھر بہت حد تک محدود کرلیتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے 'بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبیعیات' کے قیام کے بعد ہی سے پاکستانی سائنسدانوں کی کثیر تعداد کو اس مرکز میں ہونیوالی کانفرنسوں میں مدعو کرنا شروع کردیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ سائنسدان جدید طبیعیات کے بانیوں کے ساتھ رہ کر اپنی یاسیت کو کم کرسکیں۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ کار فزکس اور ریاضی کے علاوہ ٹیکنالوجی اور سائنسی وتکنیکی عوامل کی طرف بھی بڑھایا۔ انہیں جب کبھی بھی کسی بین الاقوامی ادارے، یونیورسٹی یا تحقیقی ادارے کی جانب سے شرکت کی دعوت ملی انہوں نے ہر فورم پر تیسری دنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً پاکستان میں سائنس کے لیے عملی اقدامات کرنے پرزوردیا۔ پروفیسر ایوان ارسو لکھتے ہیں کہ: ''پہلی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ عبدالسلام کے غم اور ناامیدیاں کسی ایک شخص واحد کی نہیں ہیں۔ جب وہ اپنی تمام تر داخلی قوت، شخصیت اور حق کے ساتھ ان غموں اور ناامیدیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آواز میں ترقی

پذیر ممالک کے ان فرقوں اور جماعتوں کی گونج ہوتی ہے جو دنیا کی درجہ بندی سے دوچار ہیں۔ جو غیر مساوات، ناانصافی اور غیر ترقی یافتہ ہونے کا داغ برداشت کر رہے ہیں۔ جو غربت اور بھوک کی سختیوں اور مسلسل بھڑکانے والی حقیقتوں کو ذہنی اور جسمانی بیماریوں کو ناخواندگی اور ناروا داری کو، ابتری اور تشدد کو برداشت کر رہے ہیں۔" [41]

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی تحریروں کو مختلف حصوں میں بانٹ کر دیکھا جا سکتا ہے۔

1۔ ایسی تحریریں جن میں پاکستانی سائنسدانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے تجاویز، مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کی جانب مثبت پیش رفت کی سفارش کی گئی ہے۔

2۔ ایسی تحریریں جن میں عالم انسانی کو درپیش مسائل بشمول تخفیف اسلحہ، نیوکلیائی پھیلاؤ، اور سائنس و ٹیکنالوجی کے غلط استعمال سے متعلق معلومات شامل ہیں۔

3۔ ایسی تحریریں جن میں انہوں نے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کی سائنسی محرومی دور کرنے کے لیے اداروں کی تجویز اور قیام کی جانب حکام کی توجہ مبذول کرائی۔

4۔ ایسی تحریر میں جس میں ان کے مضامین اور مختلف فورمز پر کی جانیوالی تقریریں شامل ہیں جو تیسری دنیا کے ملکوں کے لیے سائنسی پسماندگی دور کرنے کے ضمن میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ 5۔ ان کی وہ تحریریں جو خالصتاً فزکس سے متعلقہ ہیں جو انہوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے دوران تجربات سے حاصل شدہ نتائج سے اخذ کیں۔

ان تحریروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ صرف ایک نظری طبیعیات دان ہی نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی، معیشت دان منتظم، ادیب اور سب سے بڑھ کر ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا دارومدار اس کی سائنس و ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت میں مضمر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو اس بات کا شدید احساس تھا اور انہوں نے بارہا سائنس کے حوالے سے پاکستان میں ٹیکنالوجی کی منتقلی کی بجائے سائنس کی منتقلی پر زور دیا۔ ہماری صورتحال

ہمسایہ ممالک کے مقابلے میں انتہائی ناگفتہ بہ اور مایوس کن ہے۔ مثلاً پلازما طبیعیات میں پاکستان میں صرف تین جبکہ بھارت میں ڈیڑھ سو سائنسدان ہیں۔ اسی طرح لیزر فزکس میں پاکستان میں پندرہ جبکہ بھارت میں 200 سے زائد طبیعیات دان ہیں جبکہ ہمسایہ ملک چین میں یہ تعداد 2000 ہے۔ الغرض ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم تمام پاکستانی سنجیدہ ہو کر سوچیں کہ یہ پوری قوم کا مشترکہ مسئلہ کہ ان کا وطن بھی معاشی و اقتصادی میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے جبکہ پاکستان میں سنجیدہ طور پر سوچنے والے افراد کی تعداد زیادہ نہ ہی مگر موجود ضرور ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام مسلم دنیا کے بالعموم اور پاکستان کے بالخصوص سچے اور محب وطن سائنسدان تھے۔ اٹلی میں 1964ء سے قائم شدہ 'انٹرنیشنل سنٹر برائے نظری طبیعیات' کی طرز کا سنٹر قائم کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے ملک پاکستان میں یہ تجویز پیش کی تھی جو کہ منظور نہ ہوئی۔ اس بات کی مزید تصدیق کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''فروری 1974ء میں لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر انہوں نے اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کی تجویز پیش کی جسے پسند کیا گیا لیکن عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ 1983ء میں تھرڈ ورلڈ آف سائنس کی بنیاد ڈالی اور اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔'' [42]

ڈاکٹر عبدالسلام نے ترقی پذیر ممالک کو درپیش ان تین مسائل کا ہر فورم پر خصوصیت سے ذکر کیا۔ جن نے نہ صرف مسلم ممالک بلکہ بہت سے غیر مسلم ممالک بھی کسی نہ کسی صورت میں متاثر دکھائی دیتے ہیں:

1۔ ترقی پذیر ممالک کی سوسائٹیاں عادلانہ نظام قائم کرنے میں ناکام رہی ہیں۔

2۔ بہت سے افراد وسائل کی کمی یا عدم دستیابی کی وجہ سے اپنا Talent ظاہر نہیں کر پاتے اور یوں اپنی فکر کو Share بھی نہیں کر سکتے۔

3۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ سائنس ہماری مادی ضرورت پوری کرتی رہے جبکہ ہمارے

معاشرتی رویے اور اعمال کا سائنسی فکر سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہ ہے۔ یہ چند ایسے مسائل ہیں جن کا سامنا ترقی پذیر ممالک کو سب سے زیادہ ہے۔

تیسری دنیا کے سائنسدانوں میں تحقیق کی روایت بہت کم تھی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو اس بات کا احساس تھا کہ پاکستان میں ٹیکنالوجی بہت زیادہ پرانی تھی اور تعلیم کا نظام بھی زبوں حالی کا شکار تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں سرعت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے انٹرنیشنل سنٹر برائے نظری طبیعیات میں تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو سائنسی زرخیزی بہم پہنچانے کے لیے خصوصی پروگرام بھی تشکیل دیئے۔ انہوں نے سائنسی مشیر صدر پاکستان کے عہدے پر فائز ہو کر سب سے پہلے نظام تعلیم میں منصوبہ بندی اور ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کے نئے پروگرام ترتیب دیئے تاکہ پاکستان کے سائنسدانوں کے احساس محرومی کو دور کیا جا سکے۔ اس سائنسی تنہائی اور محرومی کو دور کے کرنے کے لیے انہوں نے اپلائیڈ فزکس کے پروگرام ترتیب دیئے ان پروگرامز میں بائیوفزکس، جیالوجی، کلائماٹالوجی، پلازمافزکس، سولر انرجی اور سول فزکس خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے تیسری دنیا کے سائنسدانوں کو اپنی ضروریات کے مطابق اپلائیڈ فزکس کے مختلف پروگرام اور مضامین میں شرکت پر آمادہ کیا اور خصوصاً پاکستانی سائنسدانوں کو ذہنی طور پر بیدار کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر غلام مرتضیٰ (16) 'پروفیسر سلام چیئر' گورنمنٹ کالج لاہور لکھتے ہیں کہ: ''چنانچہ چند دوسرے ساتھیوں سمیت میں نے بھی اپنے سابقہ مضمون کو خیر آباد کہا اور نئے مضمون کو اپنا لیا یعنی (Plasma Physics and Controlled fusion) آج میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے پندرہ سال کی کوششوں کے نتیجے میں اب یہ مضمون پاکستان میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔ درجنوں سائنسدان مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں میں اس مضمون کو پڑھا رہے ہیں۔''[43]

ڈاکٹر عبدالسلام ہمارے ملک کے تعلیمی نظام سے سخت خائف تھے۔ انہوں نے چونکہ کیمبرج

کے نظام تعلیم کے علاوہ چین، روس اور امریکہ کے تعلیمی نظام کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ بغور مشاہدہ بھی۔ لہٰذا اپنے اس مشاہدہ کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک میں سائنسی خلا تو موجود ہے ہی مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمارا تعلیمی نظام وقت کے بدلتے ہوئے جدید پیمانوں کے مطابق جدید نہیں ہے۔ وہ اس نظام کو ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کی بنیادی وجہ قرار دیتے تھے۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں لکھا کہ: ''آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا کہ ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔ تعلیمی نظام کا اولین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے.......... دوسو سال کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی، اس بات کو اب تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں لیکن اس طویل عرصے میں ہم اپنے اندر احساس یگانگت، احساس اخوت اور احساس قومیت پیدا نہ کر سکے۔[44]

ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستانی یونیورسٹیوں میں سائنس کی صورتحال اور مستقبل کے بارے میں انتہائی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ: ''ایک نہایت ہی افسوس ناک مثال پاکستانی یونیورسٹیوں میں سائنس کو نظر انداز کیے جانے کی ہے، گو نا قابل یقین مگر سچ ہے کہ پاکستان میں گریجویٹ سکول ٹریننگ کی کوئی روایت موجود نہیں ہے اس سلسلے میں ایک مثال پیش کروں گا۔ پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی نے بھی اپنی بنیاد پڑنے سے لے کر اب تک کامل سو سالوں میں ریاضیات میں ایک بھی Ph.D. پیدا نہیں کیا........... وہ ضروری اصلاح جسے میں پاکستان میں سائنسی تحقیقات کے بارے میں مستقبل کی بنیاد قرار دیتا ہوں۔ یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے لیے بڑے پیمانے پر وسائل کی فراہمی اور اس کے لیے الگ سرمایہ مختص کرنا ہے۔ اس اصلاح کے بغیر

پاکستانی سائنس کی نہ تو کوئی طاقت ہوگی نہ تو اس کی ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہوگی، اور نہ ہی اس کا کوئی پائیدار مستقبل ہوگا۔'' [45]

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے جہاں افرادی قوت مستحکم صورت میں موجود ہے یہاں سب سے بڑا مسئلہ جو پاکستان کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ہنر مند افراد مناسب ہنر مند سہولیات اور احساس تحفظ کے فقدان کے باعث کا اپنے ملک سے مغربی ممالک کا رخ کرتے ہیں اور یوں مشرقی یورپ کی طرح کے مسائل دینی نکاس (Brain Drain) جیسی صورتحال سامنے آتی ہے۔ الغرض اگر پاکستان کا حکمران طبقہ ان سائنسدانوں کو جو بیرونِ ملک کام کر رہے ہیں مناسب سہولیات کے عوض پاکستان میں کام کرنے پر راضی کر لیتے ہیں تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان میں بھی ٹرسٹے کی طرز کے 'سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس' اداروں کا قیام عمل میں لانے کی راہ ہموار ہو سکے گی۔ پاکستان آبادی کے لحاظ سے 12 کروڑ آبادی پر مشتمل ملک ہے اور چین کے برابر افرادی قوت بھی رکھتا ہے جبکہ پاکستان کی یہ افرادی قوت بہت سے مغربی ممالک فرانس اور برطانیہ سے بھی دگنی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سے چھوٹی معاشی ابتری کا سامنا کرنے کے بجائے مغربی ممالک کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں۔ اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''ہماری جامعات کو تحقیق پر زور دینا چاہیے۔ ہمیں اس معیار کا احترام کرنا چاہیے کہ یونیورسٹی کے ہر استاد کو اپنا آدھا وقت تحقیقی کاموں میں صرف کرنا چاہیے اور باقی آدھا درس و تدریس میں۔'' [46]

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اور ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں جہاں غربت کی سطح پاکستان سے کہیں زیادہ ہے اور پاکستان سے آبادی کے لحاظ سے بھی آٹھ گنا زیادہ ہے۔ وہاں کی جامعات ہر سال میں قریباً 300 پی ایچ ڈی (Ph.D) پیدا کرتی ہیں جبکہ پاکستان میں یہ شرح صرف 70 سے 50 کے درمیان ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حکمران طبقہ کو تعلیم جیسے اہم ترین مسئلہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ کسی بھی ملک میں معاشی اور اقتصادی صورتحال میں بہتری کے

لیے قدر آور عملی افراد کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ پاکستان میں تحقیق کے لیے جو سربراہ ادارہ تعینات کیے جاتے ہیں وہ تعلیمی اور تحقیقی میدان میں نااہل ہوتے ، اور فقط سفارش کے بل بوتے پر ان کی تعیناتی عمل میں آتی ہے تو ایسی صورتحال میں کسی طرح تحقیقی میدان میں بہتری لائی جا سکتی ہے؟ ڈاکٹر مجاہد کامران نے اس صورتحال کو یوں بیان کیا ہے کہ: ''ایک اہم بات جس کا اثر تحقیق پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں نااہل لوگوں کو سربراہ بنا کر لگا دیا جاتا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو چھوڑ کر ہماری کسی بھی جامعہ میں کوئی بھی صاحب تحقیق رئیس الجامعہ نہیں ہوا ہے۔'' [47]

صدر پاکستان کی جانب سے پاکستان دورے کی دعوت دیے جانے پر ڈاکٹر عبدالسلام نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے 15 دسمبر 1979ء کو پاکستان پہنچے۔ انہوں نے کراچی ایئر پورٹ صبح 9 بجے لینڈ کیا۔ اس دعوت پر انہوں نے ملتان، کراچی، اسلام آباد، پشاور، لاہور، جھنگ، حیدرآباد اور ربوہ کا دورہ کرنا تھا۔ 16 دسمبر کی صبح ڈاکٹر عبدالسلام نے ملتان سے اپنے دورے کا آغاز کیا۔ اس دورے کی ابتدا میں آپ نے سب سے پہلے اپنی ہمشیرہ مسعودہ بیگم (مرحومہ) کے ہاں نواں شہر ملتان میں قیام کیا اور بعد ازاں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی میں وائس چانسلر ڈاکٹر الطاف علی اور کمشنر ملتان کرنل (ر) نثار احمد خان کے ہمراہ یونیورسٹی میں طلباء سے بھی خطاب کیا۔ اس دوران بہت سے اخبارات نے اپنی رپورٹس اور کالم بھی لکھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''پاکستان میں سائنس کی ترقی سے پروفیسر سلام کو دلی لگاؤ رہا ہے۔ پاکستان سائنٹفک کمیشن کے 1959ء سے باقاعدہ ممبر اور 1974ء۔ 1961ء صدر پاکستان کے سائنس کے خصوصی مشیر کی حیثیت میں انہوں نے پاکستان میں سائنس کو فروغ دینے کی کوشش کو مستحکم کرنے اور اس مقصد کے لیے ادارہ قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن 1974ء۔ 1958ء کے ایک ممبر کی حیثیت میں اس کی پالسیاں بنانے اور اسے ترقی دینے میں انہوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔

1973ء میں پروفیسر سلام نے اسلامی سائنس فاؤنڈیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ 1974ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں اس کے لیے مسودہ پیش کیا گیا۔ یہ خیال اب ثمر آور ہوتا نظر آ رہا ہے اور ایسی فاؤنڈیشن اب قائم ہونے والی ہے۔'' [48] ڈاکٹر عبدالسلام بین الاقوامی سائنسی کمیونٹی میں تیسری دنیا کے واحد نمائندے تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ تیسری دنیا کی سائنسی اور ٹیکنا لوجیکل محرومی کو دور کرنے کے لیے ہر فورم پر بات کی جبکہ ان کا حال بھی دوسرے دانشوروں اور فلسفیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس بارے میں زاہدہ حنا ان کی پاکستان میں قدر و منزلت کے ضمن میں بیان کرتی ہیں کہ:

''ابن رشد سے عبدالسلام تک ہمارا اور ہمارے حکمرانوں کا اپنے دانشوروں، سائنسدانوں اور فلسفیوں سے ایک ہی رویہ رہا۔ کوئی ملحد تھا تو کوئی زندیق اور کوئی مرتد علمی اور سائنسی تحقیق و جستجو کا کسی بھی فرد کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سائنسدان کا عقیدہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن سائنس 'سکولر' ہے.......... سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کو خرید کر ہم سمجھتے ہیں کہ ترقی کر سکیں گے.......... یہ خوش فہمیاں ہمیں زوال کی ڈھلان پر لے گئی ہیں۔'' [49] ڈاکٹر عبدالسلام کو پاکستان اور اس کے سائنسدانوں سے بہت ہمدردی اور خصوصی محبت تھی۔ 1959ء میں کراچی ہوائی اڈے پر اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

''اب وہ یہ کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو بھی رائل سوسائٹی کا 'فیلو' منتخب کروائیں۔ چنانچہ ان کی جدوجہد سے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو بھی رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کر لیا گیا۔ یاد رہے کہ نئے فیلو کے انتخاب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم دو فیلو اس کا نام تجویز کریں۔'' [50]

ڈاکٹر عبدالسلام تیسری دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص سائنسی زرخیزی کی فضا قائم کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں اگر کسی

چیز کی کمی ہے تو وہ سائنسی فکر کی ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ انسان ٹیکنالوجی ٹرانسفر کی بات کرے، چاہیے کہ سائنس ٹرانسفر کی بات کی جائے!

ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستان کی معاشی صورتحال کے تناظر میں اپنی سفارشات ہر فورم پر پیش کیں۔ وہ پاکستان کو ایک متکلم اور ابھرتے ہوئے ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلم دنیا کی پسماندگی کو سمجھنے کے لیے بہت سے مسائل کا ادراک نہ ضروری ہے۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ وسائل کا فقدان ہے۔ اس صورتحال کا جائزہ لینے کے یہ اقتباس انتہائی غور طلب ہے کہ:

''ہم نے ایک میٹنگ (ٹرسٹ) کے دوران جن میں مشرقی یورپ کے علاقے بشمول سویٹ یونین شامل تھے اور جہاں ہم یہ دیکھنے کے لیے بیٹھے تھے کہ ہم کس قدر امداد مشرقی یورپ کو دے سکتے ہیں۔ مشرقی یورپ کا مسئلہ ترقی پذیر ممالک سے جدا گانہ ہے، وہ یہ کہ وہاں پر بہترین تربیت یافتہ ماہرین موجود ہیں مگر کام کی کمی ہے اور خطرہ ہے کہ اگر اس معاملے کو یونہی ان اداروں پر چھوڑ دیا گیا تو ہجرت ماہرین (Brain Drain) کے ذریعے مغربی یورپ کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔'' [51]

چارلس سنگر نے اپنی کتاب (A history of Technology) کی دوسری جلد کے دیباچے میں لکھا ہے کہ: ''یورپ بہرصورت ایک جزیرہ نما ہے، جو افریشیا (Afrasia) کے عظیم علاقے کی توسیع میں ایک چھوٹا سا جزیرہ نما ہے اور بلاشبہ اس کی جغرافیائی حیثیت یہی کچھ ہے، اور کم از کم تیرہویں صدی تک عام طور پر اس کی یہی حیثیت ٹیکنالوجی کے سلسلے میں بھی تھی۔ ہنرمندی اور نئی ایجادات کرنے کے سلسلہ میں 500 سے 1500 عیسوی تک کے زمانے میں سنگر کہتا ہے کہ قریب مشرق، یورپ سے بہتر تھا۔ ٹیکنالوجی کی تقریباً ہر شاخ میں بہترین مصنوعات جو یورپ میں میسر تھیں، قرب مشرق ہی سے حاصل کی گئی تھیں۔ یورپ کی ٹیکنالوجی کے پاس کوئی ایسی شے موجود نہ تھی، جو وہ

قریب مشرق کو دے سکتا۔ ٹیکنالوجی کی تحریک کا رخ دوسری سمت میں تھا۔“ [52]

ہم فی زمانہ مغرب کو ہی سائنسی ترقی اور ترقی یافتہ مہذب قوم خیال کرتے ہیں جبکہ اس کا بنیادی سبب خود مشرقی اقوام رہی ہیں۔ اس ذیل میں C.P.Snow نے اپنی کتاب "The Two Cultures" میں اپنے ایک مضمون امیر اور غریب میں لکھا ہے کہ:

”کالونیل حکمرانی کے بعد غریب اقوام نے تفاوت کا نوٹس لیا اور اس سے سبق سیکھا کہ امیر بننے کی ترکیب کا راز سائنس اور ٹیکنالوجی میں مضمر ہے کیونکہ انہوں نے اس حربہ کو دریافت کر لیا تھا کہ مغربی سائنس کی اجارہ داری اب زیادہ عرصہ چل نہ سکے گی۔۔۔ تکنیکی طور پر یہ ممکن ہے کہ انڈیا، افریقہ، جنوب مشرقی ایشیاء، لاطینی امریکہ اور مشرق اوسط میں اگلے پچاس سالوں کے اندر ایسا سائنسی انقلاب برپا ہو سکتا ہے جو ہمارے دو کلچروں کے درمیان پیدا ہونے والے شگاف کو بھر دے گا۔“[53]

آپ کو اپنے ملک پاکستان سے بے حد محبت تھی۔ آپ نے تیسری دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص پاکستان میں ایٹمی توانائی کے ادارے کے قیام کے لیے انتہائی سنجیدہ کوششیں کیں اور ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی کے تعاون سے پاکستان میں ایٹمی توانائی کمیشن کے قیام کا خواب پورا کر رکھایا۔ آپ کئی برسوں تک اس ادارے کے ممبر رہے جبکہ آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں سائنس کے لیے علیحدہ وزارت قائم کی جائے اور وہ کسی سائنسدان ہی کی سرپرستی میں اپنے کام کو جاری رکھے جبکہ اس وزارت کو عام رسمی تعلیم کی وزارت سے علیحدہ رکھا جائے۔ جون 1961ء میں آپ صدر مملکت پاکستان کے سائنسی مشیر مقرر ہوئے اور مشیر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے آپ نے پاکستان کو تیسری دنیا میں بالخصوص اور مغربی دنیا میں بالعموم اپنی حیثیت کو منوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کوششوں کے بارے میں کراچی کے ممتاز شاعر، صحافی، اور ادیب جمیل الدین عالی لکھتے ہیں کہ: ”میں نے دیکھا کہ یہی ڈاکٹر عبدالسلام برسوں وفاقی وزارت تعلیمات کے چکر

لگاتے تھے۔ ایوان صدر جاتے تھے (جب صدارتی نظام تھا) کہ ایک وزارت سائنس قائم کی جائے اور پاکستان میں بڑے پیمانے پر سائنس کی ترویج شروع ہو۔۔۔۔ان کا موقف یہ تھا کہ پاکستان میں سائنس کا مزاج رکھنے والے طلباء وطالبات کی کمی نہیں، سائنس اور ٹیکنالوجی پاکستان کی ناگزیر ضرورت ہے۔" [54] گورڈن فریزر نے اپنی کتاب "Cosmic Anger" میں ڈاکٹر عبد السلام کی زندگی سے وابستہ صرف ایک ناکامی کا ذکر کیا ہے جو ان کی زندگی میں آنے والی شاید پہلی اور آخری ناکامی تھی۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دسمبر 1953ء میں ڈاکٹر عبدالسلام اپنی اہلیہ اور تین سالہ بیٹی عزیزہ کے ہمراہ کیمبرج میں ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔ فیملی کے برطانیہ آنے کے بعد کار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر سلام نے کار چلانے کے سبق لینے کے بعد جب امتحان دیا (لائسنس کے لیے) تو جب آپ کار کو صحیح رنگ میں ریورس نہ کر پائے تو ممتحن نے آپ کو فیل کر دیا۔ اس پر سلام بھونچکا ہو کر رہ گئے۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ آپ کسی امتحان میں فیل ہوئے تھے۔'' [55]

پاکستان میں سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے قیام کے لیے ڈاکٹر عبدالسلام کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ چند ایک کی تفصیل کچھ یوں ہے:

ڈاکٹر عبدالسلام 74-1958ء تک صدر پاکستان کی جانب سے سائنٹیفک ایڈوائزر رہے۔ آپ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے ممبر تھے اور پاکستان کے لیے آپ نے نیوکلیئر پروسیسنگ پلانٹ صدر ایوب خان کے حکم سے تیار کیا۔ آپ SUPARCO کے بانی چیئرمین منتخب ہوئے۔ آپ نے ڈاکٹر عثمانی کے ساتھ مل کر 1969ء میں رہبر اوّل نامی راکٹ خلا میں چھوڑا تھا۔ آپ نے KANUPP کراچی نیوکلیئر پاور پلانٹ کے لیے حکومت پاکستان کو تجاویز دیں۔ 1970ء میں نیشنل سائنس کونسل کے ممبر کے طور پر ایک جامع رپورٹ شائع کی۔ ٹرسٹے (اٹلی) میں 1964ء میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (ICTP) قائم کیا۔(www.ictp.it) 1985ء میں تھرڈ ورلڈ

اکیڈمی آف سائنس (TWAS) قائم کی۔آپ نے تھرڈ ورلڈ آرگنائزیشن فار ویمن (TWOWS) بھی قائم کی۔آپ نے تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک فار سائنٹفک آرگنائزیشن (TWNSO) قائم کی۔آپ 1959 میں ایجوکیشن کمیشن میں ممبر سائیٹیفک کمیشن آف پاکستان کے ایڈوائز مقرر ہوئے۔ اسلامک سائنس فاؤنڈیشن کے لیے اسلامک کانفرنس لاہور کے اجلاس منعقدہ 1974ء کے اجلاس میں ایک ڈرافٹ پیش کیا۔آپ نے 500 سائنسدانوں اور ٹیکنالوجسٹ کے لیے امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں نیوکلیائی تعلیم میں داخلے کا انتظام کیا۔پاکستان میں سائنس کی تعلیم کے فروغ کے لیے 5 سوپیریئر (Superior) سائنس کالجز قائم کیے۔حکومت پاکستان کی جانب سے ان کے اعزاز میں درج ذیل انقلابی اقدامات کیے گئے۔آپ کے جھنگ میں واقع آبائی گھر کو حکومت پاکستان کی جانب سے قومی یادگار کا درجہ حاصل ہے۔اس کے علاوہ جھنگ کالج میں" سلام بلاک"، گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ ریاضی کا بڑا ہال "سلام ہال"، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں "سلام چیئر (Salam Chair in Physics)،قائم ہوچکی ہے۔

لاہور کے محلہ نیومسلم ٹاؤن میں ریاضی میں ڈاکٹریٹ دینے والا ادارہ عبدالسلام سکول آف میتھی میٹکس ان کے نام سے موسوم ہے۔

اعزازات

5 اکتوبر 1979ء کوسٹاک ہوم میں آپ کو دنیا کا سب سے بڑا اعزاز نوبل پرائز عطا کیا گیا۔آپ پہلے پاکستانی مسلم سائنسدان ہیں جن کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔آپ کے نوبل انعام کی Original کاپی PG لائبریری گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں محفوظ ہے۔[56]

ڈاکٹر عبدالسلام کو ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے پرائڈ آئی پر فارمنس 1958 ستارہ امتیاز 1959،نشان امتیاز 1979ء جیسے اعزازات سے نوازا گیا۔

1988ء میں ملکہ برطانیہ کی طرف سے ڈاکٹر عبدالسلام کو (KBE Knight))

commander of the order of the British Empire کااعزاز دیا گیا۔

ڈاکٹرعبدالسلام کودنیا کی تقریباً 40یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ریاضی میں نوجوانوں کے لیے ڈاکٹرعبدالسلام پرائز ہرسال پاکستان کے ناموَرسائنسدانوں کودیا جاتا ہے۔انٹرنیشنل سنٹرفارتھیوریٹیکل فزکس جو1964ء میں قائم کیا گیا تھا،اب اس کا نیا نام عبد السلام انٹرنیشنل سنٹرفارتھیوریٹیکل فزکس ہے۔ری پبلک آف بینن(Benin)میں ڈاکٹرعبدالسلام سائنس انسٹیٹیوٹ قائم ہے۔ڈاکٹرعبدالسلام کے نام پرجینوا،(سوئزرلینڈ)میں ایک سڑک کا نام Route Abdus Salam ہے۔کینیڈا کے شہرمیپل،Mapleصوبہ اونٹاریو، میں ایک سڑک کا نام عبد السلام سٹریٹ ہے۔تھرڈورلڈاکیڈمی آف سائنسز،اٹلی کی جانب سے ہرسال عبدالسلام میڈل دیا جاتا ہے۔گورنمنٹ آف پاکستان نے21نومبر1998ءکوڈاکٹرعبدالسلام کےاعزاز میں 2روپے کا ڈاک ٹکٹ جاری کیاجس پرعبدالسلام کی تصویرچھپی ہوئی ہے۔ری پبلک آف بین(Benin)نے نومبر2001ءمیں ان کےاعزاز میں پوسٹل ٹکٹ جاری کیا۔26جون1989ء کوبکنگھم پیلس میں آنریری نائٹ کمانڈرآف برٹش ایمپائر(KBE)کااعزاز دیا گیا۔

خراج تحسین

ڈاکٹرمجاہدکامران نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

’’ڈاکٹرعبدالسلام اپنی عمرکےلحاظ سے دنیا بھرمیں سب سے بااثرسائنسدان تصورکیے جاتے تھے۔آپ کے پرستاراورشاگرددنیا بھرمیں موجودتھے۔ایک روسی سائنسدان’وی اےکوف‘ نے انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

"I found him very nice very open people who are not as big as he is, they will be busy when you go to them, But Salam is different"

کروشیاکےعظیم سائنسدان پروفیسرمیانی(Maiani)سےمیری ملاقات ہوئی۔میں نے انہیں

اپنا ایک مضمون دیا جو میں نے دیراک (Dirac) کی زندگی پر لکھا تھا۔ انہوں نے مضمون پسند کیا اور مجھ سے پوچھا کہ تمہیں یہ لکھنے کا خیال کیسے آیا میں نے کہا کہ اس لیے اس طرح کے مضمون لکھتا ہوں کہ نئی نسل کو سائنس میں دلچسپی ہو کیونکہ عملاً پاکستان سائنسی لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ اس پر پروفیسر میانی نے فوراً حیرت سے کہا:

Oh! but you have Abdus Salam."[57]

پاکستان اپنی توانائی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر اشفاق احمد نے اسلام کے بارے میں کہا کہ: پروفیسر عبدالسلام کی زبردست کنٹری بیوشن یہ تھی کہ انہوں نے ڈاکٹر عشرت عثمانی کو اٹامک انرجی کمیشن کا ممبر چنا اور بعد میں وہ اس کے چیئرمین بنے۔[58]

ڈاکٹر عثمانی کی تعیناتی پاکستان کے مستقبل کے لیے ایک نہایت اہم سنگ میل ثابت ہوئی اور پاکستان ایٹمی دنیا میں اپنا ایک انفرادی مقام حاصل کر سکا۔ اس ضمن میں یا اقتباس ملاحظہ ہو:

"One of the first action of Dr. Usmani as a chairman was to plan for sending out 500 Physicists, Mathematicians, health Scientists and biologistabroad.Salam helped Dr. Usmani not only in the formulation of this plan but also in its execution by helping in the placement of these scientists and engineers at the best academic institution in the US and UK." [59]

ڈاکٹر عبدالسلام کی ادبی خدمات

ڈاکٹر عبدالسلام کو بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ تھا۔ آپ کے والد مختلف موضوعات پر آپ کو چھوٹے چھوٹے مضامین قلمبند کرنے کے لیے دیتے تاکہ آپ میں چیزوں کے بارے مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کا ہنر پیدا ہو۔ اس کام میں چوہدری محمد حسین کو بے حد کامیابی بھی ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کو بچپن میں سائیکل پر بٹھا کر شہر جھنگ کی سڑکوں اور قرب و جوار کی فیکٹریوں کی جانب لے جاتے اور

راستے میں ان کو ہر چیز کے بارے میں مکمل معلومات دیتے تا کہ ان کا بیٹا حالات حاضرہ اور اشیاء کے بارے میں مکمل آگہی حاصل کر سکے۔ ویسے بھی بچپن میں انسان بہت متجس (Inquisitive) ہوتا ہے لہذا عبدالسلام بھی ہر چھوٹی چھوٹی بات اپنے والد سے وضاحت کے ساتھ دریافت کرتے اور جب گھر آ کر اس پر مضمون باندھتے تو وہ تمام باتیں جو انہوں نے اپنے والد کی زبانی سنی ہوتیں ہو بہو کمال ہوشیاری کے ساتھ زیب قلم کر دیتے۔ یوں آپ کی مضمون نگاری کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر عبدالسلام ایک بہترین انشاء پرداز تھے۔ وہ جزئیات نگاری سے تحریر میں جان ڈال دیتے تھے اپنے مضمون میری زندگی، میری جدوجہد میں لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یاد ہے کہ دو بجے دوپہر سائیکل پر سوار ہو کر میں مگھیانہ سے جھنگ شہر واپس لوٹا۔ رزلٹ کی خبر جھنگ شہر میں میرے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ چوکی پولیس والے گیٹ سے مجھے بلند دروازہ کی طرف جانا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ ہندو دکان دار جو عموماً مٹی کی اس تیز گرم دوپہر کے وقت اپنے کھاٹوں پر دکانوں کے چھپروں کے سائے تلے ہوئے ہوتے تھے۔ جس وقت میں سائیکل پر گزرا اس روز سب تعظیماً اپنی دکانوں میں میرے آنے کی انتظار میں قطاروں میں کھڑے تھے۔ ان کی اس علم نوازی کا نقشہ ہمیشہ میرے دل پر رہا ہے۔'' [10] ڈاکٹر عبدالسلام بچپن ہی سے اپنے خیالات کو موزوں انداز میں پیش کرنے لگے تھے۔ اس میں ان کے والد چوہدری محمد حسین کی ذاتی کوشش اور دانشمندی کا زیادہ دخل تھا۔ انشا پردازی کا میں خصوصی مہارت کے لیے آپ کے والد نے جھنگ کے مشہور شاعر شیر افضل جعفری سے گذارش کی کہ وہ سلام کو مضمون لکھنے میں مدد کریں اور مشق کروائیں۔ اس ضمن میں ابوذیشان لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر عبدالسلام نہ صرف تحریر کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ بحیثیت قادر الکلام انشاء پرداز بھی۔ ان کی ژرف نگاہی، بصالت فکر اور وسیع النظری کا تو ایک عالم معترف تھا۔۔۔۔ ان کے والد

ان کو اپنے ساتھ سہ پہر کے وقت سائیکل پر بٹھا کر جھنگ کے مختلف مضافات میں لے جاتے جہاں وہ کھلے میدان، فیکٹریاں، دکانوں، باغات دیکھتے، یا مختلف مشینوں کے انجن جیسے بھاپ انجن، کپاس اور فلور ملز سے انجن، موٹر کار، سائیکل اور سائنسی اہمیت کی چیزیں یعنی دریا چناب کا پل اور تریموں ہیڈ وغیرہ دکھاتے۔ واپس گھر آ کر ان کے والد مطالبہ کرتے کہ جو کچھ انہوں نے مشاہدہ کیا اس کو احاطہ تحریر میں لائیں۔ یوں ان میں مشاہدہ کی قوت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ تحریر کی صلاحیت بھی نکھرتی چلی گئی۔'' [61]

ڈاکٹر عبدالسلام نے جھنگ کالج میں نہم کلاس میں داخلہ لیا تو وہاں انہیں آپ کے والد کے دیرینہ دوست شیر افضل جعفری (جو کہ جھنگ کے بہترین شعراء میں ایک خاص مقام رکھتے تھے) کی صحبت حاصل رہی۔ اگرچہ شیر افضل جعفری ان کے باقاعدہ استاد تو نہ تھے مگر چوہدری محمد حسین کے کہنے پر انہوں نے عبدالسلام کی اردو تحریروں اور خوش خطی کی جانب خصوصی توجہ کی۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں ان کی آمد کے موقع پر مشہور شاعر شیر افضل جعفری نے اپنا کلام 'پنہاں دا چن' ان کے استقبال میں پڑھا تھا۔[22]

ڈاکٹر عبدالسلام کی ادبی خدمات کی ذیل میں یہ چند ادبی تحریر میں سامنے آئی ہیں:

1۔ اقبال میری نظر میں (یہ مضمون ڈاکٹر عبدالسلام نے اقبال ڈے پر 1938ء میں پڑھا تھا) 2۔ اردو ڈرامہ (ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں 'چناب'، مجلہ گورنمنٹ کالج جھنگ میں 1939ء میں شائع ہوا تھا) 3۔ غالب کی زندگی پر مضمون جس میں اسد سے غالب تخلص کی توجیح بیان کی گئی۔ یہ مضمون 1940ء میں لکھا اور بعد ازاں مجلہ 'ادبی دنیا' لاہور میں 1943ء میں شائع ہوا۔ 4۔ سر ظفر اللہ خان کو خراج عقیدت (مضمون) یہ مضمون انگلش میں لندن میں لکھا گیا تھا۔

5. "Hair and Hair Dressers" (Published in Ravi magazine 1940

6. "The white Arm" (Published in 'Ravi' magazine, 1945)

7. "Editorial" (Published in 'Ravi' magazine, 1945)

8. "The problems of sex disproportion (Published in 'Ravi' magazine, 1945)

9. "Off The Tnue" (Published in 'Ravi' magazine, 1945)

10. "A visit to Germany" (Published in 'Ravi' magazine, 1951)

11. "Poor as Nation" (Published in Ravi magazine, 1997)

12۔ترقی انسانی جہت (ارتقاء نمبر 8،فروری 1992ء)

13۔کتالونیا بین الاقوامی نظام (21) (جوابی خطاب: مجلہ Catalonia، یونیسکو کمیشن برائے کتالونیا، شمارہ نمبر 20، 1990ء)

14۔ پاکستان میں سائنس کی حیثیت، (ارتقاء پہلا ایڈیشن، فروری 1989ء)

15۔'اسلام اور سائنس'، اپریل 1984ء، (مشمولہ 'ارمان اور حقیقت'، 1993ء)

16۔ارمان اور حقیقت (مشمولہ 'ارمان اور حقیقت'، مترجم: شہزاد احمد، (1993ء)

17۔اسلامی ممالک میں سائنس کا مستقبل، (1987ء)

ڈاکٹر عبدالسلام کو ادب سے خصوصی دلچسپی اور شغف تھا۔ان کی ادبی زندگی کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ڈاکٹر عبدالسلام نے لٹریچر کے لیے بھی وقت نکالا، خصوصاً اردو اور فارسی شاعری کے لیے، جو ساری زندگی ان کا شوق رہا۔لاہور میں وہ کالج کے میگزین 'راوی' کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔یہاں بشیر احمد کی ادارت میں شائع ہونے والے میگزین میں اس نے اردو کے عظیم شاعر اسداللہ خان غالب کی زندگی پر مضمون بھی لکھا۔سلام کو عملی سیاسی زندگی کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب اس کو گورنمنٹ کالج سٹوڈنٹ یونین کا صدر منتخب کر لیا گیا۔'' [63]

ڈاکٹر عبدالسلام کی پہلی ادبی تحریر باقاعدہ طور پر اقبال ڈے 1938ء کے موقع پر گورنمنٹ کالج جھنگ کے جلسہ گاہ میں منظر عام پر آئی۔بعد ازاں یہ تحریر ہفت روزہ 'عروج'، جھنگ میں بھی شائع

ہوئی ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو مضمون نگاری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب وہ کلاس نہم میں تھے تو انہوں نے علامہ اقبال پر ایک مضمون بعنوان اقبال میری نظر میں (23) لکھا۔[64]

اس تحریر کے وقت ڈاکٹر عبدالسلام کلاس نہم کے طالب علم تھے۔ یہ جلسہ ڈاکٹر محمد اقبال کی پہلی برسی 21 اپریل 1939ء کے موقع پر گورنمنٹ کالج جھنگ میں منعقد ہوا۔ اس مضمون سے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"In the ornate style of classical Urdu writers, Salam Wrote that if Iqbal, a poet of the caliber of Kalidas, Khusrow, and Ghalib, had not been born in India, the majestic peaks of the Himalayas in their silence and the Sub lime water of the Ganges in its motion would have enternally complained to the creator." [25]

ڈاکٹر وحید قریشی ناظم اقبال اکادمی پاکستان نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ:

''میں نے ایک موقع پر تقریر میں عرض کیا تھا کہ عبدالسلام نوبل انعام یافتہ نے اقبال پر بھی ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کی کاپی مجھے پروفیسر سمیع اللہ قریشی صاحب نے مہیا کر دی ہے۔ آپ کے ریکارڈ کے لیے اور کالج لائبریری کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔'' [66]

اس مضمون سے لیے گئے اس اقتباس میں ڈاکٹر عبدالسلام کی اردو زبان پر گرفت اور زبان کی لطافت ملاحظہ ہو:

''1876ء میں اس نوزائیدہ کی طبع رسا سے کون واقف تھا؟ جس سے گیسوئے اردو بھی منت پذیر شانہ تھی اور جس نے آ کر اس کی کایا پلٹ دی اور اس کو گنج زر دیا۔ اس وقت کیا کسی کو معلوم تھا کہ اس بچہ کی شوخی گفتار کے چرچوں سے زمین و آسمان گونج اٹھیں گے۔ نہیں ہرگز نہیں مگر فیضانِ تھے جو کہ انٹرنس کے درجہ تک طبیعت میں محفوظ رہے اور ایف اے کلاس میں مولانا میر حسن کی فیضان

صحبت نے ان جواہر کو جلا دی۔'' [27]

ڈاکٹر عبدالسلام کی ادبی تربیت ان کے والد بزرگوار نے بچپن ہی سے کرنا شروع کر دی تھی اور اس ادبی فضا میں اس وقت اور زیادہ رنگینی پیدا ہوئی جب آپ گورنمنٹ کالج جھنگ کے دوسرے سال میں مجلہ 'چناب' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس مجلہ سے آپ کے ادبی جواہر کھل کر سامنے آنے لگے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں اس مجلہ 'چناب' میں ڈاکٹر عبدالسلام کا ایک اردو ڈرامہ بھی شائع ہوا۔ (24) ڈاکٹر عبدالسلام کو شروع ہی سے انگلش، اردو، عربی اور فارسی زبانوں میں گہری دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے چوہدری محمد حسین نے ان کی ان زبانوں کے سیکھنے میں خاصی مدد کی اور بہترین اساتذہ کا انتظام بھی کیا جو ان کو باقاعدہ فارسی، عربی اور انگریزی زبان میں تعلیم دیتے اور زبان سے متعلق رموز واوقاف سمجھاتے تھے۔ آپ کے ادبی میلانات میں اضافہ کے لیے چوہدری محمد حسین ہمیشہ فکرمند رہتے۔ چوہدری عبدالحمید (برادرم عبدالسلام) لکھتے ہیں کہ:

''سیکنڈ ایئر میں انہیں کالج کے میگزین جس کا نام 'چناب' تھا کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس کام میں انہوں نے بہت دلچسپی لی اور میگزین کی ایڈیٹنگ (Editing) سے انہیں بہت فائدہ پہنچا۔ کالج کی لائبریری میں بہت اچھی کتابیں تھیں۔ اپنے کورس کی کتب کے علاوہ انہیں دوسری کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انہیں دنوں مرزا غالب پر نسخہ حمیدیہ یا 'دیوان غالب' مرتبہ عبدالرحمن پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جس سے انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ایک مقالہ لکھیں جس سے یہ ثابت کریں کہ مرزا اسداللہ غالب نے اسد سے غالب تخلص کب اور کسی تاریخ کو اختیار کیا تھا۔''[68]

عبدالسلام کی مضمون نگاری کے حوالے سے چوہدری محمد حسین نے گورنمنٹ کالج جھنگ کے پرنسپل سے دریافت بھی کیا کہ اسلام کے مضامین معیاری ہوتے ہیں یا نہیں؟ اس پر انہوں نے چوہدری محمد حسین سے کہا کہ وہ عبدالسلام کو نصیحت کریں کہ مضمون لکھتے ہوئے متن میں دوسرے ادیبوں کے لیے اقتباسات درج کرنے سے گریز کریں کیونکہ اس سے قاری کے لیے طبیعت میں

گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ سید ممتاز حسین شاہ لکھتے ہیں کہ:

''چوہدری صاحب نے اپنے بیٹے کو مجبور کیا کہ وہ مضمون نویسی میں زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس سلسلے میں مختلف شعرا و ادباء کی تحریر میں پڑھا کرے۔ عبد السلام کی تحریروں کو نکھارنے اور ان کے انداز عبدالسلام بیان کو بہتر بنانے میں مشہور جھنگوی شاعر شیر افضل جعفری نے اہم کردار ادا کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں انٹرمیڈیٹ میں چوہدری صاحب نے پرنسپل سے عبدالسلام کی مضمون نویسی کی اہمیت و قابلیت کے بارے میں صلاح و مشورہ کیا۔ پرنسپل صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ عبدالسلام کو اپنے مضامین میں جا بجا دوسرے مصنفین کی تحریروں کی جزئیات کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے اور انہیں موقع محل کے مطابق مختصر ہی استعمال کرنا چاہیے۔'' [69]

میاں بشیر احمد کی ادارت میں جب آپ رسالہ 'چناب' کے ایڈیٹر تھے انہی دنوں آپ نے بہت ہی عمدہ مضمون اسد اور غالب (25) کے موضوع پر بھی لکھا اس مضمون میں ڈاکٹر عبدالسلام نے تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شاعر اسد اللہ خان غالب نے اپنا تخلص اسد سے غالب کب اور کیوں تبدیل کیا۔ آپ نے اپنی تحقیق کے نتیجے میں اس سال کا بھی ذکر کیا جس سال انہوں نے تخلص تبدیل کیا اور یہ بھی بتایا کہ پہلی مرتبہ اس تخلص کا استعمال کب اور کہاں کیا؟ اس کے بارے میں بھی تحقیق کے ساتھ شواہد بیان کیے، اس دوران گورنمنٹ کالج جھنگ میں انٹرمیڈیٹ کے سالوں میں آپ کالج لائبریری کے انچارج بھی رہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس خاصی توجہ کا طالب ہے:

''جھنگ کالج میں سال دوئم میں عبدالسلام کالج سے نکلنے والے ادبی مجلہ 'چناب' کے ایڈیٹر بن گئے۔ بحیثیت ایڈیٹر اس رسالہ میں ان کا مضمون شائع ہوا۔ جو مرزا غالب کے شاعرانہ تخلص تبدیل کرنے کی تاریخ کے تعین کے بارے میں تھا بعد میں یہ مضمون 1943 میں اس وقت کے مشہور ترین

صف اوّل کے اردو رسالے ادبی دنیا میں دوبارہ شائع ہوا۔عبدالسلام کو اپنے اس اعلیٰ تحقیقی، ادبی اور منفرد قسم کے مضمون پر ہمیشہ فخر رہا۔'' [70]

ڈاکٹر عبدالسلام ادب کو زندگی کا بنیادی حوالہ سمجھتے تھے۔آپ ابتدا ہی سے روزمرہ زندگی کے واقعات و حالات پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتے۔آپ کو فارسی اور اردو شاعری کے علاوہ شعراء کرام کے حالات زندگی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"His extracurricular study of Urdu poetry was motivated by his fascination for dervishes,holy men, priests and mystics who preached pilosophical doctrines of Monism or the unity and immience of God. In fact Salam loved Mirza Ghalib's poetry so much that he wrote an article on him duringhis student day. It was published in an Urdu magazine called'Adbi Duniya'(Literary World)." [71]

ڈاکٹر عبدالسلام کو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا وہ اپنی کم عمری سے ہی چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ان کے اردو کے استاد شیر افضل جعفری جن کا تعلق جھنگ سے تھا ان کی اردو کی نوک پلک درست کرتے تھے۔لکھنے کا یہ عمل زندگی بھر جاری رہا۔اپنے ایک مضمون میری زندگی، میری جدوجہد میں ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں کہ:

''میں جھنگ کالج میں 1938ء میں بارہ برس کی عمر میں داخل ہوا۔چار سال یہاں گزرے۔ اس زمانے میں یہ کالج انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔نویں دسویں، فرسٹ ائر اور سیکنڈ ائر کی کلاسیں تھیں۔ کثرت ہندو طلبا کی تھی۔میری خوش قسمتی تھی کہ کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق استاد ملے۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین (مرحوم) تھے۔انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد، عربی کے شفیق استاد صوفی ضیاء الحق، فارسی کے استاد خواجہ معراج الدین، حساب اور سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔حساب میں لالہ بدری ناتھ، اور لالہ رام لال، فزکس

کے استاد لالہ ہنس راج اور کیمسٹری کے استاد لالہ نوبت رائے تھے۔[72]

ڈاکٹر عبدالسلام کو ادب سے خصوصی دلچسپی اور شاعری سے خصوصی شغف کی بنا پر کالج میگزین کا ایڈیٹر بننے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ پہلے وہ گورنمنٹ کالج جھنگ کے میگزین 'چناب' اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں رسالہ 'راوی' کے اردو اور انگلش سیکشن کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اکتوبر 1945ء میں آپ 'راوی' کے ایڈیٹر ان چیف اور اسی سال اپریل 1945ء میں بطور جوائنٹ ایڈیٹر کے بھی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ جب راوی کا سوندھی (26) نمبر شائع ہوا تو اس وقت بھی آپ بطور ایڈیٹر ان چیف تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ یہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے کہ کالج کے پرنسپل کی بیٹی جس کا نام ارمیلا تھا، آپ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ارمیلا جو ڈاکٹر عبدالسلام سے سینئر تھیں، وہ 'راوی' کے انگریزی سیکشن کی ایڈیٹر رہی تھیں۔ اس وقت رسالہ 'راوی' میں ہندی، اردو، پنجابی اور انگلش سیکشن علیحدہ علیحدہ صفحات پر مشتمل ہوتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام ان کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام کی ہینڈ رائٹنگ انتہائی خوبصورت اور دلکش تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے لفظ خود اپنے معنی بیان کرنے کی جستجو میں ہوں۔ اس ذیل میں ان کا ایک خط جو کہ انہوں نے ملتان میں فارانی صاحب کے نام لکھا وہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔[73]

اس وقت آپ کی عمر صرف 14 برس تھی۔ انور دل کی کتاب ''سائنس فار پیس اینڈ پراگرس'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"Abdus Salam's Urdu letter to his teacher Mr. Farani thanking him for his challenging teaching, affectionate guidance and prayers resulting in his creating a new record of highest marks in the matriculation examination of the Punjab University, 1940." [74]

ڈاکٹر عبدالسلام کو لفظوں کی معنوی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ تھا۔ ان کے تمام تر مضامین میں

محاورات وتراکیب کا استعمال ایک وجدانی کیفیت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔فارانی کے نام اس خط سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جوان کی خطوط نگاری کے فن کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔

''اس کامیابی کے لیے میں آپ کی مشفقانہ نصائح اورآپ کی تدریسی سرگرمیوں کا مرہون منت ہوں۔ میں خود حاضر ہوکر اپنے جذبات تشکر و امتنان کا اظہار کرتا لیکن مجھے اٹھائیس دن لگا تار بخار آتا رہاہےاور میں بہت کمزور ہوگیاہوں،اسی لیےمعذر ہوں۔امید ہے کہ جب آپ ملتان تشریف لائیں گےتوشرف بازیابی حاصل کروں گا۔'' [75]

آپ کی ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی کے پیش نظر آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی مجلہ 'راوی' کا ایڈیٹرمقرر کیا گیا۔آپ اس رسالہ میں بطور ایڈیٹر(اردو،انگریزی)مقرر تھے۔اس دوران آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں سٹوڈنٹ یونین کے صدر بھی رہے۔ڈاکٹرعبدالسلام کوبچپن ہی سے والد محترم کی سرپرستی میں مضامین لکھنے کا شرف حاصل رہا۔آپ نے اپنے سکول کے زمانہ میں بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی جھنگ کے مقامی اخبار کے لیے لکھیں اس طرح ان میں انشاپردازی کی صلاحیتیں آہستہ آہستہ پروان چڑھتی رہیں۔

ڈاکٹرعبدالسلام ضمون نگاری میں اپنی خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ ہرفورم پر کرتے تھے۔ مارچ 1936ء میں جھنگ میں منعقد ہونیوالی تعلیمی نمائش کے مقابلے میں انہیں ڈپٹی کمشنر جھنگ کی جانب سے بہترین مضمون لکھنے پر پہلے انعام سے نوازا گیا۔آپ ایک قادر الکلام انشا پرداز اور بہترین ادیب تھے۔آپ کوشاعری کا ذوق بھی تھااورخصوصاً فارسی شاعری انتہائی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ آپ کی وسیع النظری،ژرف نگاہی اور بصالت فکر کے باعث آپ کی تحریریں معنی آفریں اورسحر انگیز ہوتی تھیں۔ان کوتقریر میں بھی کمال حاصل تھا۔تقریر کافن انہوں نے اپنے والد سے سیکھا۔ ان کے والدخصوصی طور پران کوسمجھاتے تھے کہ تقریر کے دوران کسی مقام پرٹھہرنااورکس مقام پر بات کوزیادہ زوردے کر بیان کرناہے۔آپ کوخیالات کو بیان کرنے اورمناسب الفاظ کے انتخاب

میں خصوصی مہارت حاصل تھی اور اس کام کی انجام دہی کے پیش نظر آپ کو تاریخی شخصیات کے اقوال اور تواریخ بھی زبانی یاد ہوتی تھیں۔ آپ کی مضمون نگاری کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنے کے لیے شیر افضل جعفری ان کو مضامین لکھنے کی باقاعدہ مشق بھی کرواتے تھے، تاکہ ان کے طرز تحریر میں عمدگی اور تحریر کی شگفتگی میں بھی اضافہ ہو۔

الغرض آپ کی تحریروں، تقاریر، رپورٹس اور مضامین پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک صاحب اسلوب ادیب، بہترین دانشور اور فلسفی تھے۔ آپ ایک صاحب طرز ادیب اور بالغ نظر مفکر کے طور پر بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ ایک صوفیانہ مزاج، سائنسی دماغ اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی تمام تحریروں میں سحر انگیزی، جزئیات انگاری، واقعہ نگاری اور فلسفیانہ طرز فکر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی ادبی قدر و منزلت ان کے خطوط سے بھی بخوبی لگائی جاسکتی ہے۔ ان کو اپنے ملک پاکستان اور اس کے لوگوں ملکہ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپ باقاعدہ اپنے دوستوں کی جانب سے لکھے گئے خطوط کا جواب لکھ کر بھیجتے اور ان کی محبت اور شفقت کا جواب بھی انتہائی محبت اور خلوص سے دیتے۔ سال 1996 میں آپ کی صحت بہت خراب ہو گئی مگر اس کے باوجود آپ نے ڈاکٹر ممتاز حسین شاہ جو کہ بزم ڈاکٹر عبدالسلام کے سیکرٹری تھے کو ایک خط کے جواب میں اپنی والہانہ محبت کا اظہار ان لفظوں میں کیا:

"............My dear Mumtaz Hussain Shah Sahib would ask you to firstly pass my Salams and best wishes to all the assembled brothers and sisters. Please continue to pray for me as t continue to pray for you. Without the power of prayers we are nothing. As you all know I am suffering from a rare illness which is known as 'Progressive suprahvclear palsy .This disease alone, has prevented me from visiting my beloved Pakistan. I miss my home country and I would dearly love to return to see

all my family and friends]]".76

ڈاکٹر عبدالسلام کو کلام پر قدرت حاصل تھی۔ ان کا اپنا ایک منفرد اسلوب بیاں تھا۔ دنیا کے عظیم ترین افراد میں ایک خوبی ہمیشہ موجود ہوتی ہے کہ چاہے وہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ بولیں مگر ان کا وجود ایسی سحر انگیز لہریں چھوڑتا ہے کہ سامنے والا ان کے سحر میں گرفتار ہو کر بہت کچھ وارسیکھ لیتا ہے۔ ان کے جسم سے نکلنے والی لہریں سامعین کے لیے علمی پیاس کو بجھانے کا باعث بنتی ہیں کیونکہ علم ایک روشنی ہے اور روشنی کو منتشر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا جبکہ وہ بغیر Medium کے بھی سفر کر سکتی ہے۔ ان کو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا اور خود اعتمادی ان کے لہجے میں بلا کی تھی حالانکہ انگریزی ان کی مادری زبان نہ تھی مگر اپنے خیالات کو بیان کرتے ہوئے اتنی خوبصورتی سے انگریزی بولتے کہ مضامین خود بہ خود اپنی نہیں کھولتے نظر آتے۔ ڈاکٹر عبدالسلام انتہائی باریک بینی سے باربر کی تکنیکی ہنرمندی اور شیونگ کے طریقہ کار کو پر تجسس انداز میں دیکھتے ہیں۔ وہ ایک عمیق نظر ادیب تھے ان کی نظر نہ صرف مشرقی بلکہ مغربی ادب پر بھی تھی۔ انہوں نے اپنی ادبی حیثیت کو انگریزی مضامین میں بھی منوایا۔ پہلا مضمون 1940ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ راوی میں" Hair and Hairdresser" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ مضمون شگفتہ طرز تحریر کا نمونہ ہے۔ مضمون میں مختلف ممالک میں باربر شاپس میں استعمال ہونے والے اوزاروں اور ان کے استعمال سے متعلق بنیادی نوعیت کی تفریق کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ذاتی طور پر ان کا تجربہ انہیں اس وقت ہوا جب وہ پیرس میں حجام کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ یہ اقتباس اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے:

"Hair dressing and shaving is one of the most atrocious ordeals that have yet been the gloomy lot of civilized humanity.-for the very plain and simple reason that he never handled a razor or a pair of scissors. Anthropological research may have failed to lift the veil that countless centuries have

drawn across his immortal name-his, the pioneer of shaving and trimming." [44]

ڈاکٹر عبدالسلام کو بچپن ہی سے مضمون نویسی اور شاعری میں خصوصی دلچسپی رہی۔ وہ فارسی شعر بڑے ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ نائجل کالدر Nigel Calder نے اپنے مضمون 'سائنس کا انسان ۔۔۔عبدالسلام' میں لکھا ہے:

''بچپن ہی سے جب سلام نے ایرانی فلسفی اور طبیب ابوعلی سینا کی پرانی کتاب کے ذریعہ جھنگ میں عطار کو جوشاندہ اور دیگر شربت وغیرہ بناتے دیکھا تھا تب ہی سے انہوں نے اسلامی سائنس اور ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔ آج بھی ان کا مستقبل کے پاکستان کا تصور حرف مادی ضروریات کی تشکیل تک ہی محدود نہیں ہے ان کہنا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی قوم بلندیوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دے تو عالموں کو معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے، پاکستان کے دورے کے دوران ان کا شعر پڑھتے ہوئے شعراء کے درمیان قدردان اور نکتہ چین سامع کی حیثیت سے دیکھا جانا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔'' [78]

گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور مدیر کے آپ کی علمی و ادبی سرگرمیاں بہت حد تک مضمون نگاری کے لیے مخصوص تھیں یہاں پر آپ نے زندگی کے تجربات میں ادبی رنگ شامل کرنے کے لیے بھی مختلف قسم کے تجربات کیے۔ اس کے علاوہ آپ سیاسی طور پر بھی اپنے گردوپیش سے مکمل آگاہ تھے۔ آپ اپنے ادارتی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ:

"But the real shift of power cam when American capital moved across the ocean. During the 1st world war America became world's biggest furnisher of capital. The world finance centre definitely shifted from London to New York." [49]

ڈاکٹر عبدالسلام سائنس میں اپنی دماغ سوز مصروفیات اور تناؤ کو کم کرنے کے لیے اکثر اوقات

شاعری اور ادب کو بھی اپنے لیکچرز میں شامل کر لیتے تھے۔ وہ نظرت کے نادر نمونوں کو سائنسی آنکھ سے دیکھنے اور ان کے حقائق کو ادب کی زبان میں بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی ادب میں دلچسپی کا اندازہ رابرٹ وال گیٹ Robbert walgate کے مضمون Man of two worlds سے لگایا جا سکتا ہے یہ مضمون پہلی مرتبہ نیو سائنس لندن کے ہفتہ وار اخبار میں 26 اگست 1976ء کو شائع ہوا تھا:

"Abdus Salam, in a lecture delivered last December to the students of the University of Stockholm, spoke with controlled anger of exploitation of the third world by the advance nations piling fact upon fact, finaly he burst out passionately with these lines of Omar khayyam: Ah Love! could thou and I with fate conspir To grasp this sorry scheme of things entire Would not we shatter it to bits and then remould it nearer to the heart's desire] "80[

بطور ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالسلام پر بہت سی ذمہ داریاں تھیں ان ذمہ داریوں کو انہوں نے احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور اپنی ژرف نگاہی سے جلد ہی ایڈیٹر ان چیف بن گئے۔ ادبی سرگرمیوں نے ان کی ادبی شخصیت کی تعمیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ایڈیٹوریل سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے تاریخی صورتحال اور مستقبل کے خطرات کے پیش نظر اپنی بصیرت افروز گفتگو سے اہل نظر کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے:

"The age of Europe has passed, America stands at the peak of her prowess and glory, ready, perhaps, to decline. The Russia of Lenin and Trotsky, the promise of the new civilization of Beatrice and Sidney webb." [81]

ڈاکٹر عبدالسلام میں قائدانہ صلاحیتیں بچپن ہی سے ظہور پذیر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ 'چناب'

کے ایڈیٹر رہنے کی وجہ سے ان کے پاس کسی بھی ادبی رسالہ کی اشاعت اور ترویج سے متعلق بہت سی معلومات محفوظ تھیں۔ وہ ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر ذمہ داریوں کو مشترکہ طور پر بانٹ کر چلنے کے عادی تھے۔ ان کے خیال میں چند نام نہاد ادیب صرف سستی شہرت کے حصول کے لیے قلم کا سہارا لے کر معاشرے میں اپنا وقار قائم رکھنے پر بضد ہیں۔

بطور ایڈیٹر بلکہ مضمون نگار کے بھی انہوں نے اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو بخوبی احسن پورا کیا۔ کالج کے پرنسپل ڈی سوندھی کی بیٹی نے جب ایم۔اے انگلش میں فرسٹ کلاس حاصل کی تو انہیں بے حد سراہا گیا۔ بعدازاں مس ارمیلا سوندھی (Urmila Sondhi) کو 'راوی' کے انگلش کا رنر کا ایڈیٹر بنادیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے 'راوی' کی ادبی حیثیت بطور 'کالج میگزین' کے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے ایک مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"We find from the 'proceeds' of the Ravi- Box that there is considerable poetic genius in our younger generations we beg to remind our budding poets that if they had harnessed their talents in some more lucrative profession they might have had better chances of seeing their names in print." [82]

ڈاکٹر عبدالسلام انگریزی زبان پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ ان کو تاریخی اور مذہبی عقائد کا ادراک بھی تھا۔ اپنی یاداشتوں پر مشتمل ایک مضمون "White The Arm (گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلہ 'راوی' میں 1945ء میں شائع ہوا) میں انہوں نے مندر کی طلسماتی فضا اور وہاں پر موجود گولڈ اور سلور کے بتوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس مضمون میں عبادت گاہوں کی سحر انگیزی اور لطافت کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک سحر انگیز، غیر مرئی طاقت جو انسان کے ذہن پر قبضہ جما لیتی ہے اور پھر وہ ہمہ وقت اس کے فکر میں گرفتار دنیا سے بالکل نا آشنا سا ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں ایک ایسے کردار کو متعارف کرایا گیا ہے جو کہ

طلسماتی طور پر عبادت گاہوں کے اثرات کو محسوس کرتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"I felt, I had risen from a dream-I could take in the whole panorama of light and shade; that idol was placed in a niche across the room in the centre;I could not exactly discern its feature, limp in that mellow light; I think it was clay, plastered over with gold paper all a blaze of finery" [83]

ڈاکٹر عبدالسلام بطور ادیب حالات و واقعات کو بہت خوبصورتی سے اپنے مضامین کا موضوع بناتے تھے۔ ان کے مضامین میں تجسس اور سحر انگیزی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن میں ان کے ذاتی زندگی کے تجربات شامل ہیں اور وہ خود کو کردار بنا کر دنیا کا مشاہدہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کو شروع ہی سے اردو ادب سے بہت گہرا لگاؤ تھا وہ مختلف ادبی جرائد کا باقاعدہ مطالعہ بھی کرتے اور فارسی میں خصوصاً شاعری کی کتابیں پڑھانا پسند کرتے تھے۔ عبدالسلام نے جھنگ کالج سے ہی اپنی ادبی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ آپ باقاعدہ مضمون نویسی تو نہیں کرتے تھے مگر جب کبھی بھی کوئی تقریب یا کوئی اہم Event ہوتا تو آپ خصوصیت کے ساتھ اس میں دلچسپی لیتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالسلام معاشرتی ناہمواریوں اور زندگی کے نشیب و فراز کو بھی موضوع خیال بناتے تھے۔ ان کی تحریر میں حقائق پر مبنی ہوتیں اور ان کی تحریروں کو ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے نہ صرف پاکستان کے مسائل پر قلم اٹھایا بلکہ دنیا میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا ادراک رکھتے ہوئے بھی ان کے پائیدار حل کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے بے اعتنائی کے جس موضوع کو اپنے مضمون میں ڈھالا ہے اس سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں انفرادی تغیرات اپنے مخصوص معنی و مفاہیم رکھتے ہیں ۔ دنیا کے مغربی ممالک میں دوسری جنگ عظیم کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے بنیادی طور پر

مغرب کے لوگوں کی انفرادی زندگیوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا اور وہ پہلی طور پر اپنے مسائل میں اس قدر الجھ کر رہ گئے کہ قومی مقاصد کا حصول ان کی زندگیوں میں ثانوی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ایک عالمی مسئلہ پر 1945ء کے 'راوی' میں The Problem of Sex Disporportion کے عنوان سے عورتوں اور مردوں کے تناسب پر Sex کے اس انفرادی نوعیت کے مسئلے پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"But the sex-ratio holds for the entire population. It does not necessarily hold for each group in papulation population. An examination of sex-ratio for different age groups reveals that conditions were still more adverse in the marriage-able age-groups, although that males predominated in the earlier age-groups there was a still larger preponderance of the females beyond the age of fifteen." [83].

ادب ہو یا زندگی ہر ایک میں دو پائیدار تخلیقی صلاحیتیں بیک وقت موجود ہوتی ہیں اور یہ تخلیقی صلاحیتیں مظاہر قدرت کے مقابل اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں ہیں۔ بالکل اسی طرح ادب کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں، پہلی تخلیق کار کو ایک انتشار یا تصادم اور دوسری نظم وضبط و یکتائی کی جانب راغب کرتی ہے۔ تخلیق کار دونوں کو موضوع بحث بناتے ہوئے الگ الگ راستے متعین کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے جہاں ادب میں جمالیاتی پہلوؤں پر قلم اٹھایا وہیں پاکستان میں سائنسی ترقی، مسلمان اور سائنسدان کا باہمی تعلق اور اسلام اور مغربی معاشرے کے درمیان پیدا ہونیوالی خلیج کو کم کرنے میں بھی اپنا زورِ قلم استعمال کیا۔ ترقی انسانی رویوں میں شامل ایک ایسے جذبے کا نام ہے جو اس کی تہذیبی عوائل اور لمحہ بہ لمحہ ترقی کرتی زندگی کے مدارج متعین کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے ایک مضمون" ترقی ۔ انسانی جہت'' (27) میں بڑی خوبصورتی سے اپنا نقطہ نظر یوں بیان کیا ہے کہ:''اپنے مقالے کے پیش لفظ کے طور پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ترقی کا کوئی عمل ثمر یاب نہیں ہوسکتا جب تک اس سے متعلق افراد اولوالعزم اور اعلیٰ تربیت کے حامل نہ ہوں۔ اولوالعزمی ان کا

جز وایمان نہ ہو۔[85]

ڈاکٹر عبدالسلام کو علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بچپن ہی سے تھا۔ ان کے کلام کو بہت خصوصیت سے پڑھتے تھے اور علامہ اقبال کی نظم، شکوہ اور جواب شکوہ تو ان کو بے حد پسند تھیں۔ ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے انہوں نے اس نظم کا ایک بند پڑھا۔ اس کا جگجیت سنگھ نے اپنی کتاب میں بھی ذکر کیا۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"H e also recalled what he had read in his younger days at Lahore, namely, Sir Muhammad Iqbal's two celebrated urdu poems: 'Shikwa and 'Jawab-i-Shikwa'.....he remembered the famous stanza reproduced below: "In the midst of raging battle if the time came to pray, Hejazis turned the Mecca, kissed the earth and ceased from fray. Sultan and Slave in Single file Stood side by side, Than no servent was nor master, nothing did them divide. Between Serf and lord, needy and rich, difference there was none." [86]

ڈاکٹر عبدالسلام زمانہ طالب علمی سے ہی ادب میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے لکھنے کا Style بہت دلفریب تھا۔ بہت محنت اور توجہ کے ساتھ مضامین میں ادبی رنگ اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی ادب سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ نوبل انعام حاصل کرنے کے بعد بھی انہیں اپنے زمانہ طالب علمی کی ادبی کاوشوں کا کسی قدر خیال تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''میں کالج میگزین کا مدیر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے عبدالسلام کا ایک اردو ڈرامہ بھی شائع کیا تھا مگر افسوس کے میرے پاس اس رسالے کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں انہیں وہ پرچہ مہیا کروں جس میں یہ ڈرامہ چھپا تھا مگر

یہ پرچہ کہاں سے لاتا۔کالج کی لائبریری میں اس میگزین کا کوئی شمارہ محفوظ نہیں۔سنا ہے کہ 1950ء کے بعد ایک بار دریائے چناب کے سیلاب نے کالج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔دوسری کتابوں کے علاوہ کالج میگزین (میگزین کا نام بھی 'چناب' تھا) کے سارے پرچے بھی دریا برد ہو گئے تھے۔'' [87]

ڈاکٹر عبدالسلام سائنس اور آرٹس کو زندگی کے لیے ناگزیر تصور کرتے تھے ان کے نزدیک ہر شخص کائنات میں اپنی پہچان چھوڑ کر جاتا ہے مگر پہچان صرف ان لوگوں کی زندہ رہتی ہے جنھوں نے انسانیت کے لیے خلوص دل سے کام کیا ہو وہ لکھتے ہیں کہ:

"I believe that the rise of a great poet or a great writer or a great humanist in any civilization is not an isolated incident......that is always accompained by an equally siginificent emergence of men as great in science and philosphy]".88[

ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے والد سے بے انتہا محبت اور دلی لگاؤ تھا۔ان کی زندگی میں رنگ بھرنے میں سب سے زیادہ کردار ان کے والد کا تھا۔اپنے والد کی محبت اور شفقت کا تذکرہ ہمیشہ اپنے دوستوں سے کرتے تھے۔انہوں نے اپنے والد کی پدرانہ شفقت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے یہ مضمون لکھا۔ڈاکٹر عبدالسلام ادبی مضامین میں کردار نگاری کے ساتھ ساتھ چاشنی پیدا کرنے کے لیے جزئیات نگاری سے بھی کام لیتے تھے۔آپ اپنے والد کی دیکھ بھال میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ان کے والد مطالعہ کے بہت دلدادہ تھے اور کتابیں پڑھنا اور خریدنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔وہ ہر موضوع پر کتاب پڑھتے اور ڈاکٹر عبدالسلام کو بھی اچھی کتاب کا مطالعہ کرنے کے لیے کہتے۔ان کی کتاب سے محبت کے بارے میں ان کی بیٹی عزیزہ رحمن کا کہنا ہے:''ابی کے لیے باتھ روم بھی علمی تفکر کی جگہ تھی۔آنے والے مہمان ہمارے باتھ روم کی لائبریری دیکھ کر حیران ہوتے۔لندن،آکسفورڈ اور ٹریسٹ میں ان باتھ رومز میں ھکسلے،داغ دہلوی اور ووڈ ہاؤس کی کتابوں سے

لے کر نیو سائنٹسٹ، فزکس ٹوڈے اور اکانومسٹ رسالے موجود ہوتے تھے۔'' [89]

ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنی ادبی رغبت کو قائم رکھنے کے لیے بسا اوقات سیر و سیاحت کے دوران پیش آنے والے واقعات اور تجربات کو بھی زیب قلم کیا۔ ان مضامین میں ادبی رنگ بھی جابجا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں جو ان کے نزدیک ان کی زندگی میں شامل تجربات میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے۔ انہوں نے 1948ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں زمانہ طالب علمی کے دوران مضمون 'جرمنی کی سیاحت' کے نام سے قلم بند کیا بعد ازاں یہ مضمون گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ راوی میں بھی شائع ہوا۔ اس مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ان کی سیاحت سے دلچسپی اور سفر نامہ لکھنے کے فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے: ''جرمنی کی سرحد میں داخل ہونے کے ساتھ ہی تمام اخراجات بادیرین یوتھ ونگ نے ادا کیے تھے۔ غیر ملکی مہمان جن کی عمر تیس سال سے اوپر کی تھی ان کو میونخ شہر میں ٹھہرایا گیا تھا۔ کچھ کو ہوٹلوں میں اور کچھ کو نجی اقامت گاہوں میں ٹھہرایا گیا تھا۔۔۔ہم نے یہاں جرمن مہمان نوازی کا پہلا مزہ چکھا تھا۔ ٹرینیں بھری ہوئی تھیں اتنی ہی جتنی کہ یہ پاکستان میں ہجوم سے بھری ہوتی ہیں لیکن غیر ملکی Auslander کا لفظ بولنے سے ہمیں ہمیشہ کے لیے سیٹ مل جاتی رہی۔ ایسے لگتا تھا کہ پوری جرمن قوم کو باور کرایا گیا تھا کہ انہوں نے غیر ملکیوں سے کس قسم کا برتاؤ کرنا ہے۔'' [90]

ڈاکٹر عبدالسلام نے سفر نامہ لکھنے میں بھی اپنے ذوق قلم کا استعمال کیا۔ جرمنی میں جنگ کے بعد وہاں کی صورتحال بہت زیادہ پریشان کن تھی اور لوگ چھوٹے چھوٹے گھاس پھوس کے بنے ہوئے جھونپڑوں میں مقیم تھے مگر وہ اپنی حکومت اور جنگ کے بارے میں گفتگو سے گریز کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے جرمنی کے سفر کی یادداشت اور لوگوں کے حالات زندگی کو بھی قلمبند کیا۔ انہوں نے وہاں کے مقامی لوگوں سے انٹرویوز بھی کیے اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی یہ قوم کس طرح مشکلات میں اپنے اداروں کو مستحکم رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو مضمون

نگاری کے علاوہ خطوط نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ بہت ہی واقعاتی سطح پر آ کر لکھتے اور اپنے مکتوب میں ادبی حسن پیدا کرنے کے لیے فارسی اشعار کا استعمال بھی کرتے۔ سینٹ جان کالج کیمبرج سے لکھے گئے ایک خط سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو: ''قبلہ حافظ صاحب سلام مسنون!

گرامی نامہ ملا، بے اختیار زبان سے نکلا: ع۔ دے نامہ بتو خرسندم، تو بوئے کسے داری۔ اگر کہوں کہ اگر کہوں کہ آپ کے خط ملنے سے غایت خوشی ہوئی تو غلط ہے اگر کہوں کہ افسوس ہوا تو غلط تر۔۔۔۔ احساس ہو تو صرف اس قدر کہ یہ آج کی جنبش قلم بھی محض میکان کی ہے۔ [91]

ڈاکٹر عبدالسلام کا مکتوب نگاری میں غالب کا سا انداز تحریر تھا۔ بہت خوبصورتی سے مکتوب الیہ سے گفتگو کا آغاز کرتے اور اپنی بات کو بہت ہی زیادہ ادبی رنگ میں پیش کرتے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو ظرافت کی چاشنی کا اضافہ بھی کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں تجربات کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ ممکنہ حد تک حالات کو سامنے رکھ کر لکھتے اور حقیقی زندگی کے قریب تر رہ کر اپنے خط میں الفاظ کا بہترین چناؤ کرتے۔ عام خیال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں عریانی، فحاشی اور عیاشی کا بازار ہمہ وقت گرم رہتا ہے اور ایک قسم کی Sex-life سے شاید پورا یورپ لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس صورتحال کے تناظر میں لکھتے ہیں کہ:

''یہاں یونیورسٹی میں بیس انیس سال کے صاحبزادے بستے ہیں، نہ مرد اور نہ بچے۔ اس عمر سے گذر چکے ہیں کہ انہیں پیار کیا جا سکے اور خود پیار کرنے کے ناقابل۔ انگلستان حسین جگہ ہے گو لوگ اتنے حسین نہیں جتنا آپ تصور کر رہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے ذہنی رجحانات اتنے تندرست ہیں کہ اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ ہمارے طرح بیمار نہیں، اپاہج نہیں۔ ان کی زندگی میں Harmony ہے جو یہاں پر نہیں۔'' [92]

ڈاکٹر عبدالسلام کو تاریخ نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کی نظر حالات حاضرہ اور ماضی کے حالات و واقعات پر بہت گہری تھی۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا مذہب جس نے تمام دنیا کے

چھوٹے چھوٹے فرقوں اور مذاہب کو اپنے دائمی اثر سے متاثر کیا۔ آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افکار ونظریات اور ان کی پرکشش ہستی سے بہت انس تھا۔ انہوں نے 1947ء میں مسجد فضل لندن میں ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مضمون ’تاریخ اسلام .... ایک نظر میں‘ میں اسلامی تاریخ کے روشن پہلوؤں اور خلافت راشدہ کے ادوار اور فاتح اور مفتوح قوموں کے مابین پیدا ہونیوالی خلیج کی ذیل میں بہت خوبصورتی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مضمون پہلی بار ’مسلم ہیرالڈ لنڈن‘ میں 1983ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں مسلم ثقافت اور اس کے دیگر مذاہب سے دائمی تعلق اور مذہبی عقائد پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سنہری دور جس میں آنحضرت ﷺ کی سنت اور احادیث کی روشنی میں مسلمانوں نے اپنی اصلاح کی۔ یہ ایک ایسا دور تھا جب کائنات کا نظام ابھی ابتدائی تہذیبی عوامل کی جنگ لڑ رہا تھا مگر اسلام نے آ کر ان قوموں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور یہ انقلاب نہ صرف ان کی زندگیوں میں آیا بلکہ اس نے پورے تہذیبی نقشہ کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ بعد ازاں آہستہ آہستہ خلافت راشدہ کے دور کے بعد مسلمانوں کی آئندہ آنے والی خلافتوں کی گرفت کمزور پڑتی چلی گئی۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سائنسدان کس قدر ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہے اور اس کی نظر پوری اسلامی تاریخ پر بھی ہے۔

’’ہارون الرشید کی وفات کے ایک سو سال بعد عباسی خلفاء کی طاقت میں انحطاط آنا شروع ہو گیا۔ خراسان کے علاقہ میں سامانید حکومت قائم ہو گئی۔ فارس میں بودید حکومت، مصر میں فاطمی حکومت اور عرب میں کارمیتھین۔ فاطمی حکومت کے علاوہ ان تمام حکومتوں نے بغداد کے خلیفۃ کو برائے نام تسلیم کیا، مگر اسلامی امت اس قدر خلفشار کا شکار ہو چکی تھی کہ لگتا تھا کہ سیاسی طور پر تباہی اب اس کا مقدر بن چکی ہے۔‘‘ [93]

زندگی کے آخری ایام

ڈاکٹر عبد السلام مسلسل کام کی زیادتی کی وجہ سے ایک انتہائی پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ روزنامہ جنگ لندن نے 18 اکتوبر 1995ء کو ان کے بیٹے احمد سلام کی جانب سے ایک وضاحتی بیان شائع کیا۔ ''لندن: (سٹاف رپوٹر) نوبل انعام یافتہ ممتاز پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر عبد السلام نے اپنی یاداشت نہیں کھوئی اور ان کا دماغ سو فیصد پہلے کی طرح کام کر رہا ہے۔ یہ بات ان کے بیٹے احمد سلام نے ''جنگ'' کو بتائی، انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر عبد السلام کچھ عرصہ سے ''پروگریسیو پیر نیوکلیو پالیسی'' کی بیماری میں مبتلا ہیں .... ڈاکٹر عبد السلام کو جوان دنوں لندن میں ہیں، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے لیکن وہ دماغی طور پر معمول کے مطابق کام کر رہے ہیں اور اب بھی وہ دوست سائنسدانوں کے ساتھ سائنس کے متعلقہ شعبے پر باقاعدگی سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔'' [94]

ڈاکٹر عبد السلام کی سوانح عمریوں میں کاسمک انگر Cosmic Anger, 2008 ایک بہت خوبصورت اضافہ ہے۔ اس کتاب میں سے آپ کی زندگی کے آخری ایام کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

''سلام تنہا اور خاموش زندگی گزارنے لگا۔ آکسفورڈ دریا کے کنارے مکان میں سارا دن خموش بیٹھا رہتا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ بیٹھک (لیونگ روم) سے اوپر کی منزل پر واقع بیڈروم تک جا سکتا تھا ۔۔۔۔ قرآن مجید کی تلاوت کے ٹیپ کیسٹوں کو سننے کے علاوہ پاواوٹی "Pavavotti" کی مسحور کن آواز میں اوپرا کلاسیک سننا پسند کرتا تھا۔ مرض شدت اختیار کر گیا تو سلام کی قوت گویائی سلب ہوتی گئی .... تمام گفتگو کا اختصار آنکھوں کے اشاروں پر تھا۔ وہ رک رک کر صرف ایک ایک لفظ سر گوشی کے رنگ میں ادا کر سکتا تھا یا پھر سوالوں کا جواب ہاں یا ناں میں دے سکتا تھا لیکن پورا فقرہ ادا کرنے سے محروم ہو چکا تھا۔ 1995ء کے بعد اس کو کھانا نلکی کے ذریعے دیا جاتا تھا........... آخری دنوں میں سلام کئی مرتبہ زمین پر گر پڑا اور چوٹیں آئیں بلکہ بعض صورتوں میں ہسپتال لے جانا پڑا۔ 17 نومبر 1996ء کو وہ آخری بار اپنے بستر پر ایسا گرا کہ پھر ہوش نہ آئی۔'' [95]

وفات

ڈاکٹر عبدالسلام 21 نومبر 1996ء بمطابق 1417 ہجری بروز جمعرات اس دنیا سے رخصت فرما گئے۔ ان کی وفات پر نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی جرائد و اخبارات اور اشاعتی اداروں نے بھی تعزیتی کالم اور تعریفی کلمات سے ان کو خراج تحسین پیش کیا۔ دنیا کے 26 ممالک کی اہم شخصیات ان سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں ''روزنامہ خبریں'' میں 'گفتنی' کے عنوان سے کالم نگار انور سدید نے انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:۔

''ڈاکٹر عبدالسلام سادہ مزاج انسان تھے۔ علم و ادب سے انہیں گہری وابستگی تھی۔ حافظ اور اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ تنہائی کے لمحوں میں وہ اقبال پڑھتے تو ان کے فلسفہ حرکت و حرارت کو فزکس کے مطالعے سے اثبات فراہم کرتے اور ان سے مزید جستجوئے علم کا جذبہ حاصل کرتے۔ حافظ انہیں اس تجربے سے گزارتے جو قلب پر وارد ہوتا ہے تو کسی اور کائنات کی خبر دیتا ہے۔'' [96]

ربوہ میں تدفین: ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات کے بعد ان کا جسد خاکی ربوہ (چناب نگر) لایا گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق ربوہ میں ہی انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی وفات کے بعد دسمبر 1998ء ماہنامہ خالد ربوہ نے خصوصی شمارہ ڈاکٹر عبدالسلام نمبر شائع کیا تھا۔ 22 نومبر 1996ء کو ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کا مضمون "A hero is gone" شائع ہوا۔ اس سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"With the death of Prof.Abdus Salain, the world has lost one of the mightiest intellectuals born in the subcontinent and the most powerful and influential advocate of science for the developing countries."[97]

ڈاکٹر عبدالسلام کی دوسری اہلیہ محترمہ لوئس جانسن (28) سلام بھی ان کے جسد خاکی کے ساتھ ربوہ (پاکستان) تشریف لائیں۔ وہ بہت دکھ میں تھیں لیکن اس کے باوجود وہ پُرمسرت بھی تھیں کہ

ڈاکٹر صاحب کی آخری خواہش کے مطابق انہیں ربوہ میں سپرد خاک کر کے جا رہی ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ یہاں آ کر محسوس ہوا کہ لوگوں کا ان سے والہانہ پیار اور لگاؤ ہی تھا جو انہیں ہمیشہ یہاں آنے کے لیے اکساتا رہا۔'بزم عبدالسلام' کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبدالسلام کی 70 ویں سالگرہ منعقدہ 13 مارچ 1996ء کے موقع پر زاہدہ حنا نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''میں آج یہاں حاضر ہوئی ہوں تو اس لیے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی 70 ویں سالگرہ کے موقع پر خود اپنی اور قوم کی بدبختی پر گریہ کروں۔ اس بات کو کہوں کہ ہم نے نوبل انعام یافتہ عبدالسلام کے ساتھ وہی کچھ کیا ہے جو سینکڑوں برس سے ہم اپنے علماء اور فضلاء کے ساتھ کرتے آ رہے ہیں۔ ہم تاریخ کے اتنے بڑے جھوٹے ہیں کہ کل اپنے جن خرد افروز اور علم دوست مفکروں، دانشوروں اور فلسفیوں پر ہم نے کفر والحاد کے فتوے لگائے تھے، جن پر زیست حرام کر دی تھی، آج ہم ان ہی کے ناموں کے آگے رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اور ان کے نام سے پہلے 'امام' نہ لکھنے کو کفر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔'' [98]

ڈاکٹر عبدالسلام ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ عہد وسطی کے سائنسدانوں کے 500 سالہ زریں دور میں، خوارزمی، الرازی، حکیم بوعلی سینا، ابن الہیثم کے بعد آپ واحد سائنسدان ہیں جس نے سائنس کی دنیا کو زندہ جاوید حیثیت عطا کی۔ آپ کی شخصیت میں ایک جلیل القدر انسان، عظیم سائنسدان، قابل استار نامور ادیب، مقرر، عظیم فلسفی، کامیاب منتظم اعلیٰ نامور اور سائنسی سفیر مستور تھا۔ آپ کے اندر انیٹی امن کا خواہاں، خدا ترس، حب الوطن، پاکستانی سائنسدانوں کے روشن مستقبل کا خواہشمند جیسی ہزار ہا خصوصیات موجود تھیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(علامہ اقبال)

ڈاکٹر عبدالسلام سے مختلف فورمز پر کیے گئے انٹرویوز

ایک انٹرویو میں ان سے پوچھے گئے چند سوالات کے جواب پڑھ کر بخوبی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کتنے بڑے Visionist تھے۔ان کا دل پاکستان میں سائنسی ترقی کے زوال پر کڑھتا تھا:

سوال: تیسری دنیا میں سائنس میں انحطاط یا زوال کی وجہ کیا ہے؟

عبدالسلام: جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے ہم نے کافی حد تک سائنس دانوں کو نظر انداز کرنے کی ہی کوشش کی ہے۔اس حقیقت کے باوجود کہ وہ سائنسی نتائج جو دوسروں نے حاصل کیے ہیں ان کے بغیر ہم بھی قطعی زندہ نہیں رہ سکتے ۔ یہ ایک یہ ایک بہت بڑا المیہ رہا ہے کہ بنیادی اصولوں کا علم رکھنے والے مرد و خواتین کو ہمیشہ چھینا جاتا رہا ہے۔

سوال: کیا اس کا الزام صرف سائنسدانوں کو دیا جا سکتا ہے؟

عبدالسلام: نہیں! بدقسمتی یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ دفاع پر خرچ کر رہے ہیں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر بہت قلیل رقم خرچ کی جا رہی ہے۔

سوال: برین ڈرین کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

عبدالسلام: ایک بہت اہم مسئلہ جس کا ایک سائنسدان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ علیحدگی یا تنہائی ہے۔ ماحول سے علیحدگی اسے توڑ پھوڑ کا شکار کر دیتی ہے اور احساس علیحدگی ذہنی کام کے کسی بھی میدان میں موت کے برابر ہے۔ جو ممالک اگر خیال آفریں فضا مہیا نہیں کر سکتے تو پھر سائنسدان کو موردالزام ٹھہرانا بھی غلط ہے۔ کچھ ادارے جیسا کہ عالمی مرکز برائے نظری سائنس اور تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس (TWAS) ایسے اجلاس منعقد کروا سکتے ہیں جہاں سائنسدان اپنے جدید علم میں اضافہ لا سکتے ہیں۔اس سے برین ڈرین کو کسی حد تک روکا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے اداروں کی کوششوں کو سوگنا مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔"[99]

ٹورنٹو ریڈیو اسٹیشن (Chin) (17) پر ایک انٹرویو کے دوران ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ:

"پروفیسر نزندرناتھ۔۔۔آج تک صرف چند ایک ایشائی ودھوانوں کو نوبل پرائز ملا ہے۔ڈاکٹر سی۔

دی۔ رمن، رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر عبدالسلام۔

سوال: روزمرہ ایڈمنسٹریشن اور ریسرچ سے پیدا ہونے والے تناؤ کو کم کرنے کے لیے یا ریلیکس ہونے کے لیے آپ کرتے ہیں؟

عبدالسلام: سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے کام سے ہی سکون ملتا ہے۔۔۔۔۔ میں کوئی کتاب پڑھتے ہوئے سوجاتا ہوں، کوئی بایوگرافی کی کتاب ہو یا کوئی اور لائٹ سی ٹریول کی کتاب یا ناولوں میں سے مجھے 'ووڈ ہاؤس' سے بہت دلچسپی ہے۔'' [100]

ڈاکٹر عبدالسلام کی فکر سائنس کے میدان میں بالکل درست سمت پر گامزن رہتی تھی۔ ان کے نزدیک سائنس فطرت کی تلاش میں نئے نئے جہاں تخلیق کرنے اور واحدانیت کے طرف پیش قدمی کا بہترین ذریعہ ہے۔ پاکستان ٹائمز کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے اپنے اس (Vision) کی یوں وضاحت کی:

سوال: کیا سائنس کا علم (یا مطالعہ) انسان کو خدا کے نزدیک لے آتا ہے؟

عبدالسلام: سائنس اس معاملہ میں بالکل نیوٹرل ہے۔ یہ بات آپ کے ذاتی رجحان پر مبنی ہے۔ یہ آپ کی مذہبی اور کلچرل بیک گراؤنڈ ہوتی ہے جو آپ کو ایک خاص ڈگر پر چلنے پر اور سوچنے پر مجبور کرتی ہے مثلاً میری بیک گراؤنڈ اسلام کی وجہ سے 'وحدانیت' پر ہے تو میرے لیے واحدانیت لازمی امر ہے۔ جن دو کو میرے ساتھ انعام ملا ان میں سے ایک یہودی اور دوسرا عیسائی تھا۔ وہ تثلیث پر یقین رکھتا تھا، اس کے لیے بات واضح نہ تھی۔

سوال: کیا خدا کا وجود ریاضی کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

عبدالسلام: "This is Rubbish" یہ بالکل بے ہودہ مفروضہ ہے۔ اس بات کو سائنس میں دیکھا اور پرکھا ہی نہیں جاتا۔ دیکھیں موت کے موضوع پر سائنس میں کوئی بحث نہیں ہوتی۔ انسان کیوں پیدا ہوا اور کیوں مرتا ہے؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسائنس اس مسئلہ کو تو فارمولیٹ بھی نہیں

کر سکتی............ سائنس آپ کو بعض گائیڈ لائنز دیتی ہے۔'' [101]

ڈاکٹر عبدالسلام ایک سماجی مفکر کے طور پر بھی ہماری فکر کو مربوط اور منتظم صورت میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ان چند سوالات کی مدد سے ان کی فکر کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔یہ سوالات ملاحظہ ہو:

سوال: کیا ایشیائی سوسائٹی کے کردار اور جدید تکنیک کے تصور میں کوئی تضاد ہے؟

عبدالسلام: میں یہی کہوں گا کہ نہیں؟۔جاپان ہی کو لیجئے............لیکن میں خود کو پاکستان تک ہی محدود رکھ کر بات کرونگا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں جب عرب ممالک کے باشندے سائنس میں بہت ممتاز اور نمایاں مقام رکھتے تھے اس وقت اسلامی معاشرہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بے پناہ ترقی یافتہ تصور کیا جاتا تھا۔اس کے بعد بھی ترکی دور میں ترکوں کی صنعت وحرفت آج یورپ کی ابھرتی ہوئی ٹیکنالوجی سے کم تر نہیں تھی۔ یہ کہنے کے بعد مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ جس انداز میں ایشیائی زندگی نظام رواں دواں ہے۔اس میں بہت کی تبدیلیاں لانی پڑیں گی اگر ایشیاء کو صنعتی طور پر جدید بنانا ہے۔

سوال: سوال یہ ہے کہ کیسے؟ عبدالسلام: جب کوئی انسان صنعت کار معاشرے میں رہنے لگتا ہے تو اس میں مختلف اشیاء کی عادت کی پڑ جاتی ہے۔یہ مشکل نہیں ہے۔اس کو با آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے اگر ایک مرتبہ ذہنی رجحان تبدیل ہو جائے۔ یہ علم وفضل کی مانند نہیں ہے جس کی ترقی کے لیے طبعی روایات درکار ہیں۔اب روایت ہی کو لیجئے! میں اپنے پاکستانی طلباء سے کہا کرتا ہوں کہ اگر تم ہلبرٹ جیسے ریاضی دان پیدا نہیں کر سکتے تو اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔تم رامانوجن جیسے ریاضی دان تو پیدا کر سکتے ہو۔رامانوجن ایک نسبتاً غیر تربیت یافتہ نوآموز تھے۔

سوال: لیکن آپ خود کس مقام سے تعلق رکھتے ہیں؟

عبدالسلام: میرا وطن پاکستان ہے۔

سوال: میرا مقصد ہے کہ پاکستان نے آپ جیسے فرد کو کس طرح پیدا کیا؟

عبدالسلام: میں خود کو ہلبرٹ کے زمرے میں نہیں رکھتا۔ میرا موضوع نظریاتی طبعیات ہے۔ اور نظریاتی طبعیات فی الوقت ایک وجدانی کیفیت میں ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہم تجربات کی بلندیوں سے ہمکنار ہیں۔ ہم سراسر بے صبر ہیں۔ ہم ایک بازگشت ہے دوسری بازگشت تک کا انتظار بمشکل کرتے ہیں۔ اور جہاں تین بازگشت ہوئی ایک نئے نظریے کی تشکیل کر دیتے ہیں اور وہ نظریہ اگلے دن منتشر ہو جاتا ہے تو ہم فکر نہیں کرتے اور پھر الف، بے سے شروعات کر دیتے ہیں۔ نظریاتی طبیعیات میں یہ وجدانی ماحول ہے آپ کو ضرورت ہے مختلف صلاحیتوں کی اچھی قوت متخیلہ، وجدان وادراک کی اور ساتھ ہی اس بات کی کہ جو حقائق کے باہمی تعلق کو دیکھ سکے اور اسے سمجھ سکے۔ آپ کو فاضلانہ معلومات سے مزین بھی روایات کی قطعی حاجت نہیں ہے۔

سوال: آپ اس کا آغاز کیسے کریں گے؟

عبدالسلام: سب سے اہم قدم یہ ہے کہ ذہنی جمود کو توڑا جائے میرے ملک کا یہ حال ہے کہ آپ کسی بھی بات کی پانچ، چھ سات برسوں تک تبلیغ کیجئے گا، کرتے جایئے گا لیکن کوئی نہیں سنے گا اور اچانک ہی آپ دیکھیں گے کہ... مثلاً پاکستان میں سول سروس کو ہی لیجئے! سول سروس برطانوی حکومت کا ترکہ ہے۔ جس میں عام تعلیم رکھنے والے افراد قانون، امن اور مالیاتی ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوتے ہیں۔ بے ریا افراد اوّل درجے کے ناظم بنے ہوئے ہیں تے ہیں لیکن یہ نہ تو انجینئر نگ، حرفت اور سائنس جانتے ہیں اور نہ اس کے قدردان ہیں۔ ملکی ترقی کے لیے یہ لوگ مناسب نہیں ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس رواج کو جاری رکھنے کے حق میں بالکل نہیں ہوں۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے ہم برسوں سے چیخ رہے ہیں۔ یکا یک ہم نے دیکھا کہ سول سروس سے متعلق افراد ہی اپنے بچوں کو طبعیات، کیمیا، ریاضی اور انجینئر نگ کی تعلیم دلوا رہے ہیں۔ ان مضامین میں تحقیقی کام کے لیے اپنے بچوں کو بھیج رہے ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ جمود ٹوٹ رہا ہے، رکاوٹیں گر رہی ہیں

۔ایسے افراد کی تعداد کتنی ہے؟ کتنے پاکستانی نوجوان تکنیکی مضامین پڑھ رہے ہیں؟

عبدالسلام: ہم ان کی بات کریں جو پی ایچ ڈی کی منزل میں ہیں اور ان پر غور کریں گے جو انگلینڈ یا امریکہ میں زیر تربیت ہیں۔ اپنے اٹامک انرجی کمیشن کے ذریعے جو صرف ایٹمی انرجی کے پروگرام ہی کی تکمیل کرتا ہے۔ ہم نے پچھلے تین برسوں میں تقریباً پانچ سو افراد کو Ph.D کی منزل تک پہنچایا ہے اور یہ ہمارے ملک کے لیے بے شک بہت بڑی تعداد ہے۔

سوال: کیا یہ افراد پاکستان واپس چلے جائینگے؟

عبدالسلام: ہاں بالکل! وہ سب ایٹمی انرجی کمیشن کے ملازمین ہیں۔ وہ پاکستان جائینگے ہم ان کو اپنی یونیورسٹیوں اور دیگر شعبوں سے منسلک کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ ہم ماہر کیمیادان، ماہر طبعیات اور انجینئروں کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن ہم ماہر حیاتیات کا تحفظ نہیں کر پا رہے ہیں جو کہ ایک عظیم نقصان ہے۔

سوال: کیا زرعی ماہرین کا بھی نہیں؟

عبدالسلام: فی الحال نہیں دراصل ایٹمی انرجی کمیشن کی مانند کام کرنے والی کوئی دیگر تنظیم ہمارے پاس نہیں ہے۔"[102]

ڈاکٹر عبدالسلام کی زندگی ایک نظر میں

پیدائش: بمقام جھنگ (پنجاب، موجودہ پاکستان)، 29 جنوری 1926ء بمطابق 1344 ہجری، بروز جمعۃ المبارک۔

سکول میں داخلہ: 1934ء میں انہیں ایم۔ بی۔ مڈل سکول جھنگ شہر میں حافظ محمد امین (ہیڈ ماسٹر) کے سکول میں داخلہ کرایا گیا۔

کلاس ہشتم: 1938ء میں ایم۔ بی مڈل سکول جھنگ سے آٹھویں کا امتحان اوّل پوزیشن

میں پاس کیا جبکہ پنجاب بھر میں آپ پانچویں نمبر پر رہے۔ (19)

کلاس دہم (میٹرک): میٹرک کا امتحان 1940ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام صرف چودہ سال کی عمر میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرکے اوّل پوزیشن میں پاس کرکے نیا ریکارڈ قائم کیا۔[69]

انٹرمیڈیٹ: ایف اے (موجودہ F.Sc) کا امتحان 1942ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ سے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام اوّل پوزیشن میں پاس کیا اور 5.92٪ نمبر حاصل کیے۔

گریجویشن: 1944ء میں بی اے (موجودہ B.SC) ریاضی میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام اوّل پوزیشن میں پاس کیا اور 92.21 فی صد نمبر حاصل کیے۔

ماسٹرز: 1945ء میں M.Sc (فزکس) اور 1946ء میں M.Sc (ریاضی) اوّل پوزیشن سے گورنمنٹ کالج لاہور (پنجاب یونیورسٹی) سے پاس کیے اور 92.5 فیصد نمبر حاصل کیے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف 20 برس تھی۔

ڈاکٹریٹ: 1952ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے تھیوریٹیکل فزکس میں ڈاکٹر کیمر (Kemmar) کی سرپرستی میں .Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ پہلا سائنسی مقالہ: جون 1943ء میں آپ نے اپنا سائنسی مقالہ 'رامانوجن کا ایک مسئلہ' کے عنوان سے قلمبند کیا جو 1943ء میں میتھ سٹوڈنٹ جلد نمبر 10، شمارہ 2۔ 1 کی زینت بنا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے روانگی: 1946ء میں آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے پنجاب گورنمنٹ کی جانب سے سکالرشپ پر کیمبرج روانہ ہوئے۔ پہلا سمتھ پرائز: 1950ء میں آپ نے پری .Ph.D کے ضمن میں برطانیہ سے سمتھ (Smith) پرائز حاصل کیا۔ پاکستان واپسی: 1951ء میں آپ پاکستان واپس لوٹے اور صرف 25 سال کی عمر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1952ء سے 1954ء تک آپ پنجاب یونیورسٹی شعبہ ریاضی میں سربراہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

انگلینڈ روانگی: 1954ء کے آخر میں آپ انگلینڈ چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں بطور لیکچرار تعینات ہوئے اور یہیں آپ نے Unified Symmetry کا نظریہ پیش کیا۔ آپ یہاں 1956ء تک تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ امپریل کالج میں تعیناتی: آپ 1957ء میں امپیریل کالج یونیورسٹی آف لندن میں بطور پروفیسر نفسیات مقرر ہوئے اور آخری دم تک اس سے وابستہ رہے۔ مرکز نظریاتی طبیعیات سے وابستگی: 1957ء میں امپیریل کالج لندن میں نظریاتی طبیعیات کے شعبہ کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کے صدر مقرر ہوئے۔ رائل سوسائٹی فیلو: 33 سال کی عمر میں 1959ء میں رائل سوسائٹی کے کم عمر ترین فیلو (FRS) منتخب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مشیر برائے ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان: 1959ء میں آپ ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان میں بطور مشیر تعینات ہوئے۔ سائنس کمیشن آف پاکستان کی رکنیت: 1959ء میں پاکستان کے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کے عنوان کے تحت رپورٹ پیش کی اور یوں آپ کو سائنس کمیشن آف پاکستان کا رکن منتخب کیا گیا۔ مشیر برائے صدر مملکت: 1961ء میں آپ کو صدر مملکت پاکستان کا مشیر اعلیٰ برائے سائنس امور منتخب ہونے اعزاز حاصل ہوا۔ انجمن سائنس کے صدر: ترقی 62-1961ء میں آپ انجمن ترقی سائنس پاکستان میں بطور صدر خدمات سرانجام دیتے رہے۔

سپارکو میں خدمات: 64 - 1961ء تک آپ پاکستان کے خلائی ادارے سپارکو میں صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ICTP کا قیام: 1964ء میں آپ نے ٹریسٹے (اٹلی) میں انٹرنیشنل سنٹر فار تھیورٹیکل فزکس کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کے پہلے ڈائریکٹر منتخب ہوئے۔ گرینڈ یونی فکیشن تھیوری کا اعلان: آپ نے 1967ء میں الیکٹرو ویک تھیوری پیش کی جس پر نوبل انعام دیا گیا۔ نوبل پرائز کا اعلان: آپ کو 1979 میں کمزور نیوکلیائی قوتوں اور الیکٹرومگنیٹک فورسز کو متحد کرنے پر سب سے بڑا سائنسی اعزاز نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ اعزازی ڈگری: آپ کو 1979ء میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ Ideals and Relities کی

اشاعت: آپ کی سائنسی مضامین پر کتاب آئیڈیل اینڈ ریلیٹیز کی اشاعت 1984ء میں سنگاپور سے ہوئی۔

علالت

1989ء میں آپ شدید علیل ہوئے اور وہیل چیئر تک محدود ہو گئے۔

یونی فکیشن آف فنڈامینٹل فورسز کی اشاعت: 1990ء میں یونی فی کیشن کے موضوع پر بہت اہم کتاب (ForcesUnification of Fundamental) کی اشاعت عمل میں آئی۔امپیریل کالج اور ICTP سے ریٹائرمنٹ کا اعلان:1996ء میں شدید علالت کے باعث آپ نے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس اور امپیریل کالج سے سبکدوشی کا اعلان کیا۔

Slected Papers of Abdus Salam کی اشاعت:1994ء میں آپ کے سائنسی مقالات پر مشتمل کتاب سلیکٹڈ پیپرز آف عبدالسلام کی اشاعت منظر عام پر آئی۔

رموز فطرت کی اشاعت: آپ کی سائنسی تحقیقات اور زندگی کی جدو جہد کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے عبدالسلام سائنس اکیڈمی کنگسٹن (انڈیا) کی جانب سے محمد زکریا ورک کی کتاب 'رموز فطرت' کی ٹورنٹو (کینیڈا) سے اشاعت جون 1996ء کو عمل میں آئی۔آپ کی حیات میں یہ آخری کتاب تھی جو آکسفورڈ میں آپ کو بستر علالت پر پیش کی گئی تھی۔

وفات: 20 ۔ 21 نومبر 1996ء کی درمیانی رات بروز جمعہ المبارک قریباً 3 بجے آکسفورڈ (برطانیہ) میں آپ کی رحلت ہوئی۔

نماز جنازہ وتدفین:24 نومبر 1996ء بروز اتوار آپ کا جسد خاکی لندن سے PIA کے ذریعے صبح 9 بجے لاہور پہنچا۔ لاہور میں 25 نومبر بروز سوموار لجنہ اماء اللہ گراؤنڈ (ربوہ) میں 35،000 ہزار افراد کی موجودگی میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ بعدازاں وصیت کے مطابق آپ کو والد اور والدہ کے پہلو 'بہشتی مقبرہ' کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

(ماخوذ از: عالمی شہرت یافتہ سائنسدان، عبدالسلام، مرتبہ: عبدالحمید چوہدری)

حوالہ جات

1۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، فیروزسنز لاہور ص655

۔2 Abdul Hamid, Manuscript of a book, presented at Salam memorial meeting, Trieste (Itly), Nov, 1997, Page19-22

3۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسدان، عبدالسلام، مرتبہ: عبدالحمید چوہدری، احمد السلام، 8 کمپین روڈ، ایس ڈبلیو20، 16ین ڈبلیولندن، 1997ء ص380، خط سے اقتباس: ڈاکٹر عزیزہ رحمن، اور بشریٰ سلام باجوہ (امریکہ)

4۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسدان، عبدالسلام، مرتبہ: عبدالحمید چوہدری، ایضاً ص 24-25

۔5 Abdus Salam:"A biography by Jagjit singh, viking penguin, New Delhi, India 1992, Page2

6۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسدان عبدالسلام مرتبہ عبدالحمید چوہدری، (احمد سلام)، ایضاً، ص27

7۔ عظیم سائنسدان اور موجد، ترجمہ وتالیف: عامر ریاض، علی پلازہ، 3مزنگ روڈ لاہور، 2005، ص33

8. A Abdus Salam:"A biography by Jagjit singh, Do, Page 2

9. Abdul Ghani, "Dr. Abdus Salam A nobel Laureate from a muslim country", M. Aarif (Printers) Limited, Defence housing authority-Karachi-46, Page 117-118

10۔ عظیم سائنسدان اور موجد، ترجمہ وتالیف: عامر ریاض، ایضاً ص38

11".Abdul Ghani, "Dr. Abdus Salam A nobel Laureate from a muslim country", Do, Page 119

12۔عظیم سائنسدان اور موجد، ترجمہ و تالیف: عامر ریاض، ایضاً ص243

13۔عظیم سائنسدان اور موجد، ترجمہ تالیف: عامر ریاض، ایضاً ص43

14۔ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کی سائنسی خدمات، ڈاکٹریٹ کا مقالہ، الیکسیر ڈی گرائف، مترجم: زکریا ورک، نیاز مانہ پبلی کیشنز، 14بی ٹیمپل روڈ لاہور، 2010، ص 83

15۔خالد محمود عالم، پاکستان کے نامور سائنسدان، القمر انٹر پرائیز ز، اردو بازار لاہور، اکتوبر 2000ء ص 16

16۔دیکھئے ضمیمہ (ب) 17۔ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کی سائنسی خدمات، الیکسیز ذی گرائف، مترجم: زکریا ورک، ایضاً ص 301

18۔دیکھئے ضمیمہ (ب) 19۔دیکھئے ضمیمہ (ب)

20 ."Science for Peace and work of Abud Salam Edited by: Anwar Dil, Intercultural forum; Takshila Progress" Life Research University San Diego, Islamabad, 2008,P 575.

21۔ڈاکٹر عبدالسلام دی تقریر جیہڑی اوناں گرونانک دی یونیورسٹی وچ کیتی، ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، الفاظ پبلی کیشنز، 74 فیروز پور روڈ، لاہور میں 116

22۔انٹرویو، آزوارث میر، نوائے وقت، لاہور، 3دسمبر 1979ء

23۔ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، نوبل انعام کے موقع پر تقریر ایضاً ص23

24. C.P. Snow, "The Two Cultures, Cambridge University, 1993

25۔عالمی شہرت یافتہ سائنسدان عبدالسلام، مرتبہ: عبدالحمید چوہدری، ایضاً ص پیش لفظ

26۔ خالد محمود عاصم، پاکستان کے نامور سائنسدان، ایضاً ص168

27 .A Man of Science ;Abdul Salam Nobel laureate in Physics 1979,

Research Centre for cooperation with developing countries (R C C D C(Ljubljana, ol yugoslavia, 1987,page 3)B.Cizelj.)

28 .Science for Peace and Progress Life and work of Abdus salam, Edited by: Anwar Dil, Intercultural forum Takshila Research University San Diego, Islamabad 2008,Page 570-571

29- خالد اقبال یاسر محمد ارشد رازی، نوبل انعامات کے ایک سوتین سال (طبیعیات)، اردو سائنس بورڈ 299، اپر مال روڈ لاہوری 2004ء ص307

30- زکریا ورک، مسلمانوں کا نیوٹن، ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کا مضمون، عبدالسلام سائنس اکیڈمی، باکس 65، کنگسٹن ٹورنٹو کینیڈا، 2003ء، ص162،

31- ڈاکٹر عبدالسلام! اساسی قوتوں کی یکجائی، ترجمہ: انیس عالم، ڈاکٹر مشعل آر۔ بی۔ 5 سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور، 1997، ص47-48

32- ایضاً ص49

33- ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص30-25

34- تریسٹے! دنیا کے ماہرین طبیعیات کا مقام اجتماع، از ڈان بجرمین، ''ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے''، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص18

35. Gordon Fraser, "Cosmic. Anger" Oxford University Press, First edition 2008, Page xii 36.Prof. Riazuddin, "The Ravi", 1979, V:70, Page 11

37- ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص75-74

38- عبدالغنی، ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالسلام، شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی ص 35

39- روزنامہ نوائے وقت، 3 دسمبر 1979ء، انٹرویو: وارث میر سے انتخاب

40. Abdus Salam (Nobel Laureate), Achievements and honours,

Pakistan, physical society.

41۔ پروفیسر ایوان ارسو، ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص 41

42۔ انسائیکلو پیڈیا پاکستانی کا ایضاً ص 655656

43۔ زکریا ورک، مسلمانوں کا نیوٹن، ڈاکٹر سلام بحیثیت استاد، عبدالسلام سائنس اکیڈمی، باکس 65، کنگسٹن ٹورنٹو کینیڈا 2003ء ص 162-161

44۔ ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، میری زندگی، میری جدوجہد از ڈاکٹر عبدالسلام ایضاً ص 15-14

45۔ عبدالغنی، ڈاکٹر، ڈاکٹر عبدالسلام، شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی ص 132

46۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، پاکستان میں سائنس کی حیثیت، مترجم: افضال احمد، ارتقاء، ایڈیشن پہلا، فروری 1989ء، A/10 ولایت آباد نمبر، منگھوپیر روڈ کراچی ص 239

47۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، پاکستان میں سائنس کی حیثیت، مترجم: افضال احمد، ارتقاء، ایضاً ص 239

48۔ روزنامہ ڈان، کراچی، روزنامہ جنگ کراچی، 19 دسمبر 1979ء

49۔ زاہدہ حناء ابن رشد سے عبدالسلام تک، روزنامہ ایکسپریس لاہور، 23 نومبر 2008

50۔ عالمی شہرت یافتہ سائنسدان عبدالسلام!، مرتب: عبدالحمید چوہدری، ایضاً ص 107

51۔ عبدالسلام، ڈاکٹر کتالونیا بین الاقوامی نظام، ارتقاء، جنوری 1993ء، A/10 ولایت آباد نمبر، منگھوپیر روڈ کراچی ص 105

52۔ ڈاکٹر عبدالسلام، ارمان اور حقیقت، مترجم شہزاد احمد، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، 25 لوئر مال لاہور 1993ء، ص 400،

98- Page 96,The Two Cultures"Do", Snow. P.C.53

54۔ممتاز حسین شاہ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام تعارف اور خدمات، بزم ڈاکٹر محمد عبدالسلام، A-558بلاک 5، گلشن اقبال، کراچی 75300 پاکستان، ص 14

55۔ گورڈن فریز، کوسمک اینگر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2008ء

56۔دیکھئے ضمیمہ (ب) www.gc university Lahore.htm

57. The Concept, April 1994, By Dr. Mujahid Kamran

58۔دیکھئے خیمہ (ب)

59. The Nucleus, Vol. 93, No. (1-2), 1996, Page 2

60۔ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص 13

61۔ ابوذیشان، ڈاکٹر سلام بہ حیثیت انشا پرداز، زکریا ورک، مسلمانوں کا نیوٹن، عبدالسلام سائنس اکیڈمی، باکس 65، کنگسٹن ٹورنٹو کینیڈا 2003ء، ص 172-171

62۔دیکھئے ضمیمہ (ب) 63۔''ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کی سائنسی خدمات''، الیکسیز ڈی گرائف، مترجم: زکریا ورک، ایضاً ص 59

64۔دیکھئے ضمیمہ (ب)

65".Science for Peace and Progress" edited and compiled by: Anwar Dil, Intercultural forum, Takshila Research University, San Diego, Islamabad, 2008, P 630.

66۔ تحقیق نامہ شمارہ 6، 7، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور، سن 1997-98، ص 341

67۔دیکھئے ضمیمہ نمبر 1 (ماخوذ اقبال میری نظر میں۔عبدالسلام)

68۔عالمی شہرت یافتہ سائنسدان عبدالسلام، مرتبہ: عبدالحمید چوہدری، ایضاً، ص 35

69۔ممتاز حسین شاہ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام تعارف اور خدمات، ایضاً ص 12-11

70۔ ایضاً ص 12

71.Abud Salam":A biography by Jagit Singh-X-XDo, Page 6.

72۔ میری زندگی، میری جدو جہد از پروفیسر عبدالسلام، مرتب: احمد سلیم الفاظ پبلی کیشنز 740 نیروز پور روڈ لاہور، 73۔ دیکھئے ضمیمہ (ب)

74" .Science for Peace and Progress" edited and compiled by: Anwar Dil, Intercultural forum, Takshila Research University, San Diego, Islamabad, 2008, Page 630

75۔ دیکھئے ضمیمہ (ب)

76۔ ممتاز حسین شاہ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام تعارف اور خدمات، ایضاً ص5

77. From Ravi, 1940, 1997, V-84,GCU No 95(1), page 365

78۔ ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص73

79. The "Ravi", 1945, V:39,G.C.U.No.34(1), Page 3

80. C.H. Lai, Azim Kidwai, "Ideals and Realities" world scientific publishing co.pte. Ltd, Singapore 9128,1966, Page 451

81. The "Ravi", 1945, V:39,G.C.U.No.34(1), Page 6

82. "The Ravi", 1945, V:39,G.C.U.No. 34(1), Page 14

83. The 'Ravi', 1945, V:33,G.C.U.No.33(1), Page 8

84. The Ravi, 1945, V:39, GCU, No 33(1), page 7

85۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، ترقی انسانی جہت، مترجم: روشن بخاری، ارتقاء نمبر 8 فروری 1992ء، A/10 ولایت آباد نمبر 2 منگھو پیر روڈ کراچی، ص113

86 .Abdus Salam:"A biography by Jagjit singh, viking penguin, New Delhi, India 1992, Page 186

87۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، شام کی منڈیر سے، پبلی کیشنز لاہور، ص39

88۔محمد زکریا ورک، رموز فطرت، ایضاً ص184

89 ۔عبدالسلام، ڈاکٹر، جان سے پیارے ابی، ہفت روزہ الفضل انٹرنیشنل لندن، 28 جون 2000ء

90۔عبدالسلام، ڈاکٹر، جرمنی کی سیاحت، راوی، نومبر 1951، والیم: (1)45

91۔ سویرا 84 مئی۔جون 2006ء، قوسین، ٹیمپل روڈ لاہور، ص339

92۔ بہ خط، 30 جنوری 1947ء کو اوکاڑہ ڈسٹرکٹ پنجاب (انڈیا) روانہ کیا گیا، سویرا 84ء مئی۔جون 2006ء، قوسین، ٹیمپل روڈ لاہور ص 341

93 ۔عبدالسلام، ڈاکٹر، تاریخ اسلام ایک نظر میں، ریویو آف ریلیجنز لندن، اگست 2003ء، ترجمہ: زکریا ورک 94۔ محمد زکریا ورک، رموز نظرت، ایضاً ص179

95۔ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کی سائنسی خدمات، ایضاً، 2010ء، ص 324 (کاسمک اینگر سے ماخوذ) 96۔ انور سدید (گفتنی)، ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات پر خدا سے دعا، روزنامہ خبریں، 27 نومبر 1997ء

97۔ ماہنامہ، خالد، ربوہ دسمبر 1997ء، ڈاکٹر عبدالسلام نمبر، جلد 46، شمارہ 2 جص38

98۔ ماہنامہ، خالدہ ربوہ، ایضاً ص22

99۔ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: احمد سلیم، ایضاً ص 129 ـ128

100۔محمد زکریا ورک، رموز فطرت، ایضاً ص176

101۔ یادوں کی بارات، جاوید نذیر ضیاء الحق، پاکستان ٹائمز، 25 فروری 1983ء

102۔ڈاکٹر عبدالسلام شخصیت اور کارنامے، مرتب: ام سلیم، ایضاً ص56۔154

حواشی و تعلیقات

1۔ جناب عبدالحمید چوہدری ڈاکٹر عبدالسلام کے چھوٹے بھائی تھے اور سات بہن بھائیوں

میں ان کا نمبر تیسرا تھا۔ وہ 19 ستمبر 1933ء کو جھنگ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 1953ء میں ملتان سے B.SC کیا اور پھر انگلینڈ گئے جہاں انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ قیام بھی کیا۔ بعدازاں 1962ء میں سویڈن میں ڈیری پلانٹس کی مشینری بنانے میں ایک سالہ تربیت حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ 1997ء میں انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کی سوانح عمری تالیف کی تھی۔ 17 نومبر 1998ء کو وفات پائی۔ آپ ڈیری ٹیکنالوجسٹ کے طور پر پاکستان میں اپنی منفرد پہچان رکھتے تھے۔

2۔ مقامی زبان میں جھنگ درختوں یا جھاڑیوں کے 'جھنڈ' کو کہتے ہیں۔ اس ضلع سے دو بڑے دریا جہلم اور چناب گزرتے ہیں۔ 3۔ چوہدری محمد حسین (والد ڈاکٹر عبدالسلام) 2 ستمبر 1989ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جھنگ سے ہی حاصل کی بعدازاں اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آپ کی پہلی شادی سعیدہ بیگم سے جبکہ دوسری شادی ہاجرہ بیگم نامی خاتون سے ہوئی۔ آپ کے اپریل 1969ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ 4۔ گورنمنٹ کالج لاہور: گورنمنٹ کالج کی بنیاد 1864ء میں دھیان سنگھ کی حویلی میں رکھی گئی تھی۔ کالج کے پہلے پرنسپل ڈبلیو لائٹر فرائی برگ یونیورسٹی میں آئے تھے۔ ابتداء میں کالج میں فارسی، عربی، ریاضی اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کالج کی پہلی کلاس و طلباء پر مشتمل تھی۔ 1876ء میں جب طلباء کی تعداد 100 سے بڑھ گئی تو کالج موجودہ مینار والی بلڈنگ میں منتقل ہو گیا۔ کالج کی پہلی سالانہ تقریب اسناد 1900ء میں ہوئی تھی۔ کالج کا پہلا باقاعدہ شمارہ ''راوی'' کے نام سے 1906ء میں شائع ہوا۔ 1907 سے یہاں کے طلباء کو 'راوین' کہا جانے لگا۔ کالج کے قیام کے 138 سال بعد اس کو خود مختاری دی گئی اور پھر باقاعدہ طور پر 2002ء میں اس کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ کالج کی لائبریری میں 3 لاکھ سے زائد کتب موجود ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت یہاں پر طلباء کی تعداد قریباً ایک ہزار تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کے دو طالب علموں ڈاکٹر ہر گوبند کھورانا (29) کو 1968ء میں جبکہ ڈاکٹر عبدالسلام کو 1979ء میں نوبل انعام عطا کیا گیا۔

5۔ رینگلر: کیمبرج یونیورسٹی کی روایت میں ایک اصطلاح ہے جو فرسٹ کلاس ریاضی دانوں کے لیے مستعمل اصطلاح ہے۔ 6۔ امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، یونیورسٹی آف لندن کا باقاعدہ ایک سائنسی حصہ ہے جو 1907ء میں قائم کیا گیا۔ اس میں سٹی کالج، رائل کالج آف سائنس، رائل سکول آف مائینیز اور گلڈز کالج کو باقاعدہ طور پر ضم کیا گیا تھا۔ یہ کالج لندن میں ساؤتھ کینن سنگٹن پارک میں واقع ہے۔ جبکہ یہ کالج ہائر ایجوکیشن کے باقاعدہ ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم اور کلچرل سنٹر بھی قائم ہیں۔ اس کالج کے قیام کا مقصد ملک کو باقاعدہ طور پر سائنسدان اور ٹیکنالوجسٹ منتظم طور پر مہیا کرنا تھا۔ 1934ء میں جب کالج کے پروفیسر جی پی تھامپسن کو نوبل انعام سے نوازا گیا تو تب کالج کو اور بھی زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

7۔ کیمبرج: دریائے کیم (Came) کے کنارے پر واقع ایک خوبصورت شہر کا نام ہے۔ یہ شہر کالجوں کے شہر کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس شہر میں اکیس کالج ہیں۔ جبکہ اسی شہر میں کیمبرج یونیورسٹی بھی واقع ہے۔ جو 1915ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کالج کو نامور سائنسدان پیدا کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے جیسے نیوٹن وغیرہ۔

8۔ بگ سائنس ایک کالونیل ٹرم ہے جس سے مراد ریسرچ کے لیے بڑے پیمانے پر بجٹ، بڑا سٹاف، بگ لیبارٹیز، مشینریز، پارٹیکل ایکسل ریٹرز، لارج کولائیڈرز اور ریسرچ کے لیے بڑے تحقیقی اداروں کا حصول ہے۔ موجودہ صدی میں فزکس، کیمسٹری، لائف سائنسز اور ٹیکنالوجی کے میگا پراجیکٹس سبھی 'بگ سائنس' کے زمرے میں آتے ہیں۔

9۔ انوار دل کیلی فورنیا میں San Diego انٹرنیشنل یونیورسٹی لینگویج سائنس اینڈ کمیونیکشن میں (1973،2003ء) تک بطور پروفیسر تعینات رہے۔ انڈین یونیورسٹی سے Ph.D کی جبکہ ان کی پیدائش جالندھر پنجاب (پاکستان) کی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی پڑھتے رہے۔ چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ Graphic Painting Abstract-Calli میں پوری دنیا

میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

10۔ آئی سی ٹی پی: یہ اقوام متحدہ کا ایک غیر معمولی ادارہ ہے جہاں ہر سال کم و بیش پانچ سو کے قریب سائنسدان اپنے مقالات پیش کرتے ہیں اور ان سائنسدانوں میں اکثر تعداد ترقی پذیر ممالک کے سائنسدانوں کی ہوتی ہے۔ جو اپنی ذہنی آسودگی، سائنسی محرومی اور اکیلا پن دور کرنے کے لیے اس ادارے کا رخ کرتے ہیں۔ یہ ادارہ اقوام متحدہ کی دو ایجنسیوں بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی اور یونیسکو کے تعاون سے کام کرتا ہے۔

11۔ نکولیس کیمر: عبدالسلام کے P.hd کے سپروائزر تھے۔ اس کی پیدائش 1911ء میں سینٹ پیٹرز برگ میں ہوئی۔ بعد ازاں یونیورسٹی آف گوٹنگن (جرمنی) میں داخلہ لیا اس دوران یونیورسٹی میں کوانٹم تھیوری پر اعلیٰ تحقیقی کام ہو رہے تھے اور یہ یونیورسٹی تھیوریٹیکل فزکس کا عالمی مرکز سمجھی جاتی تھی۔ جس کی نگرانی و تدریس کا کام میکس بارن (Max-Born) کرتا تھا۔ میکس بارن کو بہت سی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ 1932 میں کیمر 'زیورک' آ گیا اور پھر 1963 میں لندن امپیریل کالج کی جانب رخ کیا۔ یہاں پر اس نے اعلیٰ تحقیقی کام بھی کیے۔ جس میں یوکاوا کی ''تھیوری آف سب نیوکلیئر فورسز'' کی وضاحت سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس نے نیوکلیئر فشن (Nuclear Fission) پر بھی کام کیا۔ 1936 میں وہ بطور معلم کیمبرج میں تعینات ہوا۔

12۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے 1957 میں لندن یونیورسٹی سے طبیعیات سے M.SC کیا۔ جبکہ لندن کے یونیورسٹی کالج کے شعبہ طبیعیات میں آفیسر تحقیق بھی رہے۔ 1960ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ وہ برصغیر کے پہلے سائنسدان ہیں جو 1961 میں ''سرن'' میں بطور مہمان سائنسدان تعینات ہوئے تھے۔ آپ 1966 میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی اسلام آباد کے پہلے ڈائریکٹر نامزد ہوئے تھے۔

13۔ یوکارا کی پیدائش 1907ء میں ہوئی۔ جاپان کا پہلا نوبل انعام حاصل کرنے والا رئیس تھا۔ جاپان کی ''یوٹو'' یونیورسٹی میں بطور پروفیسر لمبے عرصے تک خدمات سرانجام دیتا رہا اور پھر

1949ء میں کولمبیا یونیورسٹی کی طرف رخ کیا، بعد ازاں 1949ء میں ہی اس کو میسان (Meson) پارٹیکلز کے بارے میں پیشین گوئی کرنے پر Nobel پرائز عطا کیا گیا۔ یوکاوا کی دو مشہور کتابیں انٹروڈکشن ٹو کوانٹم مکینکس اور انٹروڈکشن ٹو تھیوری آف ایلمنٹری پارٹیکل بھی منظر عام پر آئیں۔ 1953ء میں وہ یوکاوا انسٹی ٹیوٹ آف تھیوریٹیکل فزکس کا پہلا چیئر مین منتخب ہوا۔14۔ یہ پارٹیکل، الیکٹران سے بھاری مگر پروٹان اور نیوٹران سے ہلکا ہوتا ہے۔ یہ انٹرایکشن میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔15۔ جگجیت سنگھ نے دعویٰ کیا ہے کہ ٹریسٹے میں (ICTP) کے ایک وزٹ کے دوران ایک مشہور طبیعیات دان نے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کی عمارت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ 'یہ تمام کام سلام کے لیے صرف ایک مشغلہ تھے۔16۔ پروفیسر غلام مرتضیٰ سلام چیئر کے پروفیسر اور 29 کتابوں کے مصنف ہیں۔ اب تک ان کے 132 ریسرچ پیپرز عالمی سائنسی جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں۔ سلام چیئر پاکستان میں عبدالسلام پر قائم ہونیوالی پہلی چیئر جو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں قائم کی گئی ہے۔

17۔ یہ انٹرویو ٹورنٹو کے مشہور ریڈیو اسٹیشن (Chin) پر جولائی 1980 میں نشر ہوا جب ڈاکٹر عبدالسلام نے نیویارک میں چند روز کے لیے قیام کیا تھا۔18۔ یہ آرڈر (KBE) کنگ جارج پنجم نے بیسویں صدی کے اوائل میں دینا شروع کیا تھا۔ اس کا مقصد ایسے افراد کی کاوشوں کا اعتراف کرتا تھا جو بظاہر جنگ عظیم دوم میں شرکت تو نہ کر سکے لیکن ان لوگوں نے برطانیہ کی جنگ کے دوران کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کی تھی۔ جن لوگوں کو یہ اعزاز عطا کیا جاتا ہے اگر وہ برطانوی شہری ہیں تو اپنے نام کے ساتھ SIR کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ سلام پہلا غیر برطانوی سائنسدان تھا جسے اس اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام اپنے نام کے ساتھ "Sir" سر کا اضافہ تو نہ کر سکتے تھے مگر یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

19۔ اوّل آنے والے لڑکا لائلپور (موجودہ فیصل آباد) کا تھا۔ اس نتیجہ سے چوہدری محمد حسین کو شدید افسوس ہوا چنانچہ انہوں نے اوّل آنے والے لڑکے اور عبدالسلام کے پرچے

نکلوا کر عبدالسلام کو دکھائے۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام ان دونوں پرچوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا بس ایک 'حادثہ' سا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد چوہدری محمد حسین نے اپنے بیٹے سے کہا کہ آئندہ ہر امتحان میں تم نے اوّل آنا ہے۔

20۔ شیر افضل جعفری خود کہتے ہیں کہ "میں ان کا با قاعدہ استاد تو نہ تھا مگر ان کی اردو کی نوک پلک درست کرنے کی ذمہ داری میری تھی۔ یہ بات انہوں نے مقالہ نگار سے ایک انٹرویو میں کہی جو کہ جھنگ شہر میں ہوا۔ 21۔ ڈاکٹر عبدالسلام کو "کتالونیا بین الاقوامی انعام" 29 مئی 1990ء کو بارسلونا (اسپین) میں کتالان انسٹی ٹیوٹ فار میڈیٹرینین سٹڈیز بارسلونا کی طرف سے دیا گیا تھا۔ 22۔ یونین کی صدارت نے عبدالسلام میں سیاسی زندگی کی جانب پیش قدمی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ 23۔ یہ مضمون ڈاکٹر عبدالسلام نے اقبال ڈے پر پڑھا تھا جو بعد میں ہفت روزہ عروج جھنگ میں بھی شائع ہوا تھا۔

24۔ افسوس کہ یہ ڈرامہ بے حد تلاش کے بار جو دستیاب نہ ہو سکا کیونکہ جھنگ کالج کے لائبریرین اور دیگر احباب کے توسط سے یہ پتہ چلا کہ دریائے چناب میں ایک بہت بڑے سیلاب نے تباہ کاریاں مچاتے ہوئے کالج لائبریری کا تمام تر پرانا خزینہ تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اسی سیلاب میں چناب کے پرانے ایڈیشن بھی دریا برد ہو گئے تھے۔

25۔ اس مضمون پر ڈاکٹر عبدالسلام کو ہمیشہ فخر رہا اور انہوں نے اس کا تذکرہ ایک مرتبہ ایک ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی کیا کہ یہیں سے اس مضمون کی کاپی انہیں مہیا کریں مگر وزیر آغا صاحب نے ان سے معذرت کا اظہار کیا کیونکہ یہ مضمون بھی سیلاب کی تباہ کاریوں کی نظر ہو گیا تھا۔ اور جھنگ کالج میں اس مضمون سے متعلق 'چناب' کا ایک ایڈیشن بھی محفوظ نہیں تھا۔ 26۔ کالج کے پرنسپل کا نام جی۔ ڈی سوندھی تھا۔ یہ شمارہ ان کے نام موسوم کیا گیا تھا۔ 27۔ ترقی کے عمل میں انسانی جہت، اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام UNDP کے تعاون سے متعلق ایک گول میز اجلاس کا موضوع تھا۔

28۔ ڈاکٹر 'لوئس سلام' عبدالسلام کی دوسری اہلیہ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام سے ان کے ہاں دو بچے

بیٹا عمر سلام اور بیٹی سعدیہ کی پیدائش ہوئی۔ وہ ایک لمبے عرصے تک آکسفورڈ یونیورسٹی میں مالیکیولز بیالوجی کی پروفیسر رہیں۔ آج کل ریٹائرڈ لائف گزار رہیں ہیں انہوں نے آکسفورڈ سے ہی ریٹائرمنٹ لی۔ ان کا پورا نام: J.Salam,Professor Dame D.R.Louise ہے۔ ان کے لیے خاص اعزاز "DAME" ڈاکٹر عبد السلام کو نائٹ کمانڈر آف برٹش ایمپائیر کا اعزاز پانے کی وجہ سے ملا۔

29۔ ڈاکٹر ہر گوبند کھورانا خانیوال کے نزدیک گاؤں رائے پور میں 1923ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک ڈی اے۔ وی ہائی سکول ملتان سے جبکہ 1943ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا جبکہ لیور پول یونیورسٹی سے انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 30۔ (ترجمہ: انہوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا جو انہوں نے جوانی کے دور میں لاہور میں پڑھا تھا، یوں یعنی سر محمد اقبال کی دو مشہور نظمیں، شکوہ اور جواب شکوہ۔ ان کو درج ذیل بند بھی خوب یاد تھا

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

(بحوالہ پاکستان کے نامور سائنسدانوں کی ادبی خدمات از عمران اختر۔ صفحہ 65 تا 144 ادارہ فروغ قومی زبان۔ پاکستان)

نوبیل انعام یافتہ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد السلام صاحب سے

وابستہ (چند متفرق) یادیں۔ انجینئر محمود مجیب اصغر سویڈن

ہمارے پہلے احمدی مسلمان سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد السلام جنہوں نے فزکس میں 1979ء میں نوبیل انعام حاصل کیا تعلیم کے میدان میں احمدی بچوں کے لئے رول ماڈل ہیں۔ اس مضمون میں آپ سے وابستہ چند متفرق یادیں شیئر کرنی مقصود ہیں۔

انٹر کالجیئیٹ ایسوسی ایشن

جب ہم انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پڑھتے تھے تو جمعہ مسجد دارلذکر گڑھی شاہو میں جا کر پڑھتے ہیں۔ ایک بار خطبہ ثانیہ میں اعلان ہوا کہ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب جمعہ کی نماز کے بعد احمدیہ انٹر کالجیئیٹ ایسوسی کے ممبران سے خطاب کریں گے ہم سب احمدی طلباء جو لاہور کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے تھے اس ایسوسی ایشن کے ممبر تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد طلباء کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے ساتھ کام کرنے والے تقریباً سب سائنس دان یہودی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جب میں نے ان کی کامیابی کا راز پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ توریت پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کر کے سائنسی علوم سیکھتے اور ترقی کر کے سائنس دان بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہودی تحریف شدہ کتاب پر عمل کر کے محنت کرتے ہیں اور سائنس دان بن جاتے ہیں جب کہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم کی شکل میں اعلی ترین کتاب موجود ہے اور وہ اسے نہ پڑھتے ہیں

اور نہ ہی عمل کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ امپیریل کالج لندن جہاں میں پڑھاتا ہوں تورات پڑھنے والے اس قدر پڑھائی میں دلچسپی لیتے ہیں کہ بروقت کلاس روم میں فائلوں، فٹ رول، اور کلرڈ پنسلوں کے ساتھ آتے ہیں اور پوری توجہ سے لیکچر سنتے ہیں اور نوٹس لیتے ہیں جب کہ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ خالی ہاتھ کلاس روم میں عموماً رول کال کے بعد آتے ہیں اور پتلون کی پچھلی جیب سے نوٹس لینے کے لئے کاغذ نکالتے ہیں اور وہیں پھینک کر چلے جاتے ہیں۔

نوبیل انعام کا حصول

1979ء میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو فزکس میں دو اور سائنس دانوں کے ساتھ نوبیل انعام ملا۔ پہلے احمدی مسلمان سائنس دان کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے جلسہ سالانہ پر ان کی بہت عزت افزائی فرمائی اور انہیں مختصر خطاب کرنے کا موقع دیا۔ دراصل آپ پر حضرت مسیح موعود کی عظیم الشان پیشگوئی پوری ہوئی تھی جس میں حضور علیہ السلام نے خدا سے خبر پا کر فرمایا تھا ''میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے۔'' فرمایا ''یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہوگا۔'' (تجلیات الٰہیہ)

جماعت احمدیہ کا تعلیمی منصوبہ

ڈاکٹر عبدالسلام کو رول ماڈل پیش کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے جماعت کے لئے تعلیمی منصوبہ جاری کیا اور outstanding طلباء کے لئے وظائف اور میڈلز کا سلسلہ شروع کیا۔ فرمایا کہ اگلی صدی جو غلبہ اسلام کی صدی ہے جماعت کو ایک ہزار چوٹی کے سائنس دان اور محقق چاہئیں۔

بچوں کے لئے شارٹ سٹوری بک ''پہلا احمدی مسلمان سائنس دان''

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے صدر صاحب خدام الاحمدیہ مرکزیہ محمود احمد صاحب شاہد

(المعروف بنگالی صاحب) کو ہدایت فرمائی کہ احمدی بچوں کی راہنمائی کے لئے ڈاکٹر عبدالسلام پر شارٹ سٹوری بک لکھوائیں ۔ چنانچہ بنگالی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے والد صاحب کی ڈائری ''سرگزشت'' دیتے ہوئے یہ assignment اس عاجز کو سپرد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور اس عاجز کی تصنیف کردہ شارٹ سٹوری بک ''پہلا احمدی مسلمان سائنس دان'' جو خلافت ثالثہ میں مکمل ہوئی تھی خدام الاحمدیہ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی وفات کے اگلے سال شائع کر دی۔ الحمدللہ۔

ڈاکٹر عبدالسلام سے ملاقات

1983ء کے جلسہ سالانہ ربوہ کے دوسرے دن 27 دسمبر کو ڈاکٹر صاحب کے ایک بھائی انجینئر محمد عبدالسمیع صاحب نے صدر انجمن احمدیہ کے گیسٹ ہاؤس ''سرائے محبت'' میں ان سے ملاقات کروائی اور انہیں شارٹ سٹوری بک (پہلا احمدی مسلمان سائنس دان پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام) پیش کی ۔ انہوں نے چند چھوٹی چھوٹی غلطیاں نکالیں اور واپس جا کر اٹلی سے اپنے مضامین پر کتاب (Ideals and realities) اور کچھ ریسرچ پیپرز اور مزید awards کی لسٹ بھجوائی ۔ جنہیں مجلس خدام الاحمدیہ نے اگلی اشاعت جو 2008ء میں ہوئی شامل کر لیا۔

سٹی ہال اور نوبیل میوزیم

میرے دل میں شوق پیدا ہوا کہ وہ جگہیں دیکھوں جن کا تعلق نوبیل انعام سے ہے اور جہاں ڈاکٹر عبدالسلام نے نوبیل انعام وصول کر کے حضرت مسیح موعود کی ایک عظیم پیشگوئی کو پورا کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے فضل سے اس کا انتظام فرمایا اور سویڈن کے شہر سٹاک ہوم میں اپنی فیملی کے ساتھ سٹی ہال اور نوبیل میوزیم دیکھنے کا موقع ملا۔

سٹی ہال میں ہر سال 10 دسمبر کو نوبیل انعام تقسیم کئے جاتے ہیں اور وہیں ڈاکٹر عبدالسلام نے 1979ء میں نوبیل انعام وصول کیا۔ شہر کے مرکز میں نہایت خوبصورت مقام پر lake Malaren کے کنارے سٹی ہال واقع ہے ۔ نوبیل انعام کے بانی الفریڈ نوبیل (1833-1896) کے نام پر بنایا

گیا ”نوبیل انعام میوزیم“ نوبیل انعام کے بانی کی زندگی، وصیت اور سائنسی علوم کے فروغ کا ایک مرکز ہے۔ یہاں نوبیل انعام یافتہ خوش نصیب لوگوں کے ریکارڈ کے رجسٹر اور نوبیل انعام کی تقریب کی فلمیں بھی display کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے ڈاکٹر عبد السلام کا رجسٹر میں ریکارڈ اور سٹی ہال کی انعام حاصل کرنے کی فلم display کر کے دیکھی۔

عبد السلام آئی سی ٹی پی ڈاکٹر عبد السلام صاحب کا اٹلی میں

International Centre for Theoretical Physics (ICTP)

قائم کرنا بہت بڑا علمی کارنامہ اور صدقہ جاریہ ہے اس ادارے کا نام ان کی وفات کے بعد انتظامیہ نے ICTPAbdus Salam رکھ دیا جس کے اندر داخل ہوتے ہی دیوار پر ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی ان کے دستخط کے ساتھ بہت بڑی تصویر آویزاں ہے۔ یہ انسٹی ٹیوشن اٹلی کے شہر ٹریسٹے میں واقع ہے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے 2018ء میں اپنی فیملی کے ساتھ دیکھنے کی توفیق دی۔

ہگز پارٹیکل کی دریافت

ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی تھیوری کے ضمن میں ہی CERN Geneva میں ہگز پارٹیکل کی دریافت کے لئے جن سائنس دانوں نے حصہ لیا ان میں سنوری خاندان کی ایک احمدی خاتون ڈاکٹر منصورہ شمیم بھی شامل ہیں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ ابھی سکول میں پڑھتی تھیں جب ان کے والد صاحب نے انہیں متذکرہ بالا شارٹ سٹوری بک ”پہلا احمدی مسلمان سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام“ پڑھنے کو دی کتاب پڑھ کر انہوں نے کم عمری میں فیصلہ کیا کہ وہ بھی سائنسدان بنیں گی چنانچہ اللہ کے فضل سے ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے نقش قدم پر چل کر پاکستان سے ایم ایس سی فزکس، عبد السلام آئی سی ٹی پی سے پوسٹ گریجوایٹ ڈپلومہ اور امریکہ سے پی ایچ ڈی کر کے اس ٹیم میں شامل ہوگئیں جنہوں نے سرن میں 2012ء میں ہگز پارٹیکل دریافت کیا ہے۔

ٹی آئی کالج (فزکس ڈیپارٹمنٹ)

ٹی آئی کالج ربوہ میں جب ایم ایس سی فزکس کی کلاسیں شروع ہوئیں تو حالت یہ تھی کہ ایک سال بعد اس کلاس کا ایک لڑکا پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آ گیا اور اکثر لڑکے پہلی دس پوزیشنوں میں آ جاتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر نصیر احمد خان صاحب کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے اس مقصد کے لئے یو کے سے پی ایچ ڈی کروائی تھی۔ ڈاکٹر نصیر احمد خان صاحب بہت لائق فائق اور ہر دلعزیز پروفیسر تھے میں نے بھی ان سے ایف ایس سی میں فزکس پڑھی تھی اور فسٹ ایر میں ان کے مضمون میں کالج میں اوّل آیا تھا۔ اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ جب ان کو پی ایچ ڈی کے لئے یو کے بھجوایا گیا تو ان کی کلاس کے سات طلباء کو انجینئرنگ یونیورسٹی اور پانچ کو میڈیکل کالجوں میں داخلہ مل گیا۔

1976ء میں انہوں نے مجھ سے ٹی آئی کالج کی ایم ایس سی کی کلاس کو Power Production in Pakistan پر لیکچر دلوایا اور پھر اپنے دفتر میں لے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جب ٹی آئی کالج قومیا لیا گیا تو احمدیت دشمنی میں میرا تبادلہ انٹرمیڈیٹ کالج قائدآباد کر دیا گیا اور میری جگہ جو پروفیسر پوسٹ کیا جا رہا تھا وہ صرف ایم ایس سی تھا اور اس نے ایف ایس سی کے اوپر پڑھایا ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے ایم۔ ایس۔ سی فزکس کی لیبارٹری کے لئے بہت سارا equipment لے کر دیا تھا۔ جب ان کو علم ہوا کہ جس طرح کالج کے معیار کو گرایا جا رہا ہے تو انہوں نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ذاتی خط لیا اور بتایا کہ تم بے شک احمدیت سے دشمنی کرو لیکن یہاں 50 فیصد سے زیادہ تو تمہارے لوگ پڑھتے ہیں یعنی غیر احمدی۔ اس پر بھٹو نے ڈاکٹر نصیر خان صاحب کے ٹرانسفر آرڈر واپس کروائے۔ پروفیسر نصیر خان صاحب نے کمال شفقت سے مجھے وہ ساری correspondence دکھائی جو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اور وزیراعظم کے درمیان اس ضمن میں ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عبدالسلام مجھے بہت پیارے ہیں (حضرت خلیفۃ المسیح الثالث)

ایک مرتبہ پروفیسر بشارت الرحمن صاحب جب کہ آپ صدر مجلس کارپرداز تھے دورے پر

اسلام آباد تشریف لائے اور موصیان کے ساتھ ایک میٹنگ کی آپ نے بتایا کہ ڑاکٹر عبدالسلام صاحب نے ایک بار خواہش ظاہر کی کہ انہیں قادیان جماعتی چندے دینے کی اجازت دی جائے ۔ جب معاملہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خدمت میں پیش کیا گیا تو حضور نے فرمایا کہ مجھے ڈاکٹر سلام بہت پیارے ہیں لیکن میں ان کی خاطر اصول نہیں بدل سکتا۔فرمایا جہاں کماتے ہیں وہیں چندہ دیں۔

پہلا احمدی مسلمان نوبیل انعام یافتہ سائنسدان

ڈاکٹر محمد عبدالسلام ایک زندہ جاوید شخصیت

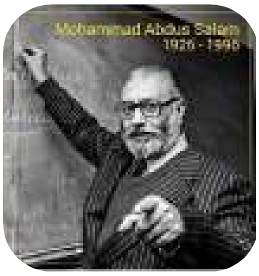

(انجینئر محمود مجیب اصغر)

The Nobel Prize shows that ideas can change the world .The courage , creativity and perseverance of the Nobel Laureates inspire us and give us hope for future.

نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (یوسف: 77) یعنی ہم جسے چاہیں درجات کے لحاظ سے بلند کرتے ہیں اور ہر علم رکھنے والے سے برتر ایک صاحب علم ہے۔

ایک عظیم الشان پیشگوئی

بانئ جماعت احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں؛

’’خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبت دلوں میں

بڑھائے گا اور میرے سلسلہ کو تمام زمین میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر میرے گروہ کو غالب کرے گا اور میرے گروہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے اور ہر ایک قوم اس چشمہ سے پانی پیئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جاوے گا۔ بہت سی روکیں پیدا ہوں گی اور ابتلا آئیں گے مگر خدا سب کو درمیان سے اٹھا دے گا اور اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ اور خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ سوائے سننے والو! ان باتوں کو یاد رکھو۔ اور ان پیش خبریوں کو اپنے صندوقوں میں محفوظ رکھ لو کہ یہ خدا کا کلام ہے جو ایک دن پورا ہوگا۔ (تجلیات الٰہیہ روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 410،409)

نوبیل انعام یافتہ سائنسدان:: حضرت خلیفۃ المسیح الثالث مرزا ناصر احمد رحمہ اللہ کے دور خلافت میں علم و معرفت میں کمال حاصل کرنے والے پہلے احمدی مسلمان سائنسدان پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالسلام صاحب ہیں جنہیں 1979ء میں دو امریکی سائنسدانوں شلڈن گلاشو اور سٹیون وین برگ کے ساتھ فزکس میں نوبیل انعام ملا۔

عزت اور مرتبہ کا مقام

آپ کے نوبیل انعام ملنے پر پورے عالم اسلام، پاکستان اور تیسری دنیا میں خاص طور پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے انہیں مبارکباد کا تار دیا اور فرمایا ”سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میری طرف سے اور جماعت احمدیہ کی طرف سے پرخلوص دلی مبارکباد قبول کریں۔ احمدیت اور تمام پاکستانیوں کو آپ پر فخر ہے کہ وہ پہلا مسلمان سائنسدان اور پاکستانی جس کو انعام ملا وہ ایک احمدی ہے۔ خدا تعالیٰ مستقبل میں آپ کو اپنی تائید و نصرت سے نوازتا رہے۔“ (روزنامہ الفضل ربوہ 17 اکتوبر 1979ء) صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے بھی مبارکباد کو تار دیا اور کہا کہ

آپ نے یقیناً پاکستان کی عظمت اور سرفرازی کو نئی تابانی بخشی ہے۔ اور انہیں اعلیٰ ترین سول ایوارڈ
▪ نشان امتیاز' دیا'' (جنگ کراچی 16 اکتوبر 1979ء) مکہ معظّمہ کے ایک اخبار نے لکھا '' ایک مسلمان
پاکستانی عالم کا اس انعام کا حصول سارے عالم اسلامی کے لئے شرف و عزت کا موجب اور ان کی
محنت کا ثمرہ ہے۔'' (العالم الاسلامی 19 نومبر 1979ء) لجنہ اماء اللہ مرکز یہ ربوہ کے سالانہ اجتماع پر
حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے فرمایا'' ڈاکٹر سلام کی عزت اور مرتبہ کا یہ مقام ہے کہ اگر کوئی کانفرنس
ہو رہی ہو اور اس میں روس، امریکہ اور۔ دیگر ممالک کے چوٹی کے سائنسدان شریک ہوں اور یہ
بعد میں کانفرنس ہال میں داخل ہوں تو جونہی یہ داخل ہوتے ہیں سارے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں
لیکن ان کی اپنی یہ حالت ہے کہ جسے انگریزی میں unassuming کہتے ہیں۔ کسی کی پرواہ نہیں،
کوئی خیال نہیں کہ میں اتنا بڑا انسان ہوں۔ نہ آرام کا خیال نہ کپڑوں کا خیال۔ آپ ان سے ملیں تو
عام انسانوں جیسا۔۔۔۔۔ وہ بالکل نہیں جانتے کہ میں اتنا بڑا سائنسدان ہوں اور دوسروں میں
اور مجھ میں کوئی فرق ہے۔'' (خطاب سالانہ اجتماع لجنہ اماء کے اللہ مرکز یہ ربوہ 20 اکتوبر 1979ء
بحوالہ پہلا احمدی سائنسدان صفحہ 35.34)

چلڈرن سٹوری بک

معروف احمدی خاتون سائنس دان مکرمہ منصورہ شمیم صاحبہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے جنیوا سوئٹزرلینڈ
میں سرن میں ہگز بوسان پارٹیکل کی دریافت میں کام کرنے کا موقع دیا بیان کرتی ہیں۔'' میں نے
بچپن میں ایک چھوٹی سی کتاب۔ پہلا احمدی مسلمان سائنسدان عبدالسلام۔ مرتبہ مکرم محمود مجیب
اصغر صاحب پڑھی تو لفظ پہلا میرے ذہن میں چمٹ گیا اور یہ چیز شعوری یا غیر شعوری طور پر مجھے
فزکس کے میدان کی طرف لے گئی۔۔۔'' (الفضل ڈائجسٹ مرتبہ محمود احمد ملک الفضل انٹرنیشنل 26
مئی 2022ء) یہ چلڈرن سٹوری بک حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ارشاد پر محمود احمد صاحب شاہد
صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکز یہ ربوہ نے اس عاجز سے لکھوائی تھی۔ الحمد للہ علی ذالك

زندہ جاوید شخصیت

ڈاکٹر پروفیسر محمد عبدالسلام صاحب نے 1979ء کے جلسہ سالانہ ربوہ پر اپنے مختصر خطاب میں فرمایا کہ آج سے تقریباً 15 سال پیشتر ان کے والد محترم چوہدری محمد حسین صاحب مرحوم نے اپنی ڈائری میں تحریر فرمایا تھا کہ انہیں (قمرالانبیا) حضرت مرزا بشیر احمد صاحب مرحوم نے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں آپ کے عزیز فرزند کے متعلق دورافق میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی (مندرجہ بالا) پیشگوئی کو پورا ہوتے دیکھتا ہوں۔" چنانچہ نوبیل انعام حاصل کرنے پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب حضرت مسیح کی اس پیشگوئی کے مصداق بن کر ایک محبوب وجود اور ایک زندہ جاوید شخصیت بن کر ابھرے۔ جو لوگ آپ کو سائنس کی دنیا میں اپنا mentor مانتے ہیں ان میں سے ایک شخص یہ راقم الحروف بھی ہے۔ اس مضمون میں ان کی ذات سے وابستہ بعض یادوں کو شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی دعا

آپ کے نوبیل انعام حاصل کرنے کے بارہ میں راقم الحروف نے نومبر 1980ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے خود سنا کہ 1978ء میں جب حضور کسر صلیب کانفرنس پر لندن تشریف لے گئے اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو شرف ملاقات بخشا تو آپ نے عرض کیا کہ حضور! مجھے اب تک فزکس میں کئی انعام مل چکے ہیں لیکن نوبیل انعام نہیں ملا۔ اس کے لئے دعا کی درخواست ہے۔ حضور نے فرمایا کہ اگلے سال (یعنی 1979ء میں) آپ کو نوبیل انعام بھی مل جائے گا۔ چنانچہ حضور کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہوبہو پورا فرمادیا۔

پہلا احمدی مسلمان سائنسدان اور جلسہ سالانہ پر ملاقات

کتاب" پہلا احمدی مسلمان سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام" مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ ربوہ کہ اشاعت پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے 1983ء کے جلسہ سالانہ پر خدام الاحمدیہ کی اور کتابوں

کے ساتھ اس کتاب کا اعلان فرمایا۔ 27 دسمبر 1983ء کو راقم الحروف نے ان کے بھائی انجینئر محمد عبد السمیع صاحب کی وساطت سے صدر انجمن احمدیہ کے گیسٹ ہاؤس (سرائے محبت) میں ان سے ملاقات کی اور انہیں ان پر لکھی گئی کتاب پیش کی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے عام انسانوں کی طرح ملے۔ بعض اور امور پر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کتاب اپنے ساتھ لے گئے۔ اٹلی سے انہوں نے اپنے اہم مضامین کی ایک کتاب، اپنے تھیسس کے کاغذات وغیرہ بھجوائے اور کتاب میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر چند معمولی غلطیاں درست کر کے بھیجیں جنہیں 2008ء کی اشاعت ثانی میں خدام الاحمدیہ نے شامل کر لیا۔

سٹی ہال اور نوبیل میوزیم

چند سال بعد راقم الحروف کو مع اہلیہ اپنے چھوٹے بیٹے محمود فاتح احسن کے پاس سٹاک ہولم سویڈن جانے کا اتفاق ہوا جہاں ہم نے سٹی ہال دیکھا جہاں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اور ان کے ساتھیوں کو ایک شاہی تقریب میں نوبیل انعام پیش کیا گیا تھا۔ 1901ء سے نوبل انعام دینے کی تقریب 10 دسمبر کو منعقد ہوتی ہے جو کہ الفرڈ نوبیل کا یوم وفات ہے۔ 10 دسمبر کو فزکس، کیمسٹری، میڈیسن، ادب، اکنامکس سائنسز کے انعامات دیئے جاتے ہیں۔ 10 دسمبر 1979ء کی تقریب میں فزکس کا نوبیل انعام ڈاکٹر عبدالسلام اور ان کے دو ساتھیوں کو دیا گیا۔ تفصیل درج ذیل ہے

The Royal Swedish Academy of Sciences has decided to award the 1979 Nobel Prize in Physics to be shared equally between Prof Sheldon L. Glashow, Havard Univ USA, Prof Abdus Salam , Intl.centre of Theoretical Physics ,Italy and Imperial college,Great Britain and Stoven Weinberg , Harvard Univ.USA, for their contribution to the theory of the Unified weak and electromagnetic Interaction between elementary particles ,including inter alla the prediction of the weak neutral current .

الفرڈ برن ہارڈ نوبیل

یہ ایک سویڈش کیمسٹ، انجینئر، موجد، تاجر اور philanthropist تھا جس نے dynamite کی تخلیق کی اور اپنے منافع کے سرمایہ سے نوبیل انعام کی وصیت کی۔ لکھا ہے

Nobel was inspired to donate his fortune to the Nobel Prize institution , which would annually recognise those who "conferred the greatest benefit to humankind".He was born on 21 October, 1833 in Stockholm ,Sweden and died on 10 December 1896 in Italy.

نوبیل کی وصیت

All of my remaining realizable assets are to be disbursed as follows: the capital , converted to safe securities by my executors , is to constitute a fund , the interest of which is to be distributed annually as prizes to those who، during the preceding year, have conferred the greatest benefit to humankind.

نوبیل کا مشہور اقتباس (quote)

"(my) dynamite will sooner lead to peace than a thousand world conventions.As soon as men will find that in one instant, whole armies can be utterly destroyed , they surely will abide by golden peace"

نوبیل میوزیم سویڈن

سویڈن میں عظیم سائنسدان اور دانشور کی یاد میں ایک میوزیم قائم کیا گیا ہے۔ جو بہت معلوماتی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا سٹور ہاؤس ہے۔ اس میں نوبیل کی وصیت کا اصل مسودہ اور نوبیل انعام پانے والوں کا مکمل باضابطہ ریکارڈ ہے۔ ڈاکٹر سلام کے عشق میں ہم نے یہ میوزیم بھی جا کر دیکھا۔

عبدالسلام انٹرنیشنل سنٹر آف تھیوریٹیکل فزکس

(Abdus Salam ICTP Italy

اٹلی میں ٹرسٹے کے مقام پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے عالمی سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس 1964 میں قائم کیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی یاد میں اعزاز کے طور پر وہاں کے سائنسدانوں نے 1997ء میں اس کا نام Abdus Salam International Centre for Theoretical Physics رکھ دیا۔ سن 2018ء میں اس عاجز کو اپنی اہلیہ اور چھوٹے بچے اور بہو کے ساتھ یہ عظیم انسٹی ٹیوشن دیکھنے کا موقع ملا۔ الحمدللہ

BLUE PLAQUE (نیلی تختی)

2020ء میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب عالمی سطح پر مشہور سائنس دان کے اعزاز میں ان کے گھر پر نیلی تختی blue plaque لگائی گئی جس کی عبارت درج ذیل ہے

ABDUL SALAM, Physicist Nobel Laureate and Champion of Science in developing countries lives here BLUE PLAQUE unveiled for Nobel Prize winner Abdus Salam 27 November 2020

ڈاکٹر عبدالسلام ڈاکومنٹری فلم

ڈاکٹر سلام کی کرشماتی شخصیت، ترقیات اور احمدی ہونے کی وجہ سے پاکستان میں نفرت وعداوت اور دنیا بھر میں عزت واحترام پر مبنی ایک شاندار فلم بنائی گئ ہے

"Salam" - The film reveals the extraordinary life of the charismatic Abdus Salam , in all its. color, virtuality and tragedy......... While Salam's legacy looms large in the world of Physics , he is largely forgotten in Pakistan because of his faith .Children do not read about him and he is still vilified and maligned by right wing clerics for being a "Qadiani" - a derogatory term for someone

belonging to the Ahmadiyyas community.

عبدالسلام کا مجسمہ

Pakistan's first Nobel Laureate's bust (Jamal Shah's Sculpture) was unveiled at the International Atomic Energy Agency (IAEA) Vienna by Director General Yukiya Amano at IAEA's 61st General conference .This day also marked Salam's 60th birth anniversary. (Sept 21, 2017)

30جون2023ءامپیریل کالج لندن لائبریری کا نام ڈاکٹر محمد عبدالسلام صاحب کے نام پر۔

London - Pakistan's physicist and Nobel Prize winner Dr Abdus Salam's legacy continues to inspiring young scientists, as contributions to science left a lasting impact on researchers in parts of the world .

Salam made significant contributions to the field of particle physics , and in light of his contributions, the prestigious Imperial College London has announced renaming its central library after Pakistani Sciencist known for unification theory.

خدا پرست سائنس دان

آپ کی وفات پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے فرمایا" ---ایک دفعہ مجھے کہہ رہے تھے کہ جب میں کسی سائنسی اجتماع میں جاتا ہوں تو بعض سرگوشیوں کی آواز آتی ہے "یہ وہ ہے جو خدا کو مانتا ہے"

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا تعلیمی منصوبہ اور نوبیل انعام یافتہ احمدی سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام

(انجینئر محمود مجیب اصغر)

میرے وطن! مجھے تیرے افق سے شکوہ ہے
کہ اس پہ ثبت ہے عبدالسلام نام کا چاند
اسے ڈبو کے کوئی اچھال کام کا چاند
تو یہ کرے تو کبھی تجھ پہ پھر زوال نہ ہو
ہر ایک شہری ہو آسودہ ہر کوئی ہو نہال
کوئی ملول نہ ہو کوئی خستہ حال نہ ہو

(کلام طاہر)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا قول ہے" نبی بے عزت نہیں مگر اپنے وطن میں" پاکستان اور تیسری دنیا کا پہلا مسلمان سائنسدان ہونے کی وجہ سے جو عزت اور احترام ڈاکٹر عبدالسلام کو دنیا بھر میں مل رہا ہے اور مسلسل ملتا ے چلا جا رہا ہے اس کی کوئی مثال نہیں اور احمدی ہونے کی وجہ سے جتنا تعصب ان کے ساتھ اپنے ہی وطن میں بڑھتا جا رہا ہے اس کی بھی کوئی حد نہیں حالانکہ آپ جیسے عظیم سائنس دان عقائد، ملک، اور قومیت سے بالا تر ہونے چاہئیں۔

ان کی وفات کے جلد ہی بعد ان کے قائم کردہ انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس ٹریسٹے اٹلی (آئی سی ٹی پی) کا نام ان سے منسوب کر دیا گیا

The Abdus Salam International Center for Theoretical Physics

ڈاکٹرعبدالسلام کی برطانیہ کی رہائش قومی ورثہ

حال ہی میں برطانیہ میں ڈاکٹرعبدالسلام کی رہائش گاہ کوقومی ورثہ قرار دے دیا گیاہے برطانوی حکومت نے نیلی تختی (BLUE PLAQUE)اس پرآویزاں کردی ہے جوسائنس دانوں کے لئے مخصوص ہے

ABDUS S A L A M (1926 _ 1996)

PHYSICIST _ NOBEL LAUREATE AND CHAMPION OF SCIENCE IN DEVELOPING COUNTRIES LIVED HERE

پاکستان میں قائدِاعظم یونیورسٹی اسلام آباد کےفزکس ڈیپارٹمنٹ جوآپ کے نام سےنواز شریف حکومت میں منسوب کیا گیا تھااسی کے داماد کی قومی اسمبلی میں زہریلی تقریر کے نتیجے میں بدلا گیاان کے ایک portrait پرسیاہی مل کربعض جاہل اور بدتہذیب نوجوانوں نے دراصل اپنے اور اپنے وطن کے چہرے کوسیاہ کیا

ڈاکٹرسلام کی وطن پرستی

ڈاکٹرسلام تو اتنا وطن پرست تھا کہ برطانیہ اور اٹلی اور کئی ملکوں کی پیشکش کے باوجود ہمیشہ پاکستانی نیشنل ہی رہااورمرکراپنے وطن میں اپنے ماں باپ کےقدموں میں دفن ہونا پسند کیا۔نوبیل انعام کی تقریب میں اپنے وطن پاکستان کی محبت میں پاکستان کاروائتی لباس شلوارقمیض شیروانی اور پگڑی پہن کرگیا

Salam was the first Muslim to win a Nobel Science Prize..He was committed to his roots and bettering the plight of his people that he wore a turban in Stockholm to receive the prize from King of Sweden.(Zakir Thaver)

ڈاکٹر عبدالسلام احمدیت کی صداقت کا غیر معمولی نشان

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر 1906ء میں اعلان فرمایا تھا

''...میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے.....''

(تجلیات الٰہیہ روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 409،410)

یہ عظیم الشان پیشگوئی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب پر پوری شان کے ساتھ پوری ہوئی اور انہیں فزکس میں نوبیل انعام ملا۔ میکسول فیراڈے نے الیکٹرک اور میگنیٹک قوتوں کو یکجا کیا تھا آئن سٹائن نے الیکٹرو میگنیٹک فورس کو گریویٹیشنل فورس کے ساتھ یکجا کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا ڈاکٹر عبدالسلام اور وینز برگ نے الیکٹرو میگنیٹک فورس کو نیوکلیر ویک فورس کے ساتھ یکجا کرنے میں کامیاب ہو کر 1979ء میں دنیا کا فزکس کا سب سے بڑا انعام یعنی نوبیل پرائیز جیت لیا۔

صد سالہ جوبلی منصوبہ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا تعلیمی منصوبہ

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے 1973ء کے جلسہ سالانہ پر ایک بہت بڑا منصوبہ جاری کیا جو احمدیت کی دوسری صدی 22 مارچ 1989ء تا 23 مارچ 2089ء (جسے آپ نے غلبہ اسلام کی صدی قرار دیا) کے استقبال اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مشن میں عالمی سطح پر وسعت پیدا کرنے کے لئے جاری کیا گیا تھا۔

اس عظیم منصوبہ کی ذیل میں آپ نے تعلیمی منصوبہ بھی جاری فرمایا۔ آپ نے 1979ء کے جلسہ سالانہ پر فرمایا۔''میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگلے دس سال میں جس صدی کو میں غلبہ اسلام کی صدی کہتا ہوں ہمیں ایک ہزار سائنسدان اور محقق چاہئیں اور یہ جو اس سے پہلے دس سال ہیں اس میں ایک سو سائنس دان چاہئیں..''

پیشگوئی کا پہلا مظہر

(حضرت مسیح موعود کی مندرجہ بالا پیشگوئی کے حوالے سے) فرمایا

" آج تک یہ ایک پیشگوئی تھی جس کا ایک بھی مظہر ہمارے سامنے نہیں تھا یعنی کچھ اس طرح وہ ابھرا ہوا اور آسمانوں تک پہنچا ہوا اپنی علمی تحقیق میں کہ واقع میں اس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ علم اور معرفت میں اس نے کمال حاصل کیا اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیا۔(اپنے حلقہ تحقیق میں) آئن سٹائن بہت بڑا سائنس دان گزرا ہے انہوں نے بھی کام کیا اور ناکام ہوئے اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے کام کیا اور وہ کامیاب ہوئے اور ان کو نوبیل پرائیز ملا اور دنیا کے چوٹی کے سائنس دانوں میں پہنچ گئے۔''(خطابات ناصر جلد دوم صفحہ 400)

1978ء کی عالمی کسر صلیب کانفرنس لندن پر ڈاکٹر سلام کی خلیفۃ المسیح الثالث سے ملاقات دراصل ڈاکٹر عبدلسلام صاحب نے نوبیل انعام خلافت کی برکت اور دعاؤں سے حاصل کیا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثالث جب 1978ء میں کسر صلیب کانفرس کے لئے لندن تشریف لے گئے جو صد سالہ احمدیہ جوبلی منصوبہ کے تحت 2، 3، 4 جون کو منعقد ہوئی تھی تو ان دنوں ڈاکٹر صاحب موصوف حضرت صاحب کو ملے اور عرض کیا کہ انہیں ابھی تک فزکس میں ریسرچ پر کئی انعام مل چکے ہیں لیکن دنیا کا سب سے بڑا انعام یعنی نوبیل پرائیز نہیں ملا دعا کریں وہ بھی مل جائے۔جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے خود نومبر 1980ء کے آخری ہفتے میں بیت الفضل گیسٹ ہاؤس اسلام آباد پاکستان میں بعد نماز مغرب وعشاء مجلس عرفان میں بتایا کہ میں نے انہیں کہا۔اس سال تو نہیں اگلے سال 1979ء میں انہیں نوبیل انعام مل جائے گا۔یہ روایت احمدی بچوں کے لئے میری لکھی ہوئی شارٹ سٹوری بک" پہلا احمدی مسلمان سائنس دان.." مطبوعہ 1983ء میں چھپ چکی ہے۔

شارٹ سٹوری بک پہلا احمدی مسلمان سائنس دان عبدالسلام ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو 10 جون 1979ء کو فزکس میں نوبیل انعام ملا تھا جس کے جلد ہی بعد ڈاکٹر عبدالسلام صاحب پر احمدی بچوں کو motivate کرنے کے لئے یہ کتاب اس عاجز سے لکھوائی گئی

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ارشاد پر صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ محترم محمود احمد صاحب شاہد (المعروف بنگالی صاحب) نے اس کی تصنیف کا کام اس عاجز کو تفویض کیا تھا اور اس کے لئے نائب صدر اور مہتمم اشاعت صاحبزادہ مرزا فرید احمد صاحب نے coordinate کیا تھا

الفضل 3 نومبر 1983ء میں کتاب پر مندرجہ ذیل تبصرہ شائع ہوا۔تبصرہ کتب

پہلا احمدی مسلمان سائنس دان عبدالسلام

نام کتاب:۔ پہلا احمدی مسلمان سائنسدان عبدالسلام

مصنف:۔مکرم محمود مجیب اصغر صاحب ناشر:۔مکرم شمیم پرویز صاحب قائد مجلس خدام الاحمدیہ جھنگ پرنٹر:۔لاہور آرٹ پریس 15 نیو انارکلی لاہور۔صفحات:۔71 صفحات قیمت:۔تین روپے

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ نے اطفال الاحمدیہ میں مسابقت فی الخیرات کی روح اجاگر کرنے کے لئے کچھ عرصہ قبل کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا زیرنظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے مصنف نے بچوں کے ذہن اور مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک کہانی کے انداز میں تحریر کیا ہے اور زبان انتہائی سادہ ور عام فہم استعمال کی گئی ہے اس کتاب میں مکرم ڈاکٹر عبدالسلام کے خاندانی حالات و واقعات اور علمی میدان میں ان کی ترقیات کو پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ پیارے اور عزیز وطن پاکستان، اسلامی دنیا اور تیسری دنیا کے ممالک کے لئے ڈاکٹر صاحب کے شاندار سائنسی کارناموں اور خدمات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے نیز ڈاکٹر عبدالسلام کو ملنے والے بین الاقوامی اعزازات کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لکھائی چھپائی معیاری ہے کاغذ عمدہ لگایا گیا ہے ٹائیٹل رنگین دیدہ زیب اور ڈاکٹر عبدالسلام کی تصویر سے مزین ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے 1983ء کے جلسہ سالانہ ربوہ پر دوسرے دن کے خطاب میں خدام الاحمدیہ کی مطبوعات کے ذکر میں اس کتاب کا نام بھی لیا تھا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کا خطبہ جمعہ فرمودہ 25 اپریل 2014ء (مطبوعہ الفضل 10 جون 2014ء سارا

محترم محمود احمد صاحب شاہد (بنگالی صاحب) کے بارے میں تھا اس عاجز نے بنگالی صاحب کی وفات پر جو نوٹ بھیجا تھا حضور نے خطبہ میں اس کا بھی ذکر فرمایا

''.....خدام الاحمدیہ کے دور میں انہوں نے ان سے کافی کتابیں لکھوائیں۔''

(الفضل 10 جون 2014ء صفحہ 3)

لیڈی احمدی سائنس دان ڈاکٹر منصورہ شمیم صاحبہ کیسے سائنس دان بنیں

How I became a Scientist

A Pakistani Physcist who worked on the discovery of Higgs Boson....

Speech delivered in Bensheim Germany by Dr Mansoora Shamim, a scientist at CERN....... ... How and when did I come to know about Prof Salam? I remember being a child in early eighties, when my father brought me a short story book in urdu, written by Mahmood Mujeeb Asghar. The title of the book was "pehla Ahmadi Musalman Siencedan" (The first Ahmadi Muslim Scientist) I read this book, but don't remember now if I understood anything about his work at that time. But I still remember and feel inside me is the inspiration of word "First Scientist". That must have stuck into my mind. It lead me, consciously or unconsciously to pursue a career in Physics..........

اتفاق سے ان کے والد شمیم احمد سنوری صاحب سے میرا تعارف لالہ موسیٰ میں واپڈا کے ایک آفس میں 1974ء میں ہوا تھا دوبارہ ملاقات 1999ء یا 2000ء میں لاہور میں ہوئی انہوں نے بتایا کہ وہ واپڈا سے ریٹائر ہو کر ٹاؤن شپ لاہور میں شفٹ ہو گئے ہیں اور ان کی بیٹی کو ڈاکٹر عبدلسلام صاحب کی یونیورسٹی (یعنی ICTP اٹلی) میں داخلہ مل گیا ہے

چند سال بعد ان کی بیٹی ڈاکٹر منصورہ شمیم صاحبہ کے اخباروں میں انٹرویو پڑھ کر ان کے

بارے میں معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ وہ ایک نامور سائنسدان بن گئی ہیں اور سرن (CERN) جنیوا (سویٹزرلینڈ) میں ہگز پارٹیکل کے multi billion تجربے کی ٹیم میں شامل ہیں یہ یقیناً حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی خواہش اور دعا کا نتیجہ ہے جس کا اظہار آپ نے جلسہ سالانہ 1979ء پر کیا تھا۔ یقیناً اور بھی کئی نئے سائنسدان جماعت میں پیدا ہو چکے ہیں جو ہنوز lime light میں ابھی نہیں آئے۔

پہلے احمدی عظیم سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خوشگوار ذاتی یادیں

اب میں اس مضمون کو پہلے عظیم احمدی سائنس دان (ڈاکٹر عبدالسلام صاحب) کی کچھ خوشگوار ذاتی یادوں پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

1) احمدیہ کالجیئٹ سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن لاہور سے خطاب

جن دنوں میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پڑھتا تھا ایک جمعہ پر خطبہ ثانیہ کے دوران دارلذکر گڑھی شاہو لاہور میں اعلان ہوا کہ نماز کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام صاحب احمدیہ انٹر کالجیئٹ ایسوسی ایشن سے خطاب فرمائیں گے۔ اپنے اس مختصر خطاب میں ڈاکٹر عبدلسلام صاحب نے بتایا امپیریل کالج لندن جہاں میں پڑھاتا ہوں وہاں کچھ پاکستانی اور ایشین طالبعلم بھی ہیں انگریز طالب علم پوری تیاری کے ساتھ فائلیں اور نوٹ بکس اور کلرڈ پنسلیں اور فٹ رول اور سلائیڈ رول وغیرہ لے کر بروقت کلاس روم میں آتے ہیں اور بڑے اہتمام سے لیکچر کے نوٹس لیتے ہیں جب کہ پاکستانی اور ایشین طالب علموں کا عام طور پر یہ حال ہے کہ رول کال کے دوران آتے ہیں بڑی بے اعتنائی سے پتلون کی پچھلی جیب سے کاغذ نکالتے ہیں اور کچھ لیکچر نوٹ کر کے وہیں پھاڑ کے چلے جاتے ہیں اپنے ساتھ کام کرنے والے سائنس دانوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ دنیا میں سائنسدانوں کی اکثریت یہودیوں کی ہے جب ان سے میں ان کی کامیابی کا راز پوچھتا ہوں تو وہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی الہامی کتاب تورات پڑھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں آپ نے فرمایا ان

کی کتابیں منسوخ اور محرف و متبدل ہو چکی ہیں لیکن ان پر عمل کر کے وہ سائنسدان بن رہے ہیں جب کہ ہمارے پاس کامل کتاب قرآن کریم ہے ہم ان سے کیوں پیچھے رہ گئے ہیں؟ اس لئے کہ ہم قرآن کریم پڑھتے نہیں ہیں اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں

2) ڈاکٹر صاحب سے خط و کتابت

نوبیل انعام کے حصول کے بعد میں نے بھی انہیں مبارکبادی کا خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود جواب دیا

Imperial college of Science and Technology Abdus Salam FRS

Professor of Theoretical Physics, Department of Physics, Prince Consort Road, London SW7 2 BZ Tel 01_ 588 _ 5111 Telex 261503

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسول الکریم و علی عبدہ المسیح الموعود

گرامی قدر جناب مجیب اصغر صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کے عنایت نامے سے بہت خوشی ہوئی اس پاک ذات کی حمد اور سپاس بیان کرتا ہوں کہ اس نے اسلام اور احمدیت کی خدمت کا کام لیا ربنا تقبل منا

اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں میرا محبت بھرا اسلام پہنچا دیں

خاکسار عبدالسلام 5 نومبر 1979ء

M. Mujib Asghar, Senior Civil Engineer, Overseas Proj Coord Cell, H _ 12, St 83, G_6/4, Islamabad, Pakistan.

3) ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے ملاقات

1983ء کے جلسہ سالانہ ربوہ پر محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اپنے چھوٹے بیٹے سمیت صدر انجمن احمدیہ کے گیسٹ ہاؤس "سرائے محبت" میں ٹھہرے ہوئے تھے ان کے بھائی انجینئر عبدالسمیع

صاحب کے ذریعے میں نے ان سے 27 دسمبر 1983ء کو ملاقات کا شرف حاصل کیا اور اپنی تصنیف کردہ کتاب "پہلا احمدی مسلمان سائنس دان" پیش کی ڈاکٹر صاحب نے سرسری سا جائزہ لے کر چند چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی نشان دہی کی اور کتاب ساتھ لے گئے

اٹلی سے انہوں نے اپنے Thesis کے کچھ پیپر اور ایک کتاب بھجوائی

IDEALS AND REALITIES Selected Essays of Abdus Salam (Third Edition) Editors: C H Lai and Azim Kidwai

4) سٹاک ہولم (سویڈن) میں سٹی ہال جہاں ڈاکٹر صاحب نے سویڈن کے بادشاہ سے نوبیل انعام حاصل کیا

نوبیل انعام کی تقریب سٹی ہال سٹاک ہولم (سویڈن) میں منعقد ہوتی ہے 2012ء میں مجھے اپنی فیملی کے ساتھ سٹی ہال دیکھنے کا موقع ملا بہت خوبصورت جگہ واقع ہے اردگرد پانی کی جھیلیں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں

It is the venue of the Nobel Prize banquet and is one of the Stockholm's major tourist attractions.

5) نوبیل میوزیم سویڈن

منجملہ اور چیزوں کے نوبیل انعام یافتہ افراد کا 100 سال کا ریکارڈ دیکھنے کا موقع ملا۔ فزکس کے انعام کے متعلق صفحہ 217 پر لکھا ہے۔ شیلڈون لی گلاسگو۔

(پیدائش 5 دسمبر 1932ء بمقام نیو یارک امریکہ)

نیز عبدالسلام۔ (پیدائش 29 جنوری 1926ء بمقام جھنگ انڈیا حال پاکستان، وفات 21 نومبر 1996ء آکسفورڈ برطانیہ)

1 نیز سٹیون وین برگ۔ (پیدائش 3 مئی 1938ء نیو یارک امریکہ)

جنہیں متحدہ کمزور اور الیکٹرومیگنیٹک قوت کو یکجا کرنے کے کام پر فزکس میں نوبیل انعام دیا

گیا۔“

Nobel Museum is a knowledge bank with active research, seminars, lectures, and debates about current issues

6) عبدالسلام عالمی سنٹر فار تھیوریٹیکل فزکس اٹلی ICTP

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک عظیم کارنامہ سائنس کے ایک عالمی مرکز کا قیام ہے جسے آپ نے 1964ء میں اٹلی کے شہر ٹریسٹے میں قائم کیا

خدا کے فضل سے 8 جولائی 2018ء کو مجھے فیملی سمیت یہ سنٹر دیکھنے کا سنہری موقع ملا جس کو دیکھنے کی دیرینہ خواہش تھی ہم گرمیوں میں اپنے چھوٹے بیٹے محمود فاتح احسن کے پاس schengen ویزے پر سوین گئے ہوئے تھے رمضان المبارک اور عید الفطر گزار کر ہمارا بیٹا چند schengen ویزے میں شامل ممالک کی سیر کے لئے لے گیا 8 جولائی 2018ء کو ہم ICTP دیکھنے کے لئے گئے اس روز اتوار تھا اور سب کچھ بند تھا اٹیلین care taker کو ہم نے درخواست کی کہ پاکستان سے پاکستانی سائنسدان عبدالسلام صاحب کا قائم کردہ عظیم ادارہ دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔اس لئے جتنا دکھا سکتے ہیں دکھا دیں ان لوگوں کے دلوں میں اس عظیم سائنس دان کی جو عزت اور محبت ہے یہ اس کا نتیجہ تھا کہ اس نے ہمیں عالمی ادارے کا اندر سے وزٹ کروا دیا اندر ہال میں داخل ہوتے ہی دائیں دیوار پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی جوانی کی تصویر لگی ہوئی ہے اس کے علاوہ جو دیکھ سکتے تھے وہ دیکھا اور لیبارٹریز کی مختلف بلڈنگس کے باہر فوٹو گرافی کی۔ دل اللہ تعالیٰ کی حمد سے لبریز ہو گیا کہ کس طرح خدا تعالیٰ نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت اور خلافت احمدیہ کی دعا اور برکت کا دائمی نشان بنا کر دنیا کو دکھا دیا ہے۔

اس ایٹمی دور میں پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے میں ڈاکٹر محمد عبدالسلام کی نمایاں خدمات

(انجینئر محمود مجیب اصغر)

دنیا کا ایٹمی دور

وما ادرك ما الحطمة نار الله الموقدة (اور تجھے کیا بتائے کہ حطمہ کیا ہے وہ اللہ کی آگ ہے بھڑکائی ہوئی)

سورۃ الھمزہ کے تعارفی نوٹ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع تحریر فرماتے ہیں"..اس زمانے کا بڑا انسان یہ گمان کرے گا کہ اس کے پاس اس کثرت سے دولت اکٹھی ہو چکی ہے اور وہ اسے بے دریغ اپنے دفاع میں خرچ کر رہا ہے گویا اب اسے اس دنیا میں ابدی برتری حاصل ہوگئی ہے؟ خبردار وہ ایک ایسی آگ میں جھونکا جائے گا جو چھوٹے چھوٹے ذروں میں بند کی گئی ہے اور تجھے کیا پتہ کہ وہ کون سی آگ ہے؟

یہ سوال طبعی طور پر اٹھتا ہے کہ چھوٹے سے ذرے میں آگ کیسے بند کی جاسکتی ہے؟ لازماً اس میں اس آگ کا ذکر ہے جو ایٹم میں بند ہوتی ہے اور لفظ حطم اور ایٹم (ATOM) میں صوتی مشابہت ہے یہ وہ آگ ہے جو دلوں پر لپکے گی اور ان پر لپکنے کے لئے ایسے ستونوں میں بند کی گئی ہے جو کھینچ کر لمبے ہو جائیں گے۔اس ساری سورۃ انسان کو سمجھ آہی نہیں سکتی جب تک اس ایٹمی دور کے حالات اس پر روشن نہ ہوں وہ ایٹمی مادہ جس میں یہ آگ بند ہے وہ پھٹنے سے پہلے عمد ممدد ہ کی شکل اختیار کرتا ہے یعنی بڑھتے ہوئے اندرونی دباؤ کی وجہ سے پھیلنے لگتا ہے

اوراس کی آگ انسانوں کے بدن جلانے سے پہلے ان کے دلوں پر لپکتی ہے اور انسانوں کی حرکت قلب بند ہو جاتی ہے تمام سائنسدان گواہ ہیں کہ بالکل یہی واقعہ ایٹم بم پھٹنے سے رونما ہوتا ہے اس کے آتش گیر مادہ کے پہنچنے سے پہلے پہلے نہایت طاقتور ریڈیائی لہریں دلوں کی حرکت بند کر دیتی ہے۔سورۃ دخان آیت 11 میں ایٹم بم کی پیشگوئی کی گئی تھی حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے اس سورۃ کے تعارفی نوٹ میں فرمایا ہے کہ سورۃ دخان کے متعلق آنحضرت ﷺ کو علم دیا گیا تھا کہ اس کی پیشگوئیوں کے ظہور کا زمانہ دجال کے ظہور سے تعلق رکھتا ہے (جو کہ موجودہ دور ہے)۔

نیوکلیر ممالک

چنانچہ اب تک چین، فرانس، روس، برطانیہ، امریکہ، انڈیا، پاکستان، اسرائیل اور شمالی کوریا ایٹمی طاقت بن چکے ہیں Pakistan is one of the nine states to possess nuclear weapons.

ڈاکٹر عبدالسلام کا حیات نامہ

curriculum Vitae

پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام کی تعلیم، استعداد، سندات، سابقہ تجربہ (حیات نامہ) curriculum vitae دیکھ کر انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ پاکستان کے اس عظیم الشان عالمی سطح کے سائنسدان کے نام اور خدمات کو موجودہ حکومت احمدیت کے بغض اور حسد اور تعصب میں چھپانے کی کس طرح ناکام کوشش کر رہی ہے وہ جسے ساری دنیا اس دور کے عظیم سائنسدانوں میں شمار کرتی ہے اور جس نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اور ایٹم بم بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا اس کے نام اور مقام کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔اٹامک انرجی کے تناظر میں وہ کون تھا جو 1955 اور 1958 میں جنیوا کانفرنس on peaceful uses of

atomic energy کا سائنسٹیفک سیکریٹری تھا۔

وہ کون تھا جسے 1968 میں ایٹم برائے امن فاؤنڈیشن نے ایٹم برائے امن میڈل اور ایوارڈ دیا گیا۔وہی تو تھا جو پاکستان اٹامک انرجی کمشن کا 1958 سے 1974 تک ممبر رہا جسے حکومت پاکستان نے 1963- 1962 کے لئے عالمی اٹامک انرجی کمشن کا گورنر نامزد کیا۔غرض یہ کہ پاکستان کواٹامک انرجی سے متعارف کروانے والوں میں ڈاکٹرعبدالسلام نے بنیادی کردارادا کیا۔

چیف ایڈوائزر برائے سائنسی امور

1961 میں صدر پاکستان جنرل محمدایوب خان کی پیشکش پرڈاکٹرعبدالسلام صاحب نے بغیرتنخواہ حکومت پاکستان کا سائنسی مشیر بنا منظور کرلیا ڈاکٹرعبدالسلام 1974 تک حکومت پاکستان کے سائنس کے مشیر اعلیٰ رہے اس.دوران Pakistan Institute of Nuclear Science and Technology PINSTECH سمیت جتنے سائنسی ترقی کے کام ہوئے ان میں ڈاکٹرعبدالسلام صاحب کا کلیدی حصہ ہے۔نیوکلیئرفزکس کے قریب ترین پارٹیکل فزکس ہے جوڈاکٹرعبدالسلام کی speciality ہے بالخصوص جب انہوں نے ٹریسٹے اٹلی میں انٹرنیشنل سنٹرفارتھیوریٹیکل فزکس ICTP قائم کیاتوسینکڑوں پاکستان کے سائنسدانوں کواٹلی بلواکرتیارکیا جنہوں نے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے میں کامیاب کیااب اس کانام۔Abdul Salam ICTP ہوگیاہے

پاکستان میں ایٹم بم بنانے کی منصوبہ بندی

اس سلسلے میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

’’1965ء کی جنگ میں جوحالات نمودار ہوئے اس کے نتیجے میں جنرل ایوب خان نے یہ پہلا فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں لازماً ایٹمی توانائی کی طرف توجہ کرنی ہوگی.......ایوب کی نظرانتخاب جس سائنسدان پرپڑی جس پرآپ کوپورااعتمادتھاوہ ڈاکٹرعبدالسلام تھےڈاکٹرعبدالسلام نے ابتدائی اور

بنیادی خدمات سرانجام دینے میں ایسا کردار ادا کیا کہ اگر کوئی مؤرخ شریف النفس ہو تو اس کردار کو بھلا نہیں سکتا...ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے ان امور میں اس قدر اخفاء سے کام لیا کہ..ایوب خان نے جو اعتماد آپ پر کیا اس کو سچا ثابت کر دکھایا۔ یہ جتنے اٹامک، نیوکلیئر کمیشن بنے ہیں مختلف قسم کے اٹامک یعنی یورینیم وغیرہ کی افزائش کے انتظامات ہوئے ان سب میں ڈاکٹر عبد السلام کے مشورے کے مطابق وہ سائنسدان ملوث ہوئے ہیں جن میں سے ایک بڑی تعداد احمدی سائنس دانوں کی تھی اور اگر وہ احمدی سائنس دان اس پر کام نہ کرتے تو آج کسی ایٹم بم کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔''(خطبہ جمعہ 12 جون 1998ء)

ڈاکٹر منیر احمد خان (1926-1999)

1972 سے 1991 تک چیئر مین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے طور پر خدمت بجالاتے رہے اور اٹامک ہتھیار کی ٹیسٹنگ تک مئی 1998 تک ملوث رہے ان کے بارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے فرمایا

''(ڈاکٹر) منیر احمد (خان) صاحب جو بڑے جرأت والے با اخلاق انسان ہیں اٹامک انرجی میں کمیشن میں بہت بڑا کام سرانجام دیا ہے اس کو منظم کرنے میں بعدازاں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور یہ تسلیم کرتے ہیں کھل کر کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے لائے ہوئے تھے اور انہی کے اعتماد کی وجہ سے ان کو یہ توفیق ملی ہے.....انہوں نے ڈاکٹر عبدالسلام پر ان کی وفات کے بعد جو مضمون لکھا جو ٹرسٹ میں پڑھا گیا اس میں بہت کھل کر ڈاکٹر عبد السلام کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔''(ایضاً خطبہ جمعہ 12 جون 1998ء) ان کا جو محبت اور وفا کا تعلق ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے تھا اس کا نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا جنازہ جب پاکستان لایا گیا تو یہ اپنے طور لاہور ائر پورٹ جنازہ وصول کرنے والوں میں شامل ہوئے۔

1971 کی ہندو پاک جنگ

1969 میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ملک کا نظم وضبط جنرل آغا محمد یحیٰ کے سپرد کر دیا جنہوں نے مارشل لاء لگا دیا اور 7 دسمبر 1970ء کو ملک میں جنرل اسمبلی کے لئے عام انتخاب کروادئے جس میں مشرقی پاکستان کے شیخ مجیب الرحمن کی پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی اور اصولا جنرل اسمبلی کا اجلاس بلا کر حکومت انہیں سونپ دینی چاہئے تھی لیکن ایسا نہ ہوا جس کے نتیجے میں ملک میں سول وار شروع ہوگئی 3 دسمبر 1971 کو انڈیا نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور 16 دسمبر 1971ء کو پاکستانی افواج نے انڈیا کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

1971 کی جنگ میں پاکستان کو شکست ہوئی مشرقی پاکستان کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی نے نسبتاً زیادہ ووٹ لئے تھے ان حالات میں 20 دسمبر 1971 کو جنرل یحییٰ خان نے استعفی دے دیا اور حکومت بھٹو کے سپرد کر دی بھٹو 1971 سے 1973 تک پاکستان کے صدر اور 1973 سے 1977 تک پاکستان کے وزیر اعظم رہے۔

ملتان میٹنگ 20 جنوری 1972

انڈیا سے شکست اور بنگلہ دیش کے قیام کے جلد ہی بعد بھٹو نے 20 جنوری 1972 کو ملتان میں top brass physcists and engineers کی ایک اہم میٹنگ طلب کی اور ایٹم بم جس پر پہلے سے کام ہو رہا تھا کے بارے میں ہدایات دیں ڈاکٹر عبدالسلام بدستور حکومت پاکستان کے چیف سائنسی مشیر تھے اس میٹنگ میں ڈاکٹر عبدالسلام اور چیرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن ڈاکٹر منیر احمد خان کے علاوہ کچھ اور اہم شخصیات شامل تھیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام کا دورہ چین

1972 میں بھٹو نے ڈاکٹر عبدالسلام کو چین بھجوایا جہاں انہوں نے چین کے وزیر اعظم چوان لائی (Zhou Enlai) سے 5 ستمبر 1972 کو ملاقات کی اور چین سے جوہری ہتھیار ٹیکنالوجی کے بارے میں رہنمائی کے معاملات طے کئے۔

ٹی پی جی گروپ

ڈاکٹر عبدالسلام نے ICTP میں پہلے سے تھیوریٹیکل فزکس گروپ (TPG) تیار کیا ہوا تھا جس میں ریاض الدین، فیاض الدین، مسعود احمد اور فہیم حسین جیسے سائنس دان تھے جنہوں نے جوہری توانائی کے حصول میں کلیدی کردار ادا کیا دسمبر 1972 میں ڈاکٹر عبدالسلام نے پاکستانی سائنس دانوں کو جو ICTP میں کام کر رہے تھے خفیہ طور پر کوڈ میمورنڈم بھیجا کہ وہ چیئر مین PAEC ڈاکٹر منیر احمد خان کو جا کر رپورٹ کریں یہ سب لوگ وہ ہیں جنہیں ڈاکٹر عبدالسلام نے train کیا اور انہوں نے PAEC کے تحت کام کیا ان میں بہت سارے احمدی سائنس دان بھی تھے۔

پاکستان کی نیوکلئر افزائش

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے فرمایا

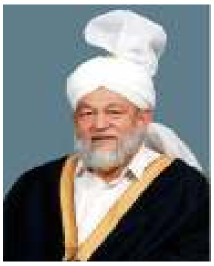

''اس وقت جو پاکستان کی نیوکلئر افزائش کے تعلق میں ایک عالمی حیثیت قائم ہوگئی ہے اس میں اوّل کردار ایوب خان اور دوئم کردار جو سائنسی کردار ہے یہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ادا کیا ڈاکٹر سلام نے یورینیم کی افزائش کے سلسلے میں ڈیرہ غازی خان میں یورینیم کے ذخائر کی دریافت کے بعد اس کو کس طرح ایٹمی توانائی کے قابل بنایا جا سکتا ہے اس کے متعلق سب سے اہم مشورے دیئے اور شیخ لطیف صاحب جو احمدی سائنس دان ہیں جن کو اس کام پر مامور رکھا......شیخ لطیف صاحب کا..مجھ سے رابطہ ہوا ہے....انہوں نے کچھ اور سائنس دانوں کے نام بھی بھیجے ہیں ڈاکٹر منیر احمد خان صاحب کی سربراہی میں جو ٹیم بنائی گئی تھی اس میں جو احمدی کلیدی اسامیوں پر فائز تھے ان میں شیخ لطیف احمد صاحب یہی امریکہ والے، دوسرے مرزا منور احمد صاحب کینیڈا والے، اس کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں مثلاً محمود احمد شاہ صاحب ٹورانٹو کینیڈا میں ہیں نیوکلئر فیوزن کی مینیجمنٹ میں انہوں نے بہت۔بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔''

شیخ لطیف صاحب کا کردار

شیخ لطیف صاحب کا جو کردار رہا ہے 1961 سے 1989 تک، مینوفیکچر آف نیوکلئر ریسرچ equipment یہ انہی کا کارنامہ ہے 1972 میں مینوفیکچر آف یورینیم ایکسٹریکشن پائلٹ پلانٹ انہوں نے تجویز کیا انہوں نے اپنے سامنے بنوا کر دکھا دیا یہ تجویز محض ایک تجویز نہیں، عملاً یہ ہو سکتا ہے 1974 تا 1979 پراسیسنگ آف یورینیم مینوفیکچرنگ نیوکلیئر فیوزن یہ بھی ان کا کارنامہ ہے... یہ وہ حقائق ہیں جو پاکستان کی تاریخ میں مندرج ہیں اور ان حقائق کو یہ مٹا ہی نہیں سکتے

مرزا منور احمد اور ڈاکٹر محمد افضل

شیخ لطیف صاحب کے علاوہ مرزا منور احمد صاحب ٹورانٹو کا میں نے بتایا ہے اسی طرح ڈاکٹر محمد افضل صاحب 1964 سے 1969 تک سنٹر فار نیوکلیئر سٹڈیز میں لیکچرار رہے ہیں یعنی پروفیسر تھے اور اٹامک انرجی کے سائنس دانوں کو نیوکلیئر سائنس کی ٹیکنالوجی پڑھانے میں انہوں نے سب سے نمایاں کام سرانجام دیا ہے جو ٹیم بنی ہے، بہت سارے کثرت سے لوگ involve ہوتے ہیں ایسے کاموں میں، اس ٹیم کو بنانے میں بھی احمدی پروفیسرز کا دخل ہے (ایضاً خطبہ جمعہ)

ڈاکٹر عبد السلام کا استعفیٰ

1974 میں بھٹو کی حکومت نے جب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا تو ڈاکٹر عبد السلام نے دینی غیرت کے پیش نظر حکومت پاکستان کے سائنسی مشیر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن اپنے طور پر رہنمائی جاری رکھی۔

نوبیل انعام 1979

ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو 1979 میں فزکس میں نوبیل انعام ملا جس سے پاکستان، اسلام اور احمدیت کا نام روشن ہوا

صدر پاکستان کا تار

اس موقع پر صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے مبارکبادی کا آپ کو جو تار بھیجا اس میں لکھا ''آپ نے یقیناً پاکستان کی عظمت اور سرفرازی کو نئی تابانی بخشی ہے۔'' (بحوالہ جنگ کراچی 16 اکتوبر 1979) آپ کو حکومت پاکستان نے اعلیٰ ترین سول اعزاز "نشان امتیاز" بھی دیا۔ مکہ سے شائع ہونے والا اخبار آپ کے نوبیل انعام حاصل کرنے پر عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مکہ کے ایک اخبار نے لکھا۔ ''ایک مسلمان پاکستانی عالم کا اس انعام کا حصول سارے عالم اسلامی کے لئے شرف و عزت کا موجب اور ان کی محنت کا ثمرہ ہے۔'' (العالم الاسلامی 19 نومبر 1979)

امام جماعت احمدیہ کا پیغام

امام جماعت احمدیہ حافظ مرزا ناصر احمد صاحب نے بھی آپ کو مبارکبادی کا تار بھیجا جس میں فرمایا۔ ''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں میری طرف سے اور جماعت احمدیہ کی طرف سے پر خلوص دلی مبارکباد قبول کریں احمدیت اور تمام پاکستانیوں کو آپ پر فخر ہے کہ وہ پہلا مسلمان سائنس دان اور پاکستانی جس کو انعام ملا وہ ایک احمدی ہے خدا تعالیٰ مستقبل میں آپ کو اپنی تائید و نصرت سے نوازتا رہے۔'' (روزنامہ الفضل ربوہ 17 اکتوبر 1979) 1980 میں آپ حکومت پاکستان کے سٹیٹ گیسٹ کے طور پر پاکستان تشریف لائے اور آپ کے نوبیل انعام ملنے کے بعد اپنے ملک میں آنے سے پاکستان اور اداروں کی دنیا بھر میں پذیرائی ہوئی۔

حضرت مسیح موعود کی ایک عظیم الشان پیشگوئی کے پہلے مظہر

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر پیشگوئی فرمائی تھی کہ میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کر دیں گے (تجلیات الہیہ)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے آپ کو اس عظیم الشان پیشگوئی کا پہلا مظہر قرار دیا۔

پہلا نیوکلیئر ٹیسٹ

28 مئی 1998 کو پاکستان نے چاغی بلوچستان کی پہاڑیوں میں پہلا کامیاب نیوکلیئر ٹیسٹ کیا اور اس طرح پاکستان ان ممالک میں شامل ہوگیا جو نیوکلیئر ممالک شمار ہوتے ہیں اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم محمد نواز شریف تھے جنہوں نے کئی موقعوں پر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

ایک متنازعہ شخصیت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو احمدیت کے عناد میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی جگہ کھڑا کر کے پاکستان میں ایٹم بم بنانے کا ہیرو بنانے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے فرمایا۔''..... یہ جو کہا جارہا ہے کہ عبدالقدیر نے فیوزن میں کام کیا باقی سب کام دوسروں نے کئے یہ سب غلط ہے عبدالقدیر صاحب کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کوئی شمار ہی نہیں تھا پروپیگنڈہ کے سپیشلسٹ ہیں وہ اور بہت پروپیگنڈا کیا ہے انہوں نے اس کے متعلق اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوچکی ہیں کہ کس طرح صحافیوں کو انہوں نے خریدا اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ان کو اپنی تائید میں لکھنے پر آمادہ کیا اب یہ ساری باتیں پاکستان کے اخبارات میں چھپی ہوئی موجود ہیں ان کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ مجھے پسند نہیں کہ عبدالقدیر خان کے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کی کوشش کروں ان بیچاروں نے جو کچھ کریڈٹ لے لیا ہے اللہ ان کو مبارک کرے مگر تاریخ بدلنے کا ان کو کوئی حق نہیں تھا جو تاریخ کہہ رہی ہے وہ یہ۔ باتیں ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔''

(خطبہ جمعہ فرمودہ 12 جون 1998ء مطبوعہ الفضل انٹرنیشنل 31 جولائی تا 13 اگست 1998)

ڈاکٹرعبدالسلام صاحب کے چندمضامین

آتا ہے یاد مجھ کوگزرا ہوا زمانہ

کچھ یاد ماضی کچھ گزارشات

پروفیسرعبدالسلام صاحب کے قلم سے

گورنمنٹ کالج لاہور کے سوا سوسالہ جشن کے موقع پر کالج سے مجلہ ''راوی'' کے لئے خصوصی تحریر)بشکریہ ''راوی''

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گورنمنٹ کالج لاہوراپنی سوا سوسالہ زندگی کے موڑ پرایک جشن منارہاہےاوراس پرمسرت موقع پر ''راوی'' اپنا خصوصی شمارہ شائع کررہاہے۔دوسرے اولڈراویز کی طرح کچھ تو یادرفتہ کےطور پراورکچھ گزارشات موجودہ مسائل کے ضمن میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یاد ماضی کی باتیں زیادہ تر چالیس پچاس سال پرانی ہیں۔وطن عزیز کا حال اچھا نہیں ہے جو ہماری ہی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے۔یہ حال بہتر کیا جاسکتا ہےاورزیادہ تر گزارشات اسی سلسلہ میں ہیں۔

میراآبائی گھر ''جھنگ'' میں ہےاورگورنمنٹ کالج لاہورمیں آنے سے پہلے میں جھنگ کالج کا طالبعلم تھا۔1938ء میں میں جھنگ کالج کا طالبعلم بنا۔اس زمانہ میں یہ کالج ایک انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔تعلیمی کیریئر کی بنیاداس کالج میں پڑی۔میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی حقیر کامیابیاں جھنگ کالج اورگورنمنٹ کالج لاہورکی تعلیم اوران کالجوں کے استادوں کی شفقتوں کی مرہون منت ہیں۔

1942ء میں میں نے گورنمنٹ کالج لاہورمیں انڈرگریجوایٹ کی حیثیت سے داخلہ لیا۔چار سال تک گورنمنٹ کالج کا طالبعلم رہااور1946ء میں ریاضی میں ایم۔اے کی ڈگری لینے کے بعد کالج کوالوداع کہا۔اس چارسال کے عرصہ کی جو باتیں بھلائی نہیں جاسکتیں اوراب بھی یادآتی ہیں وہ

اس کے استادوں، دوستوں اور ساتھیوں کی ہیں جو کہ مسلمان بھی تھے۔ ہندو بھی اور سکھ بھی۔ بہترین تعلیم کا معیار بھی ابھی تک یاد ہے۔ انگریزی کے استاد پروفیسر ایش کمار تھے۔ وہ اب اسی سال کے ہیں زندہ ہیں اور ہندوستان میں چندی گڑھ میں رہتے ہیں۔ پروفیسر کمال موقع موقع پر اقبال کے شعر منایا کرتے تھے اس شعر

علیم نہایت آج کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہ ناشکی بے بہ دل امید وارے

یہ شعر بھی بہت سناتے تھے۔

زشرر ستارہ جوئم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

1981ء میں گورونانک یونیورسٹی میں جب ان سے ملا اور پوچھا کہ اقبال کا کیا حال ہے؟ تو کہنے لگے اب میں غالب پر آ گیا ہوں۔ وہ غالب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں غالب پر ایک مستند کتاب بھی لکھی ہے۔ انگریزی کے ایک اور استاد پروفیسر عبدالطیف صاحب تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ آنرز میں انگریزی پروفیسر سراج الدین پڑھایا کرتے تھے جو بعد میں پرنسپل بھی ہے۔ ریاضی ڈاکٹر ایس ایم چاولہ پڑھاتے تھے وہ اب شاید Kansas University سے وابستہ ہیں۔ مرحوم پروفیسر عبدالحمید بھی ریاضی کے استاد تھے اور کئی دوسرے بھی۔

گورنمنٹ کالج کے قیام کے دوران مجھے کئی طرح سے خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ مثلاً مجھے 1945ء میں کالج یونین کا صدر ہونے اعزاز حاصل ہوا۔ میں نیو ہاسٹل کمیٹی کا بھی صدر تھا۔ ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ میں ''راوی'' کے اردو اور انگریزی دونوں حصوں کا ایڈیٹر بھی تھا۔ اس طرح کالج میں قیام کے دوران بہت بھرپور زندگی گزاری۔ ایک بات کا ضرور افسوس ہوتا ہے کہ میں پروفیسر صوفی تبسم کی کلاس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ وہ فارسی پڑھاتے تھے اور اس زمانے میں Extra Lectures کو Attend کرنے کی روایت نہ تھی اور میں نے فارسی کو بطور مضمون نہیں رکھا تھا۔

گورنمنٹ کالج کو(کیمبرج کی طرح) یہ روایت قائم کرنی چاہئے کہ چاہے کوئی ایک مضمون نہ بھی لئے ہو اور اس امتحان میں نہ بیٹھ رہا ہو تب بھی اسے اپنے پسندیدہ پروفیسر کے لیکچر میں بیٹھنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں طالبعلمی کے بعد 1951ء میں دوبارہ وابستگی ایک استاد کی حیثیت سے بھی رہی اور 1954ء تک میں ریاضی پڑھاتا رہا۔ مگر یہ وابستگی زیادہ دیر پا نہ تھی۔ مجھے پاکستان اور کالج دونوں ہی چھوڑنا پڑے۔ فزکس میں اعلیٰ تحقیق کی نہ تو کالج میں کوئی فضا تھی اور نہ ملک میں۔ راستے دو ہی تھے اور ان میں سے مجھے ایک کو چھوڑنا تھا۔ ایک یہ تھا کہ لاہور میں پڑھاتا رہوں اور اعلیٰ سائنسی تحقیق کو خیر باد کہہ دوں یا پھر کیمبرج واپس چلا جاؤں اور تحقیق کے کام کو جاری رکھوں۔ اس صورت میں کالج لاہور اور پاکستان کو چھوڑنا لازمی تھا۔ بادل نخواستہ دوسرا راستہ اختیار کر لیا اور یوں کالج سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ خیر اب میں پھر واپس اپنے تعلیمی زمانہ کی طرف آتا ہوں۔

میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد 1946ء میں کیمبرج پہنچا۔ کیمبرج کے کلاس روم میں طالبعلم اس انداز سے بیٹھتے ہیں جس طرح نماز سے پہلے نمازی مسجد میں آکر بیٹھتے ہیں۔ لیکچرار کے آنے سے پیشتر ایک سناٹا ہوتا ہے۔ لیکچر کے درمیان میں انگریز طالب علم چار چار قسم کی سیاہیوں والا قلم اور صحیح لکیریں ڈالنے کیلئے رولر استعمال کر رہا ہوگا۔ اس کی نوٹس لینے والی کاپیاں ایسی احتیاط سے لکھی گئی ہوں گی جیسے پروفیشنل خوش نویس لکھ رہا ہو۔ میرے ساتھ والے طالبعلم براہ راست سکولوں سے آئے تھے۔ عمر میں مجھ سے سب کم تھے لیکن ان کی خود اعتمادیوں اور امنگوں کا وہ عالم تھا جسے تحصیل کرنے کیلئے مجھے کم از کم دو سال درکار ہوئے۔ وہ ایسے ماحول سے آئے تھے جس میں ان کے سکولوں کا ہر استاد اچھے پڑھنے والے بچوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتا تھا کہ عزیز تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا۔ سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن بن سکتے ہو۔

کیمبرج میں ڈسپلن کا انداز بھی میرے لئے نیا تھا۔ کیمرج میں بی۔اے کا امتحان آپ زندگی

میں صرف ایک بار دے سکتے ہیں۔ آپ خدانخواستہ فیل ہو جائیں تو پھر دوسری بار امتحان دینا ممکن نہیں۔ ہاسٹل کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دس بجے رات تک آپ بلا اجازت کالج سے باہر رہ سکتے ہیں ۔ دس سے بارہ بجے تک ایک پینی جرمانہ، لیکن اگر آپ بارہ بجے کے بعد آئے تو سات دن کی Gating ہوگی اور اگر سال کے دوران تین بار ایسا ہوا تو آپ کو کیمرج سے نکال دیا جائے گا۔ کیمرج میں ہر طالب علم Adult تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے سب کاموں میں مکمل ذمہ دار گنا جاتا ہے۔ اس سے بے جا تعرض نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ سزائیں بھی وحشیانہ تھیں، جنہیں وہ طالبعلم مردانہ وار قبول کرتے تھے۔ کیمبرج میں یہ سختیاں 1968ء کے بعد سے ہٹ گئیں۔ کیمبرج کا طالب علم ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے دن جب میں St.Johns College پہنچا میرا اتیس سیر کا بکس ریلوے اسٹیشن سے تو Taxi پر چلا آیا لیکن جب کالج پہنچ کر میں نے پورٹر کو بلایا اور کہا یہ میرا بکس ہے تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے وہ Wheel Borrow ہے آپ اسے اٹھایئے اور باقیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لے جایئے۔ میں ان پرانے قصوں کی بازخوانی محض ذاتی حظ لینے کیلئے نہیں کر رہا میں تعلیم اور علم نوازی کے موضوع پر چند گذارشات کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں یہ داستانیں میرے مضمون کا حصہ ہیں۔

ہماری تعلیمی اور اقتصادی ترقی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان اس وقت جس بحران سے گذر رہا ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔

تعلیمی نظام کا اولین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے۔ کردار کی جو بنیاد کالج میں بنتی ہے وہ زندگی بھر شاید ہی بدل سکتی ہے لیکن اس تحریر میں میں شخصی کردار کے بارے میں عرض نہیں کروں گا۔ میرا رخ ہمارے تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف ہے۔ پاکستان کی 40 سالہ تاریخ میں سب سے اہم مسئلہ قومیت کا مسئلہ رہا ہے۔ پاکستان کا قیام ایک معجزہ تھا۔ دوسو سال کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں ایک خطہ عطا فرمایا ہے ہم جیسے چاہتے بنا سکتے تھے۔ لیکن اس طویل عرصہ

میں اپنے اندر احساس یگانگت، احساس اخوت اور احساس قومیت پیدا نہ کر سکے۔ چنانچہ اس پاک ذات نے ہمیں نااہل سمجھ کر اپنی وہ نعمت اور امانت اپنی پہلی صورت میں ہم سے واپس لے لی۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے تعلیمی نظام کا اولین فرض یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہماری یگانگت اور قومیت کے احساس کو پختگی دیتا۔ یگانگت اور قومیت کا تصور مختلف زمانوں میں بدلتا چلا آیا ہے۔ آج کے تصور کے لحاظ سے دنیا کے کئی ملکوں اور قوموں کی مثالیں ملتی ہیں۔ جن کا استحکام محض ان کے تعلیمی نظام کا مرہون منت ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا حال لیجئے۔ امریکہ کے یونائیٹڈ سٹیٹس میں انگریز، آئرش، جرمن، اٹالین، سویڈش، فرانسیسی سب قبیلوں کے لوگ رہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو قبیلوں کا نام دے رہا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اپنی علیحدہ قومیت کیلئے دو عظیم جنگوں میں جانیں دے چکے ہیں۔ ان کی زبانیں امریکہ آنے سے پہلے مختلف تھیں۔ مذہب مختلف تھے اور اب بھی مختلف ہیں لیکن امریکہ کے تعلیمی نظام نے جیسے ایک Crucible میں پگھلا کر ان قبیلوں کو ایک واحد قومیت میں منسلک کر رہا ہے۔ سکولوں میں ہر بچے کو امریکی دستور حفظ کرایا جاتا ہے۔ امریکی ہیرو اس کے زبان زد ہوتے ہیں۔ دن رات وہ امریکی ترانے سنتا ہے۔ ادیب، شاعر، افسانہ نویس اس طرز سے لکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہر ہر خطہ سے محبت اُس کے شہری کے خمیر میں رچ جائے۔ امریکہ کے شہری کو نہ صرف اپنے شہر سے محبت کا درس دیا جاتا ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو امریکہ کے ہزاروں شہروں کا شہری سمجھتا ہے۔ دور افتادہ یورپ کی گلیوں، جہاں سے وہ یا اس کے آباؤ اجداد آئے تھے۔ اسے مناسبت نہیں رہتی۔ اسے اپنے اس خطے سے مناسب ہوتی ہے جس سے اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کا روزگار اور اس کا ہر وسیلہ متعلق ہے۔ وہ اس خطے کو بڑھانے اور چمکانے کیلئے کوشاں رہتا ہے اور یہ سب کچھ سکولوں، کالجوں اخبارات، رسائل اور ٹیلیویژن کے ذریعہ ہوتا ہے۔

اس وقت پاکستان چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ (جن کے باشندوں کی اکثریت) مسلمان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جانیں دینے والے، زبان کے لحاظ سے، تاریخ کے لحاظ سے، خوراک اور لباس کے لحاظ سے کلچر کے لحاظ سے مغربی پاکستان دنیا کے Homogeneous ترین خطوں میں

سے ہے۔ یقین مانئے سکاٹ لینڈ، ویز اور انگلینڈ میں زیادہ دوریاں ہیں ۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد نسبتاً ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ امریکہ کی طرح ہمارا نظام تعلیم، ہمارا تعلیمی نصاب اس خطہ زمین سے ہماری محبتوں کو اجاگر کر سکتا ہے۔ میں ایک ذاتی خواہش کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ پاکستان میں ایک نئی اردو پیدا ہو، جو پرانی اردو، سندھی بلوچی، پشتو، انگریزی، پنجابی اور جھنگ کی منفرد بولی کا امتزاج ہو۔ جو یگانگت اور قومیت کا احساس بڑھائے۔ ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم یگانگت کے احساس کو Consciously اجاگر کرے۔ مجھے کئی برس پہلے بہت خوشی ہوئی تھی جب کراچی کے شہر میں جناب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی موجودگی میں ضیاء محی الدین صاحب نے ہیر رانجھا کو سٹیج کیا اور حضرت انشاء کے لفظوں میں۔

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

میری دوسری گزارش Technical اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ پاکستان اقتصادی طور پر پسماندہ ہے۔ ایک امریکن ہماری نسبت پچاس گنا زیادہ کماتا ہے۔ انگلستان کے ایک فرد کی اوسط آمدنی ہم سے بیس گنا زیادہ، ایران کی آٹھ گنا زیادہ، ترکی کی آٹھ گنا زیادہ، عراق، الجیریا، شام، مصر کی فی کس آمدنی ہم سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ہم قومی طور پر اس قدر غریب کیوں ہیں؟ مان لیا کہ ہماری بہت سی قومی دولت انگلستان والوں نے دہلی، پنجاب اور سندھ پر سو سالہ حکومت کے زمانے میں لوٹ لی۔ مان لیا کہ امریکہ خوش قسمت ہے۔ امریکہ والوں کو قدرتی اور معدنی وسائل سے بھرپور ایک خالی خطہ زمین مل گیا لیکن پوچھنے والا ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ ہم انگریز کے غلام کیسے بنے۔ اگر انگریز فن جہاز رانی سے واقف تھا اور ہم نہیں تھے تو یہ فن اسے کس نے سکھایا۔ اگر کلایو کی Flint Locks رائفلوں، بندوقوں اور توپوں کی ساخت اتنی اعلیٰ تھی کہ سراج الدولہ کی فتیلہ سوز (Matchlocks) ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں تو بندوق سازی کا یہ فن کس نے انگریز کو ودیعت کیا۔ یہ فن اس قوم نے خود ایجاد نہیں کیا تھا۔ کیا یہ فن ایجاد کرنے کے بعد تعلیم کے ذریعے سے

.انگریز نے خود ہی اسے اپنی قوم میں فروغ نہیں دیا۔

پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپ خانہ کی مرہون منت تھی۔رومی ترک تو اس فن میں 1536ء کے بعد بھی مزید تحقیق کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے بابر کی اولاد کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں ترقی کیلئے باقاعدہ تجربہ گاہ بنا لیتے۔آپ قسطنطنیہ میں تشریف لے جائیں ۔رومی ترک کا مسجد کا تصور اپنے زمانے میں نہ تھا کہ ہر شاہی جامعہ کے ایک طرف ہسپتال بنے گا۔ دوسری طرف مدرسہ، یہ مدرسہ صرف دینی درسگاہ ہی نہیں ہوگا۔اس میں توپ سازی کے تجربے بھی ہوں گے۔بدقسمتی سے جو ترک پاکستان اور ہندوستان آئے علم سے ان کی رغبت نسبتاً کم تھی۔وہ اپنی یادگاریں، مزار اور مقبرے مثلاً تاج محل وغیرہ چھوڑ گئے مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں۔

اگر خدا کی ذات نے امریکیوں پر رزق کھولا اور انہیں ایک نئے Continent سے نوازا تو کیا یہ ان کے عزم کا بدلہ نہ تھا جس نے انہیں بے کنار سمندروں میں نئے Contients کی دریافت میں طوفانوں سے لڑوا دیا۔اگر آج جاپان نے اپنی Industry کی دھاک ساری دنیا میں بٹھا دی ہے تو اس میں جاپانی نظام کا کتنا حصہ ہے۔خدا کے فرشتے جاپانیوں کو Technology کی تعلیم دینے کیلئے نازل نہیں ہوئے۔ایک زمانہ تھا کہ جاپان کا مال دنیا کی منڈیوں میں ناکارہ شمار کیا جاتا تھا۔اب ٹیکنیکل لحاظ سے سب سے زیادہ اسی کی ساکھ ہے۔British Layland نے Mini Morris کار تیار کی۔جاپان والوں نے وہی کاریں بنائی ہیں۔CC 1000 کے بجائے جاپان CC 600 کے آدھے سائز کے انجن سے وہی پاور Develop کرتا ہے۔یہ کس طرح ہوتا ہے؟ ہونڈا والے سو انجینئر جمع کرتے ہیں۔اس قسم کے انجینئر جو مغلپورہ سے ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں۔انہیں ایک سال کا وقفہ ملتا ہے اس دوران میں فرمائش ہے کہ وہ یہ نیا انجن Develop کریں گے۔اپنی صلاحیتیں استعمال کریں گے ان کی زندگی اور موت یہی ہے۔چالیس سال ہوئے امریکہ کے پروفیسر Townes نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔انہیں اس ایجاد پر نوبل پرائز ملا۔ان کا Patent توڑنے کیلئے ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کوششیں شروع ہوئیں اور اس قدر کامیاب ہوگئیں کہ اس وقت سے

الیکٹرونکس میں جاپانی بادشاہ ہیں۔ نہ صرف انہوں نے وہ ایجاد دوبارہ دریافت کی بلکہ پاکستانی ہو عرب ہو ایرانی ہو ٹرانسسٹر ٹیکنالوجی کو Develop کر سکے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں۔ آپ یقین نہ کریں گے یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے نا آشنا تھے۔ ایڈمرل Perry امریکن ایڈمرل جب پچھلی صدی میں اپنے جنگی جہاز جاپان لے کر آئے اور جاپانیوں نے انہیں روکنا چاہا تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے چوری ہوئی وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہو گیا اور دوسرے دن اسے واپس کر دیا گیا۔ جاپانی اس کے نعل غور سے دیکھنے اور نعل بند سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی Metallurgy اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ وہ لوہے کے نعل بناتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خودکشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج پر آئندہ داخلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس، کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ ہڑتالیں نہیں ہوتیں، امتحان کے سنٹروں کے دروازے اور شیشے نہیں توڑے جاتے۔ ساری قوم، سب استاد، والدین، طالب علم Examination Fever کا شکار ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنی مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔ بہت سال پہلے مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقع ملا۔ چین کے مڈل سکول میں طالب علم بارہ برس کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان مڈل سکولوں کو میرے طالبعلمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ کالج سمجھ لیجئے۔ ان پانچ سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو بارہ مضامین پڑھنا پڑتے ہیں۔ جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا وہ بارہ مضمون درج ذیل ہیں۔

(1) وطنیات (2) چینی زبان (3، 4) دو غیر ملکی زبانیں انگریزی، روسی یا جاپانی (5) ریاضی

(6) فزکس (7) کیمسٹری (8) بیالوجی اور زراعت (9) تاریخ (10) جغرافیہ (11) آرٹس (12) ڈرامہ، میوزک (13) ۔ Work Shop Practice

ہر طالب علم پورے بارہ کے بارہ مضمون پڑھتا ہے۔ (اب شاید نقشہ بدل گیا ہے)

میرے طالب علمی کے زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ مسلمان حساب نہیں پڑھتا۔ آج کل سننے میں آیا ہے کہ آدھے پاکستانی دماغ حساب یا فزکس یا کیمسٹری کے اہل ہیں۔ باقی پچاس فیصدی دماغوں کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ یہ مضامین ان میں سما نہیں سکتے۔ چینیوں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ سو فیصدی طالب علم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید یہ گمان فرمائیں کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار 16 / 17 برس کے طالبعلم کے لئے ہمارے انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا۔ اس کا تجربہ کرنے کیلئے میں نے فزکس اور ریاضی دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس Attend کئے۔ ریاضی میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ چودہ سالہ طالب علم Orders of infinity پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جو ہم لوگ B.A میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ وہ ہر صنعتی تکنیک کو چین میں رائج کریں گے ان کی نئی قومی زندگی ہمارے دو سال بعد 1949ء میں شروع ہوئی۔ لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان چالیس سالوں میں انہوں نے قومی سطح پر Electronics کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل کیا ہے۔ فولاد سازی انگلستان کے برابر تک جا پہنچی ہے۔ وہ اب Sophisticated Machine Tools بناتے ہیں۔ MIG21 ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالبعلم اپنے سکول اور اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتے میں ایک دن ورک شاپ میں صرف کرتا ہے۔ میں جس سکول کا معائنہ کرنے گیا تھا اس میں یہ کیفیت تھی کہ چودہ سے سولہ سالہ طلباء کا ایک گروپ Transister Components بنا رہا تھا۔ دوسرا گروپ Potaslam Corbonate معدنی صورت سے لے کر Titration کرنے کے بعد بوتلوں میں بند کر کے مارکیٹ کیلئے تیار کر رہا تھا۔ بارہ سالہ چہار طالبعلموں کا ایک گروپ اپنے ہم

جماعتوں کے بال کاٹنے میں مصروف تھا۔ایک کمرے میں چار بارہ سالہ بچے تین Cent لے کر باقی طلباء کے جوتوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ ڈالیں ان پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ہم نے جب پہلے جوتوں کی مرمت شروع کی تھی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ لگانے سے شرماتے تھے۔کھڑکیوں پر پردہ ڈالے رہتے تھے۔آہستہ آہستہ ہمیں اب اس محنت سے شرم نہیں آتی۔ضروری ہے کہ ہم اپنے طالب علمی کے زمانے میں Productive ہوں Parasite نہ ہوں۔ میں نے مدرسوں میں، کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں بار بار پوچھا کہ یہ مان بھی لیا کہ سب فیکٹریاں گورنمنٹ کی ملکیت ہیں لیکن آپ لوگ محکمہ تعلیم میں کام کرتے ہیں۔فیکٹریاں محکمہ صنعت کے پاس ہوں گی۔آپ کو متعلقہ سیکرٹری صاحب سے اجازت کسی طرح مل جاتی ہے۔آپ کو یہ سب کام کرنے کے لئے Grants کی ضرورت ہوگی۔اس کا انتظام کیسے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر صاحب اگر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر سے ملنا چاہیں تو عمال انہیں روک دیتے ہیں۔آپ کے ہاں اس قسم کے مسئلے کسی طرح حل ہوتے ہیں۔یقین مانئے جب کبھی میں نے سوال کئے میں انہیں سوال سمجھا ہی نہ سکا۔ان کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا تھا کہ ہماری سوسائٹی بنی اسی اصول پر ہے کہ ہر فرد جہاں بھی ہو ایک اچھے idea کی امداد کرے گا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی افسر کوئی حکومت کا عامل کسی طرح بھی روک بنے۔

چین کے بیان میں میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا۔میں عرض کر رہا تھا کہ اگر انگریز نے Industrial Technique ایجاد کئے اور انہیں تعلیم کے ذریعے اپنی قوم میں پھیلایا، اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے (بغیر معدنی یا دیگر وسائل رکھنے کے) اپنی ساری قوم میں skills پھیلا سکتا ہے۔اگر چین والے اپنی قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی مہارت سیکھے گا، اسے بڑھائے گا اور اگر سب قومیں اپنی غربت کا علاج اسی طرح کر رہی ہیں تو کیا اس میں ہمارے لئے سبق نہیں ہیں۔آپ فرمائیں گے کہ غریبی خود اتنی لعنت ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو، ننگا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھانے کی طرف توجہ ہی

نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمنی کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ 1947ء میں میں کیمبرج میں طالبعلم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سرنگوں تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء کی ایک پارٹی کو امریکن کنٹرول کمیشن والوں نے جرمنوں کی حالت دیکھنے کیلئے دعوت دی۔ 500 کے قریب طالبعلم سارے یورپ سے میونخ پہنچے۔ اس شہر میں ایک عمارت نہیں تھی جو صحیح وسالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلوں میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے لئے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے۔ ان خیموں کے شہر میں میں نے سنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ Research Scholar ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید 25 روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس مشاہرہ سے شاید وہ ایک وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا۔ جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی کی تحصیل کی۔ 1947ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ ہیر وارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک لاہور سے چھپی ہوئی اور خستہ حالت میں پھٹی ہوئی دلا بھٹی کی کاپی تھی۔ یہ سن کر کہ شہر میں ایک پنجابی وارد ہوا ہے وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ دلا بھٹی میں بعض مشکل مقامات میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی سے یہ مقام میرے لئے بھی مشکل تھے اور اس بے چارے کی یہ خواہش تشنہ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمائیں۔ مجھے معلوم نہیں وہ ڈکشنری شائع ہوئی یا نہیں۔ اگر شائع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم، ٹیکنالوجی کا علم زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزاریں گے۔ سٹرائیکس نہیں کریں گے۔ فلمیں نہیں دیکھیں گے۔ اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے۔ علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے شاید اس میں ہمارے لئے بھی سبق ہو سکتا ہے۔

قومی تعمیر کے بارے میں میں چین کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ یہ داستان

چیئرمین ماؤ نے بیان کی ہے اور اسے آپ ہر چینی کی زبانی سے سنیں گے۔ پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا اس کا نام ''پیر کم عقل'' تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی۔ لیکن اس کے دروازے کے سامنے ''نے ہانگ اور دانگ رؤ'' کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے جن کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں۔ ایک دن اس بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دو کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جس کا نام ''پیر دانش ور'' تھا اس بے عقل بوڑھے سے کہا ''میاں مجھے معلوم تھا کہ تم بیوقوف ہو لیکن اتنا گمان نہ تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گئے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو رفع کر سکو گے۔ ''بے عقل بوڑھا بولا تمہارا کہنا درست ہے لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹے ہیں، ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے یہ سلسلہ ہمیشہ رہے گا۔ پہاڑ اور زیادہ طویل نہیں ہوں گے۔ ہر کھودنے کے ساتھ ان کی طوالت کم ہی ہوگی۔ بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے دروازے سے دور ہو ہی جائے گی۔ ''پیر کم عقل'' کی یہ بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا دو فرشتے آئے اور انہوں نے ان دونوں پہاڑوں کی لعنت کو دور کر دیا۔

میری عرض ہی ہے کہ سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انہیں اپنے حلقہ اثر میں Patience کے ساتھ دور کرنے میں کوشاں ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ یہ فکر نہ کیجئے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔ خداوند تعالیٰ کی پاک ذات ان میں بہت برکتیں ڈالے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ اقبال کے خودی کے فلسفہ کے غلط معنی بھی نکال گئے اور Individualistic زیادہ ہو گئے اور قوم اور ملت کیلئے کام کرنے سے گریز کرنے لگے۔

''خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے''

سے یہ مطلب نہ تھا کہ ہم اپنے اپنے مفاد کو مقدم کر لیں اور قوم اور ملت کو ثانوی حیثیت دے

دیں۔ البتہ ہو یہی کچھ رہا ہے۔ مجھے دو کتابوں سے شغف ہے ہر...کی طرح ایک قرآن پاک سے اور خصوصیت سے اس کے سننے سے دوسرے شمائل ترمذی ہے۔ حضرت ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جن میں رسول پاک ﷺ کی ذاتی زندگی، حضور ﷺ کی رہائش، حضور ﷺ کی ذاتی شفقتیں، حضور کا فقر اور حضورؐ کی ذات پاکیزہ کا حال مجمع ہے۔

اس ضمن میں ایک بات یاد آ رہی ہے چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کی۔ انگلستان میں وہ ایک ہسپتال میں داخل تھے۔ میں عیادت کیلئے گیا اور ساتھ شمائل ترمذی لے گیا۔ انہیں دی اور کہا کہ اگر خدا نے توفیق دی تو مستقبل میں میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔ پھر میں Trleste چلا گیا۔ جب کئی مہینے بعد لندن واپس گیا اور ان کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کتاب کا انگریزی میں ترجمہ لئے بیٹھے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ شاید تمہیں وقت نہ ملے اور میرے پاس ہسپتال میں وقت تھا تو میں نے ترجمہ کر ڈالا۔ میں ہر طالب علم کو مشورہ دوں گا کہ وہ شمائل ضرور پڑھے اس کے پڑھنے سے بہت کچھ حاصل ہوگا۔

اسلام اور سائنس

’’اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے‘‘ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے مقالہ کی تلخیص

(مرسلہ: مکرم ملک مبشر احمد صاحب کراچی)

قرآن کریم اور سائنس

قرآن کریم میں بطور ایک سائنس دان مجھ پر فرض کیا گیا ہے کہ میں فطرت کے قوانین کو سمجھنے کی کوشش کروں اور ان کی تلاش طبیعیات، حیاتیات، طب اور ہیئت وغیرہ کے مشاہدات میں کروں کہ ان میں سب کیلئے

نشانیاں ہیں ۔قرآن شریف کی ساڑھے سات سو آیات میں (یعنی اس پاک کتاب کے تقریباً آٹھویں حصے میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ایمان لانے والے فطرت کا مشاہدہ کریں، اس پر غور کریں اور اس کے بھید کھولنے کیلئے کوشاں رہیں کہ انہیں عقل اسی لئے دی گئی ہے۔ان سے کہا گیا ہے کہ تحصیل علم کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنائیں۔

درود و سلام آنحضرت ﷺ پر کہ انہوں نے تعلیم کو ہر مرد و عورت کیلئے ضروری قرار دیا۔

آنحضرت ﷺ کے وصال کے سو برس کے اندر ہی مسلمانوں نے اس زمانے کے علوم پر عبور حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔اعلیٰ تعلیمی اداروں کے قیام سے ترقی کا ایک سلسلہ جاری ہوا جس سے ان کو ایسی علمی برتری حاصل ہوئی جو آئندہ تین سو سال تک باقی رہی۔

اسلامی دنیا میں سائنس کی ترقی کا نقطہ عروج 1000ء کے آس پاس تھا۔یہ زمانہ ابن سینا کا تھا جو قرون وسطی کے آخری عالم تھے۔

اسلامی تہذیب کا ایک قیمتی عطیہ

اہل یونان نے تدوین کا کام کیا، عام اصول بنائے اور انہیں علمی زبان میں بیان کیا۔لیکن طویل اور مسلسل تجربات کا صبر آزما طریقہ اور تجربہ کسوٹی پر نتائج اخذ کرنا یونانی مزاج کے خلاف تھا۔جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے۔ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کروایا۔اسلامی تہذیب کا ایک نہایت قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔

ایمان اور سائنس

سائنس میں ہر نظریہ صرف عارضی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور ہر قدم پر اسے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔اہل ایمان کیلئے تمام ثابت شدہ حقائق ان کے رب العالمین کے عظیم منصوبہ کا جزو ہوتے ہیں۔یہ جس صورت میں بھی ظاہر ہوں ان کی نگاہیں منور ہوتی ہیں اور وہ وارفتگی کے ساتھ خالق حقیقی کے حضور سربسجود ہو جاتے ہیں۔جن معاملات میں طبیعیات خاموش ہے میرا ایمان اسلام

کے کامل پیغام پر ہے۔اس کا صاف اشارہ قرآن کریم میں سورۃ البقرہ کے آغاز میں ''**یومنون بالغیب**'' کے الفاظ میں ہے۔غیب سے یہ بھی مراد ہے کہ وہ سب کچھ کہ جس کا علم نہیں ہوسکتا۔(یا نہیں ہوسکا)

دنیائے اسلام میں سائنس کا زوال

اس زوال کا آغاز 1100ء کے لگ بھگ شروع ہوا تھا اور آئندہ ڈھائی سو سالوں میں یہ مکمل ہو گیا۔اس کی کئی ایک خارجی وجوہات بھی تھیں مثلاً منگولوں کی لائی ہوئی تباہی و بربادی،لیکن میرے خیال میں یہ زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور اس کا بنیادی سبب اندرونی حالات تھے۔سب سے پہلے تو اسلامی سائنس والوں کی اپنے آپ میں محدود ہونے والی وہ کیفیات تھیں جس سے ان کی سائنسی کاروائیوں کا رشتہ باقی دنیا سے ٹوٹ گیا اور دوسری طرف تحقیقی اور تخلیقی طرز فکر کی حوصلہ شکنی جیسا منفی رویہ تھا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام اور اگلی صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام سخت مذہبی گروہ بندیوں اور سیاست دانوں کی شہ پر بڑھتی ہوئی تنگ نظری کا شکار تھی۔اسی دور سے اسلامی دنیا کے زوال کی بنیاد پڑی۔ہر طرف کٹر پن کا رواج تھا۔رواداری عنقا تھی،چنانچہ تقلید عام ہوگئی اور اجتہاد کا دروازہ تمام علوم پر بند ہوا۔سائنسی علوم کا بھی یہی حال ہوا۔اب کیا حالت ہے؟ کیا اب اسلامی دنیا سائنسی تحقیقات کی ہمت افزائی کرنے گئی ہے؟؟ اس وقت روئے زمین پر اہم ترین تہذیبوں کے حوالے سے سائنس سب سے زیادہ کمزور اسلامی ممالک میں ہے۔

کچھ لوگ یہ وہم کرتے ہیں کہ جدید سائنس لا مذہبیت کی طرف لے جاتی ہے۔یہ خیال بھی ہے کہ سائنس دان ایک دن مابعد الطبیعیاتی حقائق کا انکار کر دیں گے۔میں سمجھتا ہوں سائنس کی طرف یہ رویہ ان پرانے جھگڑوں کی وراثت ہے جن میں قدیم فلسفی الجھے ہوئے تھے۔انہوں نے ارسطو کے تصور کائنات کو بلا چون و چرا مان لیا تھا اور ان میں کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ان کو ان خیالات کو اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ یکجا کرنے میں مشکلیں پیش آرہی تھیں ۔ایسے رویئے

سائنس کی ترقی میں روک رہا کرتے ہیں۔ یہ بات یادرکھنی چاہیئے کہ اس قسم کے بلکہ اس سے بھی زیادہ لغو جھگڑوں میں قرون وسطیٰ کے عیسائی اہل مکتب مبتلا تھے۔

اسلامی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالت

اس وقت اسلامی دنیا کو چھ جغرافیائی خطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔1۔ پہلے خطے میں جزیرہ نما عرب اور خلیج فارس کے نو ممالک ہیں۔2۔ دوسرے خطے میں شمالی عرب کے ممالک شام، اردن، فلسطین کا مغربی کنارہ اور غزہ ہیں۔3۔ تیسرے علاقے میں ترکی، مسلم وسطی ایشیاء، ایران، افغانستان اور پاکستان ہیں۔4۔ چوتھے گھنی آبادی والے علاقے میں بنگلہ دیش، ملائشیا اور انڈونیشیا ہیں۔اسی علاقہ میں ہندوستان اور چین کی کثیر تعداد والی مسلم اقلیتیں بھی ہیں۔5۔ پانچویں علاقے میں شمالی افریقہ کی ریاستیں شامل ہیں۔6۔ چھٹے حصے میں افریقہ کے غیر عرب ممالک ہیں۔

اسلامی ممالک میں اٹھارہ سے پچیس سال کی عمر کے افراد میں سے صرف دو فیصد یونیورسٹیوں کے سائنس کے شعبوں میں داخلہ لیتے ہیں۔اس کے مقابلے میں صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک کے اس عمر کے افراد میں سے بارہ فیصد سائنس سے متعلق شعبوں میں داخل ہوتے ہیں۔

اسلامی ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق اور ترقی پر خرچ (بلحاظ مجموعی قومی پیداوار) اور ترقی یافتہ ممالک میں اسی خرچ کے درمیان ایک اور چھ کی نسبت ہے۔ساری اسلامی دنیا میں سائنس اور انجینئرنگ کے محقق 45 ہزار کے لگ بھگ ہیں۔ جب کہ صرف جاپان میں ان کی تعداد 4 لاکھ ہے۔صرف طبیعیات میں اسلامی برادری کے سائنس دان ترقی یافتہ ممالک کے سائنس دانوں کا دسواں حصہ ہیں اور سائنسی تخلیقی کاموں میں ان کا حصہ ترقی یافتہ ممالک کے کاموں کا صرف ایک فیصد ہے۔تیل پیدا کرنے والے امیر مسلمان ممالک نے خطیر سرمایہ جنگوں میں ضائع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد سائنس کی ترقی کیلئے بہت کم رقم بچتی ہے۔اسلامی دنیا میں تجارت کا انتظام پوری طرح سے درآمد شدہ ٹیکنالوجی کے شکنجے میں ہے اور سائنسی نظام تخلیق کی بجائے منقولات کی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے۔مشرق وسطی میں سیاست اور سائنس کی پالیسی ہم آہنگ نہیں

ہے۔ اس علاقہ میں شخصی استبداد کا تسلط ہے۔ اس میں کہیں رحمدلی ہے تو کہیں صورت حال بالکل برعکس۔ اس لئے جب بھی کوشش کی جاتی ہے کہ سائنس اس سرزمین میں جڑ پکڑے تو دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس علاقہ سے ترقی یافتہ ممالک کی طرف ذہین افراد کی ہجرت سے سارے مشرق وسطی کی علمی حالت کمزور ہوتی جارہی ہے۔

کیا اسلامی دنیا میں سائنس کی حیات نو ممکن ہے؟

میں نہایت انکسار سے کہوں گا کہ ہاں یہ ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی معاشرے اور مسلمان نوجوان اس کو اپنا ایک مقصد بنالیں۔ ہماری نظریاتی روایات اس کی امین رہی ہیں۔ ہمارے قرون اولی کے تجربات اس سے معمور رہے ہیں۔ یہ آسان راہ نہیں ہے۔ لازم ہوگا کہ اسلامی برادری اپنے کام کرنے والے افراد میں سے آدھے سے زیادہ لوگوں کو سائنس کی اعلیٰ تربیت دینے کا انتظام کرے اور قومی پیداوار کا ایک سے دو فیصد حصہ بنیادی اور کام میں آنے والی سائنس کی ترقی کیلئے مخصوص کر دے اور اس رقم کا کم سے کم ایک چوتھائی سے ایک تہائی حصہ صرف بنیادی سائنس پر خرچ کرے۔

جاپان میں ایسا سب کچھ ہو چکا ہے جب وہاں کے شہنشاہ نے میجی انقلاب کے زمانہ میں یہ قسم کھائی تھی کہ روئے زمین کے جس کونے سے بھی علم حاصل ہو سکے حاصل کیا جائے۔ روس میں اسٹالن نے 1945ء کے لگ بھگ لڑائی میں تباہ شدہ معیشت کے زمانے میں طے کیا کہ سائنس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور یہ فیصلہ کر دیا کہ سائنس دانوں اور انجینئروں کی آمدنی میں تین سو فیصد کا اضافہ کر دیا جائے تا کہ ذہین نوجوان جوق در جوق سائنس کے تحقیقی میدان میں آئیں۔ سائنس پر اسی قسم کا زور آج کل عوامی جمہوریہ چین میں دیا جارہا ہے۔ وہاں یہ منصوبہ بنایا جارہا ہے کہ وہ جلد ہی خلائی سائنس، جینیٹکس، مائکروالیکٹرانکس، ہائی انرجی فزکس، فیوژن فزکس اور تھرمو نیوکلیئر انرجی کو قابو میں لانے والے میدان میں بہت آگے بڑھ جائیں۔ چین نے یہ حقیقت سمجھ لی ہے کہ آج کی بنیادی سائنس کل کی قابل عمل سائنس ہوگی اور یہ کہ سائنس کی سرحدوں پر گھوڑے تیار

حالت میں رکھے جائیں!

یہ بات مدنظر رہے کہ اسلامی ممالک کی قومی پیداوار چین کی قومی پیداوار سے زیادہ ہے اور چین کو ہم پر صرف چند دہائیوں کی برتری حاصل ہے۔ کیوں نہ ہم چین سے اپنی گم کردہ حکمت کی بات سمجھ لیں؟؟ سائنس کے قوانین اس کی روایتیں اور طریقہ کار ساری دنیا کیلئے ایک جیسے ہیں اس لئے یہ خوف یا وسوسہ نہیں آنا چاہئے کہ مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہماری روایات وثقافت کو نقصان ہو گا۔ مقامی ضروریات کو مدنظر رکھ کر سائنسی ترقی کرنی چاہئے۔ اسلامی ممالک میں سائنس دانوں کی سرپرستی کی کمی ہے۔ آج کل یہ حال ہے کہ ایک عرب یا مسلمان سائنس دان اگر ضروری قابلیت رکھتا ہے تو اسے پورا یقین ہے کہ وہ مغرب یا امریکہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ وہاں اس کا خیر مقدم ہو گا، حفاظت، عزت اور کام کرنے کا مساوی مواقع ملے گا۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہئے کہ کہیں ہم اپنے سائنس دانوں میں تفریق تو نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی ان کی ملازمت محض اس لئے ختم کر دیتے ہیں کہ ان کی پیدائش ایسے ملک میں ہوئی جہاں کی حکومت سے ہمارے کچھ عارضی اختلافات ہیں۔ میری رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کی سیاسی دولت مشترکہ کے بننے کا انتظار کئے بغیر اسلامی ممالک کی سائنس کی دولت مشترکہ بنائی جائے۔ ماضی میں اس کی مثال موجود ہے۔ جب وسط ایشیا کے رہنے والے بوعلی سینا اور البیرونی عربی میں لکھتے تھے اور اس کو بالکل قدرتی بات سمجھتے تھے۔............ یا............ابن الہیثم بغیر کسی اندیشہ کے خلفائے بنوعباس کی مملکت بصرہ سے ان کے رقیب بنو فاطمہ کے زیر نگیں مصر چلے گئے تھے کہ باوجود ہر قسم کے اختلافات کے (بشمول فرقہ وارانہ اختلافات) روہاں انہیں عزت اور مرتبت ملے گی۔ یہ خیال رہے کہ اس زمانہ میں مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلافات اتنے ہی شدید تھے جتنے کہ آج کل۔

اسلامی سائنس کی دولت مشترکہ کیلئے ضرورت ہے کہ شعوری طور پر اس کے لئے کوشش کریں اور اس کوشش میں ہم دونوں یعنی اہل سائنس اور اہل حکومت برابر کے شریک ہیں۔ اسلامی دنیا میں سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہی حالت سائنسی ذرائع اور علمی سرمایہ کی ہے۔ ضرورت یہ

ہے کہ اسلامی ممالک اپنے ذرائع کو ملا کر سائنس کے تحقیقاتی ادارے بنائیں۔ اس مقصد کے حصول کیلئے اسلامی ممالک کے سائنس دان اپنی اپنی حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ایک عرصہ کیلئے مثلاً پچیس برسوں کیلئے ان کو خاص رعایتیں دیں۔ ان کو ملک کے سیاسی و مذہبی جھگڑوں سے الگ رکھا جائے تاکہ وہ ایک علمی جماعت کی طرح کام کر سکیں۔ بالکل اس طرح جیسے ماضی میں سائنس کی اسلامی دولت مشترکہ میں کام ہوتا تھا۔

مسلمان ممالک کی سائنسی سرگرمیاں بین الاقوامی سائنس سے وابستہ نہیں ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ سوائے مصر کے کوئی اسلامی ملک چند ایک سے زائد بین الاقوامی سائنسی تنظیموں کا ممبر نہیں ہے۔ مسلم ممالک میں سائنس کے بین الاقوامی مراکز نہیں ہے۔ ان کے ہاں بہت کم بین الاقوامی سائنسی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ان کے سائنس دانوں کو دوسرے ممالک کے سائنسی مراکز میں جانے یا کانفرنسوں میں شرکت کے مواقع نہیں ملتے بلکہ اس طرح کے علمی سفروں کو ''تفریح'' گردانا جاتا ہے۔ سائنسی تنہائی کے اس احساس ہی کی وجہ سے میرے دل میں سائنس کے ایک ایسے عالمی مرکز کے قیام کا خیال آیا جہاں ترقی پذیر ممالک کے سائنس دان اپنے وطن کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہے بغیر کچھ مدت کیلئے آکر اپنے مضمون میں تازہ ترین باتیں سیکھ سکیں۔ یہ مرکز اقوام متحدہ کے دو ذیلی اداروں کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ دیگر ممالک کے علاوہ اسلامی ممالک کے تقریباً 75 سائنس دان بھی ہر سال یہاں آتے ہیں۔

اسلامی ممالک میں سائنس کی پیشہ وارانہ تنظیموں کا کوئی ٹھیک نظام نہیں ہے۔ ایسے ادارے بھی نہیں ہیں جو سائنسی پیش رفت کا جائزہ لیتے رہیں۔ ایسے سائنسی مراکز بھی نہیں جن کا انتظام سائنس دان ہی کرتے ہوں اور نہ ان کاموں کیلئے سرکاری بندشوں سے آزاد سرمایہ کا نظام ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی دولت مشترکہ میں سائنس کے احیاء کیلئے کم از کم پانچ شرطیں پوری ہونا چاہئیں۔ یعنی اس مقصد سے شدید جذباتی لگاؤ، فیاضانہ سرپرستی، حفاظت کا انتظام، خودمختاری اور سائنسی کارکردگی میں بین الاقوامی نقطہ نظر۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ

اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔

دنیائے اسلام میں احیاءِ سائنس کیلئے ضروری اقدامات

الف: کلام پاک میں دو باتوں پر بہت زور دیا گیا ہے ایک تفکر یعنی قوانین فطرت پر غور اور دوسری تسخیر یعنی ان قوانین فطرت کا فن کے ذریعے استعمال کر سکنا۔ اس ہدایت خداوندی اور موجودہ حالات کے پیش نظر پہلی بات جو امت کے کرنے کی ہے وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت کی ہمت افزائی ثانوی، آخری اور یونیورسٹی کے درجوں تک کی جائے۔

مختلف اداروں، مثال کے طور پر عالمی بنک کے شائع کردہ اعداد و شمار کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ممالک میں سائنسی تعلیم میں داخلہ لینے والوں کی تعداد دوسرے ترقی پذیر ممالک کے اوسط کو بھی نہیں پہنچتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کا تو ذکر ہی کیا۔

اسلامی دنیا کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں خوب ترقی دینی ہوگی۔ اس کے لئے لائق اساتذہ اور اچھے سائنسی ساز و سامان کی ضرورت ہوگی۔ غالباً سب سے زیادہ ضرورت تو اس بات کی ہوگی کہ سائنسی تعلیم کو ہونہار طلباء کے لئے ایسا پرکشش بنایا جائے کہ وہ آگے چل کر اسے چھوڑ نہ دیں۔ سائنس چھوڑ دینے کے بہت سے واقعات ہوتے ہیں اور اس کی بہت بڑی وجہ معاشی تنگ دستی ہے۔ والدین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی طویل تعلیم دلا سکیں جو پیشہ ور سائنس دان کیلئے ضروری ہے۔ امت میں سائنس کی تعلیم کے عام رواج کیلئے ایک ایسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی جس سے ان نوعمر طلباء کی ہمت افزائی ہو سکے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں اور جن کی عمر چودہ برس کے آس پاس ہو۔

ہندوستان کے ایک دورہ میں مسلمان ماہرین تعلیم سے ایک گفتگو کے دوران مجھے یہ اندازہ ہوا کہ صرف شمالی ہندوستان کے بیس بڑے شہروں میں سائنسی تعلیم کے وظیفوں کی مد میں قریباً پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت اتنی بڑی رقم پیش نہیں کر سکتی۔ تمام دنیائے اسلام کے ہونہار طلباء کے وظائف کیلئے تقریباً پانچ کروڑ ڈالر سالانہ وظیفوں کی

ضرورت ہوگی۔ اتنے کثیر سرمایہ کی فراہمی بہت آسان نہیں ہے۔ ابتداء میں غالباً تیل پیدا کرنے والے ممالک کو خود اپنے یہاں کے لئے اپنے وظائف کے انتظام میں فیاضی سے پہل کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اس سرمایہ کے دروازے کو دوسرے مسلمان ملکوں کیلئے کھولا جا سکتا ہے اور ان میں جغرافیائی اعتبار سے خاص ضرورت کے مضامین کی تقسیم ہوسکتی ہے۔ (ب): 1973ء میں میری تحریک پر حکومت پاکستان نے لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس میں درخواست کی تھی کہ اسلامی دنیا ایک ارب ڈالر سے امریکہ کی فورڈ فاؤنڈیشن کے برابر سائنس کی ترقی کیلئے سرمایہ کا انتظام کرے۔ اس کے آٹھ برس بعد صرف پانچ کروڑ ڈالر کا سرمایہ اکٹھا ہوسکا یعنی جتنا مانگا گیا تھا اس کا صرف 1/20 ملا۔ یہ اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات ہے۔

اسلامی دنیا میں ٹیکنالوجی

اب میں ٹیکنالوجی کا ذکر کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں تفکر اور تسخیر پر برابر کا زور دیا گیا ہے۔ یعنی جتنی تاکید علم کو حاصل کرنے کی فرمائی گئی ہے اتنا ہی زور سائنس کے علم کے ذریعے سے فطرت کے قوانین سے عملی فائدہ اٹھانے پر بھی دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی مثالیں دیکر سمجھایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کی ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ اسی طرح حضرت ذوالقرنین علیہ السلام کا ٹیکنالوجی کی مدد سے دفاع کرنے کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے۔ قرآن کریم یہ باتیں سبق حاصل کرنے کیلئے بیان کرتا ہے تاکہ لوگ ان پر عمل کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے شوق سے حفاظت کیلئے نئی ایجاد کو قبول فرماتے تھے۔ خندق کے استعمال کے ذریعے دشمن کے حملہ کو روکنا اور خیبر کی تسخیر کیلئے منجنیق بنائے جانے کا ارشاد (گو کہ اس کی تیاری سے قبل خیبر پر قبضہ ہوگیا) آپؐ کے ٹیکنالوجی استعمال فرمانے کی ہی مثالیں ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی ممالک کو وہ کونسی ایسی رکاوٹیں درپیش ہیں جو ان کو اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی حاصل نہیں کرنے دیتیں۔ بالخصوص وہ ٹیکنالوجی جس کی بنیاد جدید ترین سائنس پر ہے۔

عرب مسلمان ممالک میں ہائیڈروکاربن، پیٹروکیمیکلز، تعمیرات، وسائل نقل وحرکت، لوہے،

فولاد، ادویات، کھاد بنانے کے کارخانے اور دیگر صنعتی منصوبے وغیرہ جتنے گذشتہ کچھ برسوں میں لگائے گئے ہیں پہلے کبھی نہیں لگے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ان تمام منصوبوں کو ایسی فضا میں عملی شکل دی گئی جس میں ٹیکنالوجی سیکھنے کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ چنانچہ کسی ایک عرب ملک میں بھی یہ ٹیکنکل صلاحیت نہیں ہے۔ کہ ان کارخانوں کا ازخود نقشہ تیار کریں یا ان کو تعمیر کر سکیں یا ان میں ترقی پیدا کر سکیں۔ اس کے برعکس جاپان کو دیکھیں جس کی آبادی عرب ممالک کی آبادی کے تقریباً برابر ہے۔ جاپان نے پیٹرو کیمیکلز مشینوں کے میدان میں چند دہائیاں قبل ہی قدم رکھا ہے۔ انہوں نے پہلے دن سے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ ان مشینوں کو برآمد کریں گے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اگر اس کام کے جاننے والے شروع میں وہاں نہ بھی ہوتے تو بھی ایسے لوگوں کا تیار کرنا کچھ مشکل نہیں تھا کیونکہ ان کے پاس بنیادی سائنسی معلومات موجود تھیں۔

صنعت وحرفت میں یہ غفلت صدیوں سے جاری ہے۔ مثلاً 1800ء میں استنبول میں برطانوی سفیر نے اپنا مشاہدہ تحریر کیا تھا کہ یہاں لوگوں کو جہاز رانی کا علم نہیں۔ مقناطیس کا استعمال یہ نہیں جانتے۔ سفر سے پیدا ہونے والی روشن خیالی کو نہیں سمجھتے یہ صلاحیت مذہبی نخوت اور غیر ملکیوں سے حسد کی وجہ سے ختم ہو گئی ہے۔ سائنس دان مفقود ہیں۔ توپ بنانے والوں، جہاز سازوں یا اور ٹیکنیکل کام کرنے والوں کی عزت نہیں ہے۔ یہ لوگ ان لوگوں سے تجارت کرنا پسند کرتے ہیں جو ان کیلئے تیار شدہ قیمتی مال لاتے ہوں جس کو تیار کرنے میں خود ان کو کچھ زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

صنعت وحرفت میں خود کفیل نہ ہونے کی وجہ ہر اسلامی ملک میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جن لوگوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہے وہ ماہرین فن نہیں ہیں۔ (چند ممالک کے سوا) جاپان، چین، کوریا، سویڈن اور فرانس میں ماہرین فن سائنس دان اور منتظمین ملک باہمی مفاہمت، اشتراک، لگن اور بھروسہ کی فضا میں کام کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا کو یہ راز پھر سیکھنا ہے۔ زراعت، صحت عامہ، توانائی، مواصلات، دفاع غرضیکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہر شعبے میں ذاتی مہارت پیدا کرنی لازمی ضرورت ہے۔ ابن خلدون کی یہ پرزور نصیحت دنیائے اسلام کو سمجھنی چاہئے کہ بہتر صلاحیتوں کی جستجو

ہی بعض لوگوں کو دوسروں پر فوقیت دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو اقوام اس جستجو کو بیکار سمجھنے لگتی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔

حرف آخر

عالم اسلام سائنس کی طرف متوجہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے۔ بغیر سائنس کے مادی ترقی ممکن نہیں ہے۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک دنیائے اسلام کی سائنسی زبوں حالی کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

میں سخت شرم محسوس کرتا ہوں کہ جب کسی اسپتال میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہاں جان بچانے والی جتنی دوائیں استعمال ہو رہی ہیں چاہے وہ پنسلین ہو یا کوئی اور دوا ان کے دریافت کرنے اور بنانے میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ امام غزالی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''احیاء العلوم'' کے پہلے باب میں ایسی سائنسوں کی تخلیق اور ترقی پر زور دیا ہے جو اسلامی معاشرہ کیلئے ضروری ہیں مثلاً صحت عامہ کی سائنس۔ انہوں نے اس قسم کی سائنس کو فرض کفایہ بتایا ہے۔ میں اسلامی دنیا کے دولت مند افراد حکمرانوں، سائنس پالیسیوں کے ذمہ داروں اور علمائے دین کی توجہ سائنس کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ سائنس اس لئے ضروری ہے کہ اس سے مادی کائنات کے بھید کھلتے ہیں۔ فطرت کے قوانین کا علم ہوتا ہے اس کی حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ مادی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے دفاع کیلئے بھی ضروری ہے۔ یہ ساری دنیا کو ایک دھاگے میں پروتی ہے۔ اقوام اسلام اس کے ذریعے اپنے مقصد کی طرف بڑھ سکتی ہیں۔ عالم اسلام بین الاقوامی سائنس کا قرض دار ہے۔ یہ ادھار چکانا ہے۔

میں آج کل اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہوں۔ اس کی کل آبادی ڈھائی لاکھ ہے اور لوگ زیادہ امیر نہیں۔ یہاں کے ایک بینک نے 1963ء میں ہمارے انٹرنیشنل سنٹر فار تھیوریٹیکل

فزکس کی عمارت بنانے کیلئے پندرہ لاکھ ڈالر کا گرانقدر عطیہ دیا تھا۔شہر کے لوگوں نے اب وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں کے بائیوٹیکنالوجی کے مرکز کیلئے چار کروڑ ڈالر پیش کریں گے۔ان کے سائنس سے اس لگاؤ اور دور اندیشی پر مجھے سخت حیرت ہے۔ یہ ہمارے شہروں اور بینکوں کے لئے ایک سبق ہے۔صدیوں قبل ایسی روایات ہمارے ہاں بھی تھیں ۔ عالم اسلام سائنس پر رقم خرچ کرے۔ سائنسی اوقاف بنائے جن کا انتظام سائنس دان خود کریں ۔ عالمی تعلیمی ادارے بنائے جن میں اعلیٰ درجہ کے سائنس دان تیار ہوں ۔ اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ معیار کی اور سائنسی تخلیق کیلئے سامان مہیا کرے۔ عالم اسلام کا اسلام پر یہ قرض ہے۔سائنس اور اسلام میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔قرآن کریم کے احکامات اور رسول اللہ میں اسلام کی تعلیم کے مطابق علم کی تخلیق اور تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے۔ہے۔آخر میں میں قرآن مجید کے ان کلمات پر اپنی تحریر ختم کرتا ہوں۔

''تو انہیں کہہ (کہ) اگر (ہر ایک) سمندر میرے رب کی باتوں کے (لکھنے) کے لئے روشنائی بن جاتا تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے (ہر ایک) سمندر (کا پانی ختم ہو جاتا گو (اسے) زیادہ کرنے کے لئے ہم اتنا (ہی) پانی سمندر میں لا ڈالتے۔(الکہف 110).

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک مختصر خطاب

نوجوانوں کیلئے ایک پیغام

(مرسلہ: مکرم لطیف احمد صاحب کاہلوں)

یہ 1971ء کے زمانہ کی بات ہے۔ساہیوال میں محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے برادر نسبتی مکرم چوہدری نور الدین صاحب جہانگیر وفات پا گئے۔تو آپ اپنے اس عزیز کی تعزیت کیلئے ساہیوال

تشریف لے گئے۔ خاکسار بطور مربی ان دنوں وہاں مقیم تھا۔ جناب ڈاکٹر صاحب مغرب کی نماز کیلئے ''بیت مبارک'' ساہیوال میں تشریف لائے تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرض کی کہ آپ احباب جماعت سے کچھ خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بغیر تردّد کے حامی بھر لی چنانچہ نماز کے فوراً بعد آپ نے ایک نہایت مختصر سی تقریر کی مگر آپ اپنے اس چھوٹے سے خطاب میں بہت بڑا پیغام دے گئے۔ آپ نے فرمایا۔

دنیا کی دوڑ میں اپنے آپ کو منوانے کیلئے سب سے زیادہ کارگر اور کامیاب ہتھیار علم ہے۔ اگر آپ دنیا فتح کرنا چاہتے ہیں تو علم کے میدان میں اپنا لوہا منوانا ہوگا اور پھر ساتھ ہی یہودیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ مٹھی بھر یہودی اپنی علمی برتری کی وجہ سے تمام دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور بڑی بڑی حکومتیں بھی ان کی مرہون منت ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر آپ جائزہ لیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس وقت دنیا کا بہترین ڈاکٹر یہودی ہے۔ بہترین سائنسدان یہودی ہے۔ بہترین تاجر یہودی ہے غرضیکہ علم کے بل بوتے پر یہودی دنیا کے ہر میدان میں چھائے ہوئے ہیں۔ پس اگر ہم دنیا میں کوئی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیم کے محاذ پر مورچہ بند ہو جانا چاہئے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے یہودی قوم کے علمی جنون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہودی ماؤں کو علم سے اس قدر عشق ہے کہ وہ طالمود جوان کی روایات کی کتاب ہے کا وہ حصہ جو علم کی اہمیت سے متعلق ہے اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی حفظ کروا دیتی ہیں۔ آپ نے یہودی ماں کی علم سے لگن اور دیوانگی کی مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ علم کی محبت ان کے ذہنوں پر اس طرح حاوی ہے کہ اگر کسی یہودی ماں کا جوان بیٹا پانی میں ڈوب رہا ہو تو اس وقت بھی جب کہ اسے انتہائی مختصر الفاظ میں پکار کی ضرورت ہوتی ہے یہ نہیں کہتی کہ میرے ڈوبتے ہوئے بیٹے کو بچاؤ بلکہ اس وقت بھی وہ یہی چلائے گی۔ ہائے میرے ڈوبتے ہوئے ایم۔ اے بچے کو بچاؤ۔ گویا ایسی ہنگامی صورت حال میں بھی اس کے ذہن سے علم کی اہمیت نظر انداز نہیں ہوتی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے اس مختصر سے خطاب میں نہ صرف دنیا کا فاتح بننے کا گُر بتایا گیا بلکہ علم کی ترویج کیلئے جو آپ کے ذہن میں ایک جنون تھا اور جس کے لئے وہ تمام عمر نوع انسان اور خاص طور پر پاکستانیوں کیلئے تڑپتے رہے اس کی بھی ایک جھلک تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرنے اور کاش کوئی فرد یا قوم اس پیغام پر کان دھرے۔ آمین

ڈاکٹرعبدالسلام صاحب کا ایک لیکچر

سائنس، قیام امن اور اس کے مختلف پہلو

یہ تقریر وی آنا آسٹریا میں 16 دسمبر 1985ء کو ایک میٹنگ میں کی گئی

(ترجمہ محمد زکریا ورک صاحب)

ڈاکٹرعبدالسلام نے درج ذیل معنی خیز تقریر وی آنا (آسٹریا) میں 16 دسمبر 1985ء کو انڈی پنڈنٹ کمیشن فار انٹرنیشنل ہیومینی ٹرین ایشوز کے تحت ہونے والی ایک میٹنگ میں کی تھی۔ میں آئی سی ٹی پی کے لائبریرین Fasanella.M (Zobeni@ictp.trieste.it) کا مشکور ہوں جنہوں نے مجھے یہ تقریر فراہم کی۔

سائنس اور قیام امن کے تین پہلو

جنگ اور امن کے لئے بیسویں صدی میں سائنس مرکزی حقیقت کی حامل ہے۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے سائنس اور امن کے قیام کے تین پہلو ہیں جن سے متعلق میں اظہار خیال کروں گا۔

1۔ ترقی پذیر ممالک خاص طور پر سپر پاورز کے مابین امن، اس مسئلہ کے ضروری پہلو کا تعلق سائنس نیوکلیئر پیس سے ہے۔

2۔ ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ (صنعتی) ممالک کے مابین امن۔ جرمنی کے سابق چانسلر ولی برانڈت Brandt نے اپریل 1985ء میں تھرڈ ورلڈ پرائز لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا: ترقی یافتہ ممالک نے جو تباہ کن مشینری اکٹھی کی ہے وہ درحقیقت لوگوں کو ہلاک کر رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ کوئی اسلحہ استعمال نہیں کیا جاتا .... دنیا اس وقت جو بلین ہا بلین ڈالر ملٹری مقاصد کے لئے خرچ کر رہی ہے۔ وہ فی الحقیقت نوع انسانی کے لکھوکھہا افراد کے موت کی سزا کا نوشتہ ہے۔

مَیں آج ایسے دلائل پیش کروں گا جن کے مطابق ولی برانڈت کے خیالات میں اس امر کو بھی شامل کرنا چاہئے نہ صرف وہ بلین ہا بلین ڈالر جن کا اس نے ذکر کیا ہے بلکہ اس سائنسی ٹیلنٹ اور مہارت کو بھی جس میں دنیا کی کل سائنسی کوششوں اور ریسرچ کا نصف حصہ ملٹری R&D پر خرچ ہوتا ہے۔ 3۔ سائنس اور امن کے ایک اور پہلو کا تعلق ایک انفرادی سائنس دان کی ذاتی ذمہ داری ہے ہے۔ سائنس اور امن کا یہ پہلو میرے علم میں اس وقت آیا جب برٹرینڈ رسل نے سائنس دانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: (حضرات) اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھو سیرا کیوس (سسلی) میں جب ارشمیدس نے اپنی اہلیت اور علم کو جنگ کے لئے استعمال کیا تھا۔ سائنس دان اور ٹیکنالوجسٹ اپنی مہارت کو ظالم و غاصب لوگوں کے جنگی منصوبوں کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے ممالک کے دفاع کے نام پر ہمیشہ استعمال کرتے آئے ہیں۔

خوش قسمتی سے اس ہال کے اندر موجود ہم لوگ سائنس دان اور اس کے امن سے باہمی رشتہ سے متعلق فکر کرنے سے متعلق اکیلے نہیں ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں دوسرے کئی ایک ملتے جلتے گروپس اب منظر عام پر آئے ہیں جیسے Physicians for Social Responsibility Physicians for the prevention of nuclear war اس گروپ میں ایسے ڈاکٹر شامل ہیں جنہوں نے نیوکلیئر ونٹر کے خلاف صدا بلند کی ہے اور اس گروپ کو امسال نوبیل کا امن کا انعام بھی دیا گیا ہے۔ پھر جوہری ہتھیاروں کے خلاف سائنس دانوں کا گروپ ہے نیز دوسرے گروپس

Scientist against Nuclear Arms, Computer Professionals for Social Responsibility Electronics Professional for Peace.

مؤخر الذکر تین گروپس جن کا تعلق کمپیوٹر کے پروفیشن سے ہے وہ پچھلے کئی ماہ سے کافی دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ وہ صدر ریگن کے نئے منصوبہ SDI کے تکنیکی مسائل سے عوام الناس کو آگاہ کریں۔ بدقسمتی سے ترقی یافتہ ممالک میں سائنس دانوں کا کوئی مؤثر ایسا گروپ نہیں جو سائنس اور امن کے ترقی یافتہ ممالک میں (یا سائنس اور امن کے مفقود ہونے) کے متعلق فکر کرے۔ میں نے عرض کیا کہ بیسویں صدی کی زندگی میں سائنس ایک مرکزی حقیقت ہے اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ آج کی موجودہ دنیا ئیں جس صورت میں یہ ہمیں نظر آتی ہے یہ گزشتہ سو سال کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیداوار ہے۔ خاص طور پر وہ جیسے:

1۔ سائنس اور ٹیکنالوجی جس نے غریب بیماری اور جواں مرگی کو ترقی یافتہ ممالک سے ختم کر دیا (سویڈن کے ملک میں آج سے 150 سال قبل قحط) آیا کرتے تھے۔

2۔ کمیونی اور ٹیلی کمیونی کیشن جس نے ایک دنیا کے تصور کو حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔

3۔ پینی سلیین انقلاب کے پیچھے مضمر ٹیکنالوجی جو آبادی میں زبردست اضافہ کی ذمہ دار ہے۔

4۔ وہ ٹیکنالوجی جو ماڈرن فوڈ پروڈکشن، کیمیاوی اشیاء، کیڑے مار دوائیوں کی ذمہ دار ہے اور جس کی رحمت سے آج کی موجودہ آبادہ زندہ ہے۔

اوپر بیان کردہ پہلو تو دراصل سائنس کے مثبت پہلو ہیں۔ جب کہ منفی پہلوؤں میں سائنس کا وہ پہلو ہے خاص طور پر ایسی ٹیکنالوجی جس کا تعلق جدید تباہ کن ہتھیاروں سے ہے۔ اور جس کی وجہ سے آج کی نسل کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارہ میں شبہات ہیں۔ خاص طور پر فزکس نے انسانیت کو جوہری تباہی کے دھانے پہ لا کھڑا کیا ہے جب کہ میڈیسن اور بیالوجی باوجود یہ کہ انہوں نے امراء کی بیماریوں کو رفع کر دیا ہے۔ ان دو علوم نے غرباء کی بیماریوں کے لئے ترقی پذیر ممالک میں کچھ بھی

نہیں کیا جہاں لوگوں کی اکثریت ملیریا وغیرہ جیسی موذی امراض سے جاں بحق ہو جاتے۔ ان امراض کے علاج کا ان کو ابھی تک انتظار ہے۔

اگر میڈیکل سائنس کا صحیح مصرف ہو تو یہ کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اس کی ایک مثال چیچک کا دنیا سے حال ہی میں ختم ہو جانا ہے۔ جس کا سہرا ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے سر ہے۔ ایسی ہی دوسری امراض کا اس طور پر کیوں تدارک نہیں کیا جاتا؟ اس کی بڑی وجہ فنڈز کا نہ ہونا اور ایسی امراض پر طبعی ریسرچ کا فقدان ہے۔ سائنسی ریسرچ کے لئے فنڈز کیوں نہیں مہیا کئے جاتے ہیں؟ اس ضمن میں میں آپ کے سامنے گلوبل اخراجات جو ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ R&D میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر کئے جاتے ہیں۔ ان کے اعداد وشمار میں یہاں پیش کرتا ہوں جو پچھلے اکیس سالوں پر مشتمل ہیں۔

	صنعتی ممالک	ترقی پذیر ممالک
جی این پی	70ٹریلین	8ٹریلین
ملٹری اخراجات	4ٹریلین	8.0ٹیلین
غیر ممالک کو	3.0ٹریلین	06.0ٹریلین
امداد آر اینڈ ڈی	2.1ٹریلین	25.0مریلین

1979ء میں اقوام متحدہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ پسماندہ ممالک نے مطالبہ کیا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ریسرچ کے 2 بلین ڈالر دئے جائیں (خاص طور پر اطلاقی سائنس کے لئے) اس رقم کے علاوہ جو 2 بلین وہ اپنے ذرائع سے ہر سال اس ضمن میں پہلے ہی خرچ کرتے ہیں۔ (ایک فی صد سے 20 بلین ڈالر جی این پی بنتی ہے) مگر ان کو 70 بلین ڈالر کی امداد کی پیشکش ہوئی جو 1981ء میں 40 ملین ڈالر رہ گئی اور خرید کم تر ہو رہی ہے۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ غریب ممالک کی سائنسی کی کمیونیٹیز کو امیر ممالک کی سائنس کمیونٹیز اور اس کے ساتھیوں سے کوئی امداد نہیں ملی تا در پیش صورت حال کا کوئی حل نکالا جا سکے۔

جوہری جنگ کے ضمن میں سائنسدانوں کی ذمہ داری

اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں فرق واضح کردوں گا۔ نیز ہائی لیول سائنس دانوں اوران کی ریسرچ کے غیر ضروری مصرف کا۔ اگر ہم ایسے فرق کوملحوظ بھی رکھیں تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہائی لیول سائنس دان مثلاً جوہری ہتھیاروں کی تیاری میں کتنی جوابدہی کا ذمہ دار ہے؟ آیئے ذرا آئن سٹائن کی مثال لیتے ہیں جو اخلاقی طور پر تمام دنیا کا سب سے اعلیٰ متحرک سائنسدان تھا۔ اور جو بلا شبہ تمام سائنسی علوم میں سب سے زیادہ قدر و قیمت والا انسان تھا۔ آئن سٹائن نے e=ms square کا فارمولا وضع کیا تھا جو کہ جوہری مادہ کو تباہ کن انرجی میں ڈھالنے کا (مرکزی نقطہ) ہے۔ تو اس لحاظ سے اس ضمن میں اس کی کنٹری بیوشن کے بغیر اٹامک بم بنانا ممکن ہی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اس مشہور خط کا بھی مصنف تھا جو اس نے امریکی صدر روز ویلٹ کو لکھا تھا جس کے بعد میں ہائی پروجیکٹ شروع ہوا۔ مگر بعد میں اس پروجیکٹ میں شرکت کرنے سے اس نے انکار کردیا۔ اور جنگ عظیم دوم کے بعد پگواش موومنٹ Pugwash کا آغاز کیا۔ سائنس دان کی ذمہ داری سے متعلق سب سے مکمل تفصیلی بحث ورنر ہائزان برگ Heisenberg کی خودنوشت سوانح عمری فزکس اینڈ بیانڈ Physics & Beyond میں ملتی ہے۔ اس نے اس دور کا ذکر کیا ہے جب وہ اور جرمنی کے اٹامک گروپ کے اس کے ساتھی سائنسدانوں بشمول Otto Hahn Max von Laue, w,. Gerlach Von Weizsacker. Karl Wirtz, یونیورسٹی آف کیمبرج کے فارم ہال میں نظر بند کردیا گیا تھا۔

6 اگست 1945ء کی دوپہر کو انہوں نے خبروں کے خاص پروگرام میں سنا کہ ہیروشیما کے شہر پر اٹامک بم گرادیا گیا ہے۔ ہائزن برگ کہتا ہے: پہلے تو میں نے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کردیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اٹامک بمب بنانے کے لئے لامحدود فنی کوششوں اور ملین در ملین ڈالر کے اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ اس خبر کا سب سے زیادہ برا اثر آٹوہان Otto Hahn پر ہوا۔ یورنیم

فشن جو کہ اس کی سب سے اہم دریافت تھی اس کا موجود ہوتا جوہری ہتھیار بنانے کے لئے جزو لاینفک تھا۔ اور اس دریافت سے اب ایک بڑے جاپانی شہر کو خس و خاشاک کر دیا گیا تھا۔ اس شہر کے مکین معصوم افراد تھے۔ آٹو ہان اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بہت بری طرح متاثر تھا۔ اور اس کی طبیعت میں اضمحلال تھا اور ہم کو خطرہ تھا کہ کہیں وہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچائے۔

اس کے بعد ہائزن برگ اپنے اور وائز سیکر Weizsacker کے درمیان بحث کا ذکر کرتا ہے کہ آیا آٹو ہان مجرم تھا یا نہیں؟ وائز سیکر نے کہا: ہمیں دریافت کرنے والے اور موجد کے درمیان فرق کو واضح کر دینا چاہتے آٹو ہان کا فشن کا تجربہ دراصل ایک دریافت تھا۔ جب کہ ایٹم بم کا بنایا جانا ایک ایجاد تھا۔ وہ فزسسٹ جنہوں نے امریکہ میں بم بنایا وہ موجود تھے۔ وہ خود اس ایجاد پر کام نہیں کر رہے تھے بلکہ جنگ میں شامل ایک گروہ کے براہ راست حکم پر عمل درآمد کر رہے تھے تا وہ اپنی فوج کے لئے زیادہ سے زیادہ سٹرائکنگ پاور حاصل کر لیں۔

ہائزن برگ نے اس کے جواب میں کہا: امریکہ کے فزےسسٹ شاید یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ جرمنی ان سے پہلے ایٹم بم بنا لے گا............ یقیناً یہ بات قابل فہم ہے میرے خیال میں ہم میں سے کوئی بھی اس اعتراض کی انگلی نہیں اٹھائے گا۔ خاص طور پر اگر اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ ہمارے جنگی کنسنٹریشن کیمپوں میں کیا کچھ نہیں ہوا............ ہمیں ان پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہم میں سے کون تھا جو نازی حکومت کے جرائم کو روک سکتا۔ یہ بات کہ ہمیں ان جرائم کے بارہ میں ٹھیک ٹھیک معلومات حاصل نہیں تھیں۔ یہ کوئی قابل قبول بہانہ نہیں ہے کیونکہ ہمیں ان جرائم کے بارہ میں جاننے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہئے تھی۔

وائز سیکر نے جواب دیا: اگر ہم تمہاری اس دلیل کو قبول کر لیں تو پھر ہمیں امریکن طبیعیات دانوں کو موردالزام نہیں ٹھہرانا چاہئے کہ انہوں نے اپنے اعتراضات اتنی بلند آواز سے نہیں اٹھائے کہ عوام الناس ان کو سن سکتے۔ اور ایٹم بم استعمال کرنے کا فیصلہ انہوں نے دوسروں پر چھوڑ دیا۔

میں اس کے کہ وہ خود ایسا کر سکتے کیونکہ مجھے اس بات پر ذرا بھی شک نہیں کہ ایٹم بم گرانے کے برے اثرات ان پر شروع میں ظاہر و باہر نہیں تھے۔ بائزن برگ نے جواب دیا: میں نہیں جانتا کہ لفظ الزام اس ضمن میں مناسب لفظ ہے کہ نہیں میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس معاملہ میں ہم اٹلانٹک کے اس پار اپنے دوست سائنس دانوں سے زیادہ خوش قسمت تھے۔ ہائزن برگ کتاب کے آخری ابواب میں جرمنی کے چانسلر ایڈے ناؤر Adenaur کے ساتھ اپنے جھگڑوں کا ذکر کرتا ہے۔ ایڈے ناؤر نے اعلانیہ کہا تھا کہ جوہری ہتھیاروں کا حصول ہمارے لئے اپنی آرٹیلری کے مضبوط کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ کہ رسمی ہتھیاروں اور جوہری ہتھیاروں کے درمیان صرف ایک ہی ڈگری کا فرق ہے۔ ہائزان برگ کہتا ہے کہ اوپر کا بیان صرف دھوکے کے ماسوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور ہم کچھ کرنے پر مجبور ہوکے اور اپنے خیالات کا اعلانیہ اظہار کردیا۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم اعلانیہ احتجاج میں مزید قوت پیدا کر سکتے تھے۔ اگر ہم بحیثیت منفرد انسان کے اٹامک پروگرام میں شرکت سے حلفیہ انکار کردیتے۔ یہ اس اعلانیہ کی بنیاد تھی جو 16 اپریل 1957ء کو شائع ہوا۔ اس کا اثر جرمن پبلک پر بہت ہوا۔ ایڈے ناؤر اس مہم سے کافی ناراض تھا کیونکہ یہ بات اس کے سیاسی عزائم کے برخلاف تھی۔ جس کو اس نے بڑی احتیاط سے چنا تھا۔ اس نے بہت سارے فزے سسٹ کو Bonn کے دارالحکومت میں تبادلہ خیال کے لئے بلایا تھا۔ مگر ہائزبرگ نے جانے سے انکار کردیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اس طریق کار سے نئے یا مددگار آئیڈیاز سامنے نہیں آئیں گے۔

بائزن برگ بلا شبہ عزت افزائی کے قابل ہے۔ لیکن کیا یہ اس مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے کہ سائنس دان بھی بقراط کے حلفیہ عہد Hippocrates Oath کے طرز کے ایک عہد نامے پر ہاتھ دھریں جیسے کہ ڈاکٹرز کرتے ہیں یعنی وہ ایسے سائنس پراجیکٹس پر ریسرچ نہیں کریں گے بشمول بائیوٹیکنالوجی اور بائیوانجینئرنگ کے پروجیکٹس جو بالآخر نوع انسانی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ جہاں تک کہ امریکہ ایس ڈی آئی SDI کے منصوبہ کا تعلق ہے یہ امریکہ اور برطانیہ کی

یونیورسٹیوں کے کیمپوں پر خوب زیر بحث ہے۔ بد قسمتی سے جہاں جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا تعلق ہے آج کے موجودہ حالات میں یا پھر Straetegic Defence Initiative کے جزوی طور پر کامیاب ہونے کے بعد ایسا کوئی لائحہ عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ اب ہائی لیول سائنس دانوں کی مزید ضرورت نہیں ہے جو ایس ڈی آئی جیسے منصوبہ کیلئے جوہری ہتھیار تیار کر سکیں۔

اس کے برعکس اب ایسے ٹیکنالوجسٹ ہیں جو سائنس کے دریافت شدہ کے اصولوں کا استحصال کر سکتے ہیں۔ مگر کئی ایک صورتوں میں یہ امن مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ آیا ایسے سائنس دان ایسے حلفیہ عہد نامے پر قسم اٹھانا قبول کریں گے؟ ایک پیشہ ور سپاہی سے زیادہ یا ان سے جو اسلحہ تیار کرتے ہیں۔ ان باتوں کا دار و مدار ہر سوسائٹی کی طے شدہ ضرورتوں پر ہے۔ جو کہ سائنس دان کی ذمہ داریوں سے بالا ہیں۔

ٹریسٹ میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس

آیئے اب میں اس تقریر کو اس اقدام کے ذکر سے ختم کرتا ہوں جو کہ ہم نے ٹریسٹ (اٹلی) میں اٹھایا ہے۔ یعنی تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کا قیام۔ اکیڈمی ایسے تھرڈ ورلڈ کے نامور سائنس دانوں کے لئے لائحہ عمل تیار کرتی ہے جو اس بات پر فکر مند ہیں کہ ہمارے ملک میں سائنس کی حالت زار کیسی ہے؟ نیز وہ ساؤتھ کے ممالک میں گلوبل ریسرچ پروجیکٹس پر بھی مشوش ہیں۔

اکیڈمی کی پہلی میٹنگ سے 5 جولائی 1985ء کو اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے افتتاحی خطاب کیا اور 63 ترقی پذیر ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ تا وہ قیام امن، فلاحی و بہبودی اور انسانیت کی دگرگوں صورت حال پر گفتگو کر سکیں۔ جنرل سیکرٹری نے اپنے سحر انگیز خطاب میں فرمایا:

۔تمام آنرز ایسی سائنس کے لئے جو کائنات کا کھوج لگاتی ہے اور اس کے اسرار طشت از بام کرتی ہے۔ تمام آنرز ایسی سائنس کے لیے جو دماغ اور جسم کے درمیان اجتماعی نظام کے کام کو شرح وسط سے بیان کرتی ہے۔ یہ تمام آنرز ایسی سائنس کو جو درد اور تکلیف کم کرنے کے ذرائع تلاش کرتی

ہے۔۔تمام آنرز ایسی سائنس کو جو زمین کے حدود اربعہ کو وسعت دے رہی ہے اور جو مختلف نوع کے انسانوں اور معاشروں کے درمیان کمیونی کیشن کو بہتر سے بہتر بنا رہی ہے۔لیکن کوئی آنرز ایسی سائنس کے لئے نہیں جس میں پیار اور ہمدردی نہیں اور جو انسان کی امیدوں اور خوف سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ہے۔ خاص طور پر ہمارے عہد کا سب سے بڑا یہ خون کہ کہیں تمام نوع انسانی اجتماعی طور پر خودکشی کی مرتکب نہ ہو جائے ۔نو سو سال قبل عالم اسلام کے ایک جلیل القدر طبیب الاصولی جو بخارا کا رہنے والا تھا اس نے ایک میڈیکل فارما کو پیا تصنیف کیا۔جس کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔امراء کی بیماریاں اور غریبوں کی بیماریاں اگر الاصولی آج زندہ ہوتا اور آج کے مسائل کے بارہ میں اپنے خیالات قلم بند کرتا اور وہ تباہیاں جو انسانیت نے اپنے اوپر وارد کر لی ہیں۔تو مجھے قوی امید ہے کہ وہ اپنے مخزن ادویہ کو انہی حصوں میں تقسیم کرتا۔یعنی اس کی کتاب کا ایک حصہ نیوکلیئر تباہی کی مصیبت کا ذکر کرتا جو انسانیت کی نصف امیر آبادی نے اس پر لا کھڑی کی ہے اور کتاب کا دوسرا حصہ اس مصیبت کا ذکر کرتا جس کو نصف نوع انسانیت برداشت کر رہی ہے۔ یعنی انڈر ڈیویلپمنٹ اور انڈر نورشمنٹ، نیز قحط سالی۔

وہ ان مصائب کی وجہ بھی بیان کرتا کہ ان مصیبتوں کا مآخذ اور منبع ایک ہی چیز ہے۔امیر حصہ کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی زیادتی اور غریب حصہ کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کا نہ ہونا۔

وہ نوع انسانی کی مؤخر الذکر مصیبت کا بھی ذکر کرتا یعنی انڈر ڈیویلپمنٹ ۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ دنیا میں کافی ذرائع موجود ہیں،ٹیکنیکل، سائنسی اور مادی ذرائع جن کے ذریعہ سے غربت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے، بیماری کو دور کیا جا سکتا ہے اور (غیر ضروری) اموات کو تمام دنیا سے دور کیا جا سکا ہے اگر یہ ایسا کرنا چاہے۔ (الفضل 27 اکتوبر 2003ء)

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک یادگار انٹرویو

مجھے حقیقی سرور قرآن کو پڑھ کر اور سن کر حاصل ہوتا ہے

فزکس کے پیچیدہ مسائل پر غور کرنے میں آرام محسوس کرتا ہوں۔

اسلام واحد مذہب ہے جو فطرت کے قوانین اور ان پر تفکر پر بہت زور دیتا ہے۔

انگریزی ترجمہ: محمد زکریا ورک، کینیڈا

دنیائے (احمدیت) کے سب سے پہلے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر عبدالسلام کا یہ انٹرویو لوئیس دول پرٹ Lewis wolpert نے ان کے گھر واقع ساؤتھ لنڈن (پٹنی) میں لیا تھا جب گھر کے اندر بچوں کا شوروغل اور گھر کے کام کاج پورے زور شور سے ہو رہے تھے۔ انٹرویو لینے والے نے اس بات کا اظہار کیا کہ اس ماحول میں کیسے یہ چوٹی کا سائنسدان اپنی زمین شکن تھیوریز کو وضع کرتا ہے۔ شاید اس کے خیال کی پرواز اس قدر تیز اور گہری اور اتنی اونچائی پر ہوتی ہے کہ اسے اس ماحول کا علم ہی نہیں ہوتا ہے۔ انٹرویو کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا۔ میری تربیت میرے بہی خواہوں اور خاص طور پر میرے والد صاحب نے کی جو میرے انڈین سول سروس میں جانے کے خواہش مند تھے مگر میرا پارٹیکل فرسٹ بن جانا محض حادثاتی ہے یہ حادثہ دوسری جنگ عظیم کا ہے اگر جنگ عظیم وقوع پذیر نہ ہوتی تو انڈین سول سروس کے امتحان ضرور ان مہینوں میں منعقد ہوتے جن دنوں میں جنگ عظیم جاری و ساری تھی اور مجھے فیصلہ کرنا پڑتا کہ میرا مستقبل میں کیریئر کیا ہوگا اور اب تک شاید میں سول سرونٹ بن چکا ہوتا۔

سوال...... تو کیا اس وقت آپ کے ذہن میں سائنس میں مستقبل کا کوئی وہم بھی نہ تھا؟

جواب........نہیں فی الحقیقت یہ بات حادثاتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جنگ عظیم دوم کی وجہ سے تمام آئی سی ایس کے امتحانات بند تھے جنگ کے معاً بعد بھی سول سروس کے امتحان منعقد نہ ہو رہے تھے میں یونیورسٹی آف پنجاب سے ایم اے ریاضی مکمل کر چکا تھا اور مجھے کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ ملا تھا۔

سوال......گویا آپ کا ذہن اور فطری رجحان سائنس کی طرف چھوٹی عمر سے تھا؟

جواب........ہاں ذہنی یا سائنسی رجحان تو ٹھیک ہے مگر میں ریاضی کی تعلیم اس لئے نہیں حاصل کر رہا تھا کہ ریسرچ کروں گا بلکہ اس کا مقصد سول سروس امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کرتا تھا گویا یہ نمبر حاصل کرنے کی ایک ترکیب تھی۔

سوال......تو گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دل میں سائنس کے لئے شدید خواہش چھپی ہوئی ضرور تھی۔ جواب.......میں سائنس کے مضامین پر دسترس ضرور رکھتا تھا کچھ ہی روز پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میں نے سب سے پہلا ریسرچ پیپر سولہ سال کی عمر میں تصنیف کیا تھا جو ریاضی کے ایک جرنل میں شائع ہوا تھا یعنی ریسرچ کے لئے فطری رجحان ضرور تھا مگر اس کے لئے کوئی موٹی ویشن نہیں تھی البتہ کیمبرج میں دو سال ریسرچ کے بعد میں اس میدان میں پوری دلجمعی سے اتر چکا تھا۔

سوال......آپ کا کیمبرج جانا کیسے ممکن ہوا؟

جواب......میرا کیمبرج جانا ایک سکالرشپ جس کا نام سمال ڈیسنٹ ویلفیئر فنڈ تھا اس کے ذریعہ ممکن ہوا یہ فنڈ اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے قائم کیا تھا۔

سوال کیا آپ کے خاندان کا پس منظر زراعت میں ہے؟ جواب......جی ہاں اگرچہ میرے والد سول سرونٹ تھے مگر ان کے پاس زرعی زمین کا قطعہ تھا جس کی بناء پر وہ پیزنٹ فنڈ کے معیار پر پورے اترے اس لئے مجھے ان وظائف میں سے ایک وظیفہ دیا گیا اور مزے کی بات یہ ہے کہ

صرف پانچ وظائف دیئے گئے مگر میرے علاوہ چار طلباء کو یونیورسٹی میں اس سال داخلہ نہ مل سکا پھر برصغیر کی تقسیم عمل میں آ گئی اور یہ وظائف خود بخود ختم ہو گئے تو یوں اس فنڈ کے قیام کا مقصد اور ان وظائف کا دیا جانا شاید صرف اور صرف میرے لئے مقدر کی طرف سے مقصود تھا۔

سوال.....آپ کے خیال میں کیا اس میں قسمت کا بھی کوئی دخل ہے کیونکہ ان واقعات میں ہر واقعہ محض اتفاقی معلوم ہوتا ہے؟

جواب......ہاں یقیناً میرے والد محترم جو بہت مذہبی اور نیک انسان تھے کہا کرتے تھے کہ میری کامیابیاں ان کی دعاؤں کا ثمرہ ہیں وہ چاہتے تھے کہ انکا بیٹا کی علم کے میدان میں ضیاء پاشیاں کرے وہ مجھے سول سرونٹ بنانا چاہتے تھے مگر جب میں نے فیصلہ کیا کہ میں ریسرچ میں زندگی گزاروں گا تو انہوں نے اس کو مناسب جانا اور میری ہر طرح دلجوئی کی مگر واقعات کا پورا سلسلہ Sequence of events یعنی میرا اسکالرشپ حاصل کرنا صحیح وقت پر میرا کیمبرج پہنچ جانا پھر میری سائنس میں دلچسپی کا اظہار ان کے خیال میں اس کے پیچھے کوئی خاص قوت کارفرما تھی۔

سوال....جب آپ کیمبرج پہنچے تو کیا آپ فوراً تھیورٹیکل فزکس میں ہمہ تن مشغول ہو گئے؟

جواب.....نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے ریسرچ کا کام ریاضی میں شروع کیا کیونکہ میری بیک گراؤنڈ اس مضمون میں تھی مگر رفتہ رفتہ ریاضی میں دو سال صرف کرنے کے بعد میں نے اپنی فیلڈ تھیورٹیکل فزکس چن لی اس وقت مشہور زمانہ سائنس دان پال ڈائیرک Paul Dirac اس وقت وہاں لیکچرار تھے اس لئے میں ان کے لیکچروں میں شامل ہو گیا پھر میرے سکالرشپ کا تیسرا سال بھی تھا میرے پاس اب یہ چوائس تھا کہ آیا میں ریاضی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں یعنی Part II of Math. Trios یا پھر فزکس ڈرائی پوز کروں۔ میرے اساتذہ میں سے ایک استاد شہرہ آفاق اسٹرانومر فرید ہوئیل Hoyle تھے میں ان کے پاس مشورہ کی غرض سے گیا کہ اب کیا کروں انہوں نے فرمایا کہ اگر تم فزسٹ بننا چاہتے ہو چاہے تھیوریٹیکل فزسٹ تو تمہیں کیونڈش لیبارٹری میں تجرباتی کورس

ضرور کرنا چاہئے اس کے بغیر تم کبھی بھی تجرباتی فزسٹ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرسکو گے۔ یہ مشورہ نہایت موزوں تھا مگر اتنا عرصہ تجربات نہ کرنے کی وجہ سے یہ سال میرے لئے تجرباتی کام کرنے کے لئے بہت جان جوکھوں والا تھا فی الحقیقت یہ میرے طالب علمی کے زمانہ کا سب سے مشکل ترین سال تھا۔

سوال ......آپ نے کس چیز کو بہت مشکل پایا۔ جواب ....تجربات کرنے کے لئے رجحان (کا مفقود ہونا) یہ بات بہت دلچسپ ہے کیونڈش لیبارٹری میں یہ روایت تھی کہ (تجربات کرنے کے لئے) اعلیٰ قسم کا ساز وسامان نہیں دیا جاتا تھا صرف رسی اور موم Sealing Wax دی جاتی اور طالب علم کو بددل کرنے کے لئے ہر طرح کی رکاوٹ پیدا کی جاتی اور آپ کو اس رکاوٹ کو دور کرنا ہوتا تھا۔ اس ضمن میں سب سے پہلا تجربہ جو مجھے کرنے کے لئے دیا گیا وہ یہ تھا۔

Measure the difference in wave length of 2 sodium D lines, the most prominent lines in the sodium spectrum

میں نے سوچا کہ اگر میں نے گراف پر ایک سیدھی لکیر کھینچی تو اس لکیر کو کاٹنے والی لکیر یعنی Intercept سے مجھے وہ مطلوبہ کو............ مل جائے گی جس کو میں نے ماپنا تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ایک سیدھی لکیر ریاضی میں دو نقاط سے بیان کی جاتی ہے اس لئے اگر آپ ایک اور ریڈنگ لیں تو ریاضی کے اصولوں کے مطابق یہ کافی ہے کیونکہ اب اس لائن پر تین نقاط ہوں گے دو سیدھی لکیروں کو بیان کرنے یا ذی فائن کرنے اور تیسرا اس چیز کو Confirm کرنے کے لئے۔

مجھے اس ایکس پیریمنٹ (Experiment) کی تیاری میں تین روز صرف ہو گئے اس کے بعد میں نے ریڈنگ لیں اس زمانہ میں تجربہ میں ملنے والے نمبر فائنل میں بھی شامل کئے جاتے تھے۔ سر ڈینیس ولکن سن D.Wilkinson Sir جو اس وقت سیکس یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے وہ میرے تجربہ کو چیک کرنے والوں میں سے ایک سپروائزر تھے لہٰذا میں اپنا ایکس پیری مینٹ ان

کے پاس لے گیا انہوں نے میری سٹریٹ لائن کو بغور دیکھا اور پوچھا۔تمہاری بیک گراؤنڈ کیا ہے؟
ریاضی.....میں نے جواباً عرض کیا

انہوں نے کہا ہاں میرا بھی یہی اندازہ تھا کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تمہیں صرف تین ریڈنگ لینے کی بجائے ایک ہزار ریڈنگ لینی چاہیے تھیں اور پھر ان کے درمیان میں سے سیدھی لائن گزارتے۔میں خاموش رہا اور دل میں کہا کہ میں واپس تجربہ گاہ میں ہرگز جانے کا ارادہ نہیں رکھتا کہ پھر دوبارہ وہاں جا کر سروردی سے بھرپور تین دن گزاروں میں اس وقت تک اپنے ایکس پیری مینٹ کے ساز و سامان کے اجزاء کو الگ الگ کر چکا تھا اور میں واپس تجربہ گاہ نہیں جانا چاہتا تھا اس کے بعد میں نے سر وِلکنسن کو بقیہ سال اپنا منہ نہ دکھایا۔مجھے ابھی تک وہ دن یاد ہے 1949ء میں جب امتحانات کے ریزلٹ آئے تو میں کیونڈش میں دیوار پر لگی فہرست پر اپنا نام تلاش کرنے میں مگن تھا تو پیچھے سے مسٹر سر وِلکنسن اچانک نمودار ہوئے اور فرمایا تمہارے کتنے نمبر آئے اور کیا کلاس ملی ہے؟ جناب مجھے فرسٹ کلاس ملی ہے۔میں نے شرمندگی سے جواباً کہا۔وہ اپنے پاؤں پر کھڑے کھڑے تین سو ساٹھ ڈگری گھوم گئے اور مجھے مخاطب ہوئے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان بعض دفعہ دوسروں کے بارہ میں کس قدر غلط اندازے لگا لیتا ہے۔تو ہم بات فریڈ ہوئیل سے مشورہ .... رہے تھے ان کا مشورہ نہایت مناسب اور موزوں تھا۔

سوال .... پارٹیکل فزکس میں تھیوری کے بعض اجزاء کو ملانے سے آپ کو نوبیل پرائز ملا ہے آپ کو اس کا آئیڈیا کیسے آیا؟

جواب .... یہ آئیڈیا بہت ہی دلکش ہے پارٹیکل فزکس بلکہ فزکس کی تاریخ اس بات پر مشتمل ہے کہ فزکس میں موجود کن سٹپٹس Concepts کو کم سے کم تعداد میں لایا جائے اور جب انسان ان آئیڈیاز کو کم تعداد میں بیان کرنے کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو یہ کام بالکل نیچرل معلوم ہوتا ہے فی الحقیقت اس بات پر مجھے اچنبھا ہوتا ہے کہ میرے بعض دوست احباب جن میں

سے ایک نوبیل انعام یافتہ سائنس دان بھی شامل میں میرے آئیڈیاز سے اتفاق نہیں کرتے تھے وہ کائنات میں کارفرما بالکل متفق قوتوں کے فی نامینا Phenomenon کو متحد کرنے کے خیال سے اس قدر گھبراتے تھے کہ وہ ایسا کرنے والے یا سوچنے والے کو احمق انسان گردانتے تھے۔

سوال...کیا آپ کے خیال میں آپ کے مذہبی نظریات ان قوتوں کو متحد کرنے میں ممد ثابت ہوئے؟ جواب.......شاید ایسا ہی ہو کیونکہ میرے ذہن کے پیچھے والے خانہ میں یہ خیال ضرور موجود تھا مگر میں جان بوجھ کر خوب سمجھتے ہوئے ایسا نہیں کہوں گا کیونکہ مذہبی تعلیمات میں بیان کردہ اتحاد یعنی Unity انسان کی سوچ پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔

سوال......اسٹیون وائن برگ بھی آزادانہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچا تھا کیا یہ بات اچنبھے والی نہیں ہے۔ جواب........ہرگز نہیں۔ ہمارے موضوع میں بیان ہونے والے آئیڈیاز کامن ہیں مگر ان آئیڈیاز کا diffusion یعنی ان کا انتشار حیران کن طریق سے بہت وسیع ہے ہر شخص (سائنسدان) یہ بات جانتا ہے کہ اس کی فیلڈ میں کیا ریسرچ ہو رہی ہے شاید اس کی وجہ یہ سسٹم ہے جو ہم نے ڈی ویلپ کیا ہے یعنی سمر سکولز اور سمپوزیم اور پری پرنٹ سسٹم فی الحقیقت یہ سسٹم بہت موثر ہے اور تھیوریٹیکل فزکس میں یہ سسٹم سب سے زیادہ آرگنائز ہو چکا ہے جب میں اور سٹیو Steve اس تھیوری پر ریسرچ کا کام کر رہے تھے ہم ان آئیڈیاز کو مدنظر رکھ کر ریسرچ کا کام کر رہے تھے جو اگرچہ شائع ہو چکے تھے مگر ان کو زیادہ وقعت نہیں دی جاتی تھی اس لحاظ سے یہ فیلڈ تمام کی تمام ہمارے حلقہ اثر میں تھی بہ نسبت آج کے دور کے۔

سوال...............کیا لوگوں نے آپ کی نئی تھیوری کو فوراً قبول کر لیا تھا؟

جواب.......نہیں ہرگز نہیں تھیوری کی تشریح منظر عام پر 1987ء میں آئی مگر اس کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا بلکہ اسے پہلے ہی یہ نظر ہو چکی تھی یعنی وہ پیپر جو میں نے 1964ء میں لکھا تھا اور جو میں نے ایک سائنسی جرنل کے ایڈیٹر کو بھجوایا تھا جس نے جواباً مجھے لکھا تھا۔ جس چیز کی تم پیش گوئی کر رہے

ہو اس کو ٹیسٹ کیا جا چکا ہے اور یہ کہیں دریافت نہیں ہوئی لہٰذا تم اس پیپر میں اس بات کا اضافہ کردو کہ یہ تحقیق تمام کی تمام Speculatio قیاسی ہے اور بادل نخواستہ مجھے ایسا پیپر میں لکھنا پڑا تا کہ میرا پیپر کم از کم شائع تو ہو جائے اس وقت ہونے والے تجربات غلط تھے جن کی طرف وہ ایڈیٹر اشارہ تھا لیکن ہمیں اس کی اطلاع بعد میں ملی۔

سوال. تو پھر تھیوری قبول عام کیسے ہوئی ؟ جواب........جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ کہ تھیوری کی تشریح 1967ء میں ہوئی تھی اس ضمن میں ایک ڈچ جوان ریاضی دان T. Hooft کا ذکر بہت ضروری ہے جس نے یہ ثابت کیا کہ میری تھیوری ریاضی کے تمام اصولوں پر پرکھے جانے کے بعد قابل تسلیم ثابت ہوتی ہے یہ اس نوجوان کا پہلا تحقیقی کام تھا جو اس نے 25 سال کی عمر میں کیا اس لئے اس آئیڈیا کو تھیوری ٹیشن کے نزدیک وقعت حاصل ہوگئی یہ کام 1971ء میں ہوا پھر 1973ء میں تجربہ کرنے والے سائنس دانوں نے تجربات دوبارہ کئے جو جنیوا میں سرن Cern کے اندر واقع ایکسل رے ٹر میں کئے گئے تھے ان سے پتہ چلا کہ ہماری تھیوری فی الواقع صحیح خطوط پر ترتیب دی گئی تھی پھر امریکہ میں بھی تجربات کئے گئے جنہوں نے جنیوا کے تجربات کو منفی قرار دیا۔ یوں کچھ سالوں تک امریکہ اور جنیوا کے تجربات میں یہ عمل دخل جاری رہا۔

سوال........ یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ وہ تجربات غلط ثابت ہوئے فزکس کی فیلڈ میں ایک آؤٹ سائیڈر ہونے کی بناء پر ایک شخص یہ سوچتا ہے کہ فزکس میں ایکس پیری مینٹل ڈیٹا تو کم از کم قابل اعتماد ہو میں حیران ہوں کہ (ٹھوس) حقائق اکثر یوں غلط ثابت ہوتے ہیں۔

جواب............دیکھیں بات یہ ہے آیئے مثال کے طور پر ایک تجربہ کرلیں جس کا تعلق یونی فی کیشن کے اگلے مرحلہ سے ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہم نے الیکٹرو میگنیٹک فورس کو ویک نیوکلیئر فورس سے متحد کر دیا ہے مگر ایک اور نیوکلیئر فورس بھی ہے۔ جس کا نام سٹرانگ نیوکلیئر فورس ہے جس کا اتحاد ابھی ویک فورس سے نہیں ہوا ہے ہمیں امید ہے کہ ایسا ضرور ہوگا اور ہم میں سے کئی ایک

یہ باور کرنا چاہئیں گے کہ ایسا اس وقت ہورہا ہے اس کے لئے فیصلہ کن تجربہ decay of proton ہے پروٹان اس تھیوری کے نمودار ہونے سے قبل بنیادی طور پر Stablparticle سمجھا جاتا تھا مگر یہ تھیوری کہتی ہے کہ ایسا ممکن نہیں بلکہ............10 سالوں میں پروٹان ضرور فنا ہوجائے گا یہ بہت لمبا عرصہ ہے جبکہ کائنات کی عمر 10 10 سال مانی جاتی ہے تو پھر میرے خدایا 1032 سالوں میں پروٹان زوال پذیر ہوجائے گا۔اس تھیوری کو تجرباتی طور پر دیکھنے اور پرکھنے کے لئے آپ کو 1032 پروٹان کی ضرورت ہے جن کا مشاہدہ ایک سال کے لئے کیا جائے قبل اس کے کہ ان میں سے ایک زوال پذیر ہوجائے۔اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک انڈین ایکس پیری منٹ کے مطابق جو سات ہزار فٹ گہرائی میں واقع Kolar Gold field mine تجربہ گاہ میں کیا گیا تین ایسے واقعات مشاہدہ میں آئے ہیں جن میں پروٹان کو زوال پذیر ہوتے دیکھا گیا ہے پھر جاپان ایک تجربہ کیا گیا ہے جس میں ایک بار ایسا ہوتے دیکھا گیا پھر امریکہ میں ایسے ہی اہم تجربات کئے گئے جن میں ایسا ہوتے بالکل نہیں دیکھا گیا۔تو پھر آپ کسی بات اور تجربہ کو قابل وثوق مانتے ہیں؟ تجربات کرنا جان جوکھوں والا کام ہے مجھے خود علم نہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا مگر یہ ایک فیصلہ کن تجربہ ہے تو اس لحاظ سے یہ بات عین ممکن ہے کہ بعض تجربات شاید غلط تھے یا پھر ان کی تعبیر غلط تھی یا پھر ہمیں اور مزید اشارات کے ملنے کے لئے انتظار کرنا ہوگا۔(روزنامہ الفضل 16 اپریل 2001ء)

سوال.........آپ ایک تھیوری ٹیشن ہیں آپ یہاں پرسکون بیٹھے ہیں اور ادھر ماہر تجربہ کار سائنس دان آپ کی تھیوریز کو ٹیسٹ کر رہے ہیں ان دیو قامت مشینوں کے ذریعہ تجربات کرنا ان لوگوں کے لئے ضرور مشکل ہوگا جب وہ کوئی تحقیقی کام شائع کرتے ہیں تو اس پر 50 یا 100 مصنفین کے نام لکھے ہوتے ہیں کیا ان لوگوں کو ایسا کرنا برا لگتا ہے؟

جواب.........میرے خیال میں بہت سے تجربہ دان اس صورت حال سے مطمئن نہیں ان میں سے بہت سارے پرانے طریق کار سے زیادہ اتفاق کریں گے جب ایک دو یا تین اشخاص

تجربہ کرنے میں ایک دوسرے سے معاونت کرتے اور اس سے محظوظ ہوتے تھے مگر اب صورت حال بہت مختلف ہے اور آپ بے یارو مددگار ہیں آپ کو تجربہ کرنے کے لئے بہت سارے سائنس دانوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ بہت گراں اور قابل قدر سرمایہ مانگتے ہیں اور ان کے لئے بہت سارے سائنسی آلات کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً سرن Cern میں ہونے والے دو تجربات کرنے کے لئے ان پر 150 تجربات کئے گئے تھے جس نے اس تھیوری کو ٹھیک ثابت کیا پھر سائنسی آلات نا قابل یقین سائز کے ہوتے ہیں جن مشینوں سے (ایٹم یا دوسرے ذرات) کو تلاش کیا جاتا ہے وہ تین منزلہ عمارت کی اونچائی کے برابر ہوتے ہیں۔

سوال......کیا آپ کی فیلڈ میں بہت مقابلہ بازی ہے؟ جواب......جی ہاں اس فیلڈ میں سرگرم اور فعال تھیوری ٹیشن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے اور اتنی ہی تعداد تجربات کرنے والے ماہرین کی ہے اور پھر نوجوان ہونا بھی اس میں شرط ہے جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں۔

سوال.......ایسا (یعنی جوانی کی شرط) کیوں ہے؟ کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جوانی میں انسان بہتر ہوتا ہے؟ جواب.....نہیں ایسا نہیں درحقیقت انسان جوانی میں زیادہ بوجھ نہیں اٹھائے ہوتا ہے انسان ماضی میں زندہ نہیں رہتا ہے انسان اپنی ناکامیوں پر کف افسوس نہیں ملتا ہے انسان نئے نئے آئیڈیاز کو مختلف طریقوں سے آزمانے پر زیادہ آمادہ ہوتا ہے۔

اس کے برعکس زیادہ عمر کے سائنس دان زیادہ بوجھ اس لئے اٹھائے ہوتے ہیں کہ ان کے کندھوں پر انتظامی ذمہ داریاں ہوتی ہیں تا کہ وہ تمام کام چلتا رہے اور دیگر اس سے ملتی جلتی ذمہ داریاں۔مگر اس سے زیادہ یہ ہے کہ انسان ماضی میں جن آئیڈیاز کو آزما چکا ہوتا اور ان میں ناکام ہو چکا ہوتا ہے ان سے وہ خود کو آزاد آسانی سے نہیں کرسکتا ہے کیونکہ انسان سوچتا ہے کہ فلاں آئیڈیا تو ختم ہو چکا ہے جبکہ فی الحقیقت وہ خاص طریق کار اور approach ختم ہو چکی ہوتی ہے جو آپ نے اس خاص آئیڈیا کے لئے استعمال کیا میرے نزدیک جتنے زیادہ آپ نوعمر ہوں گے اتنا ہی بہتر ہے بشرطیکہ آپ یہ رسک لے سکتے ہوں۔

سوال ....جب آپ نے یونی فیکیشن تھیوری پر ریسرچ شروع کی تو کیا آپ بھی نوعمر تھے؟ جواب ....اس آئیڈیا کا دراصل آغاز 1957ء کے لگ بھگ ہوا جبکہ میں اس وقت 31 سال کا تھا جو کہ جوانی کا ہی زمانہ ہے مگر اس پر عمل درآمد میں کافی عرصہ بیت گیا۔

سوال......کیا آپ ہر روز علی الصبح اٹھ کر اس تھیوری پر ریسرچ اور غور و فکر کا کام کیا کرتے تھے؟

جواب......نہیں ہرگز نہیں تمام یہ کام وقفہ وقفہ سے انجام پذیر ہوا انسان ان مخصوص سیٹ آف آئیڈیاز پر کام کرتا ہے پھر انہیں چھوڑ دیتا ہے اور کسی اور موضوع پر کام شروع کر دیتا ہے پھر انسان دوبارہ پہلے والے سیٹ آف آئیڈیاز پر کام شروع کر دیتا ہے اور یوں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس دوران بعض مضامین شائع کرتا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ ریسرچ آگے بڑھتی رہتی ہے۔

سوال...مگر کیا کبھی (ریسرچ کے دوران) آپ غلط ڈگر پر تھے یعنی کوئی بڑی غلطی آپ نے کی؟ جواب......شاید یہ خود بینی یعنی Egotism کا معاملہ ہے مگر میں کوئی ایسے کام کا سوچ نہیں سکتا جس میں مکمل طور پر غلط ڈگر پر کام کر رہا تھا بہت سارے آئیڈیا یقیناً احمقانہ تھے جن کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا مگر ایسا ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے ناوے فی صد آئیڈیاز کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا آپ خود کو بہت خوش قسمت انسان جانتے ہیں کہ اتنے سارے آئیڈیاز میں سے صرف ایک بھی صحیح ثابت ہو جائے۔

سوال.........آپ کو اس بارہ میں کوئی وسوسہ یا اندیشہ تھا؟

جواب .... ہرگز نہیں ہماری فیلڈ میں جب آپ کامیاب آئیڈیاز پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بارہ میں Inevitability موجود تھی اس کا پورا اظہار میں ایک لفظ سے کر سکتا ہوں یعنی سلیپ والکنگ یہ مشہور سائنسدان اور مصنف آرتھر کوئسلر Arthur Koestler کی کتاب کا نام بھی ہے جس میں کوپرلیکس۔ کیپلر اور گیلی لیو جیسے شہرہ آفاق سائنسدان موضوع سخن ہیں انسان چھوٹے چھوٹے قدم لے کر ترقی کی جانب رواں ہوتا ہے۔

سوال.......گویا سلیپ والکنگ فزکس میں ریسرچ کرنے کا غیر متحرک Passive طریق

کار ہے۔ جواب .... اس قسم کی سلیپ والکنگ دراصل سودمند ثابت ہوتی ہے یونی فیکیشن آئیڈیاز کو جس چیز کی ضرورت تھی ان کو ہم گیج تھیوریز کا نام دیتے ہیں یہ گیج تھیوریز دراصل میکس ویل Maxwell نے 1879ء میں دریافت کیں تھیں یہ الیکٹرومیگنیٹک کے اتحاد کے لئے اس نے جو مساوات وضع کیں ان سے معلوم ہوتا ہے پھر ان کی تشریح 1929ء میں جرمن ریاضی دان ھیرمین وائل Hermann Weyle نے کی ان کو جس صورت میں اب ہم استعمال کرتے ہیں یہ صورت ینگ اور ملز Mills Yang اور میرے ایک شاگرد Shaw نے 1954ء میں دی تھی ان آئیڈیاز کا آغاز میکس ویل سے ہوا مگر ان کو وسیع انداز میں اب موجودہ دور میں زیر استعمال لایا گیا ہے۔ پھر ہم نے (یعنی میں نے۔ وائن برگ اور گلاشو) نے سوچا کہ انہی گیج آئیڈیاز کی تو ہمیں اب ضرورت ہے یہ گویا اس سلسلہ میں ہماری کنٹری بیوشن تھی۔

آپ کو معلوم ہوگا نیوٹن سے جب پوچھا گیا کہ وہ اتنا عظیم انسان کیوں کر بن گیا تو اس نے جواب دیا۔ میں عظیم انسان نہ تھا مگر میں عظیم انسانوں کے کندھوں پر کھڑے ہوکر عظیم بن گیا۔ تو میرے نزدیک ہر نسل انسانی میں ایک سیٹ آف آئیڈیاز ہوتے ہیں جو عموماً ان میں اور پرانی نسل میں کامن ہوتے ہیں مگر لوگ ان کی دریافت کا سہرا اس شخص کے سر باندھ دیتے ہیں جس نے ان کا استعمال سب سے اچھا کیا ہوتا ہے اس نوع سے شاید فزکس ہمیشہ ہی سلیپ والکنگ کرتی رہی ہے۔

جب میں نے یہ کہا کہ 1879ء میں میکس ویل کو ایک زبردست آئیڈیا دماغ میں آیا تو در حقیقت اس نے یہ آئیڈیاز یا سیٹ آف آئیڈیاز کو فیراڈے Faraday سے ورثہ میں لیا تھا میکس ویل نے فیراڈے کی مساوات کو کاغذ پر لکھ کر اس کا بغور مطالعہ کیا تو ایسے معلوم ہوا کہ وہ بے رابطہ Inconsistent تھیں تو اس نے ایک اور ٹرم کا اس میں اضافہ کر دیا تو یوں اس لحاظ سے یہ چیز اٹل اور مبرم Inevitable تھی گویا یہ بھی سلیپ والکنگ کی ایک لطیف صورت تھی۔

آئن سٹائن کے آئیڈیاز کو دیکھیں ہم ان کو انقلابی اور زمین شکن تسلیم کرتے ہیں یعنی وہ آئیڈیاز جن کا تعلق زمان و مکان میں جھکاؤ Curvature of space & time سے ہے اور جو قوت

ثقل کے قانون کی تشریح کرتے ہیں ان کو اگر آپ ٹریس بیک کریں تو ان کا آغاز جرمن ریاضی دان گاس Guass سے ہوا جس نے خلاء میں جھکاؤ Curvature of spac معلوم کرنے کے لئے ٹیسٹ کئے جو چیز اس نے نہ کی وہ یہ تھی کہ اس نے اس میں ٹائم کا اضافہ نہ کیا تو دیکھیں ان آئیڈیاز کے بارہ میں Inevitability ہے اگر چہ اس چیز میں میکس ویل کی فطری قابلیت کا بھی عمل دخل ہے کہ اس نے ایکسٹرا ٹرم کو دریافت کیا اور آئن سٹائن کے لئے بھی یہ ایک زبردست خراج عقیدت ہے کہ اس نے تھری .... میں ٹائم کا اضافہ کر دیا اگر آپ یوں آئیڈیاز کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان کا آغاز کئی نسلوں میں دور بہت پہلے ہوا تھا۔

سوال............کیا آپ کے نزدیک اگر یہ فطری قابلیت والے انسان دنیا میں نہ ہوتے تو ان آئیڈیاز کی دریافت ہر صورت میں ہونا مقدر رہی تھی؟

جواب.......جی ہاں میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔

سوال....آپ کی بیک گراؤنڈ مذہبی ہے آپ کے فزکس کی تعلیم حاصل کرنے میں کیا مذہب سے اس کا کوئی تضاد یا ٹکراؤ تھا؟ جواب......نہیں ہرگز نہیں ایسا تضاد کیوں ہونا چاہئے تھا حسن اتفاق سے اور میں نے اس بات کا اظہار اپنی تحریروں میں خوب کیا ہے کہ تین بڑے بڑے مذاہب میں سے اسلام صرف ایک واحد مذہب ہے جو فطرت کے قوانین اور ان پر تفکر پر بہت زور دیتا ہے قرآن پاک کی آیات کا آٹھواں حصہ مومنوں کو فطرت کے مطالعہ کی نصیحت کرتا ہے تا وہ خدا کی ہستی کے نشانات کو فطرت کے مظاہر (فینامنا) میں تلاش کریں تو یوں اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

سوال........آپ کو فزکس کے مطالعہ اور اس کے مسائل پر تفکر سے کسی قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے؟ جواب...اس کا جواب میں ہوں دوں گا جب آپ سونے کی خاطر بستر پر جاتے ہیں آپ تھکے ماندے ہوتے ہیں سارا دن انتظامی امور کی انجام دہی کے بعد یا کسی دوسرے کام کی وجہ سے آپ تھک گئے ہوتے ہیں تو اس وقت کسی خیال سے آپ کو سب سے زیادہ تفریح حاصل ہوتی ہے

مجھے معلوم نہیں آپ کو کس خیال سے سکھ اور چین حاصل ہوتا ہے مگر مجھے فزکس کے پیچیدہ مسائل پر غور وفکر کرنے سے بے انتہا لطف حاصل ہوتا ہے اور میں ریلیکس محسوس کرتا ہوں۔

سوال.........یعنی فزکس کے پیچیدہ مسائل پر غور وفکر کرنا آپ کے نزدیک کوئی خاص مسئلہ یا بوجھل کام نہیں ہے؟ جواب.......میرے نزدیک تو یہ چیز اس کے برعکس لطف اندوز ہے میں اس بیان کو اگر چہ یوں کوالی فائی کروں گا جب آپ کسی مسئلہ پر ریسرچ کر رہے ہوتے ہیں اگر چہ یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے اور آپ کا جی چاہتا ہے کہ eatyour heart out آپ سوچتے ہیں کہ اس آئیڈیا کو کامیاب ہونا چاہئے مگر وہ کامیاب نہیں ہوتا تو پھر یہ کام رفتہ رفتہ گھبراہٹ کا باعث بن جاتا ہے مگر اس کے برعکس آپ اس مسئلہ پر متواتر غور کر رہے ہوتے ہیں تو اس لحاظ سے یہ لطف اور مسرت دینے والی چیز ہے۔

سوال................. یہ لطف کسی قسم کا ہے کیا یہ لطف اس بات میں مضمر ہے کہ آپ نے اس روز کیا امور سرانجام دئے یا یہ کہ فزکس کی بیوٹی پر غور کرنا ہی لطف اندوزی کا باعث ہے؟

جواب.......بات دراصل یہ ہے کہ جب غور وفکر کرنے کے بعد جب آپ کوئی چیز دریافت کرتے ہیں تو یہ چیز بذات خود نادر اور نایاب ہے۔

سوال.........گویا کامیابی سے ہی آپ کو لطف میسر ہوتا ہے؟

جواب.......یہ صرف کامیابی ہی نہیں جب آپ ریلیکس ہو رہے ہوتے ہیں تو اس وقت آپ ماضی کی کامیابیوں پر غور کر رہے ہوتے ہیں فی الحقیقت کوئی بھی تحقیقی مضمون جب آپ تحریر کر رہے ہوتے ہیں تو وہ مخصوص مسرت صرف چند روز کے لئے ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ اس مضمون کو لکھنے سے آپ کو ایک ہفتہ تک مسرت ہوگی اور آپ خوشی سے پھول کر سما نہیں سکتے ہوں گے کہ اس سے برآمد ہونے والا نتیجہ کس قدر زبردست اور انوکھا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ چیز آپ کی فطرت کا حصہ بن جاتی ہے شاید یہ آپ کے خوشی دینے والے خلیات کا حصہ بن جاتی ہے یہ خلیات جہاں کہیں بھی آپ کے اندر موجود ہیں یہ آپ کو مزید سے مزید تحقیق کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

سوال........کیا آپ پارٹیکل فزکس کی مافوق الفطرت ہیئت سے کبھی ورطہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں؟ جواب......یقیناً یہ بات بڑے اچنبھے کی ہے بلکہ ناقابل یقین کہ انسان بعض دفعہ جس چیز یا پروجیکٹ پر کام کرتا ہے وہ فی الحقیقت سچا یا عین صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔

سوال .... کیا آپ اس بات سے متاثر ہیں لوگ جس طرح نتائج کو اخذ کر لیتے ہیں یا اس بات سے متاثر ہیں کہ فطرت کی اصل حقیقت کیا ہے؟

جواب.......دونوں سے متاثر ہوں بہ حیثیت فطرت کے مثلاً دماغ کی سائنس کو لے لیجئے یہ بہت حیران کن ہے تو اس صورت میں فزکس منفرد نہیں ہے مگر جب میں اس چیز پر اس صورت میں غور کرتا ہوں کہ فزکس میں کتنی رفیع اور برتر تھیوریز ہیں تو اس لحاظ سے فزکس منفرد ہے۔

سوال........کیا آپ کو میوزک سننا پسند ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کو موسیقی سننے سے ایسی ہی مسرت حاصل ہوتی ہے جیسے فزکس کے مسائل پر تفکر کرنے سے؟

جواب......میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے (میوزک) سے ویسی Sublimity یعنی رفعت اور عروج حاصل ہوتا ہے۔ درحقیقت میں یہ عروج قرآن پاک کو پڑھ کر یا سن کر حاصل کرتا ہوں کیونکہ جب آپ قرآن پاک کو نصف گھنٹہ تک سنتے ہیں تو آپ کو وہی سکون اور عروج حاصل ہوتا ہے اور آپ پر سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

سوال........کیا آپ فزکس کو باعث پرواز یا بلندی پر لے جانے والا تسلیم کرتے ہیں؟

جواب.......ہاں لازماً اس بارہ میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا میرا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن کی تھیوری کو لے لیں اتنا عرصہ گزرنے کے وجود آپ یہ بے اختیار کہ اٹھتے ہیں۔

What a sublime, What a marvellous idea it is.

یہ انٹرویو اس کتاب میں شائع ہوا تھا

A Passion for Science, by lewis Wolpert, Oxford Univsersity press, 1988

(الفضل 17 اپریل 2001ء)

ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی تقاریر اور لیکچرز پر مبنی کتب کا تعارف

(تحریر و تعارف مکرمہ صبوحی ناصر صاحبہ۔ربوہ)

Scienceand Technology Challenge for the South

سن اشاعت: نومبر 1992ء: صفحات کی تعداد 232

اشاعت زیر انتظام T.W.A.S. اور T.W.M.S.O.

مطبع Tipografia Litografia Madera Trieste Italy

تعارف:

یہ کتاب ڈاکٹر عبد السلام کے ان تاریخی نوٹس پر مشتمل ہے جو انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جنوبی ممالک کی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے 22،24 اپریل 1992ء کو اٹلی میں ہونے والی T.W.M.S.O کی کانفرنس میں بیان کئے۔ یہ کتاب مشرق و مغرب میں سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقی، کارہائے نمایاں اور بہترین نتائج کا احاطہ کرتی ہے اور جنوبی ممالک کو اس بات کی تحریک پیش کرتی ہے کہ وہ بھی موجودہ چیلنجز کا سامنا کریں اور مشرق و مغرب کی ترقی سے استفادہ کریں۔ اس کتاب میں T.W.N.S.O. کی کانفرنس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں درپیش جن مسائل کو زیر بحث لایا گیا انہیں بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد ڈاکٹر عبد السلام صاحب اور Louis Ement Ji ڈائریکٹر OECD نے باہم مل کر ICTP کے Adriatico Quest House میں کیا تھا۔ اس کانفرنس سے متعلق مزید معلومات، بشمول کانفرنس کی خاص جھلکیاں ایک علیحدہ ضمیمہ میں پیش کی گئی ہیں لیکن ان میں سے چند معلومات کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کو ہر جگہ سمجھا اور جانا

جاتا ہے لیکن اکثر جنوبی ممالک میں صورتحال مختلف اور نازک ہے۔ یہاں تک کہ ان ممالک میں سائنس وٹیکنالوجی سے صرف لفظی یا زبانی حد تک دلچسپی ظاہر کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان ممالک میں پسماندگی غربت اور استحصال کا مقابلہ صرف سائنس وٹیکنالوجی کی اہمیت کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالسلام نے ان نوٹس کے ذریعے ان ممالک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے۔ T.W.N.S.O. کے افتتاحی اجلاس میں تیسری دنیا کے 36 ممالک کے نمائندگان نے شرکت کی۔ اگر ہم اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کر لیں تو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

پہلا حصہ (صفحہ 1 تا 170) ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سائنس ٹیکنالوجی سے متعلق نوٹس پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے (صفحہ 171 تا 173) میں عبدالسلام صاحب کی بطور عظیم سائنس دان ذات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک Acknowledgement کے ذریعے ڈاکٹر سلام صاحب نے سابقہ ساؤتھ کمیشن کے صدر مسٹر جولیس نائریرے Nyerere Jullus.Mr اور اپنے ساتھی ممبران کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے سائنس وٹیکنالوجی کے فروغ کے سلسلے میں ان کے تحقیقاتی دور کے دوران مفید مباحثوں کا اہتمام کروایا۔ اس کے علاوہ 4-6 اکتوبر 1988ء میں Trleste میں ہونے والی T.W.N.S.O. کی افتتاحی تقریب میں شرکت کرنے والے ساتھیوں کا بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص طور سے Louis Emeni Ji کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے Trleste کے دورے کے دوران ڈاکٹر صاحب سے سیر حاصل مباحثے اور رابطے جاری رکھے اس کے علاوہ Susan Biggin اور اپنی سیکرٹری Anne Gatti کا بھی شکریہ ادا کیا جنہوں نے اس کتاب کو شائع کرنے میں بھرپور معاونت کی۔

اس کتاب کے تیسرے حصے (صفحہ 175 تا 227) میں I.C.T.P کے مقاصد اور اس کی کارکردگی کے جائزے کے ساتھ ساتھ اس کے منتخب شدہ تحقیقاتی میدان کے موضوعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں ضروری سامان اور تحقیقی ماحول مہیا کرنے کے سلسلے میں .I.C.T.P کے طریقہ

کارکوششوں اور نتائج کے بارے میں بھی تفصیلا بحث کی گئی ہے۔ساتھ ہی I.C.T.P کی ممبر شپ کی درجہ بندی اور طریقہ کار کو بھی واضح کیا گیا ہے۔کتاب کے صفحہ 193 پر Physics for the poor عنوان سے ڈاکٹر سلام صاحب کے مختصر حالات، I.C.T.P. کے قیام کے مقاصد اور ان میں کامیابی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔6 اکتوبر 1981ء کو ڈاکٹر صاحب نے روم میں منعقدہ کانفرنس میں

Pontifical Academy of Sciences of the vatican third world Academy of (T. W. A. S) Sciences

کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ چنانچہ صفحہ (199) پر T.W.A.S کے قیام کے مقاصد ابتدائی حالات، سہولتوں اور فوائد پر جامع نوٹ تحریر کیا گیا ہے۔(صفحہ 206) پر تیسری دنیا کے ممالک کا ایک گوشوارہ بھی ترتیب دیا گیا ہے جس میں اکیڈمی کے مختلف درجہ کے ممبران کی تعداد اور ان کی مکمل تعداد الگ الگ دکھائی گئی ہے۔اس کے علاوہ (صفحہ 207 تا 208) پر T.W.A.S. کی طرف سے 79 ممالک کے سائنسدانوں کو دیئے جانے والے انعامات اعزازی رکنیت اور تحقیقی امداد کا بھی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

Abdus Salam A Blography

مصنف کا نام: جگجیت سنگھ۔ سن اشاعت: 1992ء: صفحات کی تعداد: 213
مطبع Viking Penguin India

تعارف:

1973ء میں UNESCO کی طرف سے دیئے جانے والے Kalinga Prize کے حامل اور کئی تحقیقی مقالوں اور کتابوں کے مصنف جگجیت سنگھ کی 17 ابواب پر مشتمل زیر نظر کتاب محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے والد چوہدری محمد حسین صاحب کو

دکھائے جانے والے کشف، آپ کی پیدائش، مڈل سکول جھنگ میں داخلے سے لیکر ایم۔اے کرنے تک کا تعلیمی سفر بڑے جامع اور مفصل پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔Imperial College اور Cambridge University میں ڈاکٹر سلام صاحب کے قیام اور تحقیق پر تفصیلی مواد ہمیں دو الگ الگ ابواب میں ملتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں I.C.T.P کے قیام کی اہمیت اور وجوہات بھی تفصیلاً بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا باب نمبر B The Ahmaddiya Jammat خاصی توجہ کا حامل ہے۔ اس باب میں وہ تمام حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کی رو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ پاکستان میں ایک متنازعہ دوسرے درجہ کے شہری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس باب میں جماعت احمدیہ کے آغاز سے لیکر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے تک نیز احمدیوں کو پاکستان میں درپیش مشکلات کے بارے میں نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب بھی چونکہ ایک مخلص احمدی تھے۔ تو جو مشکلات انہیں ذاتی طور پر پاکستان میں پیش آئیں اور پھر جس طرح کی متعین مخالفت کے پیش نظر انہیں مجبوراً وطن چھوڑنا پڑا ان سب حالات و واقعات کو نہایت جامع پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سائنس اور معاشرے سے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خیالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی بیماری کے آغاز اور 1990ء تک کے وہ تمام حالات بھی درج ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی ذات سے وابستہ تھے۔

کتاب کے آخری صفحات میں ان تمام اعلیٰ ایوارڈ ا ستاد اور اعزازی ڈگریوں کا ذکر ہے جو فزکس کے شعبے میں ان کے درجہ کمال کا اعتراف ہیں۔ ان میں شعبہ فزکس سے متعلقہ امن اور سائنسی تعاون میں ترقی کے اعتراف میں دیئے جانے والے ایوارڈ اور اعزازی تمغہ جات کا ذکر ہے جو ڈاکٹر صاحب نے حاصل کئے۔

Selected Papers of Abdus Salam(with commentry(

Vol. 5.World Scientific series in 20th Century Physics

مصنفین کے نام: Riazuddin. Kibble. Isham T. C. Ali.A صفحات کی تعداد 679

مطبع پریس:World Scientific publishing co Pte Ltd Singapora

تعارف

اس صدی کے عظیم ماہر نظریاتی طبیعیات ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے فزکس اور ریاضی سے متعلق 276 دستاویزات (Papers) پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔اس کتاب کی ترتیب مندرجہ ذیل مصنفین کی باہمی کوششوں اور تعاون کا نتیجہ ہے۔

1. Mr. A. Ali (Dasy) 2. Mr. C. Isham (Imperial college of Sc. and Technology) 3. Mr. T. Kibble (Imperial college of Sc. and Technology)

4. Mr. Riazudding (King Fahd university, of petroleum and minerals)

World scientific series in 20th century physics

کے اب تک چار Volumes شائع ہو چکے ہیں۔

Physics of elementary particles سے متعلق عبدالسلام صاحب کی 276 دستاویزات (Papers) اب تک شائع ہو چکی ہیں۔اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک کے سائنسی اور تعلیمی پالیسیوں پر بھی بہت سی کتب لاتعداد ضمیمے اور دستاویزات منظر عام پر آ چکے ہیں۔طبیعیات سے متعلق سلام صاحب کی ان دستاویزات کی تواریخ کی ترتیب سے پانچ بڑے درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ہر گروپ اپنے موضوع کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی وسیع اور جامع تحقیق کا احاطہ کرتا ہے۔زیر نظر کتاب مندرجہ ذیل پانچ درجوں میں موضوعاتی اعتبار سے تقسیم ہے۔

1. Quantum field theory and dispersion relations
2. Symmetries and Electroweak Unification
3 .Lepton Hadran Unification
4 .Gravity, Supersymmetry and Strings
5 .Condensed Matter and Biology

کتاب کا آخری 5-Section سلام صاحب کے انتہائی حالیہ کیے گئے کام سے متعلق ہے جس

میں ان کے جدت پسند خیالات کے تسلسل اور دلچسپیوں کی تشریح کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے گزشتہ تحقیقی کام سے قطعی مختلف یہ دستاویزات Elementary Particles کی بجائے طبعیات اور حیاتیات کے خالص مادہ کے اہم بنیادی مسائل اور ان کے حل پر مشتمل ہیں۔ Evolutionary Biology میں ایک طویل عرصے سے درپیش الجھنوں سے متعلق بہترین حل اس کتاب کی دو دستاویزات میں بیان ہے۔

1. The role of chirality in the origin of life (page 626) 2. Chirality, Phase transition and their Induction in Amino acid (p635)

کتاب کے پانچوں Sections کے آغاز میں مختصراً ہر دستاویزات سے متعلق معلومات تعارف ہے۔اس کتاب کے والیم پانچ میں ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے بہت سے مضامین کی طویل فہرست چھوڑ دی گئی ہے مثلاً Science Policy تیسری دنیا میں ترقی، بین الاقوامی امن وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بہت سے موضوعات کو دیگر مجموعات میں پہلے ہی شامل کیا جا چکا ہے۔ کتاب کے آخری صفحات پر ڈاکٹر صاحب کے کل 276 دستاویزات کی تواریخ کے لحاظ سے فہرست پیش کی گئی ہے۔ (1943ء1993) کتاب کے انتہائی ابتدائی صفحات چھوڑ کر تعارف سے پہلے ڈاکٹر سلام صاحب کی Post Card سائز تصویر ہے۔ اس کے علاوہ آخری صفحات پر ڈاکٹر سلام صاحب کا بائیو ڈیٹا بھی معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔

اسلامی دنیا کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنسدان

پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام۔(تعارف اور خدمات)

ناشر: بزم ڈاکٹر عبد السلام: کراچی۔ پاکستان

صفحات کی تعداد:203: اشاعت اوّل: مارچ 1996ء

اشاعت دوم: اگست 1997ء مطبع پریس: PRINTERS KARACHI.Y.1

تعارف:

زیرنظر کتاب بزم ڈاکٹر عبدالسلام کے زیراہتمام شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب بھی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا سوانحی خاکہ ہے جس میں ان کی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز ڈاکٹر سلام صاحب کے ابتدائی حالات زندگی، ان کی تعلیمی کارکردگی اور پھر عملی زندگی میں قدم رکھنے کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ جوں جوں کتاب کے اوراق پڑھتے جائیں قاری پر یہ واضح ہوتا جاتا ہے کہ ڈاکٹر سلام صاحب سائنس وٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے کتنے کوشاں رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام دنیا خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک پر سائنس وٹیکنالوجی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے بغیر ان ممالک سے غربت، افلاس، بھوک، پسماندگی اور دیگر مسائل کا حل ممکن نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش تھی کہ پاکستان میں سائنس کی علیحدہ وزارت قائم کی جائے اور سائنسی علوم کو وزارت تعلیم سے الگ کر دیا جائے۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر آئی۔ ایچ عثمانی نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا لیکن پاکستان کی مضبوط نوکرشاہی نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اگرچہ پاکستان میں اپنے مختصراً قیام کے دوران ڈاکٹر سلام صاحب نے بطور سائنسی مشیر خدمات انجام دیں لیکن پاکستان میں آپ کی خدمات سے صحیح فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ سو آپ مجبوراً انگلستان راپس چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب کا موقف تھا کہ پاکستان میں سائنس کا مزاج رکھنے والے طلباء وطالبات کی کمی نہیں۔ سائنس وٹیکنالوجی پاکستان کی ناگزیر ضرورت ہے اور اس کے ذریعہ پاکستان زرعی، تجارتی اور صنعتی ترقی کرسکتا ہے اور اقوام عالم میں اپنا ایک الگ مقام بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلام صاحب کو نوبل انعام دئے جانے پر روزنامہ ''ڈان'' کراچی نے 16 اکتوبر 1979ء کی اشاعت میں ان کی کامیابی کا راز بتاتے ہوئے لکھا ہے:۔

''محترم ڈاکٹر صاحب کا تعلق دین دار اور مخلص گھرانے سے ہے۔ آپ کو بچپن سے ہی قرآن

کریم سے بے انتہا عشق تھا۔ اس لئے آپ نے ساری عمر اپنے مطالعہ اور تحقیقات کے لئے بھی قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کی۔ نوبل انعام وصول کرنے کے بعد جوابی مخطاب میں سورۃ الملک کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی جس میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں ایک ترتیب ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی مخلوق میں کوئی نقادت نہیں ہے''۔ ان آیات کی تلاوت کے بعد جب ڈاکٹر صاحب نے ان کی تشریح کی تو حاضرین حیران ہوئے کہ قرآن کریم ایسے الہامات پر مشتمل ہے''۔ کتاب کے صفحہ 28 تا 29 پر نوبل انعام ملنے پر ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے جو کہا وہ بھی تفصیلا درج ہے۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور کے جناب وارث میر کو 3 دسمبر 1979ء میں ڈاکٹر صاحب نے جو انٹرویو دیا تھا وہ بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو نوبل انعام ملنے پر مختلف ملکی اور غیر ملکی اہم شخصیتوں کے تہنیتی پیغامات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔ صفحہ 44 تا 49 ڈاکٹر صاحب کے عالمی اعزازات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (صفحہ 51 تا 95) مورخہ 13 مارچ 1996ء کو بزم ڈاکٹر عبدالسلام کے زیر اہتمام ہونے والے سیمینار کی مکمل کاروائی بھی تفصیل سے بیان کی گئی۔ (صفحہ 96 تا 103) ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سانحہ ارتحال کی مکمل رپورٹ اور تدفین تک کے تمام واقعات کے علاوہ ان کے جسد خاکی، نماز جنازہ کی ادائیگی اور تدفین کی کچھ نادر تصاویر بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ گو کہ ان کی طباعت اتنی معیاری نہیں۔

رموز فطرت

دنیائے سائنس کے مہر درخشاں ڈاکٹر عبدالسلام

مصنف کا نام: محمد زکریا ورک صاحب تاریخ اشاعت: 1996ء : صفحات کی تعداد: 200 صفحات۔ مقام اشاعت: CANADA, ON K7L 4V6,KIGSTON

تعارف

محمد زکریا درک صاحب کے اب تک کئی جرائد اور اخبارات میں بے شمار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی مصنف کی ایک شاندار تصنیف ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

پہلے حصے میں ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت اور عالمی کارناموں پر مختلف مشہور افراد کے توصیفی بیانات کے علاوہ چند اخبارات ورسائل کے تعریفی اداریے وغیرہ شامل ہیں۔ بی۔بی۔سی۔لنڈن سے نشر ہونے والا ڈاکٹر عبدالسلام کا ریڈیو انٹرویو بھی اس کتاب میں اہمیت کا حامل ہے۔(صفحہ 20 تا24) علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر اسرار احمد علی کا ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے متعلق ایک مضمون ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

''عبدالسلام کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ان میں کئی کمال ہیں، کئی خوبیاں ہیں۔عبدالسلام کی عظمت کی مضبوط بنیاد یہ ہے کہ وہ عظیم سائنسدان ہیں۔سائنس کے میدان میں انہوں نے نہایت کم عمری میں اپنی عظمت کا سکہ جمایا تھا...وہ مستقل اپنی گراں قدر سائنسی تخلیقات سے طبیعیات کو نوازتے رہے اور ذراتی طبیعیات کو نئی نئی راہوں سے روشناس کراتے رہے۔''

''ان کے خیال میں ملت اسلامیہ کے زوال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے مغرب میں آنے والے سائنسی انقلاب اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے تکنیکی انقلاب سے خود کو باخبر نہ رکھا .... بشرطیکہ وہ علم ودانش کی راہ اپنا لے۔''(مضمون صفحہ 1 تا8)

کتاب میں(صفحہ 27 تا36) شامل اشاعت برسٹل یونیورسٹی انگلینڈ کے پروفیسر جان زیمان کا 2 جولائی 1981ء میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کئے جانے پر دیا جانے والا خطاب بھی اہمیت رکھتا ہے۔(صفحہ 37 تا39) پر روزنامہ ''ڈان'' کا 28 نومبر 1992ء کا ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا انٹرویو بھی نہایت اہم ہے۔کتاب کے دوسرے حصے میں TORANTO کے معروف ریڈیو سٹیشن CHIN پر جولائی 1980ء میں نشر ہونے والا ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا انٹرویو بھی شامل ہے۔اس انٹرویو کا مکمل متن کتاب کے لئے سٹیٹ یونیورسٹی آف

نیویارک کے پروفیسر زندرناتھ نے فراہم کیا ہے:۔

پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی ذات اور شخصیت سے متعلق ایک چھوٹا سا تعارف پیش کیا ہے۔اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر سلام سے کچھ سوالات پوچھے ہیں جن کے نہایت تفصیلی اور مدلل انداز میں ڈاکٹر صاحب نے جوابات دیئے ہیں۔(صفحہ 173 تا 177) کتاب کے صفحہ (182 تا 184) ڈاکٹر سلام صاحب کے اقوال زریں بھی انتہائی اہم ہیں۔(صفحہ 197 تا 199) اٹلی کے روزنامہ ''کور پر دی لا میرا'' کے 13 نومبر 1990ء کو شائع ہونے والے مضمون بعنوان ''عبدالسلام کے دو عشق۔ مذہب اور سائنس'' کو بھی کتاب میں اہم باب کی حیثیت حاصل ہے۔صفحہ 214 پر کتابوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جن میں سے 7 کتابیں وہ ہیں جو کہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف کردہ ہیں جب کہ 6 کتابیں وہ ہیں جو ان کی شخصیت، زندگی اور تخلیقی کارناموں پر مختلف مصنفین نے تحریر کی ہیں۔کتاب میں چند نادر تصاویر بھی شامل ہیں جن میں کچھ تو ان کی مصروفیات کو ظاہر کرتی ہیں اور کچھ تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔

قصہ مختصر ''رموز فطرت'' اہم ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے جو مطالعے کے دوران قاری کی توجہ ہٹنے نہیں دیتی اور اسے ایک ہی نشست میں اس کتاب کو ختم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

پاکستان اور کے نوبل انعام یافتہ سائندان ''پروفیسر عبد السلام'' سوانح حیات

مصنف کا نام: عبدالباری قیوم شاہد۔صفحات کی تعداد:80: مطبع پریس: بک ورلڈ پریس لاہور

تعارف:

قیوم اکیڈمی پبلیکیشن کے زیر اہتمام مصنف عبد الباری قیوم شاہد کی یہ کتاب محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی مختصراً سوانح حیات ہے۔

کتاب کا آغاز امام جماعت احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے ارشاد بر موقع سالانہ اجتماع

لجنہ اماء اللہ مرکزیہ تاریخ 20 اکتوبر 1979ء سے ہوتا ہے۔جس میں حضور نے ڈاکٹر سلام صاحب کی شخصیت، عقل وفراست اوراعلیٰ ذہنی استعداد کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان کی سادگی اور انکساری بھی بیان کی ہے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ ایک عظیم سائنسدان ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو دیگر عام لوگوں جیسا ہی سمجھتے ہیں۔

اس سوانح حیات میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ابتدائی حالات، تعلیمی سرگرمیاں، انگلستان جا کراعلیٰ تعلیم حاصل کرنا پاکستان میں کچھ عرصہ ملازمت کرنا اور پھر دوبارہ انگلستان واپس جا کر اپنا تحقیقاتی مشن شروع کرنا، نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تمام دنیا کے مسلمانوں کے مفاداور فلاح وبہبود سے متعلق پالیسی کو بیان کیا گیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے تمام دنیا پر یہ واضح کیا کہ سائنس وٹیکنالوجی کی اہمیت کو سمجھے بغیر دنیا میں ترقیاتی انقلاب لانا ناممکن ہے اور انقلاب کے بغیر پسماندگی دور نہیں کی جاسکتی۔ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ''میرے اپنے جذبات تو یہ ہیں کہ میں صرف پاکستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لئے کام کرنا چاہتا ہوں ۔میری خواہش ہے کہ اٹلی کی طرح کے ادارے میں اور ملکوں میں بھی قائم کرسکوں......میری تمنا ہے کہ اپنی زندگی میں سائنس تحقیقات کا ایک اعلیٰ ترین ادارہ قائم کر جاؤں۔میں اس سلسلے میں لیبیا بھی جارہا ہوں''۔(صفحہ 34 تا 35)

IDEALS AND REALITIES

SELECTED ESSAYS OF ABDUS SALAM

مصنف کا نام AZIM KIDWAI,C.H.LAI صفحات کی تعداد:509

مطبع پریس:LTD SINGAPORE.WORLD SIENTFIC PUBLISHING PVT

تعارف:

یہ نوبل انعام یافتہ عظیم سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے سائنسی ترقی کے حوالے سے دئے گئے لیکچرز پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔1993ء تک اس کے تین ایڈیشن منظر عام پر آ چکے

تھے۔ جس میں سے پہلا ایڈیشن 1984ء میں اور دوسرا 1987ء میں شائع ہوا۔ ہر ایڈیشن میں پہلے کی نسبت کچھ باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

زیر نظر تیسرے ایڈیشن میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی شعبہ فزکس میں غیر معمولی دلچسپی اور ان کے تیسری دنیا اور ترقی پذیر ممالک میں سائنسی میدان میں ہونے والی ترقی و ترویج سے گہرے لگاؤ کو بڑے مفصل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل لیکچرز میں ڈاکٹر صاحب نے سائنسی مسائل اور دستیاب وسائل کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے نیز سائنس و ٹیکنالوجی کی تعلیمی پالیسی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس کتاب میں 7-5 نومبر 1986ء کو ترکی کے بارے میں استنبول میں دیا جانے والے ڈاکٹر سلام صاحب کا خصوصی لیکچر TURKEY IN THE YEAR OF2000 بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ "THIRD WORLD HIGHER EDUCATION AND ITALY"

کے عنوان سے نومبر 1985ء میں Trieste کے مقام پر دیا جانے والا لیکچر بھی شامل اشاعت ہے۔ جس میں تیسری دنیا اور اٹلی میں ترقی کا جائزہ اور اصطلاحات پیش کی گئی ہیں۔ نیز

INTERNATIONAL CENTER FOR THEORETICAL PHYSICS

THIRD WORLD ACADEMY OF SCIENE

THIRD WORLD NETWORK OF SCIENTFIC ORGNAIZATION

کے قیام کے مقاصد اور ان کے کردار پر بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

ISLAM AND SCIENCE کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کے دو لیکچرز بھی شامل اشاعت ہیں جن میں سے ایک پیرس میں UNESCO کے مرکزی دفاتر میں اپریل 1984ء کو دیا گیا تھا جب کہ دوسرا لیکچر اٹلی میں 23-21 جون 1988ء کو دیا گیا۔ ان دونوں لیکچرز کا موضوع قرآن پاک کی آیات اور اسلامی لٹریچر کی روشنی میں سائنس اور اسلام کا موازنہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لیکچرز میں یہ وضاحت بھی کی کہ وہ ایک ''صاحب دین حق'' کیوں ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تاریخ

میں ہونے والی سائنسی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔

سائنسی میدان میں ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ ترین خدمات کا اعتراف ان کو 1979ء میں سویڈن میں دیا جانے والا نوبیل انعام ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے جو تاریخی خطاب دیا تھا وہ بھی زیر نظر ایڈیشن کا حصہ ہے۔ (صفحہ 375 تا 377)

ABDUS SALAM,A man of Science

Nobel Loureate in Physics 1979

مصنف کا نام: Jahn Ziman

صفحات کی تعداد 99: سن اشاعت: 1987ء

مطبع پریس: Research Centre for cooperation with Developing Countries Ljubliana. Yagoslavia.

تعارف:

پروفیسر جان زیمان کی تصنیف کردہ کتاب A MAN OF SCIENCE محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کی سائنسی اور تحقیقی کاوشوں پر مبنی ہے۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر جان زیمان کا خطاب ہے جو انہوں نے 2 جولائی 1981ء کو BRISTOL یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو DOCTOR OF SCIENCE کی اعزازی ڈگری دئے جانے کی تقریب میں دیا تھا۔ اس خطاب میں پروفیسر صاحب نے ڈاکٹر سلام کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

(صفحہ 11 تا 80) ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے مندرجہ ذیل لیکچرز ہیں جو انہوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف مواقع دئے۔

1. Physics and the Excellences of the Life it Brings. 2. Third World

Higher education.3. Science, transfer for Development and Global Problems of science and Technology. 4. Highlights of science for a developing country.

کتاب میں ڈاکٹرعبدالسلام صاحب کی بطور سائنسدان،معلم سائنس ایڈمنسٹریٹر اور امن کے سفیر خدمات اور جدو جہد پر مبنی کاوشوں کا مکمل جائزہ بھی لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کا مکمل BIO DATA بھی آخری صفحات میں شامل ہے۔ڈاکٹر صاحب کو اب تک ملنے والے تمام ملکی اور غیر ملکی اعزازات انعامات ڈگریاں تمغہ جات اور ممبر شپس کی مکمل تفصیل بھی کتاب کا حصہ ہے۔نظریاتی طبیعیات سے متعلق ڈاکٹر سلام صاحب کے اب تک تقریباً PAPERS250 بھی شائع ہو چکے ہیں ۔اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی ذات ان کی تخلیقی اور تحقیقی کاوشوں سے متعلق اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تفصیل بھی اس کتاب میں ملتی ہے۔

Abdus Salam Nobel Laureate from a Muslim Country

(سوانح حیات)

مصنف کا نام: ڈاکٹرعبدالغنی :صفحات کی تعداد:234

مطبع پریس: معارف پرنٹرز لمیٹڈ کراچی: تاریخ اشاعت:1982ء (پہلا ایڈیشن)

تعارف:

محترم ڈاکٹرعبدالسلام صاحب کی ابتدائی زندگی اور ان کے سائنسی و تحقیقی میدان میں کئے گئے کمالات پر مبنی مصنف ڈاکٹرعبدالغنی کی یہ کتاب ہر اس قاری کے لئے جو ڈاکٹر سلام صاحب کی ذات اور کارناموں سے گہرا شغف رکھتا ہے دلچسپی اور معلومات کا مظہر ہے۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنف نے ڈاکٹر سلام صاحب کے ابتدائی حالات زندگی اور شخصیت اور پھر درجہ بدرجہ ان کی تعلیمی مدارج میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ان کے سائنسی اور تحقیقی کارناموں کو اتنے اعلیٰ پیرائے میں سپرد تحریر کیا ہے کہ ہر بات اور ہر واقعہ اپنے

اندر مکمل دلچسپی سمیٹے ہوئے ہے۔ مصنف نے اپنے ذاتی تجربات کو بھی موقع محل کے لحاظ سے شامل تحریر کیا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں ڈاکٹر سلام صاحب سے مختلف مواقع پر ہوئے والی ملاقاتوں کو اپنی زندگی کا بہترین سرمایہ قرار دیتے ہوئے بڑی تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔

بقول مصنف 1958ء میں مجھے ذاتی طور ڈاکٹر سلام صاحب سے جدید فزکس پر طویل گفتگو کا موقع ملا جس کے نتیجہ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ سائنس پر صرف مغرب کی ہی اجارہ داری نہیں جیسا کہ پچھلی صدی بلکہ کئی صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے بلکہ یہ تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ ورثہ ہے۔

مصنف نے شہرہ آفاق ماہر تعلیم اور سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور جناب قاضی ایم۔ اسلم صاحب سے، جن کے گھر میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے 1953-1951ء تک کے عرصہ کے دوران تقریباً 18 مہینے قیام فرمایا، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متعلق ہونے والی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''عبدالسلام صاحب بہت محنتی انسان تھے لیکن انہوں نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا کہ وہ سخت محنت کر رہے ہیں۔ جب بھی کوئی ان کے کمرے میں داخل ہوتا تو وہ سلام صاحب کو اپنی میز پر کام میں مصروف پاتا لیکن ڈاکٹر سلام صاحب فوراً کھڑے ہو کر اندر آنے والے سے نہایت پرسکون اور دلنشین انداز میں گفتگو کرنے لگتے، یہاں تک کہ آنے والا واپسی کی اجازت مانگتا۔ واپس جاتے ہوئے اگر وہ مڑ کر پیچھے دیکھتا تو ایک بار پھر وہ سلام صاحب کو اس طرح کام میں منہمک پاتا کہ گویا انہیں کسی نے مخل کیا ہی نہیں تھا۔'' (صفحہ 40 تا 41)

اگست 1965ء میں سیدو شریف میں ہونے والی سوات سائنس کانفرنس کے موقع پر آخری دن جب مصنف کی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے ملاقات ہوئی تو بقول مصنف ڈاکٹر صاحب بہت اداس اور غمگین نظر آ رہے تھے۔ مصنف کے ہمراہ کار میں تشریف فرما ہوئے۔

انہوں نے انتہائی دھیمے لہجے میں کہا کہ ''اس بہیمانہ اور ملتوی شدہ جنگ سے کچھ حاصل نہیں سوائے اس کے کہ ہماری نوخیز محب وطن نوجوان نسل کو قربانی پیش کرنا پڑی۔ (صفحہ 75)

بھٹو دور میں حکومت میں احمدیوں کو ناٹ مسلم قرار دئے جانے پر جب مصنف نے ڈاکٹر صاحب کا ردعمل جاننا چاہا تو انہوں نے کہا ''ہمارے علماء نے کئی سالوں سے یہ روش اپنائی ہوئی ہے کہ جو مسلمان ان سے اختلاف کرے اسے ''کافر'' قرار دے دیا جائے...... چنانچہ ان ملاؤں کے کہنے پر بوعلی سینا کی طرح جسے اس دور میں کافر ہونے کی سزا سنائی گئی تھی، میں بھی کافر قرار دیا گیا ہوں۔''(صفحہ 88)

کتاب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے مندرجہ ذیل Technical Papers شامل ہیں۔

1. Renaissance of Sciences in Arab and Islamic Lands March 1981.
2. The nature of the Ultimate explanation in Physics Nov 1979.
3. Gauage Unification af Fundamental forces

اس کے علاوہ 20 اگست 1957ء میں پاکستان ٹائمز میں ڈاکٹر عبدالسلام کی شخصیت اور ان کی سائنسی تحقیقات پر شائع ہونے والا ایک آرٹیکل بھی شامل ہے۔(صفحہ 127 تا 134)

غرض ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی زندگی، شخصیت، سائنسی اور تحقیقی کارناموں کے حوالے سے پروفیسر عبدالغنی صاحب کی لکھی ہوئی یہ کتاب آسان فہم انگریزی زبان میں قابل مطالعہ بھی ہے اور دلچسپی و معلومات کا آئینہ بھی۔

Science & Education in Pakistan

مصنف کا نام: ڈاکٹر عبدالسلام: صفحات کی تعداد 140

مطبع پریس: سنگ میل پبلیکیشنز: سن اشاعت: 1989ء

تعارف:

زیر نظر کتاب محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے چند مضامین پر مشتمل ہے جنہیں نسیم احمد صاحب

نے Edit کیا ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جن میں انہوں نے پاکستان میں سائنسی تعلیم اور تحقیق سے متعلقہ مسائل کو زیر بحث لا کر ان کا حل پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں ہونے والی نئی سائنسی پیش رفتوں کا بھی خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں جناب نسیم احمد صاحب نے کتاب کی نوعیت پاکستان کی تعلیمی صورت حال اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایڈیٹر کے الفاظ میں اگست 1987ء میں پاکستان اپنے 40 دیں یوم آزادی کیطرف گامزن ہے۔ پاکستان میں موجودہ سائنس اور تعلیم کی صورتحال اس کی عوام اور غیر ممالک کیلئے انتہائی کم حد تک باعث اطمینان ہے۔ نہ صرف ناخواندگی عام ہے بلکہ خواندگی کے میدان میں پاکستان کا ایشیا کے صرف دو ممالک افغانستان اور نیپال سے انتہائی مشکوک حد تک فرق ہے۔ پاکستان کا تعلیمی خرچ Per Capita ایشیا میں سب سے کم ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے جو Fellow of the Royal Society اور کسی بھی اسلامی ملک سے نوبل انعام حاصل کرنے والے پہلے شخص ہیں۔ پاکستان میں سائنس اور تعلیم کیلئے اور امداد کیلئے اپنی انعامی رقم کا عطیہ دے کر اپنی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ وہ پاکستان کے بچے پر خلوص اور خدمت کیلئے وقف سپوت ہیں۔ اور تیسری دنیا کے انتھک مجاہد بھی۔

اٹلی کی حکومت کی فراخدلانہ مدد کیساتھ ساتھ وی آنا میں International Atomic Energy Agency اور پیرس میں اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم کے تعاون سے Trieste میں I.C.T.P آج دنیا کے تقریباً 25000 کے لگ بھگ سائنس دانوں اور محققین کیلئے باعث توجہ ہے۔ جن میں سے نصف تیسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ وینس سے 150 کلومیٹر مشرق میں واقع اس بے مثال ادارے کے ذریعے ڈاکٹر عبدالسلام کی کوشش ہے کہ تیسری دنیا میں بہت سے ''سلام'' پیدا ہوں جو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ان اقوام میں جہاں ذہنی تاریکی کے غلبے نے سائنس کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے وہاں سائنسی ترقی کی مشعل کو روشن رکھیں۔ عبدالسلام صاحب کا ایک اور تخیلاتی قدم جو انہوں نے اٹھایا۔ وہ تیسری دنیا کی سائنسی اکیڈمی کا قیام ہے جس سے تیسری دنیا کے

تقریباً 100 انتہائی نامور سائنسدان تعلق رکھتے ہیں۔اس کتاب میں شامل عبدالسلام کی تقاریر جو پیغام لئے ہوئے ہیں وہ لامحدود توجہ اور ان تمام سوچنے والے پاکستانیوں کی خالص امداد کی مستحق ہیں جو اپنے ملک کو آئندہ صدی میں پسماندہ اور جاہل قوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے روشن معاشرے کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جو اپنے عوام کو بہترین معیار زندگی مہیا کر سکے۔اس کتاب میں وہ خطاب بھی شامل ہے جو پچھلے سال عبدالسلام صاحب نے نتھیا گلی میں ہونے والے بین الاقوامی سیمینار میں دیا تھا اور بعض وجوہات کی بنا پر پاکستان میں شائع نہیں ہوا تھا۔پروفیسر عبد السلام صاحب نہ صرف ایک ممتاز، مانے ہوئے اور معزز سائنسدان ہیں بلکہ وہ ایک ایسے مخلص دانا ہیں جن کی ہدایات اور نصائح کو نظرانداز کرنا ہمارے لئے سخت خطرناک ہے۔پاکستان میں سائنس اور تعلیم سے منسلک افراد کا یہ فرض بنتا ہے کہ جو کچھ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے کہا اس میں اپنی گہری دلچسپی اور توجہ ظاہر کریں اور ان تمام معقول تدابیر اور کوششوں کو آگے بڑھائیں جس سے پاکستان سائنس اور تعلیم کے میدان میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضامین کے حوالے سے پاکستان کی معاشی، تعلیمی، سائنسی صورتحال کا جائزہ پیش کیا ہے اور اراکین حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ بغیر سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی سے آگاہی کے ترقی کا حصول ممکن نہیں۔ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے موجودہ اور متوقع آنیوالے مسائل کو بھانپ کر ان کے خطرات سے نمٹنے کیلئے حل بھی پیش کیا ہے۔ بقول پروفیسر ایوان ارسو۔"یہ پہلی اور اہم ترین بات ہے کہ عبدالسلام صاحب کے غم اور ناامیدیاں کسی ایک شخص واحد کی نہیں ہیں۔ جب وہ اپنی تمام تر داخلی قوت، شخصیت اور حق کیساتھ ان غم اور ناامیدیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آواز ترقی پذیر ممالک کے ان فرقوں اور جماعتوں کی گونج ہوتی ہے جو دنیا کی درجہ بندی سے دوچار ہیں۔ جو غیر مساوات ناانصافی اور غیر ترقی یافتہ ہونے کا داغ برداشت کر رہے ہیں۔مصنف بے شک خود کو اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں جو دنیا کی تاریخ کی تخلیق میں اقوام کے حقوق کیلئے لڑنے والے کا ہوتا ہے۔ایک ایسی تاریخ جو اقوام کی روحانیت کے

اہم مقامی وسائل کے مطابق ہو جو ان کی خوشحالی کیلئے زیادہ مساوات پر مبنی ہو اور جو امن اور ترقی کیلئے ایک بہتر دنیا کی تخلیق کر سکے۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کا مکمل بائیوڈیٹا دیا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ ان تمام انعامات، اعزازات، ڈگریوں اور تمغہ جات کی تفصیل بھی ہے جو انہیں مختلف مواقع پر مختلف حکومتوں اور ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کی طرف سے ملے۔ مزید برآن ڈاکٹر صاحب نے اب تک سائنسی اور طبیعیاتی موضوعات پر جتنے مضامین اور کتب وغیرہ تصنیف کیں ان کی بھی مکمل تفصیل درج ہے۔

IN ISLAM RENAISSANCE OF SCIENCES COUNTRIES

333 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر عبد السلام کی کئی ایک تصانیف میں سے ایک ہے جو کہ DALAFI.H.R اور M.A. HASSAN نے مرتب کی ہے۔ کتاب کا دیباچہ FRANCESCO GABRIELI نے جب کہ اس کا تعارف دونوں ایڈیٹر صاحبان نے پیش کیا ہے۔

کتاب کل 6 حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈاکٹر صاحب کے مسلم اور غیر مسلم ناظرین کے سامنے دیئے سے لیکچروں پر مشتمل ہے۔ جو سب کے سب اسلام اور سائنس کے بنیادی موضوع سے متعلق ہیں۔ دوسرا حصہ اسلام میں سائنس کی ترقی کے لئے کئے گئے اقدامات سے متعلق ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں جو مضامین پیش کئے گئے ہیں وہ سائنسی ترقی کے عالمی رجحانات اور انکا اسلامی ملکوں میں کی جانے والی کوششوں سے موازنہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب کے چوتھے باب میں محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کا وہ مضمون شامل ہے جو انہوں نے حضرت سر ظفر اللہ خان صاحب کے ساتھ اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر لکھا ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں محترم ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے علمی کارناموں کو BIODATA کی

شکل میں پیش کیا گیا ہے۔کتاب کے ابتدائی چند صفحات کو ڈاکٹر صاحب کی چند نادر تصاویر سے مزین کیا گیاہے۔کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری پرڈاکٹرعبدالسلام کی اس تڑپ کا گہرا اثر پڑتا ہے جو ان کے دل میں اسلامی ممالک اور تیسری دنیا میں سائنس کی ترقی کے لئے تھی۔اس کے علاوہ اسلام میں سائنسی ترقی کے زوال اورموجودہ حالات میں اسلامی ملکوں کے سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانے کی وجوہات کوتجزیاتی رنگ میں بہت تفصیل سے قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

آپ اپنے لیکچرز میں جن میں مسلمانوں کومخاطب ہوکران کواحساس دلاتے ہیں کہ فزکس ساری دنیا کے بنی نوع کا ورثہ ہے اورتیسری دنیا کے ممالک جومواقع اور وسائل کی کمی سے اپنے آپ کو سائنس کی ترقی سے خارج سمجھتے ہیں ان کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کومظہر کائنات پرغور کرنے کے لئے پیدا کیا ہےاوراس میں کسی مخصوص قوم یا علاقے کی تخصیص نہیں ہے بلکہ یہ ایک کھلا چیلنج ہے اور اگر کوئی مضبوط ارادہ باندھ لےتو تحقیق کے دروازے سب کے لئے یکساں کھلے ہیں۔

آپ ان مسلمان طبقات کے نظریے کی سختی سے تردید کرتے ہیں جن کے خیال میں مسلمانوں کو اعلیٰ سائنسی علوم کے حصول میں وقت نہیں ضائع کرنا چاہیئے۔کتاب میں اکثر مقامات پرقرآنی آیات سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پرکائنات کے سربستہ رازوں کوکھولنے کی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔

سائنسی میدان میں مسلمان ملکوں کے مغربی اقوام کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے کا تذکرہ بڑے دکھ سے کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھتے ہیں۔

’’مجھے ابھی تک یاد آتا ہے جب ایک نوبل انعام یافتہ یورپین سائنسدان نے مجھ سے کہا’’سلام کیا تم واقعی ضروری سمجھتے ہو کہ ہمیں ان قوموں کوکھلانے اورزندہ رکھنے کے لئے ان کی مدد کرنی چاہیئے جنہوں نے انسانی خزانہ علم میں ایک نقطے کا اضافہ نہیں کیا۔‘‘ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ یہ نہ بھی کہتا تو میرے احساس خودداری کواس وقت بڑی ٹھیس پہنچتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہسپتالوں

میں استعمال ہونے والی پنسلین کے بنانے میں بھی مسلمان ملکوں کا کوئی حصہ نہیں''۔(صفحہ 27)

آپ نے اسلامی ممالک کو سائنسی ترقی کے میدان میں ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا کھڑا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔آپ کہتے ہیں کہ اس کے لئے ایک لمبی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ایک پر جوش جذبہ قوت ارادی کی بھی۔ اس ضمن میں آپ جاپان کی اپنے اکثر لیکچروں میں مثال دیتے ہیں کہ 1969ء کے بعد جاپان کے شاہ MUTSUSHITO کے دوبارہ اقتدار میں آنے سے 1995ء تک جاپان نے اس کم عرصے میں کن خطوط پر منصوبے بنائے کہ وہ امریکہ کے مقابل پر آ کھڑا ہوا۔ جو بنیادی ارادہ ان کے سارے منصوبوں کی بنیاد بنا وہ یہ تھا کہ علم حاصل کرنا ہے خواہ کہیں سے بھی کرنا پڑے۔ اس کے لئے انہوں نے شروع میں باہر سے سائنسدان اور انجنیئر ز اپنے ملک میں بلائے ،اپنے طلباء پڑھنے کے لئے باہر بھیجے۔ بیرونی ماہرین کی مدد سے یونیورسٹیاں اور ریسرچ سنٹر قائم کئے اور باہر سے فارغ التحصیل طلباء نے اپنی یونیورسٹیاں اور ریسرچ سنٹرز میں باہر سے درآمد شدہ ماہرین کی مدد سے تربیت حاصل کی اور یوں ایک قلیل مدت میں جاپان کے پاس اپنے سائنسدانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ 1945ء میں ہیروشیما و ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد جاپان کا دوبارہ اپنی معیشت کو سنبھالنا بھی ان کی اولوالعزمی کی ایک زندہ مثال ہے۔ آج اسی جذبے کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ جن کا پہلا فرض ہی قرآن کریم میں علم سیکھنا اور سکھانا بنایا گیا ہے۔

کتاب کے بعض مقامات پر محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے ''اسلامی سائنسی فاؤنڈیشن'' بنانے والے منصوبے کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ جس میں اس ادارے کے قیام کے مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کی تفصیلی منصوبہ بندی درج کی گئی ہے۔ کتاب میں بیشتر مقامات پر مختلف گوشوارے دیئے گئے ہیں جن میں آپ نے اپنے لیکچرز کے دوران اسلامی ملکوں میں سائنسی میدان میں ہونے والے کاموں کا مغربی رفتار سے موازنہ پیش کیا ہے اور ایک افسوسناک حقیقت کو ہم پر کھولا ہے کہ مسلمان ملکوں میں QNP کا صرف 2 فی صد حصہ سائنسی ترقی پر خرچ کیا جاتا ہے

جب کہ مغربی اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں یہ 12 فی صد ہے۔ اس طرح مسلمان اور مغربی ملکوں میں سائنسی میدان میں کام کی رفتار اور ترقی کا تناسب 1:6 ہے جو کہ خطرناک صورتحال ہے۔

صفحہ 240 پر مشرق وسطی کے ایک ایڈیٹر کو 1986ء میں انٹرویو دیتے ہوئے عرب ممالک میں سائنس کی ناکامی پر دکھ کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ جن پانچ عناصر کی سائنسی میدان میں ترقی کے لئے ضرورت ہے ان کا عربوں میں شدت سے فقدان ہے۔ ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے، پرجوش ارادہ، اچھے ذہنوں کی حوصلہ افزائی سائنسدانوں کو اپنا کام جاری رکھنے کے لئے تحفظ کی فراہمی، سائنس COMMUNITY کی خودمختاری اور سائنسی کوششوں کا بین الاقوامی اشتراک۔ عرب فلسطین کا تذکرہ تو کریں گے، مغرب سے جنگ کی بات بھی کریں گے لیکن کوئی سائنس کی بات نہیں کرتا۔ ITCP کی ترقی کے لئے فنڈز دینے میں سوائے کویت کے کسی عرب ملک کو دلچسپی نہیں۔

آپ نے عربوں کے اس رویے کے تعلق میں کچھ اور مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیکچرز میں اسلامی ممالک میں سائنسی طرز عمل کے پیچھے رہ جانے کی وجوہات اور ان کے ازالے کے لئے فوری اقدامات کرنے کی ضرورت پر بے حد زور دیا ہے۔ صفحہ 137 پر آپ کا اٹلی میں جون 1988ء میں دیئے جانے والے لیکچر کا وہ حصہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں آپ مغربی دنیا کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ سائنس صرف عیسائی و یہود قوموں کی اختراع ہے۔ آپ نے انسانی ترقی کے اس دور میں جس کا تعلق 1000ء سے ہے ثابت کیا ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے عظیم سائنسی کارنامے انجام دیئے جو آج کے نئے سائنسی دور کے لئے بنیاد کا کام کر رہے ہیں۔ آپ نے خصوصیت سے ابن الہیثم، ابن سینا اور البیرونی کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

خدا حافظ و ناصر

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی نماز جنازہ۔

ایک رپورٹ

(مدیر ''خالد'' مکرم مبشر احمد ایاز کے قلم سے)

یوں تو روز ہی دن چڑھتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اور تاریخ کے بعد تاریخ اور مہینوں کے بعد مہینہ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جو مہینوں بلکہ سالوں پر بھی بھاری ہو جاتے ہیں۔ اپنی یادوں اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے امر ہو جاتے ہیں اور تاریخی یادگار بن جایا کرتے ہیں۔ ایسے ہی بہت سارے یادگار دنوں میں سے ایک دن 22 نومبر 1996ء کا دن بھی ہے جس دن کہ ڈاکٹر عبدالسلام خلافت کا ایک منکسر المزاج، عاجزی کا مجسمہ، خلافت کا وفادار عاشق اپنے محبوب آقا سے ہمیشہ کیلئے لندن سے رخصت ہوا۔

محبتیں اور شفقتیں لٹانے والے آقا نے بھی جس پیار اور شان سے اپنے محبوب ساتھی کو رخصت کیا لندن کے سورج کو بھی کم کم ہی ایسے نظارے دیکھنے نصیب ہوئے ہوں گے۔ گو کہ ہم لوگ اپنے مادی جسموں کے ساتھ شامل نہیں تھے لیکن ایم ٹی اے کی براہ راست منظر کشی کے ذریعہ ہم اپنے تمام تر جذبات و احساسات کے ساتھ ان قابل رشک تاریخی لمحات میں شامل تھے۔

حضور انور کا جنازہ پڑھانے سے قبل اپنے بابرکت ہاتھوں سے کچھ چھڑکنا اور پھر ان عطر بیز ''برداوسلاما'' کی تاثیر رکھنے والے قطرات محبت کو نچھاور کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنا اور دیر تک دیکھتے چلے جانا عاقبت سنوار جانے والی یہ نظریں دیر تک اس معصوم چہرے پر پڑتی رہیں۔ اس کے بعد آپ نے ڈاکٹر صاحب کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ لاریب جس کی

تاثیر مسیحائی روح تک اتر گئی ہوگی۔ زمین و آسمان اس محبت بھرے نظارے کو دیکھنے کیلئے ذرا سی دیر کیلئے تھیم سے گئے ہوں گے۔ سورج بھی رک کر، جھک کر دیکھ رہا ہوگا کہ ایسے نظارے اس نے بھی دیکھے تو ہوں سے لیکن شاذ شاذ، کبھی کبھی، کہیں کہیں۔

ایسی موت پر تو ہزاروں زندگیاں قربان ہونے کو تیار ہوتی ہیں۔ پھر طویل دعائے جنازہ اور اس کے بعد وین تک حضور انور کا اپنے کاندھوں پر اٹھا کر رخصت کرنا کہ لو! اللہ کے حوالے۔

اللہ نگہبان خدا حافظ و ناصر

ان محبتوں اور خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ پانے والی (انشاء اللہ) دعاؤں کے اعزازات سے سجا ہوا پرسکون چہرے کے ساتھ۔ نفس مطمئنہ کا نورانی رنگ چڑھائے ہوئے۔ عبدالسلام کا جسد خاکی اپنے وطن، ہاں وہی وطن جس کی محبت میں ڈاکٹر صاحب کا دل مرغ بسمل کی طرح تڑپتا رہا، اسی وطن میں آیا۔

پہلے لاہور میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور پھر ربوہ کیلئے روانگی ہوئی۔ ربوہ ....تمام احمدیوں کا روحانی مرکز، دلوں کو قرار بخشنے والا اور روحوں کو تسکین پہنچانے والا ربوہ، دور و نزدیک سے آئے ہوئے لوگ، شہر شہر اور بستی بستی سے آئے ہوئے، رات کی سردی میں کھڑے منتظر، جس میں اپنے پرائے سبھی تھے۔ بچے بوڑھے، مرد خواتین، پڑھے لکھے ان پڑھ، پروفیسرز اور تانگہ بان، صنعتکار اور خوانچہ فروش سب ایک ہی غم میں ایک قطار میں کھڑے اس کے چہرے کا آخری دیدار کرنے کیلئے بےچین۔ یوں لگتا تھا کہ جانے والا پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام تانگہ بان کا بھی اتنا ہی قریبی ہے جتنا کسی پروفیسر کا۔ ایک ان پڑھ بوڑھے دیہاتی کا بھی اتنا ہی پیارا ہے جتنا کہ نوجوان افسر کا۔ ایسے جیسے اس کو رخصت کرنے والے ایک ہی گھر کے ایک ہی کنبے کے افراد تھے جو اپنے ایک نیک، مجذوب اور بزرگ فلسفی کو الوداع کہنے آئے ہیں۔

بیمار کی نبض کی طرح یہ قطار دیر تک چلتی رہی۔ یہاں تک کہ رات بھی بھیگ گئی۔ سب سوگوار اس جانے والے اپنے بھائی کیلئے زیر لب دعا گو اور سوگوار۔ اس قطار میں سے اس ہجوم میں چند ایک

کے جذبات جو دراصل سبھی دلوں کی ترجمانی کر رہے ہیں قارئین تک پہنچانا چاہوں گا۔

محترم حضرت مرزا عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ امیر جماعتہائے احمدیہ صوبہ پنجاب

''مکرم و محترم ڈاکٹر صاحب بڑی محبت والے وجود تھے۔ جس کے ساتھ خود بخود پیار پیدا ہوتا تھا۔ آپ کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری بہت تھی۔ میں جب بھی لندن گیا تو آپ کو ضرور ملا ہوں۔ گزشتہ سال 95ء میں جب مَیں گیا ہوں تو اس وقت آپ ہسپتال میں تھے میں قریباً ڈیڑھ گھنٹہ آپ کے پاس بیٹھا رہا بات تو آپ کر نہیں سکتے تھے۔ البتہ ہاتھ پکڑ کر وہ بیٹھے رہے اور یوں ہم آنکھوں آنکھوں میں دیر تک باتیں کرتے رہے اور دل میں دعائیں کرتے رہے پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

بڑی اس مرتبہ 96ء جب میں لندن گیا تو آپ ہسپتال سے اپنے گھر آچکے تھے۔ میں وہاں حاضر ہوا۔ بہت ہی پیارے وجود معلوم ہوتے تھے۔ بڑا محبت کے ساتھ آپ ملے۔ میں آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ آپ نے بہت محبت سے میرا ہاتھ تھامے رکھا آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے گو زبان سے بول نہیں سکتے تھے لیکن ان کے چہرے سے محبت اور درد کا جو معصومانہ پیارا رنگ جھلک رہا تھا۔ اس کیفیت کو دیکھ کر میرے لئے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں عاجزی بہت تھی باوجود اس کے کہ خدا تعالیٰ نے شہرت کے آسمان پر بٹھایا۔ انہوں نے مجھے ایک کتاب تحفہ بھیجی اور اس پر لکھا کہ جو بچے کو اپنے باپ سے محبت ہوتی ہے اس جذبہ کے تحت میں کتاب پیش کرتا ہوں۔ چونکہ حضرت ڈاکٹر صاحب کے والد صاحب کے ساتھ بھی محبت کے تعلقات تھے اس وجہ سے وہ بھی خاص طور پر تعلق رکھتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا وصال دنیاوی لحاظ سے تو بہت نقصان دہ معلوم ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمتیں ہوتی ہیں جب وہ چاہتا ہے جسے چاہے بلا لیتا ہے جب وہ چاہتا ہے کسی کو بھیجتا ہے اس لحاظ سے ہم ہر بات پر راضی ہیں گو کہ طبیعت غم سے بھری ہوئی ہے انکی جدائی کی وجہ سے۔

مکرم و محترم چوہدری حمید اللہ صاحب وکیل اعلیٰ تحریک جدید

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے متعلق مجھے کہنے کی ضرورت نہیں اتنی معروف شخصیت ہے۔ بحیثیت ایک عظیم احمدی کے ایک عظیم سائنسدان کے مجھے فخر ہے کہ میں جب یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو میں ان کا شاگرد رہا نہایت شفیق اور مہربان اور حوصلہ افزائی کرنے والے استاد تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

محترم سید میر محمود احمد صاحب ناصر وکیل التعلیم

ہمارے محترم ڈاکٹرعبدالسلام صاحب جہاں سائنس کی دنیا میں چوٹی کا مقام رکھتے تھے وہاں جو میرا ذاتی تجربہ ان کے ساتھ ہے وہ ان کی محبت شفقت اور انکساری کا ہے اس وجہ سے ان کو ایک غیر معمولی مقام حاصل تھا وہ اٹلی میں تھے اور میں امریکہ میں (مربی) تھا میں نے ان کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ جب کبھی یہاں تشریف لائیں تو آپ ہمیں پہلے بتا دیں تا کہ ہم یہاں کوئی تقریب کرلیں گے۔ چنانچہ آپ تشریف لائے اور پہلے مجھے اطلاع کردی ہم نے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں واشنگٹن اور اس کی اردگرد کی یونیورسٹیوں کے فزکس کے چوٹی کے لوگ آئے۔ عالمی شہرت کے یہودی پروفیسر بھی جو ان کے ہم پلہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت لطیف اور عمدہ تقریر کی اور یوں دعوت الی اللہ کا ایک بہت عمدہ موقعہ ملا۔ اس وقت میں نے آپ کی محبت، شفقت اور سادگی انکساری کا قریب سے جائزہ لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تھوڑا سا بھی علم آجائے تو غرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب میں کسی قسم کا کوئی غرور اور تکبر نہیں آیا۔ نہایت عاجز، منکسر المزاج تھے اور یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی۔

11 بجے لجنہ کے دفاتر کی وسیع گراؤنڈ میں حضرت خلیفۃ المسیح کی عدم موجودگی میں امیر مقامی و ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب تشریف لائے۔ ہزاروں سوگواروں کو ساتھ لیکر ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ ادا کی۔ ربوہ کے خدام کے خوبصورت نظم وضبط کے ساتھ جنازہ بہشتی مقبرہ لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر صاحب (اپنی خواہش اور وصیت کے مطابق جس کو حضرت خلیفۃ المسیح نے ازراہ شفقت منظور فرمایا) اپنے بزرگ صالح والدین کے پہلو میں دفن

کئے گئے۔ اب ڈاکٹر صاحب ربوہ کی اس قطعہ زمین میں ابدی نیند سو رہے ہیں کہ کچھ ایسی سرزمین کے بارے میں خدا کے فرستادے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کچھ یوں دعا فرمائی تھی۔

''اور میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس میں برکت دے اور اس کو بہشتی مقبرہ بنا دے اور یہ اس جماعت کے پاک دل لوگوں کی خوابگاہ ہو جنہوں نے درحقیقت دین کو دنیا پر مقدم کر لیا اور دنیا کی محبت چھوڑ دی اور خدا کیلئے ہو گئے اور پاک تبدیلی اپنے اندر پیدا کر لی۔ آمین یا رب العالمین۔''

.... اور پھر میں تیسری دفعہ دعا کرتا ہوں کہ اے میرے قادر کریم اے غفور و رحیم! تو صرف ان لوگوں کو اس جگہ قبروں کی جگہ دے جو تیرے اس فرستادہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور غرض نفسانی اور بدظنی اپنے اندر نہیں رکھتے اور جیسا کہ حق ایمان اور اطاعت کا ہے۔ بجالاتے ہیں اور تیرے لئے اور تیری راہ میں اپنے دلوں میں جان فدا کر چکے ہیں جن سے تو راضی ہے اور جن کو تو جانتا ہے کہ وہ بکلی تیری محبت میں کھوئے گئے اور تیرے فرستادہ سے وفاداری اور پورے ادب اور انشراحی ایمان کے ساتھ محبت اور جانفشانی کا تعلق رکھتے ہیں۔ آمین یا رب العالمین''

(رسالہ الوصیت صفحہ 20۔18 روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 316۔318)

ہمارا ہیرو ہم سے رخصت ہو گیا

ڈاکٹر پرویز ہود بھائی، روزنامہ ڈان کراچی، 22 نومبر 1996

ترجمہ: زکریا وِرک کینیڈا

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کی رحلت سے دنیا ایک زور آور دانشور سے محروم ہوگئی جس کی پیدائش برصغیر ہندوستان میں ہوئی، اور جو ترقی پذیر ممالک میں سائنس کے فروغ کا سب سے مؤثر حامی و داعی تھا۔ فزکس کی دنیا کے لئے وہ ایک میراث چھوڑ گیا جس کو عرف عام میں یونی فی کیشن تھیوری کہا

جاتا، یعنی ایسا بنچ مارک جس کے مطابق فزکس میں آئندہ ہونے والی ریسرچز کو ماپا جائیگا۔ تیسری دنیا کے ممالک کے لئے وہ اٹلی میں ایسا منفرد ادارہ چھوڑ گیا جو ایک ہزار سائنسدانوں کو مدعو کرتا اور جو اس سے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ میری سلام سے پہلی ملاقات کیمبرج (میساچوسٹس امریکہ) میں ہوئی جہاں آپ MIT (میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی) میں لیکچر دینے کے لئے آئے تھے۔ میں فزکس میں اپنی ماسٹرز کی ڈگری قریب مکمل کرنے والا تھا، لیکن مجھے ان کے لیکچر کا کچھ بھی پلے نہ پڑا اور میں مبہوت حالت میں بیٹھا رہا۔ حاضرین نے جس طرح ان پر تعریف کے ڈونگرے برسائے جن میں ایم آئی ٹی اور ہارورڈ (یونیورسٹیوں) کے مشہور عالم طبیعیات دان بھی شامل تھے، میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کوئی عام قسم کا سیمینار نہیں ہے اور سلام بھی کوئی عام قسم کے وزیٹر نہیں ہیں۔

اس کے کئی سالوں بعد فزکس میں مزید علم و معلومات حاصل کرنے کے بعد میں سلام کے فزکس میں گہرے اور حسین تحقیقی کام کو سمجھ سکا جس کی بناء پر ان کو 1979 میں نوبیل انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس تحقیقی کام کو جو اس قدر پیچیدہ ہے اس کو آسان الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں لیکن شاید اس ضمن میں ایک مثال سے یہ کام آسان ہو جائے۔ ایک سو سال قبل جیمز کلرک میکس ویل نے ثابت کیا کہ میگنا ٹزم اور الیکٹرک قوتیں درحقیقت ایک ہی قوت ہیں، اس کامیابی کی وجہ سے ریڈیو ویوز اور دیگر اشیاء کی دریافت ممکن ہو سکی۔ سلام نے 1968 میں یہ ثابت کیا کہ الیکٹرو میگنٹزم اور ویک نیوکلئیر فورس جس کی وجہ سے سورج اور ستاروں سے روشنی اور حرارت خارج ہوتی ہے، یہ درحقیقت ایک ہی بنیادی قوت الیکٹرو ویک فورس کے مختلف مظہر تھے۔ سلام کی دریافت اور ایسے پارٹیکلز کی پیش گوئی جو اس وقت تک بالکل نامعلوم تھے، اس کی بناء پر پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا، اور ان پیش گوئیوں کو سچ ثابت کرنے کیلئے بلین ڈالر لاگت والے تجربات تیار کئے گئے۔

سلام بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے خوب یاد ہے میں نے ان سے ایک سوال اس وقت پوچھا تھا جب میں نے نیوکلئیر فزکس میں ڈاکٹریٹ 1978 میں مکمل کر لی تھی۔ جاؤ اس کا جواب

کسی کتاب میں تلاش کرو۔ یہ ان کا دوٹوک جواب تھا۔ میں نے خود کو بہت ہی چھوٹا اور سزاوار محسوس کیا۔ اس کے بعد 1984 میں ان سے رابطہ کیا۔ لیکن اس دفعہ معاملہ قدرے مختلف تھا۔ ہم دونوں میں ایک قسم کی مفاہمت پیدا ہوگئی جو سال بہ سال گہری اور مزید بڑھتی گئی۔ انہوں نے مجھے پیشکش کی کہ ہم دونوں باہم مل کر ایک مضمون ضبط تحریر میں لائیں۔ میں نے اس دعوت کو فوراً قبول کرلیا اور خاص قسم کا فخر محسوس کیا۔

سلام کے ساتھ معاملات میں محسوس کیا کہ دو جنون ان کی زندگی پر حاوی اور چھائے ہوئے تھے۔ فزکس کے مسائل میں غور وفکر اس قدر گہرا ہوتا تھا کہ ان کا دماغ جب کسی مسئلے میں الجھ جاتا تو یہ چیز ان کو ہر دیگر چیز سے غافل کر دیتی تھی۔ فزکس کی فیلڈ میں وہ محض چیلنج کرنے والی اور مشکل پرابلمز پر توجہ دیتے تھے۔ ایسی سائنسی پرابلمز کے حل چونکا دینے والے ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ''سوپر فیلڈز'' کی شاندار تخلیق۔ اس میتھے میٹکل کانسپٹ کے بغیر طبیعیات دانوں کو قدرت کے بنیادی قوانین کو ایک حد کے بعد جاننے اور ترقی کرنے میں مشکل مراحل پیش آنے تھے۔

سلام کا دوسرا جنون پاکستان تھا۔ یہ چیز میری فہم سے ہمیشہ بالاتر رہی کہ وہ اپنی جائے پیدائش والے ملک سے کیوں عشق کرتے تھے، یہ جانتے ہوئے کہ احمدی ہونے کے ناطے وہ وہاں مکمل طور پر ناپسندیدہ انسان جانے جاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے ان کو نوبیل پرائز ملنے کے بعد قائداعظم یونیورسٹی کے فزکس ڈی پارٹمنٹ کے افراد نے ان کو لیکچر دینے کیلئے مدعو کرنا چاہا۔ اس آئیڈیا کو اس وقت وِیٹو کر دیا گیا جب ایک مذہبی/ سیاسی پارٹی نے تشدد کی دھمکیاں دیں مبادا وہ کیمپس پر قدم رنجہ ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد نیز کئی اور امور کے باوجود سلام نے کبھی بھی جز بز نہ کیا، اور جو کچھ بھی وہ اپنے وطن کے لئے کر سکتے تھے اس کیلئے کوشش کرتے رہے۔

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ سلام پاکستان میں کیوں نہ رہتے تھے، بلکہ انہوں نے امپیریل کالج لندن میں پروفیسر رہنا اور اٹلی میں فزکس سینٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر قیام کرنا پسند کیا۔

میرے خیال میں ان کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ اگر وہ پاکستان میں رہتے تو ان کی عبقریت نے ضائع ہو جانا تھا، نیز اس سے فزکس کو نقصان لازماً اور بہت بڑا ہونا تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کیلئے کسی قسم کی تبدیلی لانا ناممکن ہونا تھا کیونکہ پاکستان میں فزکس کی ترقی کیلئے مواقع ہمیشہ خلاف ہی رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ سلام یہ کر سکتے کہ پہلے سے خراب حالت کو کسی حد تک ٹھیک کر سکتے، وہ بھی شاید۔

سلام ہم سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت کوئی پاکستانی نہیں اور شاید کوئی بھی سائنسدان کسی بھی مسلم ملک سے ایسا نہیں جو ان کی قد آور شخصیت کے قریب پہنچتا ہو۔ یہ نا قابل تلافی نقصان ہے۔ آیئے ہم سب مل کر ماتم کریں۔

دروغ برگردن ''راوی''

ڈاکٹر صاحب کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر کس و ناکس مثبت رائے رکھتا ہے اور ان کو محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے سوائے متعصب اور ایسے لوگوں کے گروہ کے جنہیں اخبارات میں بھی ''مذہبی جنونیوں کا ٹولہ'' کہا جاتا ہے۔ اور جن کو برسر اقتدار طبقہ نے اپنے مفاد کی خاطر ہمیشہ Free Hand دیا۔ جہاں بھی ان کا بس چلا ڈاکٹر صاحب کے خلاف جو بھی ان سے ہو سکا کیا۔ اور یہاں تک کہ اگر کہیں ان کا نام بھی آیا تو اس کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔ ایک مثال گورنمنٹ کالج لاہور کی 125 ویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والا ''راوی'' کا ضخیم خصوصی شمارہ ہے۔ یہ رسالہ اس وقت میرے سامنے ہے اس کے آغاز میں ٹائیٹل صفحہ پر ''فہرست مدیران حصہ اردو'' شائع ہوئی ہے۔ جس میں 1914ء سے 1989ء تک کے مدیران کی فہرست ہے۔ تعصب کی گھٹیا ترین مثال ہے کہ دونوں جگہ پر ڈاکٹر صاحب کا نام نہیں ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اس مجلہ کے مدیر رہ چکے ہیں اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ متعلقہ افراد کو علم نہیں ہوا ہوگا۔ کیونکہ اوّل تو راوی کے مجلّات لائبریری میں محفوظ ہیں آخر بقیہ مدیران کی فہرست بھی تو مرتب کی ہوگی۔ اور پھر اسی شمارے کے مضامین میں سے سب سے پہلا مضمون ہی ڈاکٹر عبد السلام صاحب کا تحریر کردہ ہے جو کہ صفحہ 1 سے صفحہ 8 تک

ہے۔ اس میں صفحہ 2 پر خود ڈاکٹر صاحب رقم فرماتے ہیں۔

''......ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ ''راوی'' کے اردو اور انگریزی دونوں حصوں کا ایڈیٹر بھی تھا.........'' ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کالج کے تاریخی ریکارڈ کو جس طرح مسخ کیا گیا اس پر انصاف پسند طبقہ کو دکھ ہوا ہوگا اور خود ڈاکٹر صاحب نے بھی توجہ دلائی۔ اور شاید اس صریح ناانصافی کا احساس تھا یا کوئی اور امر کہ اگست 1997ء میں راوی کے گولڈن جوبلی نمبر میں مدیران کی دوبارہ فہرست شائع کی گئی تو اردو والے حصہ میں ایک اور صاحب کے ساتھ نام دیا گیا۔ انگریزی والے حصہ میں ایک اور صاحب کے ساتھ نام دیا گیا گویا کہ اس کے دو مدیر تھے۔ لیکن اب تصحیح شدہ فہرست کو دیکھنے کیلئے اب ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اور یوں ''عذر گناہ'' کے طور پر ڈاکٹر صاحب کا نام دے تو دیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس تعصب کا فائدہ؟ اس سے کیا حاصل ہوا؟

کیا ڈاکٹر صاحب کے وقار یا عزت کو کچھ نقصان ہوا یا الٹا گورنمنٹ کالج اور اس کے مجلہ ''راوی'' کے متعصّبانہ رویہ کی وجہ سے اس کے وقار کو دھچکا لگا۔ (بحوالہ خالد صفحہ 106)

ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی

ٹریسٹے سنٹر ICTP کا نام تبدیل کر کے سلام سنٹر رکھ دیا گیا

(منیر احمد خان صاحب سابق چیئرمین پاکستان اٹامک انرجی کمیشن)

شکریہ دی نیوز 21 نومبر 1997ء

پاکستان کے واحد نوبل انعام یافتہ سائنس دان اور بیسویں صدی کے اس عظیم ترین ماہرین طبیعیات میں سے ایک ڈاکٹر عبدالسلام گزشتہ سال جلاوطنی کی حالت میں لندن میں وفات پا گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے وطن کیلئے بے شمار اعزازات حاصل کیے اور سائنس کی دنیا میں پاکستان کے تاثر کو بہت بہتر بنایا۔ وطن کے اس مایہ ناز فرزند کی نعش آخری خواہش کے مطابق تدفین کیلئے پاکستان لائی گئی مگر آپ

کے تابوت کو بھی کسی اعزاز اور گارڈ آف آنر کے ساتھ وصول نہیں کیا گیا جھنگ میں جہاں آپ نے پرورش پائی تھی آپ کی تدفین بڑی خاموشی کے ساتھ ہوگئی۔ (سہواً لکھا گیا ہے ورنہ آپ کی تدفین ربوہ میں ہوئی ہے۔مترجم) ہمارے اعلیٰ حکام نے انہیں اس لئے نظر انداز کیا کہ وہ احمدی ہونے کے باعث غیر مسلم تھے۔لیکن درحقیقت وہ ایک ایسے پاکستانی تھے جو اپنے وطن عالم اسلام اور تیسری دنیا کے لئے باعث عزت تھے۔مگر ہماری کم نگاہی اور سیاسی مصلحتوں نے ہمیں ایک ایسے شخص کو خراج تحسین پیش کرنے سے بھی روک دیا جس نے ہماری خاطر بہت کچھ کیا ہے۔

ہم تو ڈاکٹر عبدالسلام کو نظر انداز کر سکتے ہیں مگر دنیا انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔چھوٹے لوگوں نے آپ کے مفاد کو چھوٹا کر کے دکھانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ ناکام رہی ہیں کیونکہ آپ تو درحقیقت اس دور کے عظیم ترین انسانوں میں سے ہیں اس لئے آپ کی شہرت کو داغدار نہیں کیا جا سکتا۔اگر ہم ڈاکٹر عبدالسلام کے عظیم کارناموں کو حقیر کر کے دکھانے کی کوشش کریں گے تو ہم خود دنیا کی نظروں میں حقیر ہو جائیں گے۔ڈاکٹر عبدالسلام کی وفات کے بعد ہم ان کی کوئی یادگار تعمیر کرنے میں بھی پس وپیش کر رہے ہیں۔حالانکہ بددیانت رہنماؤں، جاہل ماہرین تعلیم اور خود اپنی قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے نام پر ہم نے سڑکوں، پلوں اور اداروں اور شہروں کے نام خود ان کی زندگیوں میں رکھے ہیں۔حالانکہ انسان کی حقیقی قدرومنزلت کی پہچان اس کے مرنے کے بعد ہوتی ہے۔سٹالن کی طرح کے ظالم آمروں اور جھوٹے اور جعلی ہیروز کے نام تاریخ بڑی بے رحمی سے مٹا ڈالتی ہے۔لیکن ہمارے سلام کو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔

اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں آپ کی وفات کی پہلی برسی کے موقعہ پر عصر حاضر کے مشہور ترین اور اہم ترین ماہرین طبیعیات کے اجتماع میں جس میں کئی نوبیل انعام یافتہ بھی شامل تھے۔عالمی شہرت رکھنے والے نظریاتی طبیعیات کے ادارہ (ICTP) کا نام تبدیل کر کے عبدالسلام سنٹر رکھ دیا گیا ہے۔جدید تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک عظیم ادارے کا نام تیسری دنیا کے ایک سائنس دان کے نام پر رکھا گیا ہے۔یہ پاکستانی حکومت کی خواہش پر نہیں کیا گیا بلکہ ادارے کی سرپرستی کرنے

والوں کا اپنا فیصلہ ہے۔ان سر پرستی کرنے والوں میں اٹلی کی حکومت، انٹرنیشنل انو یک انرجی ایجنسی اور اقوام متحدہ کی تعلیمی سائنسی اور ثقافتی تنظیمیں شامل ہیں۔اٹلی کی حکومت اپنے کسی نوبل انعام یافتہ کے نام پر اس کا نام رکھنے کیلئے اصرار کر سکتی تھی کیونکہ وہ اس ادارے کا 80 فیصد خرچ جو 15 ملین ڈالر سالانہ ہے دیتی ہے۔یہ ان سب کی فراخ دلی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کے نام پر اس کا نام رکھا جس نے ساری دنیا کے فائدے کے لئے یہ علمی درسگاہ تعمیر کی۔

دنیا کے عظیم ماہرین طبیعیات ڈاکٹر عبدالسلام کا بے حد احترام کرتے تھے کیونکہ انہوں نے انسان کے علم میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔آپ نے چار بنیادی قوتوں کے متعلق ثابت کیا کہ وہ درحقیقت تین ہیں۔ چار بنیادی قوتیں کشش ثقل، مضبوط نیوکلیائی طاقت، برقی مقناطیسی طاقت اور کمزور نیوکلیائی طاقت ہیں۔آپ نے ثابت کیا کہ کمزور نیوکلیائی طاقت اور برقی مقناطیسی طاقت دراصل ایک ہی ہیں۔چار بنیادی قوتوں کو ایک ثابت کرنے کی جانب یہ ایک بہت عظیم قدم تھا۔اور یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے تمام ماہرین طبیعیات کوشاں ہیں۔

دنیا کے مشہور ماہرین طبیعیات محض علمی پیاس بجھانے کیلئے تحقیق کرتے ہیں مگر ڈاکٹر عبدالسلام کی جستجو کا سفر خالق کائنات کی واحدانیت پر ایمان کے ساتھ آگے بڑھا ہے۔ان کا اعلان یہ تھا کہ چونکہ یہ تمام قوتیں خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں اس لئے بالاخر یہ ایک ثابت ہوگی کیونکہ ان کا منبع و ماخذ ایک ہے۔ڈاکٹر عبدالسلام اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ریاضی اور طبیعیات کی مدد سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ زندگی کا عمل اور خلیات کی تقسیم کا عمل کیسے آگے بڑھا ہے۔انہیں اس کام کو مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی مگر اس میدان میں آپ کی پیش رفت سے ممکن ہے کہ بعض دوسرے لوگ مدد لیکر اس مسئلہ کو حل کر سکیں اور نوبل انعام کے حقدار ٹھہریں۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے اگرچہ 45 سال جلاوطنی میں گزارے مگر آپ پاکستان کو کبھی بھی نہیں بھولے۔بہتوں نے آپ کو پاکستانی شہریت واپس کرنے کی ترغیب دی اور اس کے لئے کئی لالچ دیئے مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا۔یہاں تک کہ جب برطانیہ کی ملکہ کی طرف سے آپ کو نائٹ کا

خطاب مل چکا تھا تب بھی آپ اس بات کیلئے تیار نہیں ہوئے کو کہ اپنے ملک کی شہریت واپس کر کے کسی اور ملک کی شہریت قبول کر جو لیں۔ آپ پاکستان پر ایمان رکھتے تھے اور اسے پھولا پھلتا دیکھنا چاہتے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو پاکستان کی اقتصادی اور سماجی ترقی کیلئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آپ چودہ سال تک پاکستان کے تین صدور کے سائنسی مشیر رہے اور اس حیثیت سے آپ نے بار بار انہیں یہ ترغیب دی کہ وہ سائنس، ٹیکنالوجی اور تعلیم میں زیادہ سرمایہ کاری کریں۔ بہت سے ایسے کمیشن جنہوں نے ان شعبوں میں ترقی کیلئے منصوبے تیار کیے آپ ان کے سربراہ رہے۔ مگر بد قسمتی سے آپ کی سفارشات سیاسی رہنماؤں اور پالیسی بنانے والوں نے ہمیشہ نظر انداز رکھیں۔ آپ نے صدر ایوب خان کو یہ مشورہ دیا کہ امریکہ سے قرضوں کی بجائے ٹیکنالوجی حاصل کی جائے۔ اس لئے صدر کینڈی نے Revalle Mission پاکستان بھیجا جس کا مقصد سیم اور تھور کے مسائل کا جائزہ لینا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے خلائی تحقیق کیلئے سپارکو کی تعمیر و تشکیل کے منصوبے پر بھی کام کیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے 14 سال تک ممبر رہے اور اس کے کئی منصوبوں اور کاموں میں مدد دیتے رہے۔ Pinstech اور Kanupp کے قیام میں بھی آپ کا تعاون شامل تھا۔ اگر صدر ایوب آپ کی سفارشات کو قبول کر لیتے تو پاکستان ری پروسنگ پلانٹ اور دیگر سہولتیں ساٹھ کی دہائی میں ہی حاصل کر لیتا جب کہ وہ کم قیمت پر اور عالمی پابندیوں کے بغیر میں ہو سکتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مشرقی بھی تھے اور مغربی بھی۔ آپ کو ایک عالمی احترام نصیب ہوا۔ مختلف ممالک کے بادشاہ، صدور، وزرائے اعظم آپ کا استقبال کرتے تھے اور آپ کے مشورے کے متمنی رہتے تھے۔ آپ کے اعزاز میں ایک مرتبہ چین میں ایک عشائیہ دیا گیا جس میں چینی وزیر اعظم مہمان خصوصی کے طور پر شامل تھے۔ یہ بات سب کیلئے حیران کن تھی کہ چینی صدر نے سفارتی آداب و روایت کے برعکس اس تقریب میں شمولیت کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ اس عظیم انسان سے ملنا چاہتے تھے۔

تیسری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کیلئے آپ نے بہت سے کام کیے ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کی باقی دنیا سے علیحدگی ختم کرنے کیلئے آپ نے ٹریسٹ میں ICTP کا ادارہ قائم

کیا۔(آپ گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانے میں ایسی ہی تنہائی اور علیحدگی کا شکار رہ چکے تھے۔) یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں غریب ممالک کے سائنسدان امیر ممالک کے سائنس دانوں سے مل سکتے ہیں۔ یہی وہ ادارہ ہے جہاں سرد جنگ کے زمانے میں مشرق اور مغرب کے سائنس دان رابطہ کر سکتے تھے۔ اس واسطے کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں اور محققین کو ایک جوش اور ولولہ نصیب ہوا جو اپنے وقت کے عظیم دماغوں سے ملے بغیر ممکن نہیں تھا۔ انہی لوگوں نے اپنے ممالک میں واپس جا کر سائنسی ترقی کیلئے کام کا آغاز کیا جو آج پھول پھل رہا ہے۔ آپ کا سائنس کے متعلق نظریہ بے حد وسیع تھا اور آپ اسے ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ آپ نے کمپیوٹرز، لیزر، جینٹک انجینیئر نگ، بائیوٹیکنالوجی جیسے شعبوں کیلئے تھرڈ ورلڈ اکیڈی اور دوسرے مراکز تحقیق بنائے۔ آپ نے نہ صرف شمال اور جنوب کے مابین تعاون کی حوصلہ افزائی کی بلکہ مشرق و مغرب کے مابین بھی تعاون کی فضا قائم کی۔

ڈاکٹر عبدالسلام اپنی تمام عزت وعظمت وشہریت کے باوجود ہمیشہ ایک عاجز اور منکسر المزاج انسان رہے۔ آپ نے کبھی اپنے مقام اور مرتبہ کو دولت جمع کرنے کی اور محلات تعمیر کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ نوبل انعام کی رقم میں سے آپ نے ضرورت مندوں کو وظائف دینے کا اعلان کیا۔ نوجوان سائنس دانوں کیلئے ڈاکٹر عبدالسلام ہمیشہ ایک نمونہ اور ماڈل کے طور پر رہیں گے۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میں فزکس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا ادارہ ہو۔ پاکستان میں منعقد ہونے والے ایک سالانہ سیمینار کے متعلق آپ کو امید تھی کہ یہ ایک ایسے ادارے کے قیام پر منتج ہوگا جو پھر پاکستان میں ماہرین طبیعیات اور ریاضی کی ایک نئی نسل کو جنم دے گا۔ آپ خود یہاں آ کر لیکچر دینا چاہتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ایک ایسے مرکز کی تجویز نوکر شاہی کی دلدل میں پھنس گئی اور باہمی جھگڑوں کی نذر ہوگئی۔ پاکستان کے ماہرین طبیعیات جو بہترین خراج تحسین ڈاکٹر صاحب کو پیش کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک ایسا ادارہ قائم کریں جہاں نوجوان سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے نقش قدم پر چل سکیں۔'' (ترجمہ مکرم محمود احمد صاحب اشرف)

قرارداد تعزیت

بروفات محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب

جماعت احمدیہ کے مایہ ناز فرزند اور عالی شہرت کے حامل پاکستان کے قابل فخر سپوت محترم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب مورخہ 21 نومبر 1996ء کو عمر 70 سے سال آکسفورڈ انگلستان میں انتقال فرما گئے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ 20 جنوری 1926 کو اپنے ننھیال ''سنتو کھ داس'' ضلع ساہیوال میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد حضرت چوہدری محمد حسین صاحب جھنگ شہر کے ایک مخلص اور فدائی اور صاحب کشف والہام بزرگ تھے۔محترم ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم سے لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے تک آپ نے اوّل پوزیشن کا اعزاز حاصل کیا اور اس دوران کئی تعلیمی ریکارڈ قائم کئے۔کیمبرج یونیورسٹی انگلستان میں اپنی غیر معمولی استعداد کی بناء پر چھ سال کا تعلیمی دور صرف تین سال میں مکمل کیا۔آپ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبہ ریاضی کی حیثیت سے تدریسی فرائض ادا کرتے رہے اور پھر امپیریل کالج لندن میں پروفیسر مقرر ہوئے۔آپ اسی کالج میں صدر شعبہ بھی مقرر ہو گئے اور اس دوران کئی ممالک میں تحقیقی لیکچر دیئے۔

محترم پروفیسر صاحب کو پاکستان، برطانیہ، اٹلی، پیرو، وینزویلا، پولینڈ، اردن، ترکی، بھارت، بنگلہ دیش، نائیجیریا، فلپائن، سوڈان، سپین، امریکہ، کینیا اور ارجنٹائن وغیرہ ممالک نے متعدد اعزازی ڈگریاں پیش کیں۔اس طرح پوری دنیا سے انہوں نے متعدد ایوارڈ حاصل کئے۔علاوہ ازیں نشان امتیاز (پاکستان)، نشان اندلس (وینزویلا)، نشان استقلال (اردن)، نشان میرٹ (اٹلی)، جیسے اعزازات بھی آپ کو حاصل ہوئے۔دنیا کی چھ یونیورسٹیوں میں آپ کا تقرر ہوا۔اس کے علاوہ بے شمار عالمی اکیڈمیوں اور سوسائٹیوں کے رکن، منتخب فیلو اور بانی رہ چکے ہیں۔ٹریسٹ اٹلی میں آپ کا قائم کردہ ادارہ ''انٹرنیشنل سینٹر برائے نظریاتی فزکس'' آپ کا ایک عظیم کارنامہ ہے جس

کے ذریعہ تیسری دنیا کے ہزاروں سائنسدانوں نے استفادہ کر کے اپنے اپنے ملک کو فائدہ پہنچایا۔ آپ کا شمار دنیا کے ناموراور شہرہ آفاق سائنسدانوں میں ہوتا ہے کہ جن پر دنیائے سائنس بجا طور پر فخر کرے گی۔

آپ نے 1979ء میں فزکس میں نوبل انعام حاصل کیا۔ آپ نے 250 کے قریب تحقیقی مقالات لکھے اور متعدد کتب تصنیف فرمائیں۔ آپ جہاں خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر غیر متزلزل یقین اور ایمان کی بناء پر تمام سائنسدانوں میں ممتاز اور منفرد مقام کے حامل تھے وہاں احمدیت کی صداقت کا بھی ایک عظیم نشان تھے کہ آپ اس علم و معرفت سے نوازے گئے جس کا وعدہ حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کو دیا گیا تھا۔ جیسا کہ حضور نے فرمایا:

''خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبت دلوں میں بٹھائے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور نشانوں کی رو سے سب کا منہ بند کریں گے۔'' (تجلیات الٰہیہ)

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی وفات سے جو ایک خلا پیدا ہوا ہے ہماری خدائے واحد و یگانہ و علیم و حکیم سے دعا ہے کہ وہ حضرت اقدس بانی سلسلہ احمدیہ کی اس پیشگوئی کے حامل سینکڑوں ہزاروں ''عبدالسلام'' جماعت احمدیہ کو عطا فرمائے۔ جن کا آغاز بھی نیک ہو اور انجام بھی نیک ہو۔ جنہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے وہی عظمتیں نصیب ہوں جو مرحوم ڈاکٹر صاحب کے حصہ میں آئیں۔

مجلس عاملہ خدام الاحمدیہ پاکستان اپنے پیارے امام ہمام ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اور محترم ڈاکٹر صاحب کے جملہ اہل خانہ ولواحقین اور عالمگیر جماعت احمدیہ کے تمام ممبران سے دلی تعزیت کا اظہار کرتی ہے۔ (راجہ منیر احمد خان صدر مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان)

ہم ہیں ممبران عاملہ مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رانا عبدالرزاق خان صاحب

لندن کے معروف شاعر، ادیب، مصنف، کالم نگار، صحافی کی ادبی خدمات

مصنف:

۱۔قندیل حق۔ ۲۔قندیل علم۔ ۳۔دانشکدہ عظیم۔ ۴۔سپوت ایشیا۔ ۵۔تاریخ احمدیت راجپوتاں کاٹھگڑھ۔
۶۔نافلہ مہدی۔ ۷۔سوانح بہادر شیر کاٹھگڑھی۔ (۸) موسیقار دربار۔ (۹) قائد عظیم کا دست راست (۱۰) قندیلِ صحرائی
(۱۱) سیرت سوانح عبدالرحمن خادم گجراتی صاحب (۱۲) سیرت وسوانح حضرت قاضی ظہور الدین اکمل صاحبؓ
(۱۳) تذکرہ شعرائے حق (۱۴) سیرت ڈاکٹر عبدالسلام صاحب۔ (۱۵) تاریخ مسجد فضل لندن

میگزین: ۱۔قندیل ادب انٹرنیشنل لندن ۲۔قندیل حق لندن

رانا عبدالرزاق خان

(Mob.) +44 7886 304637 E-mai: ranarazzaq52@gmail.com

SHEHENSHAH AQLEEM SCIENCE

SEERAT DR. ABDUS SALAM SAHIB

تعارف مصنّف

رانا عبدالرزاق خاں

پیدائش۔ 13 اپریل 1951۔ چک نمبر 2TDA ضلع خوشاب۔

تعلیم۔میٹرک،ایف اے تعلیم الاسلام سکول وکالج ربوہ۔۔بی اے پنجاب یونیورسٹی لاہور

1972. ملازمت۔۔سپروائزر۔پیکیجز بورڈ ملز لاہور۔زعیم۔خدام الاحمدیہ حلقہ جنرل ہسپتال قیادت ماڈل ٹاؤن لاہور

1975 بحرین عربین گلف روانگی بطور ایگریکلچر اسسٹنٹ بحرین۔وہاں نو سال سیکٹری مال جماعت کام کی توفیق ملی۔

شادی 28 نومبر 1977 ربوہ۔۔سسر چچا جان ناصر احمد بہادر شیر افسر حفاظت خاص۔۔شمولیت حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ

1984 میں والد صاحب کی وفات پر تقرری نمبردار چک نمبر 2TDA ضلع خوشاب۔

1985 قائد خدام الاحمدیہ ضلع خوشاب۔1989 صدر جماعت احمدیہ چک نمبر 2TDA ضلع خوشاب مسلسل 2005 تک صدر رہے۔16 سال۔

1995۔ناظم مجلس انصاراللہ ضلع خوشاب وشمولیت ممبر شوریٰ مرکزیہ۔سیکٹری دعوت الی اللہ ضلع خوشاب 1997۔۔ذیابیطس کی بیماری لگی۔

2001۔انتخاب بطور امیر ضلع خوشاب۔ 2005۔روانگی لندن۔رضا کارانہ خدمت شعبہ عمومی مجلس انصاراللہ مرکزیہ عرصہ دس سال۔

2009 مجلس شعروسخن کا قیام بوساطت محترم مبارک صدیقی صاحب

2010۔کالم نگاری یوکے ٹائمز۔۔۔ایڈیٹر گوشہ ادب یوکے ٹائمز۔۔۔اخبار احمدیہ یوکے کے ادارتی بورڈ میں شمولیت۔جو کہ آج تک ہے۔

2012۔ معاون صدر TICOSA UK 2013۔قندیل ادب انٹرنیشنل کا اجرا جنوری سے شروع۔

2014۔سیکرٹری تجنید TICOSA UK ساری تجنید مرتب کی۔رسالہ قندیل حق کا جنوری 2018 میں اجرا کیا۔

2015۔جنرل سیکرٹری TICOSA UK مشاعرے اور دورہ جات کروائے۔

2017۔جنرل سیکرٹری TICOSA UK۔دو کتب کی اشاعت۔قندیل حق 500 صفحات۔قندیل علم۔506 صفحات

2018۔تیسری کتاب کی اشاعت ہوئی۔دانشکدہ عظیم 600 صفحات۔ایک دینی میگزین، قندیل حق سہ ماہی شروع کیا گیا۔

2020۔چوتھی کتاب کی اشاعت۔۔سپوت ایشیا۔630 صفحات 2022۔پانچویں کتاب۔تاریخ کا ٹھگرڑھ 500۔صفحات

2023۔چھٹی کتاب بہادر شیر مرحوم۔صفحات 100۔ساتویں کتاب نافلہ مہدی ایم ایم احمد صاحب۔قندیل ادب انٹرنیشنل کے دس سال مکمل۔

آٹھویں کتاب مجموعہ کلام (قندیل صحرائی) کے نام سے شائع ہونے کو تیار ہے۔

اس عرصہ میں رانا عبدالرزاق خاں نے تین صد سے زائد مشاعرے کروائے۔جس میں ہزاروں شعراء نے شمولت کی۔زوم پر بھی مشاعرے کروائے گئے۔

2023 نویں کتاب... موسیقارِ دربارِ خلافت ثاقب زیروی کی سوانح تحریر کی۔دسویں کتاب قائداعظم کا دستِ راست۔۔چوہدری ظفراللہ خان

2024 تذکرہ شعرائے حق، سیرت ڈاکٹر عبدالسلام، تاریخ مسجد فضل لندن، سیرت سوانح خالد احمدیت مولانا عبدالرحمٰن صاحب خادم، سیرت سوانح قاضی ظہور الدین اکمل صاحب زیر ترتیب ہیں۔۔۔نیز قندیلِ حق کے 30 رسالے نکال چکے ہیں۔

Written by:

Rana Abdul Razzaq Khan, London